بہتے پانی پہ مکان
مشہور ٹی وی ڈرامہ
آنچ
کی کہانی
ناہید سلطانہ اختر
Eqbal Mehdi

بار اوّل ——— جنوری ۱۹۹۱ء
قیمت ——— ۱۰۰/- روپے
مطبوعہ ——— احمد پرنٹنگ کارپوریشن
ناظم آباد۔ کراچی

دوسری بار ——— 1993

سرورق
اقبال مہدی

ناشر

کتابیات پبلی کیشنز
پوسٹ بکس ۲۳، رمضان چیمبرز بلیموریا اسٹریٹ آئی آئی چندریگر روڈ کراچی

انتساب

بہت محبت کے ساتھ
اپنے اہل خانہ کے نام

جو

مجھے یکسوئی سے لکھنے کے لیے ہر ممکن سہولت بہم پہنچاتے ہیں

مصنفہ کی دوسری کتابیں

"پھول کھلتے ہیں" افسانے

"سلسلے وفا کے" ناول (زیرِ طبع)

"نئی رُتوں کی چاہ میں" ناول (زیرِ طبع)

حریم

سلطنتِ روم کے شہنشاہ مارکس آریلیس نے کہا تھا: ہر لمحہ اپنے کام کو سادگی اور وقار کے ساتھ اور محبت کے جذبے سے کرو، خود غرضی کو الگ رکھو اور جو کچھ تمہاری قسمت میں ہے اس پر راضی اور شاکر رہو۔

شتے پانی پہچان کی بنیاد مارکس آریلیس کے اسی قول پر رکھی گئی اور اس کی تعمیر میں اس ایقان کی روح شامل [illegible] کہ سچی خوشی انھی کو ملا کرتی ہے جو اپنے آپ پر حکومت کرنا سیکھ لیتے ہیں۔

زیرِ نظر ناول یوں تو میرا تیسرا ناول ہے لیکن اس اعتبار سے پہلا کہ کتابی صورت میں نقشِ اول ہے اور اپنے پیش رو [illegible] "سلسلے وفا کے" اور "نئی رُتوں کی چاہ میں" کی طرح بالاقساط شائع ہو چکا ہے۔ چنانچہ آپ میں سے اکثر کرم فرما یقیناً اسے پڑھ چکے ہوں گے۔

اس ناول کی آخری قسط شائع ہوئے ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا ہے۔ ناول کی پندرہ قسطوں کی قارئین نے جس محبت سے پذیرائی کی وہ میرے لیے اثاثہ گراں بہا ہے۔ ناول کی قسط وار اشاعت کے دوران مجھ سے اکثر یہ سوال پوچھا جاتا رہا کہ کیا الفت واقعتاً کوئی حقیقی کردار ہے؟ اور لطف کی بات یہ کہ اکثر سوال کرنے والے خود ہی یہ بتاتے رہے کہ الفت کا کردار ان کی فلاں شناسا سے مشابہ ہے۔

اس ناول کا مرکزی کردار الفت کوئی غیر معمولی کردار نہیں بلکہ ایک عام سی عورت ہے جو اپنے نام کی حرمت کا بٹوارہ ہوتے برداشت نہیں کر سکی۔ [illegible] مافوق الفطری کردار نہیں بلکہ ناول کے آغاز سے نقطۂ عروج تک اس کی کمزوریاں اور

سنز و ریاں کبھی آگے پیچھے اور کبھی پہلو بہ پہلو بالکل ایسے ہی ملی جلی ہیں جیسے راہِ حیات پر بہت سی اُلفتیں کبھی ہمارے آگے پیچھے اور کبھی ساتھ ساتھ چلتی دکھائی دیتی ہیں۔

جلیس الحسن جیسے شادی شدہ، عیال دار اور زخم خوردہ مرد کی زندگی میں قدم رکھنے والی دوسری عورت کو بلاشبہ بہتے پانی پر ہی تو مکان تعمیر کرنا پڑتا ہے۔ بہتے پانی پر مکاں بنانا کیسا وقت طلب اور صبر آزما کام ہے یہ اُلفت جیسی عورتیں ہی سمجھ سکتی ہیں لیکن بہتے پانی پر مکاں انہیں جو سرخروئی عطا کرتا ہے وہ سبھی دیکھ سکتے ہیں۔

یہ ناول بطورِ خاص ان عورتوں کے لیے لکھا گیا ہے جو بہتے پانی پہ مکاں تعمیر کرنے چلی ہیں تعمیر کے اس عمل میں ان مردوں کو علیحدہ رکھنا ناممکن ہے جن سے اُن کا مقسوم وابستہ ہوا ہے۔ اگر آپ بھی بہتے پانی پہ مکاں تعمیر کرنے والیوں میں سے ہیں تو اپنے دل کو اس یقین پر ٹھہرا لیجیے کہ خوشی انہی کو ملتی ہے جو اپنی قسمت کے لکھے پر راضی اور شاکر رہتے ہوئے خود غرضی کو الگ رکھ کر اپنے آپ پر حکومت کرنا سیکھ لیتے ہیں اور ... اگر آپ جلیس الحسن کے ہم جلیس ہیں تو آپ کو تعمیرِ نشیمن میں اپنی اُلفت کو اپنی محبت اور چاہت کا سہارا یقیناً دینا ہو گا ورنہ اُلفت بہتے پانی پہ مکاں کیوں کر بنا پائے گی!

میں اُن تمام کرم فرماؤں کی انتہائی شکر گزار ہوں جنہوں نے اُلفت کی تمام تر کمزوریوں سنز و ریوں اور منزل سے دو گام پرے اُس کے قدموں کی ڈگمگاہٹ کو نظر انداز کر کے اُس کی سرفرازی پر بڑی فراخدلی سے اظہارِ مسرت کیا اور اس کی سرخروئی میں جلیس الحسن اور ان کے بچوں ہی کو نہیں بلکہ عاصمہ کو بھی شریک قرار دے کر اپنی وسیع القلبی کا ثبوت دیا۔

میں محترم معراج رسول صاحب کی ممنون ہوں کہ بہتے پانی پہ بنے اس مکاں کو بہت بروقت نئی آب و تاب دینے کا سہرا کاملاً انہی کے سر جاتا ہے۔

کئی برس قبل اپنی چند منتخب کہانیوں پر مبنی مجموعہ "پھول کھلتے ہیں" کی اشاعت کے موقع پر میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ بشرطِ حیات زیادہ بہتر کہانیاں آپ کی خدمت میں پیش کروں گی۔ اس ناول کو اسی وعدے کی ایک کڑی سمجھیے اور ان الفاظ کو تجدیدِ عہد کہ آپ کی محبتیں اور عنایتیں یوں ہی میرے دل کو بڑھاتے رہیں تو انشاء اللہ العزیز مستقبل میں "بہتے پانی پہ مکاں" سے زیادہ بہتر اور تازہ تر کہانیاں پیش کرنے کی کوشش کروں گی۔

آپ کی کرم نوازیوں پر ایک بار پھر انتہائی شکر گزار

ناہید سلطانہ اختر

۱۸ ـ دسمبر ۱۹۹۰ء

پبلی کیشنز
کراچی
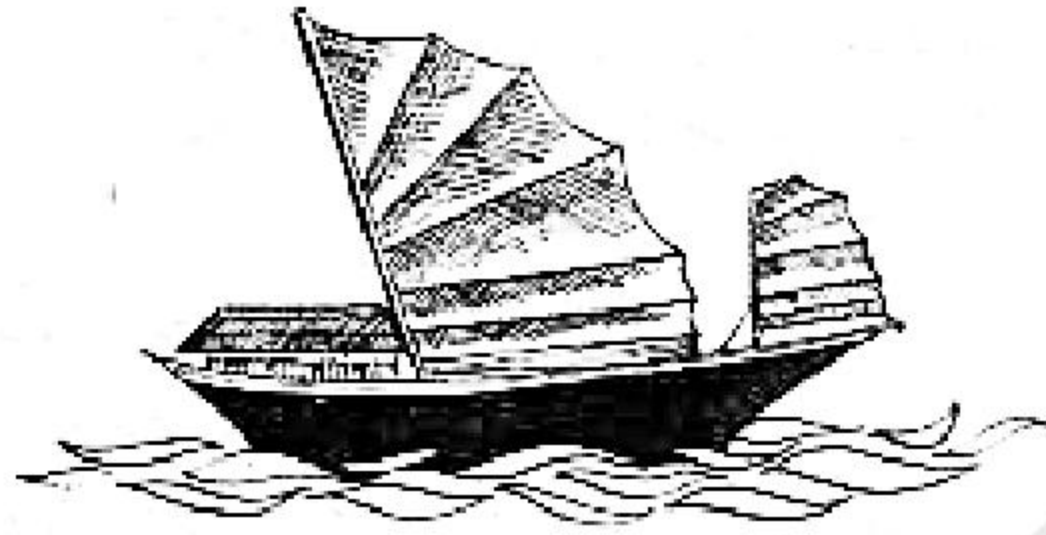
بالآخر اُس نے ہار مان لی
اور وہ سب جو اُس کے مقابل صف آرا تھے، جیت گئے۔
کسی نے اُس کی آنکھوں میں دیکھنے کی کوشش نہیں کی
کہ وہاں آبی لہریں تھیں۔
کسی نے اُس کے دل میں نہیں جھانکا
کہ وہاں درد ہلکورے لے رہا تھا۔
کسی نے اُس کے من کو ٹٹولنے کی زحمت نہیں کی
کہ وہاں اندیشوں اور وسوسوں کے مہیب سائے لرزاں تھے۔
شاید وہ سب کٹھور اور بے حس بن گئے تھے
مگر نہیں
ان سب میں امی اور بابا جان بھی تو شامل تھے، وہ بے حس اور کٹھور کیونکر ہو سکتے تھے بلکہ اُن کے بارے میں تو ایسا سوچنا بھی گناہ تھا۔
اولاد کے معاملے میں تو وہ دونوں ہی موم کے بنے ہوئے تھے۔
شاید سارے ماں باپ اپنی اولاد کے معاملے میں ایسے ہی رقیق القلب ہوا کرتے ہیں۔
تو پھر ایسا کیوں ہوا تھا؟
امی اور بابا جان بھی اوروں کے ساتھی اور ہمنوا کیوں بن گئے تھے؟
شاید زندگی کی ایک تلخ حقیقت کی شدت میں قدرے افاقہ پانے کی خاطر امی اور بابا ایک دوسری تلخ حقیقت کو آنکھیں بند کر کے ویسے ہی گھونٹ بھر لینے کے لیے تیار ہو گئے تھے جیسے ملیریا سے نجات پانے کے لیے کونین کی کڑوی گولی حلق سے اتار لی جاتی ہے۔
شاید اوروں کے ساتھ امی اور بابا جان بھی اُس کی آنکھوں میں مچلتی آبی لہروں، دل میں ہلکورے لیتے درد اور من میں لرزاں مہیب سایوں سے جانتے بوجھتے انجان بن گئے تھے۔
نجات دہندہ کو اپنی صلیب کا بوجھ شانوں پر اُٹھا کر سولی پر لٹکنا پڑتا ہے۔

سو وہ بھی صلیب شانوں پر اُٹھائے آسمان کی سمت نگاہیں ٹکائے کھڑی ہو گئی تھی۔
نجات دہندہ ہونے کا اعزاز اُس نے اپنے سینے پر خود سجایا تھا۔
امی اور بابا جان کو اُن کی فکروں سے نجات دلانے کا اعزاز۔
ورنہ سب لوگ کیا کہتے!
اُس کے مسلسل انکار پر بڑی ممانی نے کہہ تو دیا تھا "الفت! تمہیں ماں باپ کا خیال ہوتا تو ہرگز انکار نہ کرتیں۔"
خالہ بی بی نے جن کی ماہرانہ خدمات اس سلسلے میں بطورِ خاص حاصل کی گئی تھیں کہا تھا "بیٹی! ایک تمہارے ہاں کر لینے سے بہت ہلکا ہو جائے گا تمہارے والدین کا بوجھ۔"
بھابی جان نے صدیوں پرانا مکالمہ خاصے جذباتی انداز میں دہرایا تھا "الفی! اپنے لیے تو سب ہی جیتے ہیں جان! دوسروں کو خوشیاں دے کر جینا بڑی بات ہے۔"
تائی اماں نے کسی پکے ریاضی داں کی طرح ضرب جمع تقسیم کے معاملے میں اپنی ماہرانہ گرفت کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا۔
"دیکھو بیٹی! خیر سے پینتیس برس کی تو تم خود بھی ہو۔ صحیح وقت پر شادی ہو گئی ہوتی جیسے کہ ہمارے زمانے میں ہو جایا کرتی تھی چودہ پندرہ برس کی عمر میں تو اتنے بڑے بڑے بچے تو تمہارے اپنے بھی ہوتے بلکہ شاید ان سے بھی بڑے۔"
اُس کے جی میں آیا کہے۔
"ہاں مگر وہ میرے بچے ہوتے... میرے اپنے بچے، کسی اور کے تو نہیں!"
مگر وہ مارے حجاب کے تائی اماں سے یہ بات نہ کہہ سکی۔
عظمت آپا نے کہا "الفی! ہم لوگوں پر زیادہ بار نہیں پڑے گا۔ انھوں نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ ایک دھیلا نہیں چاہیے بس نکاح کر دیں سادگی سے۔"
اُس کا جی چاہا کہے۔
"کاش! آپ میری جگہ ہوتیں!"
مگر لب بے صدا رہے۔
اُس سے چھوٹی شادی شدہ بہن فضیلت نے کہا "آپا! چھوٹے چھوٹے تو ہیں نہیں ماشاء اللہ چاروں ہی بچے بڑے ہیں۔ آپ کو کوئی دقت نہیں اُٹھانا پڑے گی بلکہ سچ پوچھیے تو فائدے میں ہی رہیں گی چار پلے پلائے بچے مل جائیں گے۔ سچ کہتی ہوں! ہم سے پوچھ کر دیکھیں کہ بچے پالنا کس قدر مشکل کام ہے۔"
"یہ تم اس لیے کہہ رہی ہو کہ تم میری جگہ نہیں ہو۔"
"نہیں ایسی بات نہیں ہے۔"
"بالکل یہی بات ہے۔ اپنی جگہ کھڑے ہو کر دوسروں کے بے فیصلے صادر کر دینا یا انھیں مشوروں سے نواز دینا بہت آسان کام ہے لیکن جب فیصلہ سننے اور سنانے والوں کی جگہیں بدل جائیں تو دوسروں کے بے فیصلے صادر کرنے والوں کو خود اپنے لیے وہی فیصلہ بہت گراں گزرتا ہے۔"
"کچھ تہنیت ہی کا خیال کیجیے آپ کے چکر میں اُس کی شادی میں بھی دیر ہوئی جا رہی ہے۔"
"میں نے کوئی پابندی تو نہیں عائد کر رکھی۔"
"رکاوٹ تو بہرحال ہے۔"
"اگر تمہاری دفعہ اس رکاوٹ کو پس پشت ڈالا جا سکتا تھا تو تہنیت بے چاری کے لیے اس رکاوٹ کا لحاظ کیوں کیا جا رہا ہے؟" اُس نے ناگواری سے کہا۔
"آپ تو خفا ہونے لگیں۔"
"تم بات ہی ایسی کر رہی ہو۔"
"آپ کو بری بات بُری لگی ہے تو میں معافی چاہتی ہوں اور اپنے الفاظ واپس لیتی ہوں۔ ویسے آپا جانتی ہیں یہ کہے بنا پھر ... کہ آپ اس رشتے سے انکار کر کے زیادتی کر رہی ہیں نہ صرف اپنے بلکہ امی اور بابا جان کے ساتھ بھی۔"
تہنیت نے دبی زبان سے کہا "آپا آپ انکار کیوں کر رہی ہیں؟ عظمت آپا، دولھا بھائی، بھیا اور بھابی جان وغیرہ گئے تھے اُن کے ہاں۔ وہ لوگ بتا رہے تھے۔ خاصا اچھا گھر ہے گاڑی بھی ہے بلکہ شاید دو گاڑیاں ہیں۔ نوکر چاکر بھی ہیں۔ چاروں بچے بہت سمجھدار اور تمیزدار نظر آتے ہیں اور وہ صاحب ہر قسم کی ضمانت دینے کو تیار ہیں۔"

"کیسی ضمانت؟" اُس نے ابرو پر بل ڈالتے ہوئے پوچھا۔
"آپ کو خوش رکھنے کی۔"
"پاگل پن کی باتیں مت کرو۔ تم ابھی بچی ہو۔"
"بچی! آپ مجھے بچی کہہ رہی ہیں!" تہنیت نے آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا، پھر منہ اوپر کر کے ہنس دی اور مائیں کی بات کو یکسر رد کر دینے کے انداز میں سر جھٹکتے ہوئے بولی "جناب آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ چھبیس کی ہو کر چھبیسویں برس میں لگ چکی ہوں۔"
"مجھ سے تقریباً دس سال چھوٹی ہو۔" الفت نے جتایا۔
"ہاں مگر بچی تو نہیں کہہ سکتیں آپ مجھے۔"
"میں بحث کے موڈ میں قطعاً نہیں۔"
"جلیس صاحب نے کہا ہے وہ آپ کو خوش رکھنے کی ہر ممکن ضمانت دینے کو تیار ہیں۔"
"یہ وہی احمقانہ بات! کچی خوشیوں کی ضمانت کوئی نہیں دے سکتا۔"
"وہ وعدے تو ہیں، آپ کو تو فقط ایک کام کرنا ہوگا۔"
"وہ بھلا کیا؟"
"اُن کے بچوں کا خیال رکھنا ہوگا۔"
اب اُس کے ہنسنے کی باری تھی۔
"ہا ہا!" وہ منہ اوپر کر کے ہنس دی۔
تہنیت نے استعجاب سے دیکھنے لگی۔
"سودا!" الفت کا لہجہ انتہائی تلخ تھا۔
"ایسا جانی! اسے سودا تو نہیں کہہ سکتیں آپ۔" تہنیت نے منہ بنایا۔
"تو پھر کیا کہوں؟"
"یہ تو اُن کی مجبوری ہے۔"
"تمہیں جس کسی نے بھی سبق پڑھا کر میرے پاس بھیجا ہے اُن سے جا کر کہہ دو... نہیں" اُس نے لفظ "نہیں" فیصلہ کن لہجے میں ادا کیا۔
"مجھے کسی نے سبق نہیں پڑھایا نہ ہی میں کسی کے ایما پر آپ سے بات کر رہی ہوں۔"
"تو پھر؟" الفت نے گہری نگاہوں سے اُسے دیکھا۔
"خود اپنے طور پر بات کر رہی ہوں میں تو۔"
"اگر واقعی ایسا ہے" الفت نے اُسے گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا "تو جان لو کہ تم بہت چھوٹی ہو مجھ سے۔"
"اچھا اب اس سے اچھا رشتہ اور کیا ملے گا؟"
"مرنے میں شادی کے لیے مری نہیں جا رہی ہوں۔"
"پلیز!" تہنیت گڑگڑا دی۔
"دیکھو اگر تم یہ سمجھتی ہو کہ میں تمہارے راستے کی رکاوٹ بنی ہوئی ہوں تو ایسی کوئی بات نہیں آخر فضیلت کی شادی بھی تو ہو ہی گئی تھی۔"
"یہ آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں؟" تہنیت قدرے خجل نظر آنے لگی۔
"میں صاف بات کر رہی ہوں۔ گھر والوں کا یہی خیال ہے کہ میں تمہارے رشتے کی رکاوٹ بنی ہوں۔"
"آپ کو بدگمانی ہوئی ہے ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"
"بالکل یہی بات ہے میری جان اور تم میری جانب سے گھر والوں سے کہہ دینا کہ اگر ان کے نزدیک میری موجودگی تمہاری راہ کی رکاوٹ بن رہی ہے یا بن سکتی ہے تو میں کسی ہاسٹل میں چلی جاؤں گی ... کہ میں خود کفیل ہوں میری تنخواہ میرے لیے بہت ہے بلکہ میری ضرورت سے زیادہ رہتی ہے۔" اس کی آواز شدتِ جذبات سے لحظہ بہ لحظہ بوجھل تر ہوتی چلی گئی۔
"آپا جانی ایسی باتیں نہ کریں۔" تہنیت گڑگڑائی۔
الفت کی آنکھوں کے کنارے چھلکنے سے بے تاب تھے۔

کس بُری طرح سے سب لوگ اُس کا گھیراؤ کر رہے تھے۔
اُس کا قصور کیا تھا بھلا!
سارا قصور تو حالات کا تھا۔

عظمت آپا کے لیے مناسب بر کے انتظار میں اُس کے کئی سنہرے سال سنولا گئے تھے۔ جب اُن کے لیے امی اور بابا جان کے حسبِ منشا بر ملا تو وہ اپنی عمر کا تیسرا عشرہ مکمل کرنے کے قریب تھی۔ اور فضیلت ان دنوں پورے جوبن پر تھی۔ آپا کی شادی کے بعد جب اُس کے لیے مناسب بر کی تلاش شروع ہوئی تو بابا کے سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہونے میں چار پانچ سال باقی رہ گئے تھے۔ رشتہ آتا اُس کے نام سے تھا مگر آنے والے پسند فضیلت کو کر جاتے تھے۔ ناچار امی اور بابا کو اس سے پہلے ہی فضیلت کے ہاتھ پیلے کرنا پڑے تھے۔

فضیلت کے رخصت ہوتے تک تہنیت اپنے پورے جوبن پر آ چکی تھی۔ اور خالہ بی بی اُس کے حقوق اپنے صاحبزادے کے نام محفوظ کرا چکی تھیں۔ الفت کے لیے اپنے پرایوں کے توسط اور امی کے ہر ملنے جلنے والے سے کہنے سننے سے رشتے آنے تو رہتے تھے مگر آنے والے جانے کے بعد پلٹ کر منہ نہ دکھاتے تھے۔ چالیس سال کا مرد بھی اپنے سے اٹھارہ بیس سال چھوٹی حسین و جمیل لڑکی کا طلبگار تھا اور لڑکے کی اماں بہنیں تو گویا حور پری کی تلاش میں نکلتی تھیں خواہ صاحبزادے بذاتِ خود چاہے کیوں نہ دکھائی دیتے ہوں ۔ چالیس پینتالیس سال کے بیٹے اور بھائی کے لیے بھی نوعمر خوبرو دلہن کی تلاش کی جاتی۔ ہزار ڈیڑھ ہزار پانے والے صاحبزادے کی جیب بھاری کرنے کی خاطر کوئی تگڑی سی آسامی ڈھونڈی جاتی۔ خیر جیب تو بھاری کی جا سکتی تھی کیونکہ بابا کے پاس اب جو بھی اثاثہ تھا اُس کے اور تہنیت کے لیے ہی تو تھا۔ تیرے سرکاری افسر تھے ملازمت سے سبکدوشی کے وقت خطیر واجبات ملے تھے۔ اللہ رکھے بھائی جان بھی ہاتھ بٹانے کو موجود تھے۔ پھر الفت نے اپنی ملازمت سے خود بھی اچھی خاصی رقم جوڑ رکھی تھی۔ مگر اب اس کا کیا علاج کہ آنے والے اُس کی ڈھلتی عمر دیکھ کر واپس نہ پلٹتے تھے۔ بابا جان نے دو تین مرتبہ اخبار میں "ضرورتِ رشتہ" کا اشتہار بھی شائع کروا دیکھا۔ عمر صاف صاف لکھوا دی کہ عمر کا چھپانا اُن کے خیال میں فضول تھا اور ناممکن بھی کہ بعض کا ئیاں قسم کے لوگ تو سن پیدائش و بھنکنے کی خاطر میٹرک کی سند دیکھنے کی فرمائش کر بیٹھتے تھے یاد بھلتے نہ تھے تو باتوں ہی باتوں میں یہ ضرور پوچھ لیتے تھے کہ میٹرک کب کیا؟ انٹر کب کیا؟ بی اے کس سال کیا؟ بی ایڈ کیے کتنے برس ہو گئے؟ ملازمت کرتے کتنے برس گزر گئے؟ اور ان تمام سوالات کا مقصد عمر کا تخمینہ لگانا ہوتا تھا۔ بابا کی جانب سے اخبارات میں دیے گئے اشتہارات کے جواب میں رنڈوے، طلاق یافتہ، مالی مدد کے خواہاں ... نامناسب قسم کے رشتے ہی آتے بھولے بھٹکے ایک آدھ مناسب ہوا بھی تو معاملہ کہیں نہ کہیں اٹک کر رہ گیا اور بات آگے نہ بڑھنے پائی۔
خدا خدا کر کے بھائی جان کے بھائی کے دوستوں میں یہ رشتہ ملا تھا جس کے لیے پورا خاندان ہی گویا الفت کے مقابل صف آرا ہو گیا تھا۔

اپنے اپنے طور پر سب ہی لاسے لگا رہے تھے۔

↔

جلیس الحسن بھابی جان کے بڑے بھائی کے ایک دوست کے شناسا تھے۔ پیشے کے لحاظ سے سول انجینئر تھے کسی کے ملازم نہ تھے بلکہ خود ٹھیکیدار کی حیثیت میں کام کرتے تھے۔ انھوں نے اپنی بیوی کو طلاق دے رکھی تھی۔ چار بچوں کے باپ تھے۔ سب سے بڑی بیٹی پندرہ برس کی تھی اور دسویں جماعت کی طالبہ۔ دوسرے نمبر پر اُس سے ایک برس چھوٹا بیٹا تھا جو نویں جماعت کا طالب علم تھا۔ تیسرے نمبر پر بھی بیٹا تھا بڑے سے تقریباً دو سال چھوٹا اور ساتویں جماعت میں زیرِ تعلیم تھا۔ چوتھے نمبر پر بیٹی تھی کوئی آٹھ نو برس کی۔ چوتھی جماعت میں پڑھتی تھی۔ جلیس الحسن کی رہائش ایک پوش علاقے میں تھی۔ تین ہزار مربع گز پر گھر بنا رکھا تھا۔ زندگی کو پُرراحت بنانے والی ان گنت آسائشیں گھر میں میسر تھیں۔ ایک نہیں دو دو گاڑیاں تھیں۔ نوکر چاکر تھے۔ فارغ البالی بھی تھی۔ بچے شہر کے معروف ترین تعلیمی ادارے میں زیرِ تعلیم تھے۔ اچھا کھاتے اور اچھا پہنتے تھے۔

برس سوا برس پہلے تک جلیس الحسن کا گھرانا ایک خوش باش مثالی گھرانا ہوا کرتا تھا جلیس الحسن اور ان کی اہلیہ عاصمہ کو اُن کے احباب رشک سے دیکھا کرتے تھے۔ اور چاند سورج کی جوڑی کہا کرتے تھے۔ وہ دونوں جس محفل میں جاتے مرکزِ نگاہ بن جایا کرتے تھے۔ جلیس الحسن کو عاصمہ بیگم سے انتہائی محبت تھی۔ اور سوائے اُن کی امریکا جا بسنے کی خواہش کے انھوں نے کبھی عاصمہ بیگم کی کوئی بات ٹالنے کی کوشش نہیں کی۔

لیکن پھر اس خوش حال اور خوش باش گھرانے کی خوشیوں میں یک بیک دراڑیں پڑ گئیں۔

عاصمہ بیگم کے ایک عزیز اسد حلیم امریکا سے آئے اور اُن کے ہاں قیام پذیر ہوئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے عاصمہ بیگم سے موصوف کے مراسم اتنے بڑھے کہ جلیس الحسن کو عاصمہ بیگم ... اپنے سے دُور کھڑی محسوس ہونے لگیں۔ اس خدشے کا اظہار جلیس الحسن نے عاصمہ

بیگم سے کیا تو انھوں نے اُن کے اس خدشے کو ہوس کروا ہمے پر محمول کیا لیکن بہت جلد یہ حقیقت عریاں ہو کر جلیس الحسن کے سامنے آ گئی۔
عاصمہ بیگم نے جلیس الحسن سے طلاق کا مطالبہ کر دیا۔
بچوں کی خاطر جلیس الحسن نے عاصمہ بیگم کو اُن کے ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی انھیں بہت سمجھایا بجھایا مگر وہ اپنے ارادے پر اڑی رہیں۔
ناچار جلیس الحسن کو انھیں طلاق دینا ہی پڑی۔
عاصمہ بیگم نے اسد حلیم سے شادی کر لی اور امریکا چلی گئیں۔
جلیس الحسن کے لیے عاصمہ بیگم کا اُن کی زندگی سے نکل جانا، نہ صرف اُن کے لیے بلکہ بچوں سے بھی قطع تعلق کر جانا، بسے بسائے گھر کا اُجڑ جانا ایسا سانحہ تھا جس نے اُن کی دنیا اُلٹ پلٹ کر کے رکھ دی۔
کیسا خوش باش گھرانا تھا اُن کا!
احباب و اقارب رشک سے دیکھا کرتے تھے۔
خدا جانے کس بدخواہ کی نظر لگ گئی!
جلیس الحسن نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ اُن کی خوشیوں کو یوں کسی کی نظر کھا جائے گی۔
عاصمہ بیگم سے انھیں اتنی محبت بلکہ عشق تھا کہ انھیں وہ اپنی متاعِ حیات، اپنی کائنات سمجھا کرتے تھے۔ عاصمہ بیگم کے حوالے سے وہ عورت کو اس دنیا کی مقدس و محترم مخلوق سمجھا کرتے تھے اور اقبال کے اس خیال سے سو فی صد نہیں بلکہ ہزار فی صد متفق تھے کہ
ع وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ
مگر عاصمہ کی بے وفائی نے اُن کے اس ایقان کی بنیادیں متزلزل کر کے رکھ دیں۔ عورت ذات پر سے اُن کا اعتماد اُٹھ گیا تھا۔
عاصمہ کے اپنی زندگی سے نکل جانے کے بعد وہ دنوں کھوئے کھوئے سے رہے۔ انھوں نے احباب و اقارب سے ملنا تقریباً موقوف ہی کر دیا۔ وہ لوگوں سے نظریں ملانے کی ہمت نہ کر پاتے تھے۔ انھوں نے تقریبات میں جانا ترک کر دیا تھا کیونکہ انھیں لوگوں کی سوالیہ نگاہوں سے کوفت ہوتی تھی۔ لوگوں کی معنی خیز مسکراہٹیں انھیں اپنے وجود کے آر پار ہوتی محسوس ہوتی تھیں۔ تکلیف دہ استفسارات اور سوالیہ نگاہوں سے بچنے کی خاطر انھوں نے نہ صرف احباب و اقارب بلکہ عزیز رشتے داروں سے بھی تقریباً قطع تعلق ہی کر لی۔ کراچی میں عاصمہ بیگم کا تو کوئی عزیز رشتے دار نہ تھا۔ اُن کے والدین انتقال کر چکے تھے۔ بہن بھائی بیرونِ ملک مقیم تھے — جو عزیز رشتے دار پاکستان میں تھے بھی وہ لاہور اور پنجاب کے دیگر شہروں میں مقیم تھے۔
جلیس الحسن نے یہ تو سُن اور پڑھ رکھا تھا کہ کسی عورت کے لیے طلاق ایک صدمۂ گراں ہوا کرتی ہے مگر اس ذاتی المیے سے گزرنے کے بعد انھیں اندازہ ہوا کہ کسی مرد کو اُس کی عورت کا چھوڑ جانا بھی مرد کے لیے کچھ کم کٹھن آزمائش اور کوئی صدمہ نہیں ہوا کرتی۔
اور عورت بھی کیسی جو مرد کو محبوب ہو!
اس تجربے سے گزرنے کے بعد انھیں پتا چلا کہ طلاق کے بعد عورت ہی نہیں بلکہ اکثر مرد بھی نکو بن جایا کرتا ہے۔
جلیس الحسن کے چند بہی خواہوں نے انھیں دوسری شادی کر لینے کا مشورہ دیا مگر انھوں نے اس مشورے کو پوری شدت سے رد کر دیا۔
وہ ان دنوں دو بڑی اُلجھنوں کا شکار تھے۔
عاصمہ بیگم کی بے وفائی کے نتیجے میں عورت ذات پر سے اُن کا اعتبار جاتا رہا تھا اور اس اُلجھن سے زیادہ گمبھیر مسئلہ یہ تھا کہ وہ عاصمہ بیگم کی بے وفائی کے باوجود اُن سے وابستہ یادوں کو فراموش نہ کر پا رہے تھے۔
زندگی کے اس روپ کا تو انھوں نے کبھی تصور بھی نہ کیا تھا۔
عاصمہ بیگم کے بنا گھر انھیں گھر ہی نہ لگتا تھا۔
گھر کے چپے چپے پر عاصمہ بیگم کی یادیں ثبت تھیں،
وہ عورت ذات سے بدگمان ضرور ہو چکے تھے مگر ظرف تماشا یہ تھا کہ اس عورت کے خیال کو اپنے ذہن سے محو نہ کر پا رہے تھے جس کے طرزِ عمل نے انھیں عورت ذات سے بدگمان ہو جانے پر مجبور کر دیا تھا۔
انھیں عاصمہ بیگم سے اس درجہ عشق رہا تھا کہ اب اُن کے لیے یہ تصور بھی محال تھا کہ کوئی دوسری عورت، عاصمہ بیگم کی جگہ اُن کے دل پر حکمران کرے۔
اسی لیے انھوں نے بہی خواہوں کی جانب سے ملنے والے اس مشورے کو پوری شدت سے رد کر دیا تھا کہ انھیں اپنے معصوم بچوں کی خاطر دوسری شادی کر لینا چاہیے۔

جلیس الحسن کے پاس مال و زر کی کمی نہ تھی۔ بچوں کو انھوں نے ہر قسم کی سہولت اور آسائش فراہم کر رکھی تھی۔ بچوں کو ہر چیز کی کمی تھی سوائے ماں کے اور اس کی کمی کو کوئی دوسری عورت بھلا کیونکر پورا کر سکتی تھی۔

جلیس الحسن نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ نئے حالات سے جیسے تیسے سمجھوتا کر کے زندگی کے اس نئے روپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کا مقابلہ کرنے کی کوشش کریں گے۔

مگر زیادہ نہیں تھوڑے ہی عرصے میں زندگی کے اس نئے اور تکلیف دہ رخ کی ذلتیں کھل کر اُن کے سامنے آگئیں۔

مال و زر اور آسائشوں کی فراوانی کا زعم اور جیون بندھن توڑ کر چلی جانے والی بیوی کی یاد دل کو بہت ہمدردی کے ساتھ سینے سے لگائے رکھنا اور بات تھی اور چار بچوں کے جذباتی تقاضوں کی تشفی مختلف بات!

عورت کے بنا گھر بھلا گھر کہاں لگتا ہے؟

ماں کے سوا بچوں کی جذباتی کیفیات اور اُن کے نہاں خانۂ دل میں پنہاں ہر چیز کی شدت کا بھلا کون اندازہ کر سکتا ہے؟

جلیس الحسن جنھوں نے بہی خواہوں کے مشورے کو یکسر مسترد کر دیا تھا، برس بھر کے اندر ہی سنجیدگی سے دوسری شادی کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو گئے۔

بیسیوں چھوٹے بڑے مسائل تھے جن کی بنا پر انھیں اس بارے میں سوچنے پر مجبور ہونا پڑا تھا۔

گھر میں نوجوان بیٹی تھی اور عمر کے انتہائی حساس دور سے گزرتے ہوئے دو نوعمر بیٹے جنھیں قدم قدم پر رہنمائی درکار تھی۔

سب سے چھوٹی بیٹی ماں کے اتنی نزدیک رہی تھی کہ اس کے ہزاروں میل دور چلے جانے کے بعد وہ قدم قدم پر اُس کی کمی محسوس کر رہی تھی اور لحظہ لحظہ ماں کی محبت اور شفقت کو بوند بوند ترس رہی تھی۔

بچوں کی مناسب تربیت کے لیے گھر میں ماں کی موجودگی لازم تھی۔

ان کے جذباتی تقاضوں کی تشفی بھی ضروری تھی۔ بصورتِ دیگر اُن کی شخصیت میں جھول پڑ جانے یا کوئی گہرا سقم پڑ جانے کا اندیشہ تھا۔

بجا کہ بچوں کی خدمت گزاری اور اُن کی مختلف النوع ضروریات کی تسکین اور امورِ خانہ داری کی انجام دہی کے لیے ملازمین گھر میں موجود تھے۔

اور یہ بھی تسلیم کہ کوئی دوسری عورت بچوں کی سگی ماں کی جگہ نہ لے سکتی تھی۔

مگر گھر اور بچوں کو کاملاً نوکروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا دانشمندی نہ تھی۔ جلیس الحسن خود تو صبح تا شام گھر میں بیٹھے نہ رہ سکتے تھے۔

زندگی کے اور بہت سے تقاضے بھی تو تھے۔

بالخصوص معاشی تقاضے!

بے شک انھیں بچوں سے بے حد محبت تھی مگر فقط محبت سے نہ تو بچوں کا خالی پیٹ بھرا جا سکتا تھا نہ انھیں تعلیم دلوائی جا سکتی تھی۔ نہ ہی اُن کی دیگر احتیاجات کی تسکین ممکن تھی۔

بچوں کی ضروریات سے قطع نظر جلیس الحسن کے کچھ اپنے بھی توجہ طلب تقاضے تھے!

کوئی محرم راز انھیں بھی تو درکار تھا جس سے دل کی بات کہی جا سکتی۔

کسی آشنائے درد کی ضرورت انھیں بھی تھی۔

کوئی مہربان و مشفق ہاتھ جو اُن کی تھکان اپنی پوروں میں جذب کر لینے کا حوصلہ رکھتا۔

کوئی شریکِ سفر جو زندگی کے بقیہ سفر میں اُن کے ہم قدم چل سکتا۔

صبح آنکھ کھلنے پر وہ پہلے کی طرح اب بھی کسی مسکراتے ہوئے چہرے کو اپنے سامنے دیکھنا چاہتے تھے۔

شام ڈھلے جب تھکے ماندے گھر لوٹتے تو اُن کا بھی جی چاہتا کہ کوئی تو ہو جو مسکرا کر اُن کا استقبال کرے اور اُن کی تھکان اور جھنجلاہٹ اپنی ٹھنڈی کی ٹھنڈک اور دلفریب مسکراہٹ کے پیچھے رکھ دے۔

ویسے تو اُن کے بچے بھی کافی تھے جو اپنی مسکراہٹوں سے اُن کی بلائیں لیا کرتے تھے اور شام کو اُن کی گھر واپسی پر مسکرا کر اُن کا استقبال کیا کرتے تھے مگر بچوں نے ہر رشتے کا جدا مزہ رکھا ہے ورنہ خدا آدم کے لیے حوا تخلیق کرنے کے بجائے دو چار بچے ہی تخلیق کر دیتا!

جلیس الحسن کو اپنی جستجوؤں، نیز خوشیوں اور غموں کی ساتھی کی ضرورت تھی!

عاصمہ کے بعد جلیس الحسن بچوں کے ساتھ بہت ایک نو وضع خول میں محصور ہو کر رہ گئے تھے۔ بہت ہوتا تو چھٹی والے دن بچوں کو گھمانے پھرانے نکل جاتے یا پھر کبھی کبھار دفتر سے جلدی گھر واپس آ کر انھیں شاپنگ کروانے بازار لے جاتے۔ عزیز رشتے داروں سے تو ان باتوں کی وجہ سے تقریباً قطع تعلقی ہی کر لی تھی کہ اُن کے استفسارات بچوں کو پریشان کر دیا کرتے تھے۔ مگر یہ بات بھی تھی کہ جب وہ بچوں کو سب

لانے کے لیے یا خریداری کروانے اپنے ہمراہ بازار جاتے تو ایسے موقعوں پر کسی ہمسفر اور رفاقت سے محرومی کا احساس اُن کے دل کو اور زیادہ شدت سے اپنی مٹھی میں جکڑنے لگتا۔

مجبوراً انھوں نے دوسری شادی نہ کرنے کی بات اپنے فیصلے پر خطِ تنسیخ کھینچ دیا اور اپنے بہی خواہوں کے توسط سے ایسی ہمدرد، مہربان اور خدا ترس شریکِ سفر کی تلاش شروع کر دی جو اُن کے گھر میں محض اُن کی شریکِ زندگی بن کر نہ آئے بلکہ اُن کے بچوں کے لیے جو انھیں عزیز از جان تھے، اپنے دامن میں محبت اور شفقت لے کر آئے۔

الفت کی بھاوج عرشیہ کے میکے کی وساطت سے الفت کے لیے جلیس الحسن کا پیام آیا تو پیام لانے والوں نے جلیس الحسن کی تعریف میں یوں رطب اللسان کی کہ اماں جان نے جلیس صاحب کو بالمشافہ ملاقات کے لیے بلوا بھیجا۔

کچھ جلیس الحسن کی مردانہ وجاہت کا اثر، کچھ اُن کے نجیب الطرفین ہونے کا دبدبہ، کچھ اُن کی خوش حالی کا رعب اور کچھ اُن کی حلیم الطبعی ہونے کا جادو کہ سب ہی اُن پر فدا ہو گئے اور ہر ایک نے اپنا حقِ رائے دہی انھی کے حق میں استعمال کر ڈالا۔

مگر سب ایک طرف

اور اُن کے مقابل الفت تن تنہا۔

ہر ایک نے اپنی فراست اور تدبر آزما ڈالا۔

مگر الفت پر کسی کی فراست اور تدبر کا جادو نہ چل سکا۔

سب کا اصرار تھا

اور اُس کا انکار!

اپنی دانست میں اور اپنے حسابوں ہر ایک نے ہی اُسے سبز باغ دکھانے کی کوشش کی۔

کسی نے کہا، بہت عیش و آرام ملے گا۔

کسی نے کہا، جلیس بہت ناز اٹھائیں گے اور قدر کریں گے۔

کسی نے کہا، پلے پلائے چار بچے نہیں گے، ذرا سی محبت سے مطیع ہو جائیں گے۔

مگر الفت اِس تصویر کو صرف ایک ہی رُخ سے نہ دیکھ رہی تھی۔

وہ اُٹھارہ اُنیس برس کی ناتجربہ کار لڑکی نہ تھی، چھتیس برس کی ہو چکی تھی۔ زندگی کی اس منزل پر تھی جہاں پہنچنے کے بعد ہر چمکنے والی چیز کو سونا سمجھنے والی حماقت معدوم ہو جاتی ہے۔ شکر کی تہ چڑھی کڑوی گولیوں کو حلق سے اتارتے ہوئے ذہن اس حقیقت سے غافل نہیں ہوتا کہ اس شیریں غلاف میں کڑی کڑوی حقیقت پنہاں ہے۔ جہاں پہنچنے کے بعد بہت سی عریاں حقیقتوں کو سمجھنے کی اہلیت آجاتی ہے۔ عقل و شعور بالیدگی کے مراحل طے کر چکے ہوتے ہیں اور فرد اپنے لیے سوچ سمجھ کر فیصلہ کر سکتا ہے۔

جیسے جلیس نے کیا تھا۔

انھوں نے اماں جان سے بالمشافہ ملاقات کے موقع پر برملا کہا تھا: میری خواہش ہے کہ جن خاتون سے بھی سلسلہ چلے انھیں میرے حالات کی تفصیل علم ہو تاکہ وہ بھی سوچ سمجھ کر فیصلہ کر سکیں۔

جلیس الحسن کی دانشمندی کی اس سے بڑھ کر دلیل اور کیا ہو سکتی تھی کہ اُن کے بہی خواہوں نے اُن کے دوسری شادی پر آمادہ ہوتے ہی متعدد کم عمر اور خوبصورت لڑکیوں کے رشتے اُن کے گوش گزار کیے۔ دو چار لڑکیاں انھیں دکھائی بھی گئیں مگر انھوں نے ان تمام رشتوں کو اس بنا پر مسترد کر دیا کہ انھیں اپنے لیے ایک کم عمر اور خوبرو بیوی کی نہیں ایک ایسی سمجھدار اور باشعور شریکِ سفر کی ضرورت تھی جو اُن کے بچوں کی ماں نظر بھی آئے اور ثابت ہونے کی کوشش بھی کرے۔

چنانچہ جلیس الحسن کے اصرار پر اور اُن کی خواہش کے مطابق اُن کے جملہ حالات الفت کے علم میں لائے گئے تھے۔

اسے سب کچھ بتا دیا گیا تھا۔

اس سے اقرار کروانے کے لیے اصرار بھی کیا گیا تھا۔

مگر اس نے انکار کر دیا تھا۔

اور اپنے انکار پر ڈٹی ہوئی تھی۔

اگر اصرار کرنے والوں سے اُس کا مناظرہ کروا دیا جاتا تو وہ اپنے انکار کو برحق ثابت کر سکتی تھی۔

بھابی جان نے کہا تھا، جلیس صاحب زخم خوردہ ہیں۔ عورت ذات پر سے اُن کا اعتماد اٹھا ہوا ہے۔ تم اپنی ذرا سی کوشش سے انھیں زندگی بھر کے لیے جیت سکتی ہو!

مگر کیا ضمانت تھی کہ وہ اس زخم خوردہ مرد کے زخم مندمل کر سکے گی؟

پھر ایک نہ دو چار بچوں کی ذمے داری۔
جن کی ماں اُن کی زندگی سے نکل گئی تھی۔
کیا ضمانت تھی کہ وہ اُن کی ماں کا خلا پُر کرنے میں کامیاب ہو سکے گی؟
اور
سب سے بڑی بات یہ کہ وہ عورت جس کے چار بچوں کے جلیبیں الحسن باپ تھے اُن کی اور اُن کے بچوں کی زندگی سے نکل ضرور گئی تھی۔
مگر کیا جانے والے واپس نہیں لوٹ آیا کرتے؟
الفت نے بہت سوچ سمجھ کر انکار کیا تھا۔
اور چٹان کی طرح اپنے فیصلے پر اٹل رہنا چاہتی تھی۔
مگر

پھر بابا جان اُس کے روبرو آ بیٹھے۔
"بیٹا! میں یہ دعویٰ تو نہیں کروں گا کہ جو کچھ ہم تمہارے لیے سوچ رہے ہیں وہ حرف بحرف درست ہے لیکن بعض فیصلے ہم حالات کی سنگینی اور نزاکت کے سبب کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ تمہاری حق تلفی ہوئی ہے۔ عظمت کی شادی پہلے کرنے کے چکر میں ہم نے تمہارے کتنے سال اپنی اس احمقانہ رٹ کی بھینٹ چڑھا دیے کہ پہلے بڑی کی شادی ہوگی۔ پھر حالات مزید الجھ گئے۔ بہرحال بیٹا جو حماقت ہو چکی اُس پر ہم سوائے دل گرفتہ ہونے کے اور کیا کر سکتے ہیں......... اب وقت کم ہے کہ ہم تو اب چراغ سحری ہو چکے۔ میں جلیبیں الحسن سے ملا ہوں، بہت سمجھ دار اور شریف النفس نظر آتے ہیں وہ مجھے اور دیگر اہل خانہ کی بھی یہی رائے ہے۔ تمہاری امی نے بھی بات کی ہے اُن سے وہ بھی مطمئن ہوئیں۔ جلیبیں الحسن کی حد تک تو یہ رشتہ انتہائی معقول نظر آتا ہے اب رہی بات اُن کے حالات کی تو میں مانتا ہوں بیٹا کہ کسی اور کے بچے اپنانا آسان بات نہیں ہوتی۔ بڑی کٹھن منزل ہوگی یہ تمہارے لیے مگر بیٹے......... کبھی کبھی دوسروں کی خاطر انسان کو اپنی ذات کی نفی کرنا پڑتی ہے۔ اوروں کو کسی بڑی فکر، بڑی مشکل سے نجات دلانے کے لیے اپنی ذات سے ماورا ہو کر سوچنا پڑتا ہے۔ ہماری نجات اسی میں ہے کہ تم اور تہنیت بھی اپنے اپنے گھر کی ہو جاؤ......... بیٹی! بوڑھا ہو چکا ہوں اور تھک بھی چکا ہوں اب زیادہ عرصہ تم دونوں بہنوں کا بوجھ اپنے نحیف اور نزار شانوں پر اٹھائے کھڑا نہیں رہ سکتا اور اس بوجھ کو اتارے بغیر مرنا بھی نہیں چاہتا کہ روح مضطرب رہے گی۔ تہنیت کے لیے گھر کا رشتہ موجود ہے اُس کی طرف سے تو اطمینان ہے۔ میرا اور تمہاری امی کے لیے زیادہ اہم مسئلہ تمہارا ہے۔ تمہاری فکر ہم دونوں کے دل کو دن رات اپنی مٹھی میں جکڑے رکھتی ہے۔ تمہارے فرض سے سبکدوشی کا غالباً یہ بہترین موقع ہے۔ تم ہاں کر دو تو ہماری فکر دور ہو جائے۔" بابا نے توقف کیا پھر بولے "بیٹا دوسروں کی نجات کے لیے کسی نہ کسی کو مصلوب ہونا ہی پڑتا ہے۔"
پھر بابا خاموش ہو گئے۔
اور وہ بھی سر جھکائے چپ بیٹھی رہی۔
"میں تمہارے جواب کا منتظر ہوں بیٹے۔" کچھ دیر بعد بابا نے کہا۔
"بابا........." وہ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں مضطربانہ باہم مروڑنے لگی۔
"ہاں ہاں بولو میں سن رہا ہوں۔"
"ہر کوئی تو مسیحا نہیں ہو سکتا بابا۔"
"میرا اور اپنی ماں کے روگ کی مسیحائی تمہارے لیے ممکن ہے۔"
"آپ تہنیت کے لیے تاخیر نہ کریں۔" اُس نے دھیرے سے کہا۔
"بیٹا، تمہاری ہو جاتے پھر اُس کے لیے تو کوئی دیر نہیں۔ اس وقت تمہارا مسئلہ ہمارے لیے زیادہ اہم ہے۔ ہم تمہیں جلد از جلد اپنے گھر بار کا دیکھنا چاہتے ہیں۔"
"آپ میری فکر چھوڑ دیں۔"
"الفت بیٹی، سارے والدین اولاد کے لیے متفکر ہی رہا کرتے ہیں۔"
"آپ یہ سمجھ لیں کہ میں ہوں ہی نہیں۔"
بابا نے ایک گہری سانس لی پھر بولے "بعض باتیں کہہ دینا آسان ہوتی ہیں مگر عملاً وہ ناممکن ہوتی ہیں۔ تم بھی اس وقت ایسی ہی بات کر رہی ہو۔"

وہ خاموش رہی۔
"بیٹے! سقراط نے تو سچ کی خاطر زہر پی لیا تھا کیا تم اپنے ماں باپ کی نجات کی خاطر ایک کڑوا گھونٹ نہیں پی سکتیں؟ ہمارے خاطر یہ کڑوا گھونٹ پی لو بیٹا۔"
اُس نے تڑپ کر بابا جان کی طرف دیکھا۔
"ہاں بیٹا ہماری خاطر......... اپنے بوڑھے باپ کی خاطر۔"
بابا کے لہجے کی بے بسی نے اُسے بے بس کر کے رکھ دیا۔
اور
اُس نے سر جھکا دیا۔
با دلِ ناخواستہ ہاں کر دی۔
اور اُس کے اقرار نے گھر بھر میں یہاں سے وہاں تک خوشی کی ایک لہر دوڑا دی۔
اُس کے گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ ایسی بے وقعت گردانی جاتی تھی۔
چار بچوں کے طلاق یافتہ باپ کا رشتہ بھی اُس کے لیے اس قدر ہنسی خوشی منظور کر لیا جائے گا!
کیا ہوا اگر اُس کی عمر پینتیس برس سے تجاوز کر چکی تھی؟
تھی تو آخر وہ ایک لڑکی ہی۔
ہر لڑکی کی طرح اُس نے بھی کچھ خواب دیکھے تھے۔
اُس کی بھی کچھ تمنائیں تھیں۔
اُن خوابوں اور تمناؤں کی یہ تعبیر کس درجہ وحشت خیز تھی!
پھر
جلیبیں الحسن نے دبی زبان سے ایک خواہش ظاہر کی۔
وہ الفت سے تخلیے میں فقط دو باتیں کرنا چاہتے تھے۔
امی تو اُن کی اس خواہش پر بھونچکا سی رہ گئیں۔
"اُن سے کہہ دیں کہ ہم لوگ اتنے آزاد اور بے باک نہیں ہیں۔" امی نے بابا سے کہا۔
مگر بابا جان نے کہا "کوئی حرج نہیں اُن کے الفت سے بات کر لینے میں۔"
امی، بابا کے جواب پر انگشت بدنداں رہ گئیں۔
بہنوں اور بھابی جان نے بابا کی تائید کی۔
بھائی جان 'خاموشی نیم رضا مندی است' کی تصویر بنے چپ رہے۔
الفت کو پہلے تردد ہوا
لیکن پھر اُس نے سوچا۔
"جب بابا کی خوشی کے لیے ہاں کر ہی دی تو اُن کی خاطر یہ مرحلہ بھی سہی۔"
جلیبیں الحسن نے تخلیے میں اُس سے صرف چند باتیں کہیں۔
"میرے تمام حالات آپ کے علم میں تو ہیں نا؟ اور آپ جانتی ہیں کہ میرے چار بچے بھی ہیں؟"
"جی۔"
"آپ نے اچھی طرح سوچ سمجھ لیا ہے؟"
"جی۔"
"کوئی جبر، کوئی دباؤ تو نہیں آپ پر؟"
اُس نے نفی میں سر ہلا دیا۔
"ملازمت کے بارے میں کیا ارادہ ہے؟"
"آئندہ حالات پر منحصر ہوگا۔"
"ذاتی طور پر میری یہی خواہش ہوگی کہ آپ ملازمت ترک کر دیں۔"
"اب تو امکانات خطرناک حد تک ڈانواں ہوں گے۔" الفت نے چپ چاپ سوچا۔

ساحل کی نم ریت پھران کے نقوش پا کو اپنی آغوش میں سمیٹنے لگی۔
"بابا! ہمیں اسٹیپ مدر نہیں چاہیے۔ ہم اس کے بغیر بھی بہت اچھی طرح رہ سکتے ہیں بلکہ رہ رہے ہیں۔" اعجاز نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔
جلیس الحسن کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ قدم من من بھر کے ہو گئے مگر وہ تھمے نہیں۔
"بیٹے بھی!" انھوں نے انتہائی تحمل سے کہا۔ "آپ مجھ پر بھروسا کرتے ہیں یا نہیں؟"
اعجاز نے ذرا متذبذب نگاہوں سے باپ کی طرف کچھ اس طرح دیکھا جیسے اُن کی بات کا مطلب سمجھنے سے قاصر رہا ہو۔
"میرا مطلب ہے آپ مجھے ٹرسٹ کرتے ہیں یا نہیں؟"
"جی..... کرتے ہیں۔"
"کیا آپ کے خیال میں میں ایسا کوئی کام کرسکتا ہوں جس سے آپ کو سکھ کے بجائے دکھ یا نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو؟"
اعجاز نے نفی میں سر ہلا دیا۔
"بس تو آپ یقین رکھیے کہ میں جو کچھ بھی کروں گا آپ چاروں کی بہتری کے لیے ہوگا۔ میں جانتا ہوں کہ آپ لوگ اسٹیپ مدر کے بغیر بھی رہ سکتے ہیں مگر میں اسے ضروری سمجھتا ہوں۔ گھر میں کوئی خاتون ہونا چاہیے۔ آپ کی مناسب دیکھ بھال اور میری غیر موجودگی میں آپ کے تحفظ کے لیے۔"
"لیکن بابا......" نگین کہتے کہتے رک گئی۔
"ہاں بولو چپ کیوں ہو گئیں؟" جلیس الحسن نے رُوئے سخن بیٹی کی جانب کرتے ہوئے کہا۔
"بابا! اسٹیپ مدرز اچھی تو نہیں ہوتیں۔" نگین نے منہ بنا کر کہا۔
"بیٹا جی سب بُری بھی نہیں ہوتیں۔"
"مگر سب اچھی بھی تو نہیں ہوتیں۔" اعجاز جرح کرنے والے انداز میں بولا۔
"بابا جان! آپ فکر نہ کریں ہم لوگ اپنے آپ بھی رہ سکتے ہیں۔ میرا مطلب ہے میں زری اور فراز کی دیکھ بھال کرسکتی ہوں اور چاچی تو ہیں ہی ہمارے۔" نگین نے پورے اعتماد سے کہا اور اعجاز کی طرف تائید طلب نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "کیوں چاچی ٹھیک کہہ رہی ہوں نا میں؟"
"ہاں بالکل ٹھیک۔"
"میں مانتا ہوں کہ آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔" جلیس الحسن نے رسانیت سے کہا۔ "مگر بیٹے مجھے تو آپ لوگوں کی فکر رہتی ہے نا خاص طور سے اس وقت جبکہ میں گھر پر نہیں ہوتا۔ میری عدم موجودگی میں گھر پر کوئی بڑا تو ہونا چاہیے جو آپ لوگوں کے ساتھ رہے۔"
"بابا! نگہبان ہوتی ہے، خانساماں ہے۔ مالی بابا ہیں، چوکیدار ہے۔ ڈرائیور ہے۔ اتنے بہت سے لوگ تو ہوتے ہیں گھر میں۔"
"میں فیملی ممبر کی بات کر رہا ہوں ملازموں کی نہیں۔" جلیس الحسن نے بڑے تحمل سے کہا۔
وہ دونوں چپ رہے۔
جلیس الحسن نے دزدیدہ نگاہوں سے باری باری دونوں کو دیکھا۔ اُن کے چہروں سے ناگواری اور باپ کی بات سے اختلاف کا تاثر مترشح تھا۔
انھوں نے ایک گہری سانس کھینچنے کے بعد بوجھل آواز میں کہا۔ "کیا آپ کے خیال میں، میں آپ لوگوں کے لیے کوئی غلط فیصلہ کرسکتا ہوں؟"
دونوں بدستور خاموش رہے۔
"بولیں بیٹا!"
ان دونوں نے دزدیدہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر نگین نے دھیرے سے کہا۔ "نہیں بابا!"
"دیکھیں گے اگر تقاضا ٹھیک بیٹھا تو صحیح ورنہ یہ آپ سے وعدہ ہے میرا کہ کسی تیسرے شخص کے مقابلے میں آپ لوگ ہمیشہ میرے لیے زیادہ اہم رہیں گے۔ آپ لوگوں کی خوشی، آپ کا اطمینان اور آپ کی سہولت ہمیشہ میری پہلی ترجیح رہے گی۔" جلیس الحسن نے پل بھر کی خاموشی کے بعد فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "آپ کی ماں کے بعد ہم کسی کو بھی اس بات کی اجازت نہیں دے سکیں گے کہ وہ ہمارے لیے پریشانی کا سبب بنے..... آپ دونوں سمجھ رہے ہیں نا میری بات؟"
"جی بابا!" نگین منمنائی۔
مگر اعجاز چپ رہا۔ اس کے چہرے سے ہویدا تھا کہ وہ اپنے ذہن کو باپ کی کسی دلیل، کسی منطق کی تائید کے لیے آمادہ نہ کر پا رہا تھا۔

انھوں نے ایک اچٹتی ہوئی سی نظر بیٹے کے خفا خفا سے چہرے پر ڈالی اور جی ہی جی میں سوچا۔ "انسان کی مجبوریاں بعض اوقات اسے اپنی عزیز از جان ہستیوں سے بھی کتنی دور لے جا کھڑا کرتی ہیں!"
ایک دبی دبی سی سرد آہ بے ساختہ اُن کے لبوں سے نکل کر نم فضاؤں میں تحلیل ہو گئی۔
"بیٹے آپ بھی تو کچھ بولیں۔" انھوں نے اعجاز سے کہا۔
اعجاز نے خاموشی سے بہن کی طرف دیکھا۔
"کوئی چارہ نہیں۔" بہن نے نگاہوں ہی نگاہوں میں کہا۔
"ٹھیک ہے بابا!" اعجاز نے دھیمی آواز میں کہا۔
مگر اس کی آواز اور اس کا لہجہ گواہ تھا کہ اس نے جو کچھ کہا تھا، بادلِ ناخواستہ!
جبراً اور قہراً!
جلیس الحسن چلتے چلتے تھم گئے۔ گردن موڑ کر انھوں نے پہلے نگین کی پیشانی کو بوسہ دیا پھر اعجاز کا ماتھا چوما۔
وہ دونوں چپ اور ناخوش نظر آ رہے تھے۔
"بیٹے جی! فراز اور زرین کو یہ بات بتانا اور انھیں سمجھانا آپ دونوں کی ذمے داری ہے۔ میں بھی اُن سے بات کرلوں گا مگر پہلے آپ دونوں انھیں مل جل کر بتا دیں۔ سمجھا دیں۔"
نگین اپنے بائیں ہاتھ کی انگلیاں مضطربانہ دائیں ہاتھ سے مروڑنے لگی۔
"اوکے بابا!" نگین نے کہا۔
"جاجی بیٹے؟" جلیس الحسن نے گہری نگاہوں سے بیٹے کو دیکھا۔
"ٹھیک ہے بابا!" وہ ماندے دل سے بولا۔
ساریان اُن سے اتنی دور نکل چکا تھا کہ اس کے پیچھے جانا عبث سمجھ کر جلیس الحسن اس کے پلٹنے کے انتظار میں دونوں بچوں سمیت وہیں تھم گئے۔
دونوں بچوں کے چہروں سے جلیس الحسن کے لیے یہ اندازہ کرنا دشوار نہ تھا کہ وہ دونوں اس خبر سے خاصے ناخوش ہوئے تھے اور اُن کی بات سے انھوں نے خاصی بادلِ ناخواستگی کے ساتھ جبراً اور قہراً اتفاق کیا تھا۔
جلیس الحسن کو اُن کے بجھے ہوئے چہرے دیکھ کر دکھ ہو رہا تھا۔
زندگی کی بعض منزلیں کتنی کٹھن ہوا کرتی ہیں!
بچوں کو اعتماد میں لینے کی کوشش کے نتیجے میں اُن کا دل اس خلش کا شکار ہو گیا تھا کہ وہ نئی ماں کے لیے دامنِ دل دراز کر دینے کو تیار نہ تھے۔
بہرحال اب اس خلش کو زیادہ پاؤں پسارنے کا موقع دینا فضول تھا۔
جلیس الحسن جس منزل پر کھڑے تھے وہاں سے پیچھے ہٹنے کی اب کوئی گنجائش نہ تھی۔ اب تو اگلی منزلوں پر نگاہ جمانا ضروری تھا۔ الفت سے اُن کا رشتہ طے پا چکا تھا۔ الفت کے گھر والے زبان دے چکے تھے۔ اب تو ایک آدھ روز میں تاریخِ شادی طے ہونے جا رہی تھی۔
وہ اگر چاہتے بھی تو پیچھے نہ پلٹ سکتے تھے۔

⟷

اپنے حالات کے پیشِ نظر جلیس الحسن تو بالکل سادگی سے نکاح کرنا چاہتے تھے مگر الفت کے ہاں سب کی رائے یہ ٹھہری کہ گو جلیس الحسن کی یہ دوسری شادی سہی مگر لڑکی چونکہ کنواری تھی اس لیے ساری رسوم ادا کی جائیں خواہ جلیس الحسن کے حالات کا لحاظ رکھتے ہوئے سادگی سے اور محدود پیمانے پر ہی سہی۔
"جلیس آخر لڑکی کے کچھ تو ارمان ہوں گے۔" الفت نے خالہ بی بی کو کہتے سُنا تو اُس کے لبوں پر تلخ مسکراہٹ پھیل گئی۔
"ارمان!" اُس نے ایک سرد آہ کھینچی۔
ہاں ارمان تو بہت تھے اُس کے بھی۔
ہر لڑکی کی طرح سجیلے اور نشیلے سپنے اُس نے بھی دیکھے تھے۔
ایک اجنبی کے ساتھ جیون بندھن میں بندھ کر جیون راہ پر اس کے سنگ سنگ چلنے کے خواب تو اُس نے بھی دیکھے تھے۔
مقدر اُسے جو کچھ دکھانے جا رہا تھا اُس کا تو اُس نے بھولے سے بھی تصور نہ کیا تھا۔

ایک نہ دو چار بچوں کے باپ سے شادی کا تو اُس نے مطلق گمان نہ کیا تھا۔
وہ تو متوحش ہوئی جا رہی تھی۔
سارے ارمان اور آرزوئیں ہراساں ہو کر تو چکنا چور ہو گئے تھے۔
اُسے تو بس یہ وحشت اور فکر لاحق تھی کہ مستقبل خدا جانے اسے کیسی صورتِ حال سے دوچار کرنے جا رہا تھا!
دل کو ارمانوں کا جو یقین ملا کیونکر ہوتا؟
جلیس الحسن نے شریف النفسی اور بے حد خوشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بابا جان سے کہا تھا "آپ لوگ ہرگز ہرگز کسی تکلف میں نہ پڑیے گا۔ مجھے جہیز نہیں چاہیے۔ خدا کا دیا بہت کچھ ہے میرے پاس۔ آپ کی جانب سے اس سے بڑا عطا اور کیا ہو سکتا ہے میرے لیے کہ آپ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں چار بچوں کا باپ ہوں! اپنی لختِ جگر کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے رہے ہیں۔"
جہیز ان کے منع کر دینے کا مطلب یہ تو نہ تھا کہ واقعی الفت کو کچھ نہ دیا جاتا۔
امی ایک شادی شدہ بچوں والے مرد سے اُس کی نسبت طے پانے پر ایسی رقیق القلب ہو گئیں کہ انھوں نے کہا "الفت کو اس کے حق سے بڑھ کر دیا جائے۔"
بہت سا اسباب جہیز تو الفت نے اپنی جیب خاص سے پہلے ہی جوڑ رکھا تھا۔ اب جو یہ مرحلہ آیا تو کسی سے کچھ کہے سنے یا مشورہ کیے بغیر اپنے بینک اکاؤنٹ میں جمع شدہ تمام رقم نکلوا کر اُس نے چپ چاپ امی کے سامنے لا دھری۔ خطیر رقم تھی آخر کو اسے ملازمت کرتے ہوئے بھی تو تیرہ چودہ برس ہو گئے تھے۔ ملازمت بھی سرکاری تھی۔ اسے خیرباد کہہ دینے کی صورت میں اچھے خاصے واجبات بھی ملنا تھے۔
"یہ کیا؟" امی نے نوٹوں کی ضخیم گڈیاں دیکھتے ہوئے پوچھا۔
"جتنے پیسوں کی ضرورت ہو خرچ کر لیجیے گا' باقی تہنیت کے کام آئیں گے۔"
"پاگل ہو گئی ہو۔ کیا انسان باؤ کو ایسا محتاج اور فقیر سمجھ لیا کہ تمہارے خیال میں وہ تمہاری مدد کے بغیر تمہارے گھر بار کا بھی نہیں کر سکتے؟" امی کھائل لہجے میں بولیں۔
"اوہ! یہ بات نہیں ہے امی۔" وہ تڑپ کر بولی۔
"تو پھر کیوں نکلوا لائیں یہ پیسے؟"
"پھر کر بھی کیا کرتی؟"
"کیا مطلب؟"
"میں اپنی محنت کی کمائی غیر گھر کیوں لے جاؤں۔ میرے اپنوں کے کام کیوں نہ آئے؟" اُس کے لہجے سے تلخی عیاں تھی۔
"تم پہ لوگ کبھی اسراف نہ کرو ہیں۔ پیسا سنبھال کر رکھیے تہنی کے کام آئے گا۔ زیادہ خرچ کرنے سے فائدہ بھی کیا؟"
"خرچ کی فکر مت کرو۔ تمہارے بابا نے اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد ملنے والے واجبات تمہارے اور تہنیت کے لیے ہی سنبھال کر رکھ دیے تھے...... اور ہاں...... یہ غیر گھر والی بھلا کیا بات ہوئی؟ بیٹی اب وہی تمہارا گھر ہوگا۔" امی نے بڑی رسانیت سے کہا۔
"کون جانے!" اُس نے دکھتے دل سے سوچا۔
نکاح کی تاریخ لینے کے لیے جلیس اپنے قریب ترین دوست بختیار ہمدانی اور اُن کی بیگم کے ہمراہ آئے۔ تاریخ ٹھہرائی جا چکی تو بابا نے کہا "جلیس میاں ایک آدھ روز میں مطلع کروا دیجیے گا کہ آپ کے ہمراہ کتنے باراتی تشریف لائیں گے تاکہ انتظامات کیے جا سکیں۔"
"بزرگوار! میرے ہمراہ تو گنتی کے چند احباب ہوں گے۔" جلیس الحسن بولے۔
"تعداد کا کچھ اندازہ تو آپ دے سکتے نا؟" بابا نے کہا۔
"بمشکل آٹھ دس افراد۔"
"صرف!" بھیا بے ساختہ بولے۔
"جی ہاں..... درحقیقت میں زیادہ..... "جلیس الحسن نے بات ادھوری چھوڑ دی۔
"ٹھیک ہے میاں جلیس آپ کی خوشی۔" بابا اُن کی دبی دبی خفت بھانپ کر بولے
"تو اس کا مطلب ہے ولیمے میں ہمیں بھی گنے چنے مہمان ہی لانے کی اجازت ہوگی؟" بھابی جان نے کہا۔
"قطعاً نہیں...... آپ کو پورا اختیار ہے جتنے چاہیں آپ لوگ ولیمے میں مدعو کر سکتے ہیں۔ بس تعداد سے مجھے آگاہ کر دیجیے گا۔"
پھر پورے زور و شور سے تیاریاں ہونے لگیں۔
جوڑوں کی سلائی کڑھائی شروع ہو گئی۔

جمع شدہ اسباب جہیز کے ذخیرے میں مزید اضافہ ہونے لگا۔
دعوت نامے کا مضمون ترتیب دینے کے لیے اہلِ خانہ کا باقاعدہ اجلاس ہوا۔
مہمانوں کی فہرست ترتیب دینے کا مرحلہ آیا تو امی نے تجویز پیش کی "بس قریبی رشتے داروں کو بلایا جائے ورنہ جتنے زیادہ لوگ آئیں گے اتنی ہی باتیں بنیں گی۔ کوئی کچھ کہے گا کوئی کچھ۔"
"امی! لوگوں کی تو خیر آپ قطعاً پروا مت کیجیے۔ لوگوں کا تو کام ہی باتیں بنانا ہے۔" عظمت آپا بولیں۔
"بیٹی کرنا پڑتی ہے پروا...... لوگوں کی زبانیں شعلوں کا سا کام کرتی ہیں۔"
"تو کیا جلیس صاحب کی طرح ہماری طرف سے بھی بس آٹھ دس افراد ہی ہوں گے؟"
"اب اتنا بھی نہ گھٹاؤ۔"
"تو پھر؟"
"بھئی خالائیں، ماموں، تایا چچا، پھوپیاں، ان سب کے گھر والے، بھتیجیاں، بھتیجے، بہنوں کی سسرال والے، بہو کے میکے والے اور قریب کے لوگ تو ضرور ہی شریک ہوں گے۔"
"تو پھر بچا ہی کون؟" عظمت آپا ہنس دیں۔
"بھئی یہ تو اپنے قریبی لوگ ہیں، ان کی شرکت تو بہرحال لازم ہے۔ میرا مطلب یہ تھا کہ پوری برادری نہ جوڑی جائے۔" امی نے وضاحت کی۔
"اور ولیمے میں؟"
"ظاہر ہے ولیمے میں بھی ان سب کو مدعو کرنا لازم ہوگا ورنہ جس کو نہ بلایا اسی کو شکوہ ہوگا مگر ہاں پہلے جلیس سے اُن کی گنجائش ضرور پوچھ لی جائے۔"
"امی جان! اُن کی گنجائش کی تو آپ چنداں فکر نہ کریں، کھلی چھٹی دے گئے ہیں وہ اس معاملے میں۔" بھابی جان بولیں۔
"بھابی جان ولیمہ ہوگا کہاں؟" تہنیت نے پُراشتیاق لہجے میں پوچھا۔
"بھئی کسی فائیو اسٹار ہوٹل سے تو کیا کم بات ہوگی۔" عظمت آپا نے کہا۔
"یہ بھی تو ممکن ہے کہ گھر ہی میں کر لیں۔ واہ! کیا خوبصورت لان ہے ان کا۔" نفیسات نے بھی چونچ کھولی۔
"امی جان! مایوں، مہندی اور دوسری رسموں کے لیے جلیس صاحب معذرت کر گئے ہیں تو کیا ہماری طرف بھی یہ رسمیں نہ ہوں گی؟" عظمت آپا نے پوچھا۔
"ضرور ہوں گی بیٹی۔" امی بولیں۔
"ہائے تاکہ ہماری الفت دل چھوٹا نہ کرے۔" بھابی جان نے تائید کی۔
"ہاں بھئی یہ خیال رکھنا لازم ہے کہ کوئی بات ایسی نہ ہو جس سے الفت بیٹی کا دل چھوٹا ہو کیونکہ وہ پہلے ہی دل برداشتہ ہو رہی ہے۔" بابا کی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی۔
"ہا!" امی نے ایک سرد آہ کھینچی۔ "اس کے مقدر میں یہی لکھا تھا۔ ورنہ کس کس سے بیٹی نہ رکھا تھا ہم نے...... کس کس طرح ہاتھ پاؤں نہ مار دیکھے ہم نے اُس کے لیے...... سچ ہے بیٹی کے مقدر کا کچھ پتا نہیں ہوتا اور...... وہ جو سیانوں نے کہا ہے کہ بیٹی کا رونا تھوڑی ہوا کرتا ہے، رونا تو اُس کے نصیبوں کا ہوتا ہے، سچ ہی کہا ہے۔" امی دل شکستہ نظر آنے لگیں۔
اُن کی دل شکستگی کی پرچھائیاں جملہ اہلِ بزم کے چہروں پر لرزاں دیکھی جا سکتی تھیں۔
اور
الفت اس محفل سے دُور سب سے الگ تھلگ اپنے کمرے میں تنہا نے وسوسوں، اندیشوں اور خدشوں میں گھری بستر پر پڑی ٹکٹکی باندھے چھت سے آویزاں جھولتے سے فانوس کو دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی۔
"خدا جانے کیا ہوگا؟"

دعوت نامے تقسیم ہونا شروع ہوئے تو بھابی جان نے اُس سے پوچھا "الفی تمہیں کتنے کارڈز چاہییں؟"
"کیسے کارڈز بھابی؟" وہ جانتے بوجھتے انجان بن گئی۔
"شادی کے دعوت نامے بھئی' تمہیں اپنی دوستوں وغیرہ کو بھی تو دینا ہوں گے نا؟"
ضبط کی لاکھ کوشش کے باوجود دبی دبی سی ایک سرد آہ تڑپ کر اس کے لبوں کے راستے قفسِ سینہ سے نکل۔ بھابی نے اُسے

معنی خیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پھر اپنا سوال دہرایا۔

"ایک بھی نہیں بھابی جان۔" اُس نے بوجھل آواز میں کہا۔

"کیوں؟ اپنی کسی دوست کو نہیں بلاؤ گی کیا؟"

"کیا آپ کے خیال میں بلا سکتی ہوں؟"

"کیوں نہیں؟"

اُس کے چہرے پر کرب آمیز مسکراہٹ پھیل گئی۔

بھابی نے چند لمحے انتظار کیا کہ شاید وہ کچھ کہے مگر اُس نے کچھ نہ کہا۔

"بھئی کیوں نہیں بلا سکتیں؟ ضرور بلاؤ۔"

"تاکہ وہ میرا تماشا دیکھیں!"

"کیا مطلب؟" بھابی نے چونک کر پوچھا۔

"انھیں بلاؤں تاکہ وہ میرے چار بچوں کی آیا بن کر جانے کا تماشا دیکھ سکیں۔" اُس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ اُس کی آنکھوں کے کنارے بھیگ گئے تھے۔

بھابی اُس کے قریب آ بیٹھیں اور اپنا بایاں بازو اُس کے شانے پر پھیلاتے ہوئے بڑی اپنائیت اور محبت سے بولیں—

"راقی جان! تم خواہ مخواہ اپنا دل چھوٹا کر رہی ہو۔"

"خواہ مخواہ؟" اُس نے تڑپ کر بھابی جان کی طرف دیکھا۔

"ہاں اور کیا، بالکل خواہ مخواہ۔"

وہ بھابی جان کا منہ دیکھتی رہ گئی۔

"میری جان! یہ کوئی انوکھی یا اَنہونی بات تو ہے نہیں۔ تم اس دنیا کی پہلی لڑکی نہیں ہو جسے ایک شادی شدہ مرد سے بیاہا جا رہا ہے۔ اَن گنت لڑکیاں بچوں والے مطلقہ یا رنڈوے مردوں سے بیاہی جا چکی ہیں اور شاید جب تک یہ دنیا ہے بیاہی جاتی رہیں گی۔ پگلی! بعض لڑکیاں تو خود ہی بچوں ہی نہیں بیوی والے بلکہ کبھی کبھی تو بیویوں والے مردوں سے بھی خوشی خوشی شادی کر لیتی ہیں۔ جلیس صاحب کے ساتھ کم از کم بیوی کا دُم چھلا تو نہیں ہے۔ بس بچے ہی ہیں۔"

"مگر......" وہ اتنا ہی کہہ سکی۔ اس سے آگے اُس کی آواز گھُٹ کے رہ گئی۔

"مگر کیا؟"

"میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔"

"کیا نہیں سوچا تھا؟"

"کہ...... یہ ہوگا۔"

"سوچا تو شاید ہم میں سے کسی نے بھی نہیں تھا۔ جب جلیس صاحب کا رشتہ آیا تو امی جان نے تو صاف انکار کر دیا تھا مگر بابا نے کہا غور کر لینے میں کوئی ہرج نہیں۔ امی نے بابا کی اس بات پر بہت واویلا مچایا کہ میں راقی کا ہاتھ کسی بچوں والے مرد کے ہاتھ میں نہیں دوں گی۔ بھلا کوئی ماں بھی یہ نہیں چاہتی مگر پھر سب نے بابا جان کا ساتھ دیا کہ غور کر لینے میں کوئی ہرج نہیں۔ جلیس صاحب بابا جان سے ملے، امی سے بھی ملاقات کروائی گئی۔ پھر ہم سب اُن کا گھر بار دیکھنے کے لیے گئے۔ اُن کے بارے میں چھان بین کروائی گئی۔ جب ہر لحاظ سے ہمارا اطمینان ہو گیا تو بابا نے امی کو سمجھایا کہ کنوارے لڑکے کی تلاش میں اس معقول رشتے کو کھو دینا دانشمندی نہ ہوگی کیونکہ پہلے ہی خاصی دیر ہو چکی تھی۔ پھر امی رام ہو گئیں۔ اسے مجبوری سمجھ لو، مقدر کے آگے بے بسی کہہ لو یا مصلحتِ وقت کا تقاضا۔ بہرحال ہم سب کو خدا کی ذات پر بھروسا ہے اور اُمید ہے کہ تم خوش رہو گی۔"

وہ خاموش بیٹھی سنتی رہی۔

بھابی جان نے کچھ دیر کو توقف کیا، پھر وہی سوال دہرایا۔ "ہاں بھئی کتنے کارڈز؟"

"ایک بھی نہیں۔" اُس نے بڑی قطعیت کے ساتھ کہا۔

"اپنے اسکول کی ساتھیوں کو تو بلاؤ گی نا؟"

اُس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"کیوں؟"

"بس یونہی۔"

"کیا سوچیں گی وہ کہ چپ چھپاتے شادی کر لی۔"

"اس قسم کی شادی کے ڈھنڈورے بھی تو نہیں پیٹے جا سکتے۔"

"اوہ! پھر وہی بات!"

"کسی کو نہیں بلانا ہے۔" اب اُس کے لہجے میں ہلکی سی جھنجھلاہٹ عود کر آئی تھی۔

"لیکن کیوں آخر؟"

"بھابی......" اُس کی پلکیں بھیگ گئیں اور آواز رندھ گئی۔ "وہ سب ہنسیں گی۔ میرا مذاق اُڑائیں گی۔"

"مذاق اُڑانے یا ہنسنے کی آخر کیا بات ہے؟"

وہ مضطربانہ اپنے ہاتھوں کی اُنگلیاں باہم مروڑنے لگی۔

کچھ دیر خاموشی چھائی رہی پھر اُس کی بوجھل آواز نے اس خاموشی کا سینہ چیرا۔

"پچھلے سال سالانہ تعطیلات میں ہماری ایک ساتھی کی دو بچوں والے ایک رنڈوے سے شادی ہوئی تھی۔ چھٹیوں کے بعد جب وہ اسکول آئی تو سب نے بہت مذاق بنایا تھا اُس کا۔ ہمارا گروپ تو اب تک اُسے بھی کہہ کر چھیڑا کرتا ہے۔ مجھے کیا خبر تھی کہ میں بھی تماشا بننے جا رہی ہوں۔" آخری جملے پر اُس کی آواز رندھ گئی۔

"ہمارا گروپ؟" بھابی جان نے مستفسرانہ انداز میں کہا۔ "یعنی تم بھی شامل تھیں اس بے چاری کا مذاق اُڑانے والوں میں؟"

اُس نے اثبات میں سر ہلا دیا پھر دھیمی آواز میں بولی۔ "شاید اسی کی سزا ملی ہے مجھے۔"

"یہ تمہارا وہم ہے...... ہاں البتہ تمہیں یا کسی کو بھی اُس کا مذاق نہیں اُڑانا چاہیے تھا۔ کسی کی ذاتیات کو تختۂ مشق بنانا یا کسی کا مضحکہ اڑانا تو بہرحال مستحسن فعل نہیں۔"

"میرا دل تو یہی کہتا ہے کہ اُسی کی سزا ملی ہے مجھے۔"

"اچھا چلو اگر تمہارا اصرار ہے تو یہی سہی۔ اب تلافی کی صورت یہی ہے کہ اپنی مذکورہ ساتھی کو اپنی شادی میں بطورِ خاص مدعو کرو۔"

"ہرگز نہیں...... کسی کو بھی نہیں۔" وہ اٹل لہجے میں بولی۔

"شکوہ نہ کریں گی تمہاری ساتھیاں؟"

"شکوہ تو کیا باتیں بنائیں گی سو وہ اُنھیں بہرصورت بنانا ہیں خواہ اُنھیں بلایا جائے یا نہ بلایا جائے تو کیوں انھیں بلا کر تماشا بنوں؟"

"تماشا بننے والی کوئی بات نہیں ہے راقی۔"

"چھوڑیں بھابی جان! اس قصّے کو چھوڑیں۔" وہ سر جھٹک کر قدرے بیزاری سے بولی۔

"شادی کے بعد جب اسکول جاؤ گی تو سب گلہ کریں گی اس لیے میرا مخلصانہ مشورہ تو یہی ہے کہ مدعو کر لو اپنی ساتھیوں کو۔"

"شاید نہ جاؤں۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ کیا ملازمت چھوڑ دو گی؟ استعفا دے دو گی؟"

اُلفت جس نے جلیس الحسن سے تخلیے میں ہونے والی گفتگو کی تفصیل احتیاجاً کسی کو نہ بتائی تھی بھابی جان کی اس بات پر بولی۔ "ہاں چھوڑنا ہی پڑے گی۔ چار بچوں کی آیا بن کر جا رہی ہوں آخر کچھ تو ذمّے داریاں ہوں گی جو مجھے پوری کرنا پڑیں گی۔"

"تم ناحق دل چھوٹا کر رہی ہو۔ خدا کرے ایسا ہو تو تم میری بات کہ بہت خوش رہو گی۔"

وہ ایک ٹھنڈی سی سانس بھر کر رہ گئی۔

بھابی جان اُس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے اُٹھ کھڑی ہوئیں اور جہازی سائز کے اس لفافے میں سے جو وہ اپنے ساتھ لے کر اُس کے پاس آئی تھیں خاکستری لفافوں میں ملفوف چند دعوت نامے نکال کر اُس کے قریب رکھتے ہوئے بولیں۔ "خیر یہ چند کارڈز چھوڑے جا رہی ہوں۔ میری رائے تو یہی ہے کہ اپنی ساتھیوں کو ضرور مدعو کرو۔ خون کے رشتے داروں سے تو ہمارا کبھی کبھار ملنا ہوتا ہے لیکن ساتھ پڑھنے، ساتھ کام کرنے اور ساتھ اُٹھنے بیٹھنے والوں سے تو ہمارا دُکھ سکھ کا رشتہ بن جاتا ہے۔ انھیں اپنی اس خوشی میں شریک کرنا لازم ہے۔ سب کو نہ سہی چند قریبی دوستوں ہی کو بلا لو کیونکہ اسکول چھوڑ بھی دو گی تو کیا، اُن سے کہیں اور بھی تو ملنا ہو سکتا ہے۔ آئندہ زندگی میں ان سے نظریں ملانے اور سامنا کرنے کی گنجائش تو ضرور رکھو۔ ویسے بھی یہ کوئی چوری تو ہے نہیں جو چھپ چھپ کر کی جائے یا خدانخواستہ کوئی بُرا فعل نہیں کہ لوگوں سے ڈرا جائے۔ رہا تمہارا یہ خدشہ کہ وہ باتیں بنائیں گی یا مذاق اُڑائیں گی تو یقین رکھو کہ تمہاری کوئی بھی باشعور، باعقل اور سمجھ دار ساتھی ہرگز ایسی حماقت کی مرتکب نہیں ہوگی۔"

بھابی جان تو یہ کہہ کر چلی گئیں اور اُن کی بات نے الفت کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ وہ بے شعور اور اپنی ساتھی رعنا کی بدخواہ تھی جو اُس نے رعنا کی دو بچوں والے رنڈوے مرد سے اُن کی شادی پر اسکول میں اپنی چند قریبی ساتھیوں کے ساتھ مل کر خوب مذاق اُڑایا تھا اور جلیس احسن سے بات چیت کا سلسلہ چلنے سے پہلے تک اکثر اپنی دوسری ساتھیوں کے ساتھ مل کر اُن کا مضحکہ اُڑایا کرتی تھی۔

چار بچوں والے ایک مطلقہ مرد سے اُس کی اپنی شادی کے دعوت نامے اُس کے سامنے پڑے تھے اور بھابی جان کے الفاظ بازگشت کی صورت ایوانِ سماعت میں گونج رہے تھے۔

"اسکول چھوڑ دو گی تو کیا اُن سے کہیں اور بھی ملنا ہو سکتا ہے۔ آئندہ زندگی میں بھی اُن سے نظریں ملانے اور سامنا کرنے کی گنجائش ضرور رکھو۔ ویسے بھی یہ کوئی چوری تو ہے نہیں جو چھپ کر کی جائے یا خدانخواستہ کوئی بُرا فعل نہیں کہ لوگوں سے ڈرا جائے!"

اور......

"تلافی کی یہی صورت ہے کہ اپنی مذکورہ ساتھی کو اپنی شادی میں بطورِ خاص مدعو کرو۔"

ایک میخ سی دل میں گڑتی چلی جا رہی تھی۔

مسز رعنا جمیل جو شادی سے پہلے مس رعنا راشد ہوا کرتی تھیں، کا چہرہ اُس کے تصور میں بار بار اُبھر رہا تھا ڈوب رہا تھا۔
اپنی قریبی ساتھیوں کے ساتھ مل کر رعنا جمیل کی دو بچوں والے رنڈوے مرد سے شادی کے بعد اُس نے کس کس طور اُن کا مذاق نہ اُڑایا تھا۔

اُسے رعنا کے ساتھ کی جانے والی اپنی اور اپنی ساتھیوں کی ایک ایک زیادتی یاد آ رہی تھی۔ رعنا کا مذاق اُڑانے والوں میں وہی تو سب سے پیش پیش ہوا کرتی تھی۔

گزشتہ برس موسمِ گرما کی تعطیلات کے بعد اسکول کھلنے پر جب رعنا پہلے دن سہاگن کے رُوپ میں اسکول آئی تھیں تو اُن کو دیکھ کر بیشتر چہروں پر دبی دبی معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ بیسیوں بلکہ سیکڑوں استفسارات کیے گئے تھے۔ اُلفت نے جو اپنے گروپ کی گویا لیڈر تھی رعنا کو ممی کا خطاب دے کر میدان مار لیا تھا۔ اُس کی ساتھیاں ہنس ہنس کر دوہری ہو گئی تھیں۔
"خدا کی قسم اُلفت! ایسا خطاب ڈھونڈ کر لائی ہو تم رعنا کے لیے کہ جواب نہیں!" اُس کی معتمد ترین دوست شائستہ نے اُس کی پیٹھ ٹھونکتے ہوئے کہا تھا۔

پھر تو رعنا جمیل کے لیے ممی کی ایسی گردان بندھی کہ اس بے چاری کا گویا ناطقہ بند کر دیا گیا۔ کبھی کبھی تو وہ زچ ہو کر اسٹاف رُوم سے نکل کر برآمدے میں کرسی ڈال کر بیٹھ جایا کرتی تھیں۔

تب الفت کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ایک روز وہ خود بھی رعنا جمیل والے آئینے میں اپنا عکس دیکھنے پر مجبور ہو جائے گی۔
زندگی بھی عجب کھیل کھیلتی ہے!
کبھی کبھی آدمی کو ایسے مقام پر لا کھڑا کرتی ہے کہ وہ آپ اپنے لفظوں پر پشیمان ہونے پر مجبور ہو جاتا ہے!
دوسروں کے ساتھ کی گئی زیادتیاں میخ بن کر اُس کے اپنے دل میں گڑتی چلی جاتی ہیں!
اور... دل کے روبرو رکھے جانے والے آئینے میں اُس کا اپنا عکس نظر آنے لگتا ہے۔

اور

آدمی دوسروں کے ساتھ کی جانے والی زیادتیوں کی تلافی اور ازالے کی راہیں تلاش کرنے لگتا ہے۔
زندگی اس کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی کھیل کھیل گئی تھی!!

اُس نے ہمت کر ہی لی۔
اسکول میں ایک کارڈ اُس نے ہیڈ مسٹریس اور جملہ اسٹاف ممبران کے نام دیا۔
دوسرا عمومی دعوت نامے کے دو روز بعد بطورِ خاص رعنا جمیل کے نام مع اُن کے اہلِ خانہ!
پیش لفظ اور تمہید کے بغیر یوں اچانک اُس کی شادی کا دعوت نامہ دیکھتے ہی اُس کی ساتھیاں اُچھل پڑیں۔
قریبی دوستوں نے شکایتیں شروع کر دیں۔

• "کبھی ایسی بھی کیا رازداری کہ کانوں کان ہم نے ہوا نہ لگنے دی۔ آخر بات چیت تو پہلے سے چل رہی ہوگی!"
• "الفت ڈیئر! تم تو بڑی چھپی رستم نکلیں!" شکوہ کیا گیا۔
• "یار! تم نے تو بڑے بڑوں کے کان کتر دیے۔ صبح اسکول لگنے سے چھٹی ہونے تک بیسیوں مرتبہ سامنا ہوتا تھا۔ فری پیریڈ میں اکٹھے مل کر بیٹھتے تھے۔ انٹرول میں ساتھ چائے پیتے تھے مگر یار تم نے بھنک نہ دی!" اُس کے گروپ کی ایک منہ پھٹ ساتھی نے کہا۔
"بس اچانک ہی سب کچھ طے ہوا!"
"کتنا بھی اچانک ہوا ہوگا چند دن تو لگے ہی ہوں گے۔ راتوں رات تو رشتہ طے نہ کیا گیا ہوگا اور نہ ہی یہ دعوت نامے راتوں رات چھپے ہوں گے!" اُسے آڑے ہاتھوں لینے کی کوشش کی گئی۔
"بڑی گہری نکلیں تم تو!"
اب وہ کیا بتاتی انھیں!
ان شکایتوں اور شکایتوں پر اُس نے خاموش رہنا ہی بہتر جانا۔
منہ در منہ کیے جانے والے ان گلے شکووں سے قطع نظر پیٹھ پیچھے بھی خوب باتیں بنائی گئیں۔
لبوں پر طنزیہ جملے تھے۔
آنکھوں میں حسد کے شرارے
چہروں پر معنی خیز مسکراہٹیں!
اس صورتِ احوال کے تصور سے تو وہ خائف تھی۔
اُسے یوں لگ رہا تھا جیسے کھلے میدان میں وہ بے سائبان اور بے ردا کھڑی ہو اور چہار اطراف سے چھوٹی چھوٹی کنکریاں اُس کی سمت اُچھالی جا رہی ہوں جو گو کہ بظاہر بے ضرر دکھائی دیتے ہوئے بھی اُسے شاید آزار پہنچانے کا موجب بن رہی ہوں۔
پھر حسبِ توفیق نوع بہ نوع استفسارات کا سلسلہ شروع ہوا۔
"شادی کہاں ہو رہی ہے؟"
"کس سے ہو رہی ہے؟"
"خاندان کے ہیں یا پرایوں میں سے؟"
"نام کیا ہے؟"
"عمر کتنی ہے؟"
"رہنے والے کہاں کے ہیں؟"
"پڑھے لکھے کتنے ہیں؟"
"کرتے کیا ہیں؟"

"رہتے کہاں ہیں؟"
"گھر اپنا ہے یا کرائے کا؟"
"گھر ہے کتنا بڑا؟"
"وہ دیکھنے میں کیسے ہیں؟"
"دُبلے ہیں یا موٹے؟"
"لمبے ہیں یا چھوٹے؟"
"گورے ہیں یا کالے؟"
"انھوں نے تمہیں دیکھا؟"
"تم نے انھیں دیکھا؟"
"ساس سسر ہیں؟"
"نندیں ہیں؟"
"دیور جیٹھ ہیں؟"
"جہیز میں کیا کیا ہوگا؟"
"بری میں کیا کیا چڑھایا جا رہا ہے؟"

اور

اس نوعیت کے ان گنت سوالات!
غرضیکہ سارا جغرافیہ پوچھ لیا گیا۔
اگر نہیں پوچھا گیا تو یہ کہ صاحب کی پہلی شادی تھی یا دوسری؟
بچے ہیں؟
اگر ہیں تو کتنے؟
شاید احتیاطاً یہ نہ پوچھا گیا تھا۔
یا پھر یہ کسی کو گمان ہی نہ تھا کہ اس کی شادی کسی شادی شدہ مرد سے بھی ہو سکتی تھی۔
ایسا مرد جس کی بیوی اُسے چھوڑ کر چلی گئی تھی۔
اپنے چار بچے اس کے پاس چھوڑ کر!
اُس کی ساتھیوں نے اپنی دانست میں سب کچھ پوچھ لیا۔
اگر نہیں پوچھا تو وہ سوال جو سانپ کے گلے میں چھچھوندر کے مصداق کانٹے کی طرح اس کے ذہن میں اٹکا ہوا تھا۔
جہاں دیدہ اور زمانہ شناس دیرینہ ساتھی مسز رفیع نے البتہ یہ ضرور کہا "شادی ہونے پر تو لڑکیاں خوش ہو اٹھتی ہیں۔
تم نے منہ کیوں لٹکا رکھا ہے؟"
اس کا جی بھر آیا۔
دل میں آیا سب کچھ بتا دے انھیں۔
مگر ہمت نہ ہوئی۔

دو روز بعد جب اُس نے طبیعیات کی تجربہ گاہ کے ایک گوشے میں طالبات کے جرنلز کی پڑتال میں مصروف رعنا جمیل کو بطور خاص علیحدہ سے دعوت نامہ دیا تو وہ حیرانی سے بولیں "مس اُلفت! آپ نے مجھے اپنے دوستوں میں کب سے شامل کر لیا؟"
"میں...... میں سمجھی نہیں آپ کا مطلب؟" اُلفت نے اُن سے نگاہیں ملائے بغیر کہا۔
"میرا مطلب ہے علیحدہ سے دعوت نامے تو آپ نے اپنی قریبی دوستوں ہی کو دیے ہوں گے؟"
"جی نہیں سوائے آپ کے کسی کو بھی نہیں دیا ہے میں نے علیحدہ سے کارڈ۔" وہ دھیرے سے بولی۔
"کیا واقعی؟" رعنا جمیل نے قدرے بے یقینی اور حیرانی کی ملی جلی کیفیت اپنی نگاہوں میں سموئے اس کی طرف دیکھا۔
اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
"اچھا! پھر تو آپ کا بے حد شکریہ" رعنا نے کہا "کیا فری پیریڈ ہے آپ کا؟"
"جی ہاں۔"

"تو بیٹھیے!" وہ اپنے قریب پڑی خالی کرسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولیں۔
وہ بیٹھیں تو رعنا نے قلم ایک طرف رکھتے ہوئے اپنا کام روک دیا۔
"ایک بات پوچھوں مس اُلفت؟" وہ معتدل لہجے میں بولیں۔
"جی؟" اُلفت نے چونک کر ذرا کی ذرا اُن کی طرف دیکھا۔
"اگر یہ سچ ہے کہ آپ نے علیحدہ سے کسی کو دعوت نامہ نہیں دیا ہے سوائے مجھ ناچیز کے تو کیا میں اس خصوصی عنایت کا سبب پوچھ سکتی ہوں؟"
اُلفت پر ایک اضطرابی کیفیت طاری ہو گئی۔
"میں آپ سے معافی مانگنا چاہتی ہوں مسز جمیل۔" وہ بوجھل آواز میں بولی۔
"معافی!" رعنا نے حیرانی سے اُسے دیکھا اور بولیں "میں سمجھی نہیں۔"
ایک گہری سانس کھینچتے ہوئے اُلفت نے تجربہ گاہ کی کھلی کھڑکی سے باہر سبزہ زار کی جانب دیکھا اور رفت اور ندامت کے غماز لہجے میں بولی "میں نے آپ کو بہت تنگ کیا...... آئی ایم رئیلی سوری فار دیٹ۔"
"اوہ!" رعنا معاملے کی نوعیت سمجھ کر ہنس دیں پھر اپنا ہاتھ بڑھا کر اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولیں "میں جانتی ہوں ماں باپ کا گھر چھوڑتے ہوئے لڑکیاں رقیق القلب ہو جایا کرتی ہیں۔" انھوں نے پل بھر کو توقف کیا پھر اس کے ہاتھ کی پشت اپنے ہاتھ سے تھپتھپاتے ہوئے بولیں "کوئی بات نہیں جو حقیقت ہے سو ہے...... ہاں میں دو بچوں کی ممی ہوں تو یہی اگر دوسروں کے ساتھ تم نے بھی ہنس کر مجھے ممی کہہ دیا تو کون سی بُری بات ہے؟"
اُلفت کی آنکھیں بھیگ گئیں۔
"آئی ایم سوری" اُس نے بھیگی آنکھوں سے رعنا کو دیکھتے ہوئے کہا۔
"کوئی بات نہیں۔" رعنا مسکرا کر بولیں۔
"آپ نے مجھے معاف کر دیا؟"
"دیکھو...... تمہارے معافی چاہنے یا میرے معاف کر دینے کی کوئی بات ہی نہیں...... بہرحال چونکہ میں تمہاری جذباتی کیفیت کو محسوس کر سکتی ہوں اس لیے اگر میرے یہ کہنے سے کہ ہاں میں نے معاف کر دیا تمہارا اطمینان ہو سکتا ہے تو ٹھیک ہے میں نے تمہیں معاف کر دیا۔" رعنا جمیل جو اُلفت سے ہمیشہ آپ جناب سے مخاطب ہی تھیں بے تکلفی اور اپنائیت سے بولیں۔
"تھینک یو ویری مچ۔" اُس نے دھیرے سے کہا۔
"میری دعا ہے کہ تم اپنی آئندہ زندگی میں بہت خوش رہو۔"
"ایک بات پوچھوں آپ سے؟" اُلفت مدھم سروں میں گویا ہوئی۔
"ضرور پوچھو۔"
"آپ خوش ہیں؟"
"خوش!" انھوں نے دھیرے سے اُلفت کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ پھر ایک گہری سانس کھینچنے کے بعد بولیں "خوشی بڑی ہی ناقابل اعتبار شے ہے اُلفت...... یہ انسان کے ساتھ پوری زندگی آنکھ مچولی کھیلتی رہتی ہے۔"
رعنا کے چہرے پر دھندلاہٹ سی لرزاں دیکھ کر اُلفت کا دل مضطرب ہو گیا۔
"یعنی آپ خوش نہیں ہیں؟"
"یہ میں نے کب کہا؟"
اُلفت ہکا بکا ہو کر اُن کا منہ دیکھنے لگی۔
"تم نے مجھ سے یہ سوال کس حوالے سے کیا ہے؟"
"میرا مطلب ہے آپ اپنی شادی سے خوش ہیں؟"
"ایسی کچھ ناخوش بھی نہیں!" وہ موہوم سی مسکراہٹ کے ساتھ بولیں۔
"یعنی بہت خوش بھی نہیں؟"
"سمجھ سکتی ہو۔"
"مگر کیوں؟ بہت خوش نہ ہونے کی وجہ؟"

"بچے؟" اُلفت کا دل اُچھل کر حلق میں آن اٹکا۔

"ہاں...... دوسرے کے بچے اپنے کب بنتے ہیں!" رعنا جمیل نے کہا "تم اپنا دل بھی نکال کر اُن کے سامنے رکھ دو تب بھی وہ تمہارے نہیں بنتے۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے مگر میرے گھر والوں خصوصاً میرے والد نے مجھے بے بس کر دیا۔" یہ کہتے ہوئے اُس کی آنکھیں چھلک اُٹھیں۔

"کیا مطلب؟ میں سمجھی نہیں۔"

ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے اُلفت نے اپنی آنکھوں کی نمی رومال میں جذب کی پھر گلوگیر لہجے میں بولی۔

"جو صاحب میرے مقدر میں لکھے جا رہے ہیں اُن کے پہلے ہی چار بچے ہیں۔"

"واقعی!" رعنا کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"ہاں۔"

اُلفت کی آنکھوں میں پھر آنسو اُمڈ آئے۔

رعنا جمیل نے ایک گہری سانس کھینچتے ہوئے ترحم آمیز نگاہوں سے اُسے دیکھا۔

عین اُسی لمحے اُس کی نگاہیں بھی رعنا کی جانب اُٹھیں اور اُن کی ترحم آمیز نگاہیں اُسے اپنے وجود میں کھُبتی محسوس ہونے لگیں۔

کچھ دیر خاموشی رہی پھر رعنا نے پوچھا "بیوی مر گئی ہے کیا؟"

"نہیں۔"

"تو پھر؟"

"علیحدگی ہو گئی ہے۔"

"قانونی یا زبانی کلامی؟"

"قانونی۔"

"طلاق نامہ دیکھا تمہارے گھر والوں نے؟"

"جی۔"

"طلاق نامے کی تصدیق بھی کروائی متعلقہ عدالت سے؟"

"یہ تو مجھے معلوم نہیں البتہ طلاق واقعی دے چکے ہیں وہ صاحب اپنی محترمہ کو۔"

"پکی بات؟"

"جی ہاں۔"

"دراصل آج کل عموماً ایسے فراڈ سننے میں آتے ہیں کہ صاحب کی اہلیہ اور بچے موجود ہیں اور کسی دوسرے گھر میں جھوٹا طلاق نامہ دکھا کر دوسری شادی رچا لی۔ بعد کو لڑکی کو پتہ چلتا ہے تو سانپ نکل جانے کے بعد لکیر پیٹنے سے فائدہ! ہمارے اپنے جاننے والوں میں ایسا ہی ایک کیس ہوا ہے ابھی پچھلے دنوں۔"

"یہاں البتہ ایسی کوئی بات نہیں لیکن اُن محترمہ نے تو طلاق کے بعد کسی اور سے شادی بھی کر لی ہے۔" اُلفت نے بتایا۔

"چار بچوں کی ماں نے!"

"جی ہاں۔"

"بچے بھی ایک دو نہیں چار ہیں۔" رعنا جمیل نے تشویش کا اظہار کیا اور بولیں "ڈیئر! بچوں والے مرد سے شادی کا بڑا نقصان یہ ہے کہ ایسے مرد کی پوری توجہ اور محبت دوسری عورت کے حصے میں آ ہی نہیں سکتی۔ بڑی گڑبڑ کر دیتے ہیں بچے۔ ایک تو موقع بے موقع بیچ میں پڑتے ہیں۔ اگر بچے نہ ہوتے موصوف کے تو اچھا تھا۔ تم نے مجھ سے مشورہ لیا ہوتا تو میں تمہیں ہرگز ہاں کرنے کا مشورہ نہ دیتی۔ خیر اب کیا ہو سکتا ہے۔ اب تو تم ہاں کر چکیں بلکہ دعوت نامے بھی چھپ چکے۔ اب تو انکار کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔"

اُلفت کو پچھتاوے کے احساس نے آگھیرا۔ "اب تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا...... ہے نا؟"

"ظاہر ہے۔" اُلفت کو خود اپنی آواز کسی اندھے کنوئیں سے آتی محسوس ہوئی۔

"کاش تم نے مجھ ہی سے مشورہ کر لیا ہوتا۔" رعنا نے بڑی دردمندی سے کہا۔

"بس میں اتنی اُلجھی ہوئی تھی کہ......" الفاظ اُس کے حلق میں گھُٹ کر رہ گئے۔

"اسٹاف میں سے کس کس کو معلوم ہے یہ بات؟"

"کسی کو بھی نہیں۔"

"کیا واقعی؟"

"جی۔"

"مس راحیلہ تو تمہاری قریبی دوست ہیں۔ انھیں تو ضرور بتائی ہو گی تم نے یہ بات۔"

"جی نہیں انھیں بھی نہیں۔"

"اچھا!" رعنا کی حیرت کی انتہا دیکھنے کے لائق تھی۔ "گویا کسی کو معلوم نہیں کہ تمہاری شادی......؟"

"جی نہیں۔" اُس نے بڑی قطعیت کے ساتھ کہا

"خیر پتا تو چل ہی جائے گا کسی نہ کسی طرح۔ ایسی باتیں راز کب رہتی ہیں...... میری شادی تو موسم گرما کی تعطیلات کے دوران ہوئی تھی مگر یہ اپنی مسز رفیع کے دور پار کے عزیزوں میں ہیں۔ یہ شادی میں بھی شریک تھیں اور ولیمے میں بھی۔ مسز رفیع چھٹیوں کے دوران ہی اسٹاف میں سے جس جس کو بتا سکتی تھیں انھوں نے بتا ڈالا کہ رعنا کی شادی دو بچوں والے ایک وڈوور سے ہوئی ہے۔ جن کو چھٹیوں میں معلوم نہ ہو سکا انھیں اسکول کھلنے کے پہلے ہی دن یہ بات معلوم ہو گئی۔ اس لیے یہ تو مجھے یقین ہے کہ یہ بات تم چھپا تو خیر ہرگز نہیں سکو گی۔"

"ہاں چھپا تو نہیں سکتی مگر خود بتانا کبھی اچھا نہیں لگتا۔ کوئی اور بتائے تو دوسری بات ہے۔"

"اگر تمہاری اجازت ہو تو میں بتا دوں" تاکہ اسٹاف میں سے جو بھی شادی میں شریک ہو پہلے سے اس خبر سے آشنا ہو اور تمہاری شادی میں سرِ محفل سر جوڑ کر باتیں نہ بنائی جائیں۔"

"آپ کی مرضی۔"

"تمہیں یعنی میری مرضی کی بات نہیں، بات تمہاری مرضی اور اجازت کی ہے۔ تمہیں تو پتا ہے ناں کہ اپنی بعض اسٹاف ممبرز کس مزاج کی ہیں۔ بجائے اس کے کہ یہ شادی کی تقریب میں سر جوڑ کر باتیں کریں انھیں پہلے ہی بتا دیا جائے تاکہ جتنی کھلبلی مچنا ہو پہلے ہی مچ جائے۔ سچ کہتی ہوں اُلفت ہماری بیشتر مشکلات کو یہ دنیا والے زیادہ گمبھیر بنا دیتے ہیں۔ میں تمہیں اپنی مثال دوں کہ دو بچوں کے باپ سے مجھے جو خیالات تھی سو تھی عزیز رشتے داروں اور دوستوں نے میری مشکل میں اور اضافہ کر دیا۔ کوئی کچھ کہتا تھا کوئی کچھ۔ رشتے داروں نے کہا "اسے یہی دو بچوں کا باپ ہی ملا تھا رعنا کے لیے!" کسی نے تھوڑی پر ہاتھ پھیر کر کہا کنوارا نہیں ہو سکے گا۔ کسی نے کہا کہ ایک عورت کو برت چکنے والا مرد مشکل ہی سے دوسری عورت کے قابو آتا ہے۔ اسکول کی ساتھیوں نے بھی کچھ کم باتیں نہیں بنائیں۔ بُرا مت ماننا آمی کی گردان سے میرا مذاق اُڑایا گیا۔ میں اور میرے گھر والے چپ چاپ سب کی سنا کیے۔ کسی کی زبان نہیں پکڑ سکے کسی سے کچھ نہیں کہہ سکے۔ ان لوگوں سے آدمی کیا کہہ سکتا ہے جو جانتے ہوئے مسائل سے آشنا ہوں...... کیا میرے گھر والوں نے میرے لیے کوئی کنوارا بر تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی ہو گی! لیکن نہیں ملا کوئی کنوارا لڑکا ہماری قسمت میں۔ مجبوراً دو بچوں کے باپ ہی سے ہاں کرنا پڑی۔"

الفت نے رعنا جمیل کی طرف دیکھا۔ وہ آزردہ اور دل شکستہ نظر آ رہی تھیں۔ اُسے یوں لگا جیسے رعنا کی کہانی اُس کی اپنی کہانی سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھی۔ فرق تھا تو اتنا کہ رعنا کے میاں رنڈوے اور دو بچوں کے باپ تھے جبکہ اس کا ہونے والا شوہر طلاق یافتہ اور چار بچوں کا باپ تھا!

اُسے اپنی اماں کی بات یاد آ گئی۔ انھوں نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا تھا:

"میری جان! یہ کوئی فرق نہیں پڑتا، کوئی انوکھی بات نہیں۔ تم اس دنیا کی پہلی لڑکی نہیں ہو جسے ایک شادی شدہ مرد سے بیاہا جا رہا ہے۔ ان گنت لڑکیاں بچوں والے مطلقہ اور رنڈوے مردوں سے بیاہی جا چکی ہیں اور شاید جب تک یہ دنیا ہے بیاہی جاتی رہیں گی۔"

"بتا دوں اسٹاف میں سب کو؟"

"بتا دیں۔" اس نے نیم دلی سے کہا اور لگے ہی بولی "پتا نہیں"

"کہیں جو باتیں تمہیں شادی کے بعد اسکول آنے پر سننا پڑیں گی وہ پہلے ہی کیوں نہ سُن لو۔"

"خیر اسکول تو میں چھوڑ دوں گی۔"

"کیا مطلب؟"
"ملازمت چھوڑ دینے کا حکم ملا ہے؟"
"تمہارے گھر والوں کی طرف سے؟"
"جی نہیں۔"
"تو کیا اُن کی طرف سے؟" رعنا نے لفظ "اُن" معنی خیز لہجے میں ادا کیا۔
اُس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
"نہ ..... ایسی غلطی بھی نہ کرنا۔" رعنا نے [illegible] اس قدر تشویش کے ساتھ کہا کہ الفت چونک کر اُن کی طرف دیکھنے لگی۔
"کیا پتا آئندہ کس قسم کے حالات ہوں۔ ملازمت برقرار رکھو گی تو دل کو تقویت رہے گی۔ خود کو بے آسرا اور کمزور محسوس نہ کرو گی۔ کم از کم کفالت کا مسئلہ تو نہ ہوگا اور [illegible] میرا ذاتی تجربہ تو یہی کہتا ہے کہ بیوی کی ملازمت اُس کے شوہر کے لیے ایک خاموش تنبیہ ہے کہ [illegible] اُن کے لیے اس قسم کی باتیں سوچ کر دل بیٹھنے لگتا ہے [illegible] اپنے پیروں پر کھڑی ہو۔"
رعنا نے لمحہ بھر کو توقف کیا پھر تنبیہی لہجے میں بولیں: "نوکری چھوڑنے کی غلطی ہرگز نہ کرنا۔ ویسا ہی ہے تو طویل رخصت لے لینا۔ سرکاری نوکری چھوڑ دینا آسان ہے مگر ملنی بہت مشکل۔ [illegible] طویل رخصت لے سکتی ہو۔ پہلے تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو پھر جا ہو تو پانچ برس کی رخصت لے لینا۔ ورنہ ایک دو برس کی لیتی جانا۔ اگر زندگی سے پوری طور مطمئن ہو جاؤ تب ملازمت چھوڑنا، ورنہ ..... ویسے کیا پتا آئندہ زندگی میں یہ ملازمت تمہاری ضرورت ہی بن جائے جیسے کہ میری بن گئی ہے۔"
"کیا مطلب؟"
"مطلب یہ کہ پہلے اپنے ہونے والے شوہر کی تنخواہ اور وسائل کا جائزہ لینا۔ ہو سکتا ہے اُن کے وسائل اتنے محدود ہوں کہ معاشی فراغت کے لیے میری طرح تم بھی ملازمت جاری رکھنا ضروری سمجھو۔"
"نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ تب ہی تو مجھے ملازمت چھوڑنے کا حکم دیا گیا ہے۔"
"میرا مخلصانہ مشورہ یہی ہے کہ ملازمت چھوڑنے کے معاملے کو فی الحال التوا میں رکھو۔ سالانہ چھٹیاں کتنی جمع ہیں تمہاری؟"
"پتا نہیں۔ ویسے جب سے میں ملازمت پر آئی ہوں میں نے کبھی رخصت لی ہی نہیں۔ بس اتفاقی چھٹیوں سے کام چلتا رہا۔"
"تب تو کافی چھٹیاں جمع ہوں گی تمہاری۔ پہلے تنخواہ کے ساتھ وہ تمام چھٹیاں لو پھر بعد کو دیکھنا۔"
"اچھی بات ہے۔" الفت نے سعادت مندی سے کہا پھر تشکر آمیز لہجے میں بولی: "آپ کے گراں قدر مشورے کا بہت بہت شکریہ۔"
تب ہی لنگر پیریڈ کی گھنٹی بجی اور وہ دونوں ایک ساتھ اٹھ کھڑی ہوئیں۔
"چھٹی کے لیے تو تمہیں آج کل میں درخواست دے دینی چاہیے۔ آفس سپرنٹنڈنٹ صاحب سے کہو کہ وہ تمہارا لیو اکاؤنٹ بنا دیں۔ اسی حساب سے چھٹی کی درخواست دے دینا۔" رعنا جمیل نے چیزیں اٹھاتے ہوئے کہا۔
"آپ کا بہت شکریہ۔" الفت نے پھر کہا۔
"کس بات کا شکریہ؟" رعنا نے دروازے کا رخ کرتے ہوئے کہا۔
"میری الجھن میں اضافہ کر دینے اور مجھے مشورہ دینے کا۔"
رعنا مسکرا دیں۔
برآمدے سے گزرتے ہوئے الفت نے رعنا سے کہا: "نہ جانے کیوں آپ سے بات کرنے کے بعد مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے میرے دل کا بوجھ کم ہو گیا ہو۔"
"میں بتاؤں کیوں؟"
"ہاں بتائیے۔"
"کیونکہ ہم دو مشترک کی زنجیروں میں بندھے ہوئے ہیں۔" رعنا جمیل نے کہا۔
الفت اس کی [illegible] جہاں اب اس کا پیریڈ تھا۔
"میری دعائیں تمہارے ساتھ رہیں گی۔" رعنا [illegible]
الفت اگرچہ دلگیر ضرور تھی مگر اپنے پیروں تلے زمین اُسے سنگلاخ یا دلدل کی طرح بے رحم محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

اور کسی درد آشنا سے محروم ہونے کا دکھ بھی ماند پڑ گیا تھا۔

"کیا واقعی؟"
"کیا یہ سچ ہے؟"
اگلے دو تین دن وہ اسی نوعیت کے استفسارات کی زد میں رہی۔
اور تب اُسے احساس ہوا کہ حقیقت سے نظریں چرانے کے بجائے اُس کا سامنا کر کے آدمی زیادہ طمانیت محسوس کرتا ہے۔
وہ رعنا جمیل کی مشکور تھی کہ اُن کی حفاظتی پیش بندیوں نے اُسے بے جا خفت اور انجانے خوف سے نجات دلا دی تھی۔
رعنا کے مشورے کے مطابق اُس نے کلرک سے آفس سپرنٹنڈنٹ کی زیرِ نگرانی اپنی تمام چھٹیوں کا حساب کتاب کروانے کے بعد محکمہ کو تین ماہ کی چھٹی کی درخواست بھجوا دی۔
اپنی ساڑھے تیرہ برس کی ملازمت کے دوران اُسے لمبی رخصت لینے کی ضرورت ہی پیش نہ آئی تھی۔ برس کے برس دو ڈھائی سوا دو ماہ کی موسم گرما کی تعطیلات مل جایا کرتی تھیں۔ ہفتہ عشرہ موسم سرما کی چھٹیاں۔ علاوہ ازیں مختلف مدارس کے دن چھٹیاں ملتی رہتی تھیں۔ اُن سے قطع نظر سالانہ اتفاقی چھٹیوں کا مقررہ کوٹہ علیحدہ تھا۔ محکمہ جاتی قواعد و ضوابط کے تحت ملنے والی اُس کی تمام سالانہ چھٹیاں جمع پڑی تھیں۔
رعنا جمیل کے مشورے کی روشنی میں اُس نے فی الحال محض تین ماہ کی رخصت کے لیے درخواست دینا مناسب سمجھا۔ طویل رخصت لینا فی الحال بلا جواز محسوس ہوا۔ کیا عجب کہ آئندہ حالات اس تین ماہ کی رخصت کو غیر ضروری قرار دے دیتے ۔۔۔!
رعنا کو احوالِ دل سنانا اور اُن کا مشورہ حاصل کر لینا مفید ہی رہا تھا ورنہ شاید وہ تو آنکھ بند کر کے استعفا ہی دے ڈالتی۔
اس فائدے سے قطع نظر دل کو جو تقویت ملی تھی اور حقیقت کا سامنا کرنے کا حوصلہ پایا تھا وہ جدا تھا۔
شادی کی تیاریاں دونوں طرف ہی شروع ہو چکی تھیں۔
اِدھر جوش و خروش کے ساتھ
اور علی الاعلان!
لیکن جلیس الحسن کی طرف بہت احتیاط کے ساتھ۔
بچوں کی جذباتی کیفیت کا انھیں بخوبی اندازہ تھا اور اُن کا خیال کرتے ہوئے انھوں نے بری کی تیاری کے تمام معاملات اپنے قریب ترین دوست بختیار ہمدانی کی بیگم کے سپرد کر دیے تھے۔ انھوں نے فیصلہ کیا تھا کہ بری کے ملبوسات اور زیورات وغیرہ بیگم ہمدانی نہ صرف تیار کروا دیں بلکہ انھیں اپنے ہاں ہی رکھیں۔ ساری تیاری ہمدانی صاحب کے ہاں ہو اور نکاح والے دن مختصر سی برات بھی ہمدانی صاحب کے ہی گھر سے جائے۔
بچوں کو اپنی دوسری شادی کے بارے میں اعتماد میں لے لینے کے باوجود وہ یہ ساری حکمتِ عملی بچوں کی جذباتی کیفیت کو مزید مجروح نہ ہونے دینے کی خاطر اختیار کر رہے تھے۔
ملبوسات اور زیورات کے انتخاب کے لیے بیگم ہمدانی نے جلیس الحسن کے ایما پر الفت کو مع ایک دو بہنوں اور بھاوج کے اپنے ہمراہ لے جانے کی کوشش کی تھی مگر امی نے اس کی اجازت نہ دی۔ گو اپنی جگہ بیگم ہمدانی کا یہ کہنا بھی بجا تھا کہ زمانہ بہت بدل چکا ہے اور یہ بھی درست کہ الفت پختہ عمر کی سمجھدار لڑکی تھی مگر امی کو مشرقی اقدار اور رواج کا بڑا پاس تھا۔ الفت سے جلیس الحسن کی تخلیے میں ملاقات کی بھی انھوں نے بارہا مذمت کی۔ جملہ اہلِ خانہ کے سمجھانے بجھانے پر بہ دقت تمام اجازت دی تھی، بالآخر غلطت آیا۔ بھائی جان اور تہنیت کو بیگم ہمدانی کے اصرار پر بری کی خریداری میں اُن کی معاونت اور مشاورت کے لیے اُن کے ہمراہ دو تین بار بازار جانا پڑا۔
ولیمے کی بابت امی کی یہ رائے ٹھہری تھی کہ جب جلیس الحسن نکاح میں گنتی کے چند اصحاب لا رہے تھے تو اُن کی طرف سے ولیمے میں بھی محدود تعداد میں لوگ جائیں۔ خاندان کے قریبی گھرانوں سے ایک ایک یا حد سے حد دو دو افراد کو مدعو کر لیا جائے۔ بابا بھی اُن کی اس رائے سے متفق تھے اور بقیہ اہلِ خانہ بھی کہ ان سب کے خیال میں امی کی یہ رائے انتہائی

...مقبول تھی۔

بہت احتیاط سے ولیمے کے مدعوئین کی فہرست تیار کرنے کے بعد جلیس الحسن کو اس تعداد سے آگاہ کیا گیا تو وہ ورثے ہوئے بابا کے پاس آئے اور انھوں نے کہا "نکاح میں کم لوگوں کو مدعو کرنا اب میری ذاتی مجبوری سمجھیے مگر ولیمے میں آپ کی جانب سے زیادہ سے زیادہ لوگوں کی شرکت کو آپ میری خواہش سمجھیں۔"

"میاں! اسراف سے فائدہ؟" بابا نے کہا۔

"اسراف نہیں بلکہ آپ اسے میری خوشی سمجھیے۔" جلیس الحسن نے لجاجت سے کہا۔

"اچھی بات ہے میاں جیسی آپ کی خوشی۔"

نئے سرے سے ولیمے کے مدعوئین کی فہرست ترتیب دی گئی اور جلیس الحسن کو اُن کی تعداد سے آگاہ کر دیا گیا۔

تقریبِ ولیمہ کے لیے جلیس الحسن نے شہر کے معروف ترین فائیو اسٹار ہوٹل کا انتخاب کیا تھا اور مینو بختیار ہمدانی اور اُن کی بیگم کی مشاورت سے ترتیب دیا تھا۔

رسمِ نکاح اور ولیمے کے علاوہ جلیس الحسن نے بقیہ تمام رسومات کی ادائیگی میں کسی قسم کی دلچسپی لینے یا شرکت کرنے سے معذوری ظاہر کر دی تھی۔

مگر

اس طرف ساری مروجہ رسمیں پورے جوش و خروش سے ادا کی جا رہی تھیں۔

الفت کو مایوں بھی بٹھایا گیا۔

ڈھولک بھی بجائی جا رہی تھی۔

گیت بھی گائے جا رہے تھے۔

اور رت جگے بھی نبھائے جا رہے تھے۔

مہندی کی رسم بھی ہوئی۔

امی کی خواہش اور ہدایت کے مطابق سارے ارمان پورے کیے جا رہے تھے کہ جلیس الحسن کی اگر دوسری شادی تھی تو کیا الفت تو پہلی بار دلہن بننے جا رہی تھی۔

ویسے اندر سے امی بڑی متفکر تھیں۔ کنواری بیٹی کو چار بچوں کے مطلقہ باپ سے بیاہنا پُل صراط کے سفر کے مترادف تھا خدشات اور وسوسے بار بار اُن کے دل کو ہولانے لگتے تھے اور وہ ان خدشات اور وسوسوں کا بابا کے سامنے برملا اظہار کرنے بیٹھ جاتی تھیں۔

بابا اُنھیں سمجھاتے بجھاتے مگر حقیقت یہ تھی کہ متفکر وہ خود بھی تھے اب یہ اور بات تھی کہ وہ کسی سے کچھ کہتے سنتے نہ تھے۔

متفکر تو اپنی اپنی جگہ الفت کے جملہ متعلقین تھے۔

اور خود الفت بھی!

جوں جوں شادی کا دن نزدیک آتا جا رہا تھا اُس کے قلب و روح پر چھائے اضطراب کے سائے گہرے ہوتے جا رہے تھے۔

اُس کی راتوں کی نیندیں اُڑ گئی تھیں۔

ایک شادی شدہ مرد کنوارے مرد کی طرح سادہ تختی تو نہیں ہوتی کہ اُس کی زندگی میں داخل ہونے والی عورت بڑے زعم سے اس پر جو چاہے سو لکھ دے۔ اس کے ذہن پر تو بہت کچھ لکھا جا چکا ہوتا ہے۔ اُس کے دل کے نہاں خانوں میں پچھلی عورت کی پرچھائیاں ہلکورے لے رہی ہوتی ہیں۔

شادی شدہ مرد کی زندگی میں داخل ہونے والی نئی عورت کو جو شوہر کی خواہاں ہو ہر قدم اتنی خوبصورتی اور احتیاط سے اُٹھانا پڑتا ہے کہ اُس کے دل سے گزر جانے والی پچھلی عورت کے نقوشِ پا اُس کے قدموں تلے نہ صرف چھپ جائیں بلکہ نئے نقوشِ پا حنا کی خوشبو اور پازیبوں کی جھنکار کے امین محسوس ہوں۔

الفت جانتی تھی کہ زندگی کے پیچ و خم اُسے ایک کٹھن راستے کے نقطۂ آغاز پر لے جا کھڑا کرنے جا رہے تھے۔

اُس راستے کی دقتوں کا اُسے ابھی سے اندازہ تھا۔

راہ کے نشیب و فراز اور پیچ و خم پہ ابھی سے نظر تھی۔

اگلی منزلیں اشتباہ کی دُھند اور بے یقینی کے کہر میں ملفوف تھیں۔

خدشات کا گھنگھور اندھیارا اُس کے دل کو اپنی مٹھی میں جکڑے لے رہا تھا۔

منزل سے دُور بیچ راہ میں بھٹکتے رہ جانے کا خوف آسیب زدہ اور اُس کے دل کی حالت دگرگوں کیے دے رہا تھا۔

اشتباہ اور بے یقینی کی وحشت تو جلیس الحسن کے دل پر بھی طاری تھی۔

خدشات کا اندھیارا اُن کے من میں بھی اُترا ہوا تھا۔

ایک دو نہیں اَن گنت خدشات تھے!

ڈھیروں فکریں تھیں۔

اور سوچوں کا ایک لامتناہی سلسلہ جس نے اُن کی راتوں کی نیندیں اُڑا دی تھیں۔

وہ سوچتے:

کیا اُن کی زندگی میں آنے والی نئی عورت اُن کی زندگی سے نکل جانے والی عورت کا نعم البدل ثابت ہو سکے گی؟

کیا وہ صحیح معنوں میں اُن کی شریکِ زندگی بن سکے گی؟

کیا وہ اُن کے بچوں کو کھلے دل سے قبول کرلے گی؟

انھیں اپنے دامنِ محبت میں پناہ دے گی؟

انھیں ماں کا پیار دینے کی کوشش کرے گی؟

اس خلا کو پُر کر سکے گی جو اُن کی اپنی ماں کے جانے سے پیدا ہو گیا تھا؟

کیا وہ سوتیلی ماں کے روایتی تصور سے مختلف ثابت ہو سکے گی؟

اس گھر کی گم گشتہ خوشیوں کی واپسی کا سامان ہو سکے گا؟

اور

ان تمام سوالوں اور سوچوں سے زیادہ اہم سوال یہ تھا کہ کیا گھر آنے والی اس نئی عورت کو بچے اپنی ماں کی جگہ دے سکیں گے؟

جلیس الحسن کے لیے یہ سوال اس لیے زیادہ اہم اور گمبھیر ہو گیا تھا کہ جب سے انھوں نے اپنے بڑے بیٹے اعجاز اور بیٹی تمکین کو اس سلسلے میں اعتماد میں لینے کی خاطر اُن سے بات کی تھی اُن کے رویے میں ایک عجیب سی احتیاط اور کھنچاؤ سا آ گیا تھا۔

نہ صرف ان دونوں کے بلکہ اُن سے چھوٹے فرزانہ اور زرین کے رویے میں بھی!

جلیس الحسن کے ایما پر ان دونوں کو اس معاملے سے پہلے اعجاز اور تمکین نے آگاہ کیا تھا مگر کچھ اس طرح جیسے اُن کے لیے نئی ماں گھر لانے کا فیصلہ کر کے اُن کا باپ اُن کے ساتھ کوئی بہت بڑی زیادتی کرنے کا مرتکب ہونے جا رہا تھا!

پھر جب جلیس الحسن نے ایک رات فرزانہ اور زرین سے اس سلسلے میں بات کی تو زرین نے معصومانہ سنجیدگی سے بلا تردد کہہ دیا۔

"بابا! ہمیں ممی نہیں چاہیے۔"

"کیوں بیٹا؟"

"بس۔" زرین نے بڑی قطعیت کے ساتھ اپنا فیصلہ سنا دیا۔

اور اُس کی اس "بس" کے آگے جلیس الحسن خود کو بے بس محسوس کرنے لگے تھے۔

مگر اب اُن کے بے بس ہونے سے کوئی فرق نہ پڑ سکتا تھا۔

بات بہت آگے بڑھ چکی تھی۔

اتنی آگے کہ واپسی کی کوئی گنجائش ہی نہ تھی۔

وہ ایک شریف اور معزز گھرانے کی لڑکی سے عقدِ ثانی کرنے جا رہے تھے اور اس سلسلے میں مکمل تیاری کی جا چکی تھی۔

بچوں کے اس رویے کے پیشِ نظر انھوں نے انھیں تقریب سے دُور رکھنا ہی مناسب سمجھا۔

"بیٹا! آپ لوگ مائنڈ تو نہیں کریں گے اگر آپ کی نئی ممّا کو ہم خود ہی لے آئیں میرا مطلب ہے آپ لوگوں کو ساتھ لے جائے بغیر؟"

نکاح سے تین روز قبل انھوں نے کھانے کی میز پر بچوں سے پوچھا۔ اُن کے لہجے میں احتیاط اور خفت کی ملی جلی کیفیت تھی۔

اعجاز اور تمکین نے یک بیک کھانے سے ہاتھ روک لیا۔

پہلے انھوں نے چونک کر باپ کی جانب دیکھا پھر معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔
جلیس الحسن نے دزدیدہ نگاہوں سے اُن کے تاثرات کا جائزہ لیا۔ پھر دھیمے سروں میں بولے۔ "آپ لوگوں نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟"
"کیا کہتے ہو بھائی؟" نگین نے جو چاروں بہن بھائیوں میں سب سے بڑی تھی، نگاہوں ہی نگاہوں میں اعجاز کی رضا لینے کی کوشش کی۔
"مجبوری ہے۔" اعجاز نے شانے اُچکاتے ہوئے نظروں ہی نظروں میں بہن کو جواب دیا۔
"ٹھیک ہے پاپا!" نگین نے گھٹی گھٹی آواز میں جواب دیا۔
اُس کی آواز اور اُس کا لہجہ گواہ تھا کہ اُس نے جو کچھ کہا تھا بادلِ ناخواستہ۔
اُس کے لہجے کی یا دلِ ناخواستگی جلیس الحسن کے دل میں چبھ کر رہ گئی۔
"ٹھیک ہے بیٹا!" انھوں نے بچوں سے نگاہیں ملائے بنا کہا۔
وہ جنھیں وہ رگِ جاں کے آس پاس پایا کرتے تھے آج دوسرے کنارے پر کھڑے محسوس ہو رہے تھے!
زندگی کی سفاکی اور جعلسازی نے انھیں شدید ذہنی اذیت سے دوچار کر دیا تھا۔

شادی سے دو دن قبل
گھر کے بڑے ہال نما کمرے میں اُلفت کا اسبابِ جہیز آراستہ و پیراستہ بالکل تیار دھرا تھا۔
حسبِ دستور اُس کی نمائش بھی کی جا چکی تھی۔
نمائش کیا بس خاندان کے قریبی مدعوئین کو دکھایا گیا تھا۔
جس نے بھی جہیز دیکھا تعریف ہی کی۔
خیر سے وسائل تھے اس لیے اتنا دیا جا رہا تھا اور طرفہ تماشا یہ کہ جلیس الحسن کے منع کر دینے کے باوجود دیا جا رہا تھا۔
ورنہ ان گنت لڑکیاں اِس معاشرے میں صرف اسی لیے ماں باپ کی دہلیز پر بیٹھی بیٹھی بوڑھی ہو جاتی ہیں کہ مانگنے والے فقیروں کی طرح کاسے پھیلاتے ہیں یا پھر غنڈہ ٹیکس سمجھ کر طلب کرتے ہیں اور جن سے طلب کیا جاتا ہے وہ اپنی بے بسی پر آنسو بہاتے، سسکیاں بھرتے رہ جاتے ہیں!
خاندانی دستور کے مطابق الفت کا جہیز ایک روز پہلے اُس کے نئے گھر پہنچ جانا چاہیے تھا۔ امی کو اس سلسلے میں سب سے زیادہ فکر تھی۔ وہ چاہتی تھیں کہ ایک ایک چیز بحفاظت الفت کی سسرال پہنچ جائے تاکہ تائی اماں جو اسبابِ جہیز کی نگرانی پر مامور بیٹھی تھیں، فراغت پائیں۔
امی نے تو چاہا کہ ابا جلیس الحسن سے فون پر رابطہ قائم کر کے کہیں کہ آئیں اور اپنی امانت اٹھوا لے جائیں۔ مگر پھر رائے یہ ٹھہری کہ فون پر اس قسم کا پیغام دینا مناسب نہیں رہے گا بلکہ یا تو جلیس الحسن کو بلا لیا جاتا یا اُن کے دولت کدے پر جا کر انھیں یہ پیغام پہنچایا جاتا۔
چنانچہ اس امر کی تصدیق کے بعد کہ جلیس الحسن گھر ہی پر تھے، ایک باضابطہ وفد جو بھتیجا، بھابی جان اور عظمت آپا پر مشتمل تھا اُن کے گھر جا پہنچا۔
جلیس الحسن سے بات ہوئی تو انھوں نے کہا۔ "میں نے تو آپ لوگوں سے کہہ دیا تھا کہ مجھے بفضلِ خدا کسی چیز کی ضرورت نہیں۔"
"آپ کو تو ضرورت نہیں مگر یہ دستور ہے۔" بھابی نے کہا۔
جلیس الحسن زیرِ لب مسکرا دیے
"اچھی بات ہے اگر آپ لوگ ضروری سمجھتے ہیں تو اسبابِ جہیز الفت کے یہاں آ جانے کے بعد بھجوانے کی زحمت کیجیے گا!"
"الفت کے یہاں آنے کے بعد!" بھابی نے خاصے تعجب سے کہا اور معنی خیز نگاہوں سے میاں اور نند کو دیکھنے لگیں۔
"جلیس بھائی! دستور کے مطابق تو جہیز لڑکی کے سسرال پہنچنے سے پہلے یا پھر اُس کے ساتھ ہی سسرال پہنچایا جاتا ہے۔" عظمت آپا نے بڑے تدبر سے کہا۔
"بجا!" جلیس الحسن بولے۔ "مگر میری عرض بھی سن لیجیے۔ مسئلہ یہ ہے کہ غریب خانہ پہلے ہی اسباب سے بھرا پڑا ہے۔

آراستہ رکھنے کا جنون تھا عاصمہ کو۔" کہنے کو تو جلیس الحسن یہ بات کہہ گئے مگر اگلے ہی لمحے انھیں اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ الفت کے گھر والوں کے سامنے عاصمہ کا نام غلطی سے بھی اُن کی زبان پر نہیں آنا چاہیے تھا۔
مگر اب تو آ چکا تھا۔
گویا تیر کمان سے نکل چکا تھا!
بھتیجا، بھابی اور عظمت آپا تینوں کے چہروں کے تاثرات دیدنی تھے۔
جلیس الحسن دزدیدہ نگاہوں سے اپنے ہونے والے سسرالی عزیزوں کے تاثرات کا جائزہ لیتے اور اپنی خجالت چھپاتے ہوئے گویا ہوئے۔ "مجھے کوئی عار نہیں اگر آپ لوگ پہلے بھجوانا چاہتے ہیں تو شوق سے بھجوا دیں مگر مجھے گھر کی آرائش کا کوئی تجربہ نہیں اور گھر میں کوئی اور ذمے دار فرد نہیں۔ گزشتہ برس بھر سے اس گھر کا انتظام ملازمین کے ہاتھوں میں ہے۔ اسباب آپ بھجوانے کو بھجوا تو دیں گے لیکن وہ یا تو برآمدے میں رکھا رہے گا یا پھر ملازم اُسے اپنی سمجھ سے اُلٹا سیدھا اِدھر اُدھر رکھ دیں گے چنانچہ میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ بہتر یہی ہے کہ آپ لوگ جو اسباب بھجوانا چاہتے ہیں اپنی ہمشیرہ کے یہاں آنے کے بعد بھجوائیں تاکہ وہ اس اسباب کے لیے جگہ نکال کر اپنی نگرانی میں اپنی مرضی کے موافق ترتیب سے رکھوا سکیں۔"
"بات تو صحیح ہے۔" عظمت آپا نے بھابی جان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"ہاں ہے تو صحیح بات۔" بھابی نے تائید کی۔
دونوں خواتین میں کھسر پھسر ہونے لگی۔
اس وقفے کو غنیمت جانتے ہوئے جلیس الحسن نے پوچھا۔ "آپ لوگ کیا پینا پسند کریں گے؟"
"ہرگز کچھ نہیں۔" بھتیجا بولے
بھابی اور عظمت آپا نے بھی سرگوشیاں روک کر اُن کی تائید کی۔
"یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے۔" جلیس الحسن نے ڈرائنگ روم سے باہر جانے کو پر تولے اور کہا۔ "اگر آپ لوگ میری مشکل آسان کر دیں تو اچھا ہے ورنہ مجھے گرم اور ٹھنڈے دونوں مشروبات لے آنے کی ہدایت کرنی پڑے گی۔"
بھتیجے نے بھابی کو اور بھابی نے عظمت آپا کو دیکھا اور تینوں دھیرے سے مسکرا دیے۔
"اچھا تو چائے پلوا دیجیے کیونکہ ہم سب پکے کراچوی ہیں۔" بھابی بولیں۔
"بہت عمدہ۔" جلیس الحسن بے ساختہ ہنس دیے اور دروازے کی سمت مڑ گئے۔
"بہت خوب بھابی! آپ نے کراچی سے کراچوی اچھی ترکیب بنائی۔" عظمت آپا جلیس الحسن کے کمرے سے نکل جانے کے بعد بولی۔
پھر بھابی وقت ضائع کیے بنا اور جلیس الحسن کی عدم موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بولیں۔ "جلیس صاحب بات بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ ویسے بھی جہیز میں بھاری سامان کے علاوہ چھوٹا موٹا بے شمار سامان ہے۔ کپڑے ہیں، زیورات ہیں۔ نئے جہیز کے ساتھ سب کچھ ہی بھجوا دیا جائے گا۔ خدانخواستہ ملازموں نے کوئی چیز اِدھر اُدھر کر دی تو! کیوں عظمت تمہارا کیا خیال ہے؟"
"بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔ کسی کی نیت کا کچھ اعتبار نہیں خصوصاً ملازموں کی نیت کا۔"
چند ثانیے خاموشی ٹھہری رہی۔
پھر بھتیجا نے پوچھا۔ "ہاں تو کیا بات ٹھہری؟"
"بھئی امی اور ابا کو بتائے دیتے ہیں ہم لوگ گھر چل کر یہ ساری صورتِ حال پھر جو اُن کی مرضی۔"
"ویسے بھابی جان! بہتر یہی ہے کہ جہیز الفت کے یہاں آنے کے بعد بھجوایا جائے۔۔۔۔۔ بس یہ ہے کہ تب تک اپنے ہاں ذرا احتیاط رکھنی پڑے گی اور جہیز کے سامان کی نگرانی کرنی ہو گی کیونکہ وہ بھی شادی کا گھر ہے اللہ بری گھڑی سے بچائے۔" عظمت آپا نے کہا۔
"وہ کوئی مسئلہ نہیں جس کمرے میں جہیز سجا ہے اُسے لاک کر دیں گے۔ اللہ اللہ خیر صلا۔" بھابی جان بولیں۔
"کیا مع تائی اماں کے؟" بھتیجا نے کہا۔
اور ان کی اس بات پر وہ دونوں ہنس دیں۔
"تائی اماں بھی خوب ہیں۔ کل جب سے جہیز آراستہ ہونا شروع ہوا نفعات سے جو اپنا پاندان سنبھال کر وہاں بیٹھی تھیں، تو رات ہی کو اٹھیں اور آج بھی صبح سے آ بیٹھی ہیں۔ یہی کہتیں جہیز جانے کے بعد اٹھوں گی۔"

"انھیں سمجھایا جاتا کہ ذرا علیحدہ ہو کر بیٹھیے گا اور یونہی جلتی رہیے گا کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کو بھی ٹرک میں لدوا دیا جائے۔"

"اللہ سے توبہ کیجیے کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ۔ آخر کو وہ بزرگ ہیں ہماری۔" بھائی جان نے انھیں ٹوکا۔

"بھئی ان سے ہمارا مذاق چلتا ہے۔ خاندان کی واحد بزرگ ہیں جو پچھتر سال کی عمر میں بھی بچوں میں بچی بن جاتی ہیں۔ واللہ کیا شگفتہ مزاج پایا ہے ہماری تائی اماں نے۔"

تب ہی جلیس الحسن پلٹ گئے اور دوبارہ اُن کے روبرو آ بیٹھے۔

"جلیس صاحب! آپ ہمیں اجازت دیتے تو اچھا تھا کیونکہ بے شمار کام پڑے ہیں نمٹانے کو۔" بھیا نعمان نے کہا۔

"میں جانتا ہوں مگر پانچ دس منٹ ہمارے نام اور سہی۔"

"بچے نظر نہیں آ رہے؟"

عظمت آپا کے اس سوال پر جلیس الحسن نے پہلو بدلا۔

"اوپر ہیں! اپنا ہوم ورک کرنے میں مصروف۔"

"ٹھیک ٹھاک ہیں؟"

"جی بالکل!"

جلیس الحسن کے لہجے سے عیاں تھا کہ وہ اس وقت بچوں کے بارے میں زیادہ بات نہ کرنا چاہتے تھے۔ عظمت آپا اُن کی یہ کیفیت تاڑتے ہوئے چپ ہو رہیں۔

ذرا دیر بعد ملازم لوازماتِ خورد و نوش سے لدی پھندی ٹرالی دھکیلتا کمرے میں داخل ہوا۔ پھر مؤدبانہ گھر آئے اہم مہمانوں کی خاطر تواضع کرنے لگا۔

چائے کے بعد جب وہ لوگ جانے کو اٹھے تو جلیس الحسن انھیں رخصت کرنے کوٹھی کے وسیع احاطے میں کھڑی اُن کی ٹویوٹا تک گئے۔

جب وہ اپنی ہونے والی شریکِ حیات کے بھائی، بھاوج اور بہن کو گرمجوشی سے رخصت کر رہے تھے تو کوٹھی کی بالائی منزل پر واقع نگین کے کمرے کی کھڑکی پر پڑے پردوں کی آڑ سے اُن کے چاروں بچے اُن کی نگاہوں سے اوجھل اُن پر اور رخصت ہوتے مہمانوں پر اپنی غصیلی نگاہیں جمائے کھڑے تھے۔

"راسکل!" اعجاز نے اپنی ہونے والی ماں کے بھائی کو شدید نفرت سے دیکھتے ہوئے زیرِ لب کہا۔

"ہنچ!" انگریزی اسکول میں زیرِ تعلیم نگین نے کسی بات پر کھلکھلا کر ہنس پڑنے والی عظمت آپا کو بہت دور سے گھورتے ہوئے دانت پیسے۔

فراز کو باپ کا مسکرانا سخت بُرا لگ رہا تھا۔

زرّین چپ تھی۔

جب گاڑی فراٹے بھرتی کوٹھی کے احاطے سے نکل گئی اور جلیس الحسن پلٹ گئے تو وہ چاروں بھی کھڑکی کے پاس سے ہٹ گئے۔

اعجاز نے اپنے دائیں ہاتھ کا مکا بنا کر بائیں ہتھیلی پر پوری شدت سے مارتے ہوئے سر جھٹکا کر کہا "پتا نہیں! پاپا کو کیا ہو گیا ہے؟"

پھر اُس نے کمرے میں بچھے قالین پر پڑی فراز کی گیند کو پوری قوت سے کک لگائی اور سخت ہیجان کے عالم میں جوتوں سمیت بستر پر ڈھیر ہو گیا۔

"ہی..... ہی..... ہی.....!" نگین نے اپنی ہونے والی ماں کی بڑی بہن کی ہنسی کی نقل اتارنے کی کوشش کی پھر اظہارِ نفرت میں اُس کے چہرے کے دلفریب نقوش بری طرح بگڑ گئے اور وہ بپھری ہوئی بستر پر ڈھیر بھائی کے قریب آ بیٹھی۔

"ہشت!" فراز نے ناک چڑھا کر پردوں سے ڈھکی کھڑکی کی جانب رُخ کرتے ہوئے کہا۔

چند لمحے دبے پاؤں گزر گئے۔

پھر اعجاز اٹھا اور دونوں ہاتھوں کے مکّے بنا کر پوری قوت سے ایک دوسرے سے ٹکراتا کمرے میں گھومنے لگا۔

کمرے کی مشرقی دیوار کے نزدیک پہنچ کر وہ تھم گیا اور اُس نے دیوار پر تابڑ توڑ مکّے برسانا شروع کر دیے۔ اس پر ایسی دیوانگی طاری تھی کہ وہ اس تکلیف کی بھی پروا نہ کر رہا تھا جو اُسے گوشت پوست کے جاندار ہاتھ سے سخت اور بے جان سی دیوار کو مارنے پر ہو رہی تھی۔

فراز نے اپنا دایاں پاؤں زمین سے ذرا اوپر اٹھایا، ٹانگ کو پوری قوت سے جھٹکا اور پاؤں میں پہنی چپل دروازے کی سمت اچھال دی۔ پھر وہ نگین کے پاس آ بیٹھا اور اُس نے زور زور سے دونوں ٹانگیں ہلانا شروع کر دیں۔

نگین اٹھی اور اُس نے اسٹیریو اونچی آواز میں آن کر دیا۔

زرّین سہمی ہوئی یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔

"فار گاڈز سیک!" اعجاز اپنے دونوں کانوں پر ہاتھ رکھ کر دہاڑا۔ "بند کرو اسے!"

"نہیں بند کرتی۔" نگین نے گردن موڑ کر اُس کی طرف دیکھا۔

"کیوں نہیں کرو گی بند؟"

"بس میری مرضی!"

اعجاز اُس کے روبرو آ کھڑا ہوا۔

"نہیں کرو گی بند؟" اُس نے بہن کو گھورتے ہوئے کہا۔

"نہیں!" وہ بڑی قطعیت کے ساتھ بولی۔

"بند کر دو ورنہ!" اعجاز نے مٹھیاں جکڑ لیں۔

"ورنہ کیا کرو گے؟" نگین سینہ تان کر اُس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

"ورنہ....." اعجاز نے دانت پیسے۔

"ہاں..... ہاں بولو نا کیا کرو گے تم!"

"آئی ول کِل یو!" اعجاز نے آنکھیں نکالیں۔

زرّین سہم کر ایک کونے میں دبک گئی۔

فراز بھی قدرے خوفزدہ نظر آنے لگا۔

"اونہہ!" نگین سر جھٹک کر بولی۔ "مجھے مارنے سے کیا فائدہ! مارنا چاہتے ہو تو انھیں مارو۔" اُس نے معنی خیز انداز میں اپنے گردن کے جھٹکے اور نگاہوں سے کھڑکی کی جانب اشارہ کیا۔

"انھیں تو ایسا ماروں گا کہ وہ بھی یاد رکھیں گے۔" اعجاز کے تیور جارحانہ تھے۔ "اب اسے بند کرو۔" اُس نے تنبیہی نگاہوں سے نگین کو گھورا۔

"میں میوزک سننا چاہتی ہوں۔" نگین نے اپنے خوبصورت ریشمی بالوں کو جھٹکا۔

"لیکن میں سننا نہیں چاہتا۔"

"تو جاؤ اپنے کمرے میں۔ یہ میرا کمرا ہے۔"

"پھر میرے کمرے میں بھی مت آنا کبھی!"

"آؤں گی۔ آؤں گی۔ آؤں گی سو دفعہ آؤں گی۔"

"میں تمہارا سر توڑ دوں گا!"

"اُن کا جا کر توڑو۔" نگین نے پھر معنی خیز انداز میں کھڑکی کی سمت اشارہ کیا۔

"فکر مت کرو اُن کے سر کے تو ٹکڑے کر دوں گا۔" یہ کہتا ہوا وہ آگے بڑھا اور اُس نے بٹن دبا کر اسٹیریو بند کر دیا۔

نگین لپک کر آگے بڑھی۔ اُس نے اسٹیریو دوبارہ آن کرنا چاہا۔ مگر اعجاز نے بجلی کی سی سرعت سے اُس کی کلائی اپنے ہاتھ میں دبوچ لی۔ اور اگلے ہی لمحے وہ غراتے ہوئے ایک دوسرے کے مقابل کھڑے تھے۔

"آئی ول کِل یو!" اعجاز دہاڑا۔

زرّین سہم کر رونے لگی۔

ان دونوں نے چونک کر زرّین کی جانب دیکھا جو نگین کی ڈریسنگ ٹیبل کی آڑ میں دبکی رو رہی تھی۔

"اسٹوپڈ! چھوٹی رو رہی ہے۔" نگین نے اعجاز کو گھورا۔

اعجاز نے [illegible] انداز میں نگین کا ہاتھ چھوڑ دیا اور دونوں ایک ساتھ زرّین کی طرف لپکے۔

نگین نے اُسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔

"چھوٹی! ہم تو مذاق کر رہے تھے۔" اعجاز زرّین کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

"جی نہیں آپ لڑ رہے تھے۔" زرین بلبلا کر بولی۔
"نہیں چھوٹی ہم واقعی مذاق کر رہے تھے۔" نگین نے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا
"نہیں چھوٹی بی باجی اور جاجی بھائی جھوٹ بولتے ہیں' یہ لڑ رہے تھے۔" فراز نے بی جمالو کا کردار ادا کرنے کی کوشش کی۔
"ہاں آپ دونوں لڑ رہے تھے۔" زرین کے چہرے کے خطوط سنورتے سنورتے پھر بگڑنے لگے۔
"فراز جھوٹ بولتا ہے۔ ہم مذاق کر رہے تھے۔ دیکھو ہماری تو دوستی ہے۔" نگین نے اپنا ہاتھ اعجاز کی جانب بڑھایا۔
اور اعجاز نے بہن کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔
"رئیلی!" زرین کے لبوں پر بھیگی بھیگی مسکراہٹ پھیل گئی۔
"ہاں۔"

زرین مسکرا دی۔

اور اس مسکراہٹ کا عکس نگین' اعجاز اور فراز کے چہروں پر بھی ہلکورے لینے لگا۔
"اچھا تو پھر اسٹیریو لگاؤ۔" زرین نے اعجاز کی طرف دیکھا۔
اعجاز آگے بڑھا اور اسٹیریو آن کر دیا۔
پھر وہ زرین کو خوش کرنے کے لیے انگریزی دھن پر تھرکنے لگا۔
ذرا دیر بعد ہی
فکرِ فردا سے بے نیاز وہ چاروں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے رقصاں تھے اور قہقہے لگا رہے تھے۔
کوٹھی کی زیریں منزل پر جلیس الحسن فکرِ فردا سے متوحش بیٹھے تھے۔
بالائی منزل پر انگریزی موسیقی کا شور انھیں یہ سوچنے پر مجبور کیے دے رہا تھا کہ کیا کل کے بعد بھی اس گھر میں ایسا ہی شور ایسے ہی قہقہے سنائی دے سکیں گے!
وہ اس امر سے بے نیاز تھے کہ یہ شور' یہ قہقہے تو اس سرد زور طوفانی لہر کی بازگشت تھے جو کچھ دیر پہلے ان کے بچوں کے قلب و روح کو تہ و بالا کرتی گزر گئی تھی۔

اگلے روز برات تھی۔
شام سات بجے پانچ کاروں پر مشتمل مختصر سی برات بختیار ہمدانی کے گھر سے روانہ ہوئی'
اور
رات کو ساڑھے بارہ بجے کے لگ بھگ جب ان پانچ گاڑیوں میں سے دو "حسن لاج" کے صدر دروازے پر پہنچیں تو دربان .... اپنے مالک اور نئی مالکن کے استقبال کو مستعد تھا۔ ہارن سنتے ہی اس نے دروازہ وا کر دیا اور ہیڈ لائٹس سے نظریں چرانے لگا۔
ان میں سے ایک گاڑی جلیس الحسن کی تھی جسے اس روز بختیار ہمدانی کے برادرِ خورد ڈرائیو کر رہے تھے۔ اگرچہ جلیس الحسن چاہتے تو اس روز ڈرائیور کو یہ خدمت سونپ سکتے تھے مگر انھوں نے تقریبِ نکاح سے نہ صرف اپنے بچوں بلکہ ملازمین کو بھی دور رکھا تھا مبادا وہ بعد میں چٹخارے دار داستان طرازیاں کریں۔
ڈرائیونگ سیٹ کے برابر دوسری نشست پر گلاب کے پھولوں سے ڈھکی جلیس الحسن کی کلاہ دھری تھی سہرا ان کے لیے کنوارے دولہاؤں کا سا جوڑا بھجوایا گیا تھا جسے وہ بختیار ہمدانی کے ہاں سے زیب تن کر کے سسرال پہنچے تھے۔
گاڑی کی عقبی نشست پر الفت درمیان میں بیٹھی تھی اور اس کے دائیں جانب جلیس الحسن اور بائیں جانب پھوپی زاد بھاوج شاکرہ بیٹھی تھیں جو ساتھ والی بن کر اس کے ہمراہ آئی تھیں۔
دوسری گاڑی میں بختیار ہمدانی' ان کی بیگم اور دو بچے تھے۔
کوٹھی کی بالائی منزل پر خلافِ معمول رات کے ساڑھے بارہ بجے بھی ٹی وی لاؤنج کی بتی جل رہی تھی۔
چاروں بچے جاگ رہے تھے۔
نیچے گاڑی کا ہارن بجنے اور آہنی صدر دروازہ کھلنے کی آواز سنتے ہی وہ چاروں لاؤنج کے سلائیڈنگ المونیم ڈور میں جڑے شفاف شیشوں کے پیچھے آ کھڑے ہوئے۔
کوٹھی کے احاطے میں گاڑی کے داخل ہوتے ہی جلیس الحسن کی نظر بے ساختہ بالائی منزل کی جانب اٹھی۔ اور وہ

خلافِ معمول اتنی رات گئے ٹی وی لاؤنج کی بتی جلتے اور شیشوں کے پیچھے چار شناسا سائے متحرک دیکھ کر ایک عجیب احساسِ جرم سے دوچار ہو گئے اور انھوں نے چپ چاپ ادھر سے نظریں چرالیں۔
زیریں منزل تو چکا چوند ہو ہی رہی تھی۔
ماما اور خانساماں نئی مالکن کے استقبال کو اندر سے باہر لپکے چلے آتے تھے۔
گاڑیوں کے رکتے ہی عقبی گاڑی سے بیگم ہمدانی اپنی بنارسی ساڑھی کا پلو سنبھالتی اتریں اور جلیس الحسن کی گاڑی تک پہنچنے کے بعد الفت کو سہارا دے کر گاڑی سے اتارنے میں جلیس الحسن اور شاکرہ بھابی کی معاونت کرنے لگیں۔
جلیس الحسن اور شاکرہ بھابی الفت کو سہارا دیے برآمدے کی سیڑھیوں تک پہنچے۔ بیگم ہمدانی نے اس کے شرعی غرارے کو جھک کر چٹکی سے پکڑتے ہوئے قدرے اوپر کر رکھا تھا۔
ہر قدم سہج سہج یوں اٹھایا جا رہا تھا جیسے پھولوں پر چل رہے ہوں!
برآمدے کی سیڑھیوں کے نزدیک پہنچ کر بیگم ہمدانی کے اشارے پر وہ سب تھم گئے۔
"جلیس بھائی ایک جگ ٹھنڈا پانی تو منگوا دیجئے گا۔" بیگم ہمدانی نے کہا۔
جلیس الحسن کے حکم پر ماما لپکی ہوئی اندر گئی اور ٹھنڈے پانی سے بھرا جگ لے آئی۔ بیگم ہمدانی نے دلہن کی راہ میں ٹھنڈے پانی کا چھڑکاؤ کیا۔ اسے سدا سکھی اور شاد رہنے اور پھلنے پھولنے کی دعائیں دیں۔
سہارا دے کر الفت کو اس کے نئے گھر کی دہلیز پر چڑھا دیا گیا تھا۔
کوٹھی کی بالائی منزل پر چاروں بچے جو ٹی وی لاؤنج سے نکل کر ٹیرس پر آ کھڑے ہوئے تھے ریلنگ کے سہارے جھکے انتہائی حیرانی سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔
ان کی آنکھیں نیند سے بوجھل تھیں۔
نگاہوں میں حیرانی تھی۔
اداسی تھی۔
اندیشے تھے!
الفت کو نفاست سے آراستہ جلیس الحسن کی خواب گاہ میں پہنچا دیا گیا تھا۔ شاکرہ بھابی اس کے پاس ہی تھیں۔
بیگم ہمدانی اور جلیس الحسن باہر چلے گئے تھے۔
بختیار ہمدانی نے بری میں لے جایا جانے والا سوٹ کیس اور وینٹی بکس اپنی گاڑی کی ڈگی سے نکلوا کر برآمدے میں رکھوا دیا تھا۔
الفت کا تمام جہیز یا سوا ملبوسات کے جہازی سائز سوٹ کیس اور زیورات کے ابھی میکے ہی میں تھا۔ مذکورہ سوٹ کیس جو مقفل تھا اور جلیس الحسن کی گاڑی کی ڈگی میں رکھا تھا۔ جلیس الحسن نے الفت کو اس کے کمرے میں پہنچانے کے بعد دوبارہ اپنی نگرانی میں خانساماں اور چوکیدار سے ڈگی سے اتروایا اور دونوں سوٹ کیس الفت کے کمرے میں پہنچا دینے کی ہدایت کی۔
بیگم ہمدانی نے دونوں سوٹ کیسوں کی چابیاں جلیس الحسن کے حوالے کیں۔ الفت کے کمرے میں پلٹیں۔ کچھ دیر اس کے پاس بیٹھیں پھر اجازت چاہی۔
بختیار ہمدانی' ان کے برادرِ خورد اور دونوں بچے ان کے منتظر تھے۔
زرتار سرخ دوپٹے کی اوٹ سے الفت نے اس کمرے کا جائزہ لیا جس میں وہ اس وقت بیٹھی تھی۔
خواب گاہ کی آرائش صاحبِ خانہ کے صاحبِ حیثیت ہونے کی غماز تھی۔ وہ جہازی سائز کی شاہانہ مسہری پر بیٹھی تھی۔
مگر
زرتار لڑیوں سے آراستہ حجلۂ عروسی تھا نہ گلاب کی نرم و ملائم مخملیں پنکھڑیوں سے سجی سیج۔
زرتار گھونگھٹ کی اوٹ سے دکھائی دینے والا ہر منظر اس سے مادی طمانیت کا وعدہ کر رہا تھا۔
جس گھر سے وہ اس گھر میں آئی تھی وہاں کے مقابلے میں یہاں بہت کچھ تھا لیکن اگر نہیں تو اطمینانِ قلب اور سچی خوشی کا احساس!
دفعتاً ایک خیال کوڑیالے سانپ کی طرح اس کے ذہن میں لہرایا۔

وہ اس گھر میں پہلی عورت نہ تھی۔
جس بستر پر بیٹھی تھی وہ کنوارا نہ تھا!

شاکرہ بھابی جن سے اس کی گھنٹوں نوک جھونک چلا کرتی تھی اس وقت اُس کے نزدیک بیٹھی اُسے لب کشائی پر آمادہ کرنے کے لیے مختلف حربے آزما رہی تھیں اور وہ مُہوں ہاں کے سوا کچھ نہ کہہ پا رہی تھی۔

مہمانوں کے رخصت ہو چکنے کے بعد جلیس الحسن کمرے میں آئے تو شاکرہ بھابی اُٹھنے کو پر تولنے لگیں۔

"آپ یقیناً تھک چکی ہیں۔" جلیس الحسن شاکرہ بھابی سے بولے۔

"ہاں بھیا مجھے تو آپ میرے بستر پر رہنے کی جگہ پہنچا دیجیے۔"

"آئیے میں آپ کو آپ کے کمرے تک پہنچا دوں۔"

شاکرہ بھابی نے الفت کے قریب جھک کر اُس کا گھونگھٹ تھوڑا سرکاتے ہوئے معنی خیز نگاہوں سے اُسے دیکھا، دھیرے سے مسکرائیں اور بولیں: "اچھا بھئی الفت شب بخیر!"

الفت کے قلب و روح پر ایک عجیب سی وحشت طاری ہونے لگی۔ اُس نے چپکے سے شاکرہ بھابی کا ہاتھ اپنے حنائی ہاتھوں میں دبوچ لیا۔ شاکرہ بھابی نے بہت دھیرے سے اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے چھڑایا اور اس کے سر کو بوسہ دینے اور اُس کا شانہ تھپتھپانے کے بعد جلیس الحسن کی معیت میں کمرے سے باہر چلی گئیں۔

الفت کا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔

نئی منزلوں کی دہلیز پر وہ سر تا پا ہراساں کھڑی تھی۔

شاکرہ بھابی کو گیسٹ روم تک پہنچانے اور ماما کو اُن کے آرام و سہولت کا پورا خیال رکھنے کی ہدایت دینے کے بعد جلیس الحسن نے اپنے کمرے کا رُخ کرنے کے بجائے بالائی منزل کو جانے والے زینے کا رُخ کیا۔

ٹی وی لاؤنج کی بتی اب بجھ چکی تھی تاہم نگین اور زرین کے مشترکہ کمرے کی بتی جل رہی تھی۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور دروازے پر پڑے پردے سرکے ہوئے تھے۔ چاروں بچے اسی کمرے میں تھے۔

خاموش
اُداس
اور دل گرفتہ!

جلیس الحسن کو ایک بے نام سے احساسِ خطا نے آلیا۔

جیسے اُن کی خاموشی، اُداسی اور دل گرفتگی کے ذمہ دار وہی ہوں۔

مگر نہیں

اُن کی خاموشی، اُداسی اور دل گرفتگی کی اصل ذمہ دار تو اس وقت سات سمندر پار اُن سے ہزاروں میل دُور بیٹھی تھی۔

کاش! اُس نے جانے سے پہلے سوچا ہوتا کہ وہ ایک ایسی خطا کی مرتکب ہو رہی تھی جس کی سزا اس کے جگر گوشے بھگتنے جا رہے تھے۔

نگین مسہری کے کنارے بیٹھی تھی۔

زرین بستر پر اس طرح اوندھی پڑی تھی کہ اُس کا سر نگین کے زانو پر تھا اور نگین کی انگلیاں اُس کے ریشمی بالوں میں دھیرے دھیرے حرکت کر رہی تھیں۔

اعجاز نیم دراز تکیے مسہری کے کنارے سے سر ٹکائے خاموشی سے چھت کو تک رہا تھا۔ اُس کا چہرہ کسی گہری سوچ کا غماز نظر آ رہا تھا۔

فراز کرسی پر بیٹھا معصومانہ بے بسی سے کبھی نگین کبھی اعجاز کو دیکھنے لگتا۔

اپنی اپنی دنیا میں وہ اس قدر گم تھے کہ انھیں کمرے کے دروازے پر باپ کے آ کھڑے ہونے کی خبر ہی نہ ہوئی۔

جلیس الحسن دروازے میں کچھ دیر کھڑے انھیں دیکھتے رہے پھر انھوں نے کھنکار کر اُن کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانے کی کوشش کی اور اپنے دل پر طاری احساسِ خطا کو خوش گوار مسکراہٹ کی ردا اوڑھاتے ہوئے آگے بڑھ آئے۔

نگین، اعجاز اور فراز نے چونک کر اُن کی جانب توجہ کی اور زرین اُٹھ بیٹھی۔

"کیا بات ہے بھئی آج ابھی تک جگائی ہو رہی ہے؟"

چاروں میں سے کوئی کچھ نہیں بولا۔

جلیس الحسن زرین کے پاس جا بیٹھے اور اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے: "کیوں بیٹے آپ سوئیں نہیں ابھی تک؟"

زرین نے دزدیدہ نگاہوں سے پہلے بڑی بہن اور دونوں بھائیوں کو دیکھا پھر مدھم سُروں میں بولی: "نیند نہیں آئی آپ نے سُلایا جو نہیں۔"

جلیس الحسن نے نگین، اعجاز اور فراز کے تاثرات کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔

خاموشی کی ایک سرمئی نقاب تو ان تینوں ہی کے چہروں پر پڑی تھی مگر اعجاز کا چہرہ سرد خاموشی کی آڑ میں غیر معمولی کیفیت کا مظہر نظر آتا تھا۔

جلیس الحسن کے لیے یہ اندازہ کرنا مشکل نہ تھا کہ اُن میں سے کوئی بھی اس وقت اُن سے بات کرنے یا اُن کی کسی بات کا جواب دینے کے موڈ میں نہ تھا۔

انھوں نے ہلکی سی کھنکار کے بعد کہا: "بھئی! وہ...... آپ کی نئی ماما آگئی ہیں۔ کیا آپ لوگ اُن سے ملنا پسند کریں گے؟"

اعجاز نے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے اور دھیرے سے رُخ بدل لیا۔

نگین انگلیاں چٹخانے لگی۔

فراز اور زرین بھی مضطرب سے نظر آنے لگے۔

جلیس الحسن نے اعجاز کی جانب پیش قدمی کی اور اُس کے سر پر بصد شفقت ہاتھ دھرتے ہوئے بولے: "جب آپ لوگ جاگ رہے ہیں تو مل ہی لیں اپنی نئی ماما سے۔"

"صبح...... مل...... لیں گے پاپا!" نگین نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"بیٹے جی جب آپ جاگ رہے ہیں تو ابھی کیوں نہیں؟"

"آں...... ہاں...... اچھا...... ٹھیک ہے۔" نگین اٹکتے ہوئے بولی۔

"گُڈ!" جلیس الحسن بیٹی کی سعادت مندی پر خوش ہو گئے۔

فراز اور زرین بھی کچھ زیادہ بیزاری کی کیفیت نہ دکھائی دے رہے تھے مگر اعجاز تیکھے سے اکھڑا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔

جلیس الحسن نے جھک کر اُس کے شانے پر ہاتھ دھر دیا اور بڑے ملائم لہجے میں بولے: "بیٹا جی! آپ کی کیا مرضی ہے؟"

"ٹھیک ہے۔" وہ اُن کی طرف دیکھے بنا سپاٹ لہجے میں بولا۔

"کیا ٹھیک ہے شاہزادے؟" جلیس الحسن نے اُس کا شانہ تھپتھپایا۔

"مل لیتے ہیں جی اُن سے۔" وہ نیم دلی سے بولا۔

"اُن سے کن سے؟" جلیس الحسن نے مسکرانے کی کوشش کی۔

اعجاز جزبز نظر آنے لگا۔

"بیٹے جی!" جلیس الحسن نے رسانیت سے کہا: "میں مانتا ہوں کہ وہ آپ کی سگی ماں نہیں مگر شاید آپ کی مما سے اس لحاظ سے بہتر ہیں کہ آپ کی مما اس گھر کو اور آپ سب کو چھوڑ کر آپ کی پروا کیے بغیر بہت دور چلی گئیں جبکہ آپ کی نئی ماما اپنا گھر، اپنے امی ابو اور بھائی بہنوں کو خدا حافظ کہہ کر آپ کا خیال رکھنے کے لیے اس گھر میں آئی ہیں۔ اب آپ لوگوں کو اُن کا خیال رکھنا ہوگا۔ اُن کی عزت کرنی ہوگی اور انھیں شکایت کا موقع کم سے کم دینا ہوگا۔ کیونکہ ہمیں اُن کی ضرورت ہے۔" انھوں نے توقف کیا پھر بولے: "آپ سمجھ رہے ہیں نا میری بات؟"

"جی پاپا!" اعجاز نے منمنا کر کہا۔

"ٹھیک ہے تو پھر اُٹھو اور چل کر اپنی نئی ماما سے ملو۔"

اعجاز بے دلی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

مسلسل کئی گھنٹے تک بیٹھے رہنے سے الفت کی کمر تختہ ہو چکی تھی۔

جلیس الحسن خاصی دیر کے بعد پلٹے۔

قدموں کی آہٹ سنتے ہی الفت کا دل بُری طرح دھڑکنے لگا۔

گھونگھٹ کی اوٹ سے اُلفت نے اس آہٹ کی سمت دیکھا اور اسے لمحہ بھر کو تو یوں لگا جیسے اُس کا دل دھڑکنا بھول گیا ہو جلیس الحسن تنہا واپس نہ آئے تھے بلکہ چار بچے بھی اُن کے ہمراہ تھے!

یقیناً یہ وہی بچے تھے جن کے باپ کے ساتھ رشتۂ مناکحت قائم ہو جانے کے بعد وہ اُن کی ماں بن کر اس گھر میں آئی تھی۔

اُس کے دل نے کہا

بہتر ہوتا کہ یہ بچے اس وقت تو نہ لائے گئے ہوتے۔

مگر جلیس الحسن نے انہیں جاگتے پاکر اسی وقت انھیں اُن کی ماں سے ملوا دینا مناسب جانا تھا۔

زندگی کی جن حقیقتوں کو نہ جھٹلایا جا سکے نہ اُن پر پردہ ڈالنا ممکن ہو اُن سے نظریں چرانے سے فائدہ!

ان بچوں کو جلیس الحسن اپنی زندگی کی سب سے بڑی حقیقت اور سچائی سمجھتے تھے۔

چاروں بچوں نے زرق برق عروسی جوڑے میں ملبوس آتشیں گٹھڑی کی صورت بیٹھی دلہن کو جو اُن کی ماں کے بستر پر متمکن تھی، وزدیدہ نگاہوں سے دیکھا پھر بے بسی سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ زرین نے خائف ہو کر بڑی بہن کا بازو دبوچتے ہوئے اپنا آدھا چہرہ اُس کے بازو کی آڑ میں چھپا لیا۔ اعجاز کا منہ بنا ہوا تھا اور فراز کی نگاہوں سے خوف اور ناگواری کی ملی جلی کیفیت مترشح تھی۔

"بھئی آپ لوگ رُک کیوں گئے؟ آگے بڑھیے اور اپنی ماں سے ملیے۔" جلیس الحسن کی آواز الفت کی سماعت سے ٹکرائی۔

اُسے یوں لگا جیسے پگھلا ہوا سیسہ اُس کے کانوں میں انڈیل دیا گیا ہو۔

ابھی سہاگ رات شروع بھی نہ ہوئی تھی۔

اور اُسے ماں بنا دیا گیا تھا۔

پھر وہ بچوں کو لیے آگے بڑھے انھیں ایک ایک کر کے الفت سے متعارف کرانے اور اُس کے دائیں بائیں بیٹھنے کے بعد خود بھی اس سے ذرا دور مسہری کے کنارے پر ٹک بیٹھے۔

الفت نے سانس روک لی۔

نگین، اعجاز اور فراز سر جھکائے خاموش بیٹھے تھے۔ زرین نے سہمی ہوئی نگاہوں سے فرار کی ذرا الفت کی جانب دیکھا پھر اُس کی خائف نظریں باپ پر آ رکیں۔

جلیس الحسن جو گہری نگاہوں سے بچوں کے تاثرات دیکھ رہے تھے زرین کو اپنی طرف دیکھتے پاکر بولے: "زری بیٹا! آپ یہاں آئیے ہمارے پاس۔"

زرین سہمی سہمی سی اپنی جگہ سے اٹھی اور اُن کے پاس جا پہنچی۔

جلیس الحسن نے اُس کا ہاتھ چوما اور اُسے اپنے نزدیک بٹھا کر بڑے پریم سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔

"بیٹا جی! اپنی ممی کو یہ تو بتائیے کہ آپ کس کلاس میں پڑھتی ہیں؟"

خدا جانے یہ باپ کی محبت بھرے لمس کا اثر تھا یا اُن کی قربت میں ملنے والے تحفظ کا احساس جس نے زرین کے لبوں پر لگی چپ کی مہر توڑ دی۔

"فورتھ میں۔" اُس نے کہا۔

"فراز میاں اب آپ بتائیں ماما کو کس کلاس میں ہیں؟"

فراز نے جواب دینے سے پہلے بڑے بھائی اور بہن کو دیکھا پھر دھیرے سے بولا۔ "سیونتھ میں۔"

"اور اب اعجاز میاں کی باری ہے۔"

"نائنتھ کلاس میں۔"

اعجاز کے لہجے کی کرختگی اور ناگواری نے الفت کو بے ساختہ چونک کر گھونگھٹ کی اوٹ سے اعجاز کی طرف نظر اٹھانے پر مجبور کر دیا۔

"نگی بیٹا؟" جلیس الحسن نے فقط اتنا ہی کہا مگر ان دو الفاظ نے بھی پورا سوال بیان کر دیا۔

"میٹرک میں پاپا۔"

نگین کے چہرے کے خطوط بگڑے ہوئے تھے۔

"جانی! پاپا کو معلوم ہے آپ ماما کو بتا رہی ہیں۔"

"جی..... ٹینتھ کلاس میں۔" نگین نے جھکی جھکی نگاہوں سے اپنی نئی ماما کے حنائی ہاتھوں پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالتے ہوئے قدرے ناگوار لہجے میں کہا۔

جلیس الحسن بچوں کے اُلفت سے پہلی ملاقات میں اس ناروا طرزِ عمل پر قدرے خفت محسوس کرتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"اچھا بھئی بہت دیر ہو چکی ہے۔ آپ لوگوں کو سونا بھی ہے۔ باقی باتیں کل۔" وہ زرین کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولے۔

نگین، اعجاز اور فراز تو گویا اٹھنے کے لیے بہانے کے منتظر تھے پلک جھپکتے اٹھے اور دروازے کا رُخ کیا۔

"ماما کو شب بخیر تو کہیے۔" جلیس الحسن نے کہا۔

اعجاز نے پلٹ کر دیکھا۔

نگین بھی تھم گئی۔

اور فراز بھی۔

اُن کے چہروں پر تذبذب تھا۔ حیرانی تھی اور دبا دبا سا احتجاج بھی۔

اُن کا باپ انھیں اُن کی سوتیلی ماں کے ساتھ بھی وہی معمول اختیار کرنے کی ترغیب دے رہا تھا جو وہ اپنی سگی ماں کے ساتھ روا رکھتے تھے!

"گڈ نائٹ!"

اُن میں سے ہر ایک نے کہا۔

مگر اُن کے لہجے میں اجنبیت اور سرد مہری تھی۔

"ایسے؟" جلیس الحسن نے تنبیہی نگاہوں سے انھیں ٹوکا۔

"تو پھر کیسے؟" اُن کی استفہامیہ نگاہوں نے باپ سے پوچھا۔

"جیسے آپ.....؟" جلیس الحسن کہتے کہتے رک گئے۔

مگر بچے اُن کی ادھوری بات کو پورے طور سمجھ گئے۔ اُن کے باپ نے انھیں تذبذب میں ڈال دیا تھا۔

جلیس الحسن نے نگاہوں ہی نگاہوں میں انھیں الفت کی جانب بڑھنے کا اشارہ کیا۔

نگین، فراز اور زرین باری باری الفت کی طرف بڑھے اور انھوں نے اُسے بے حد سرد مہری سے پیار کیا۔

مگر اعجاز نے ایسا نہیں کیا۔

الفت کو سانس لینا بھی دشوار معلوم ہونے لگا۔

پھر جلیس الحسن چاروں بچوں کے ہمراہ کمرے سے چلے گئے۔

اُن کی واپسی خاصی دیر بعد ہوئی۔

"آئی ایم سوری۔" انھوں نے الفت سے پہلے معذرت چاہی پھر [illegible] کہا۔ "زرین چاہتی ہے جب تک وہ سو نہ جائے میں اُس کے پاس ہی بیٹھا رہوں۔ دراصل وہ ماں کے بعد خود کو غیر محفوظ سمجھنے لگی ہے۔ شاید اسے میرا بھی اعتبار نہیں رہا ہے۔ میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبوچ کر سوتی ہے۔"

وہ اُس کے نزدیک بیٹھ گئے۔

اُس کا دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔

"الفت! ان چاروں بچوں کو آپ میری جانب سے اپنی سہاگ رات کا تحفہ سمجھ سکتی ہیں۔"

الفت کو یوں لگا جیسے کسی نے اُس کے دل پر پوری شدت سے گھونسا دے مارا ہو۔

سہاگ رات تھی

اور

اُس کا خدائے مجازی کوئی دلکش، دلفریب اور قیمتی جیز زیور یا [illegible] کے جلو میں اُس کی نذر کرنے کے بجائے چار بچے تحفے میں دے رہا تھا!

"الفت!" وہ دھیمی آواز میں گویا تھے۔ "یہ بچے مجھے اس وقت بھی عزیز تھے جب اُن کی ماں میرے ساتھ تھی مگر اس کے جانے کے بعد مجھے [illegible]

سرزد ہوں گی..... حالات نے انہیں اُبھار رکھا ہے۔ ان کے مسائل کو ماں کی نظر سے دیکھنے اور اُن کے دکھ سکھ کو اسی حیثیت سے بٹانے کی کوشش کیجیے گا اور جب اُن سے لغزشیں سرزد ہوں تو اُن کے لیے کوئی سزا تجویز کرنے سے قبل بحظہ بھر کو اتنا سوچ لیجیے گا کہ اگر ان بچوں نے آپ کے بطن سے جنم لیا ہوتا تو اُن کی غلطی یا لغزش پر آپ کا ردِ عمل کیا ہوتا؟ آپ ان بچوں کے معاملے میں مجھ سے تعاون کیجیے، میں آپ کے ہر معاملے میں آپ سے تعاون کروں گا۔"

پھر وہ اپنی جگہ سے اُٹھے۔ خواب گاہ میں ایستادہ بلند و بالا چوبی الماری تک گئے۔ الماری کھولی۔ اُس میں سے ایک سنہرا ڈبہ نکالا اور دوبارہ اُس کے نزدیک آ بیٹھے اور اُس کا دایاں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر تیسری اُنگلی میں موجود انگوٹھی کے آگے ایک اور ہیرے جڑی انگوٹھی پہناتے ہوئے بولے۔ "اگر وہ دانشور جس کا یہ مقولہ عالمگیر شہرت کا حامل ہے کہ مرد کے دل تک پہنچنے کا راستہ اُس کے معدے سے ہو کر گزرتا ہے، میری طرح کے حالات کا شکار رہا ہوتا تو یقیناً یہ کہتا کہ ایک بچوں والے مرد کے دل تک پہنچنے کا راستہ اُس کے بچوں کے دل سے ہو کر گزرتا ہے!"

اور چند لمحوں بعد

صندلیں ایئر فریشنر سے مہکتی خواب گاہ میں پھیلا دودھیا اُجیالا تیرگی کی لطیف و سحر انگیز باہوں میں سمٹ گیا۔

اگلی صبح جلیس الحسن نے بہت ہی آہستگی سے اُس کا شانہ ہلاتے ہوئے اُسے بیدار کرنے کی کوشش کی۔

"اُلفت! بچے ناشتے پر ہمارے منتظر ہوں گے۔"

غنیمت ہوا کہ ہفتہ وار تعطیل تھی۔

ورنہ شاید جلیس الحسن یہ بھی کہتے کہ

"انہیں اسکول بھیجنا ہے۔"

یا

"انہیں اسکول بھی پہنچانا ہے۔"

یا پھر یہ کہ

"انہیں اسکول بھی جانا ہے۔"

اُس کے دل پر دھچکا سا پڑا۔

گزشتہ رات نئی منزلوں کی دہلیز پر ہی چار بچوں کی ماں بن جانے کا صدمہ ابھی دھیما نہ پڑا کہ صبح آنکھ کھلنے سے پہلے ہی پھر بچوں کا ذکر!

وہ اُٹھ بیٹھی۔

محتاط اور مجوب سی!

جلیس الحسن نہا دھو کے نکھرے نکھرے سے تیار کھڑے تھے۔

وائل کا سفید براق کلف دار کرتا اور کھڑا پاجامہ۔

گریبان میں طلائی بٹن

کلائی پر دمکتی سنہری گھڑی۔

پیروں میں سلیم شاہی جوتے

اور نفاست سے آراستہ بال۔

اُن کے وجود سے اٹھتی کولون کی ہوش ربا مہک نے الفت کی مشامِ جاں کو معطر کر دیا۔

اُس نے ایک نظر انہیں دیکھا اور غرور کا احساس اُس کے دل میں سرسبز و جوانی کی طرح انگڑائیاں لینے لگا۔

"کل رات شادی میں جن اشاعت عمبر نے دیکھا ہوگا، دل تھام کے رہ گئی ہوں گی!" الفت نے جی ہی جی میں سوچا۔

"اور اگر اس وقت دیکھ لیں تو......!"

اُسے یاد تھا کہ جب اُس کی ساتھی رخشی کی شادی کے موقع پر شادی میں شریک اشاعت عمبر نے رخشی کے دولہا کو دیکھا تھا تو اُن کی صفوں میں یہاں سے وہاں تک رشک کا بصورتِ سیلاب اُمڈ آیا تھا اور اگلی صبح اسکول میں سلام دعا کے بجائے یہی پوچھا جا رہا تھا کہ رخشی کے دولہا کو دیکھا؟

مگر

جلیس الحسن

اُس کا اپنا شریکِ زندگی تو رخشی کے دولہا کو کوسوں پیچھے چھوڑ گیا تھا۔

رخشی کے دولہا کی فقط رنگت ہی تو سرخ و سپید تھی جس پر اشاعت عمبر فریفتہ تھیں۔

اُس کا شریکِ سفر تو مردانہ وجاہت کے سات سُروں میں ڈوبا نظر آتا تھا۔

دراز قامت

اپنی فٹنس کا بھرپور خیال رکھنے والے کسی اتھلیٹ کی طرح مستعد اور چاق و چوبند۔

چہرے پر تمازت اور تازگی۔

آنکھوں میں خمار

گھنی مونچھیں

اس مجمل ہئیت کو سنجیدگی اور متانت نے دو آتشہ کر دیا تھا۔

شاید وہ نوجوانی میں اتنے بھلے نہ لگا کرتے ہوں گے جتنے کہ اس درمیانی عمر میں لگ رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر کچھ ایسا تاثر ملتا تھا جیسے کسی لمبے اور لق و دق راستے کے بیچ وسط میں کوئی راہ رو چلتے چلتے یک بیک تھم گیا ہو کچھ دیر سستانے کی خاطر اور پلٹ کر پیچھے آنے والوں کو بصد غرور و ناز دیکھتے ہوئے کہتا ہو "دیکھو تم سے کتنا آگے نکل آیا ہوں......" اور پھر گردن موڑ کر پیشِ نظر دیکھتے ہوئے آگے نکل جانے والوں سے کہتا ہو "فکر مت کرو، میں پہنچا ہی چاہتا ہوں!"

ایر کنڈیشنر جو رات بھر چلتا رہا تھا ہنوز برسرِ کار تھا۔

صندلیں مہک بدستور کمرے کی یخ فضا میں ہلکورے لے رہی تھی۔

کمرے میں جلیس الحسن کی موجودگی الفت کو ایک عجیب سے سحر انگیز احساس سے ہم آغوش کیے دے رہی تھی۔

وہ اُٹھ بیٹھی تھی اور محجوب مگر متلاشی نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔

"کچھ مدد کر سکتا ہوں میں؟" جلیس الحسن اُس کی نگاہوں کا جائزہ لیتے ہوئے بولے۔

"وہ..... شاکرہ بھابی......"

"انہیں بلواؤں؟" انہوں نے بڑی رسانیت سے پوچھا۔

"جی!"

اُسے زیب تن کرنے کے لیے نیا جوڑا چاہیے تھا۔ گو بری اور جہیز کے ملبوسات پر مشتمل دونوں سوٹ کیس اسی کمرے میں رکھے تھے۔ جہیز والے سوٹ کیس کی چابی جسے وہ کی رنگ سے پہچان سکتی تھی۔ سائیڈ بورڈ پر ایک دوسری کی رنگ کے ساتھ جو یقیناً بری والے سوٹ کیس کی ایک جیسی دو چابیاں اپنے حلقے میں سمیٹے ہوئے تھی، پڑی تھی مگر حجاب کا تقاضا تھا کہ وہ نئی صبح کے لیے نیا جوڑا منتخب کرنے کے سلسلے میں شاکرہ بھابی کو زحمت دے۔

جلیس الحسن کے کمرے سے جانے کے بعد اُس کی طائرانہ نگاہیں کمرے کے طول و عرض میں بھٹکنے لگیں اور پہلو بہ پہلو ایستادہ تین مختلف آئینوں والی ڈریسنگ ٹیبل پر نظر پڑتے ہی اُس کا دل دھک سے رہ گیا۔

ڈریسنگ ٹیبل ان تمام لوازمات سے مزین تھی جو جدید دور کی ایک فیشن ایبل عورت اپنے حُسن کی آرائش کے لیے استعمال کیا کرتی ہے۔

یقیناً وہ لوازمات آرائشِ حُسن جلیس الحسن کی پہلی بیوی کے استعمال میں رہے تھے جو اگرچہ اُن کی زندگی سے نکل چکی تھی مگر اپنے نقوشِ پا چھوڑ گئی تھی!

اس ان دیکھی، انجانی عورت سے رقابت کا احساس تپش کی صورت الفت کے رگ و پے میں پاؤں پسارنے لگا۔

شاکرہ بھابی تنہا کمرے میں آئیں اور اُنہوں نے آتے ہی اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر شاکی لہجے میں کہا: "سچ کہتی ہوں الفی! رات بھر اس خیال نے مجھے بے کل رکھا کہ جب تمہارے دولہا نے رات کو چاروں بلائیں تمہارے سر پر لا کھڑی کی ہوں گی تو تمہارے دل پر کیا گزری ہوگی؟"

الفت کو یوں لگا جیسے گھاؤ ابھی ابھی لگا ہو۔
لیکن اگلے ہی لمحے وہ متعجب ہو کر شاکرہ بھابی کی جانب دیکھنے لگی۔
"آپ کو کس نے بتایا؟" اُس نے چونک کر پوچھا۔
"بتاتا کون......! میں نے خود دیکھا۔"
"مگر...... آپ...... آپ تو یہاں سے جا چکی تھیں!"
"بھئی جی! یہاں سے جا چکی تھی تو کیا ہوا۔ تھی تو اسی گھر میں۔"
"تو آپ نے...... دیکھا؟"
"ہاں بالکل دیکھا اور کمرے کی کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔"
"اس کمرے کی؟" وہ گھبرا کر چاروں اور دیکھنے لگی۔
"نہیں بھئی اُس کمرے کی جو مجھے سونے کے لیے دیا گیا۔"
اُلفت نے سکون کا سانس لیا۔
وہ تو اس خیال ہی سے وحشت زدہ ہو گئی تھی کہ کہیں کھڑکی سے شاکرہ بھابی رات بھر......!
"بی بی! میں تو یونہی ذرا کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی تھی دیکھا تو تمہارے دولھا چاروں بچوں کو سمیٹے زینے سے نیچے اُتر رہے تھے...... میرا دل تو جیسے کسی نے چھری تلے دبا دیا۔" شاکرہ بھابی نے توقف کیا پھر بولیں "یہ کیوں لے کر گئے تھے؟"
"ملوانے۔" اُس نے بوجھل آواز میں کہا۔
"تو بھلا یہ ایسے تھوڑی ہوا کرتا ہے...... بات نہ چیت...... سلام نہ دعا چار بچے لا کر کوری دلہن کے سر پر کھڑے کر دیے۔ صبح تک انتظار نہیں کر سکتے تھے کیا! ارے بھئی کہیں بھاگی تو نہیں جا رہی تھیں تم۔ اب تو صبر شکر کر کے اسی گھر میں رہنا ہے۔"
اُلفت پر اضطرابی کیفیت طاری ہونے لگی۔
"کچھ کہا رہے تھے؟"
"کچھ نہیں۔"
"بس رونمائی کو لائے تھے؟" شاکرہ بھابی کے لہجے سے ناگواری عیاں تھی۔
"جی۔"
"کس کی؟ اُن کی یا تمہاری؟"
اُلفت کے لبوں پر لرزش سی طاری ہونے لگی۔
شاکرہ بھابی اپنی تیوریوں پر پڑے بلوں میں مزید اضافہ کرتے ہوئے بولیں "اتی! یہ بتاؤ تمہارے دل پر کیا گزری؟"
"کیا گزرنی تھی بھابی!" اُس کے لہجے سے ملال اور دل شکستگی عیاں تھی۔
شاکرہ بھابی نے ایسی سرد اور لمبی سانس کھینچی جو اُسے اپنے دل کی گہرائیوں میں کھبتی محسوس ہوئی۔
"سارے خاندان والوں کو دکھ ہے اس بات کا۔" انھوں نے کہا۔
"کس بات کا؟" الفت نے استفہامیہ انداز میں شاکرہ بھابی کی جانب دیکھا۔
"تمہیں چار بچوں پر دیے جانے کا!"
الفت کو یوں لگا جیسے اُس کا دل ہمیشہ کے لیے دھڑکنا بند کر دے گا۔
اُسے اپنی سماعت بے کلام محسوس ہوئی۔
یہ بات شاکرہ بھابی کہہ رہی تھیں؛
شاکرہ بھابی، جنھوں نے ایک روز عظمت آپا کے ساتھ بیٹھ کر اُسے سمجھایا بجھایا تھا کہ،
چار بچوں کے باپ سے اُس کی شادی کوئی عجوبہ امر نہ ہوگی۔
ان گنت کنواری لڑکیاں بیاہی گئی ہیں مطلقہ اور رنڈووں کے ساتھ۔
اور ایسے مرد تو اپنی دوسری بیویوں کا بہت خیال رکھتے ہیں۔
بہت خوش رہتی ہیں وہ۔
اور ویسے بھی مر جانے یا چھوڑ کر چلی جانے والی ماؤں کے بچوں کے سر پہ ہاتھ رکھنا کارِ ثواب ہوا کرتا ہے۔

ماں چھوڑ کر چلی گئی تو بے چارے بچوں کا کیا قصور!
وہ تو پیار محبت کے بھوکے ہوں گے۔
ذرا سا پیار کرو گی اور محبت سے سر پہ ہاتھ دھرو گی تو تمہارے بن جائیں گے۔
اور
اب اس وقت!
وہی شاکرہ بھابی کہہ رہی تھیں کہ سارے خاندان والوں کو تمہیں چار بچوں پر دیے جانے کا رنج ہے!
کیسے یقین کر لیتی وہ اس بات کا؟
وہ تنہا تھی اور سارا خاندان اُس کے مقابل صف آرا تھا۔
اُس کا انکار تھا اور ان سب کا اصرار!
ان سب نے مل کر اُسے زہر سے پیش بھی کیا تھا اور آنکھیں بند کر کے پی جانے پر مجبور بھی۔ ان سب نے تو مل کر اُسے صلیب پر چڑھایا تھا اور پھر اُس کے بدن میں میخیں ٹھونکی تھیں۔ کیسے یقین کر لیتی وہ شاکرہ بھابی کی اس بات کا کہ خاندان والوں کو اُس کی بدقسمتی کا ملال تھا۔
وہ تو خوش ہوتے ہوں گے اس کا تابوت سجا کر!
لیکن
شاکرہ بھابی کی یہ بات سچ بھی تو ہو سکتی تھی۔
وہ خود بھی تو اسے زہر پیش کرنے اور صلیب پر چڑھا کر اُس کے بدن میں میخیں ٹھونک دینے والوں میں شامل رہی تھیں۔
اس وقت اگر وہ اس کے مقدر پر رنج و ملال کا اظہار کر رہی تھیں تو دوسرے بھی ایسا کر سکتے تھے۔
تو!
اس وقت ان سب نے اس کے گرد اپنا حصار اتنا تنگ کیوں کر دیا تھا کہ اُس کا دم گھٹنے لگا تھا کوئی راہ فرار نہ رہی تھی۔
اور اُس نے گردن ڈال دی تھی۔
"تو پھر اس وقت سب میری جان کو کیوں آ گئے تھے؟ آپ نے بھی تو اصرار کیا تھا!" الفت گھٹی گھٹی آواز میں بولی۔
"بھئی جب تمہارے اپنے گھر والے بخوشی راضی تھے تو اوروں کو مخالفت کرنے کا بھلا کیا اختیار تھا؟ کہ کعبت کا ثواب ملتا؟ یہ بات تو تمہارے گھر والوں کے سوچنے کی تھی...... اور...... وہ سب بخوشی تیار تھے۔ اسے کہتے ہیں دیکھتے بھالتے مکھی نگل جانا۔"
شاکرہ بھابی ٹھیک ہی کہہ رہی تھیں۔
جب ستمگر اپنے ہی ہوں تو پھر دوسروں سے گلہ شکوہ کیسا؟
چپکے سے اُس کی آنکھوں کے کنارے بھیگ گئے۔
شاکرہ بھابی نے چہار اطراف نظر دوڑائی پھر رشک آمیز لہجے میں بولیں "صبح اُٹھتے ہی میں نے اوپر نیچے سارے گھر کا چکر لگا لیا۔ ماشاء اللہ گھر بہت بڑا اور بہت اچھا ہے۔ راج کرو گی۔"
ہائیں!
یہ کیسی ڈپلومیسی تھی!
ابھی ذرا دیر پہلے تو شاکرہ بھابی اُس کی بدقسمتی کا نوحہ پڑھ رہی تھیں۔
اور اب کہہ رہی تھیں راج کرو گی!
اُن کی کس بات کا اعتبار کر لیتی وہ؟
"مگر دیکھو بھئی۔" شاکرہ بھابی دروازے پر نگاہیں جمائے اُس کے نزدیک سرک آئیں اور بہت رازداری سے بولیں۔
"بچوں کو ہرگز سر نہ چڑھانا ورنہ سر پکڑ کر روؤ گی۔ اوّل دن سے ہی سختی رکھنا۔ شیر کی نظر سے دیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے سوتیلی اولاد کو اور اس گمان میں ذرا بھی نہ رہنا کہ یہ کبھی تمہارے اپنے بنیں گے۔ اللہ بخشے ہماری بڑی خالہ کو دل نکال کر رکھ دیا انھوں نے اپنا سوتیلے بچوں کے سامنے مگر کہلائیں سوتیلی ماں ہی۔ خالو ابا کے مرنے کے بعد بڑی خالہ نے ساری جائیداد سوتیلے بچوں کے نام کر دی تھی...... اپنے حصے کی بھی...... کیونکہ اُن کے اپنے ہاں تو دو بچے ہوئے اور دونوں بچپن ہی میں مر گئے تھے مگر سوتیلی اولاد ایسی بدبخت

کر بڑی خالہ کا احسان ماننے کے بجائے کہہ دیا تمہارے باپ ہی کی تو تھی جائیداد۔ کون سا ہماری سوتیلی ماں اپنے گھر سے لائی تھیں.....

اور بھیتو برامت ماننا تم، تمہارے دولہا کے بچے تو مجھے بڑے ہی چھٹے ہوئے اور بدذات لگتے ہیں۔ تھوڑی دیر پہلے جب میں گھر کا نچلا حصہ دیکھ دیکھا اوپر والی منزل دیکھنے کے لیے اوپر پہنچی تو چاروں بدذات سر جوڑے ایک کمرے میں بیٹھے تھے۔ کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ میں نے اندر جھانکا تو بڑے والوں نے مجھے اس بری طرح گھورا کہ میں تو الٹے قدموں پلٹ آئی۔ اکٹھا تو تم انھیں بیٹھنے ہی مت دینا۔ جب بیٹھیں گے سازباز ہی کریں گے تمہارے خلاف۔"

شاکرہ بھابی کی باتوں نے اُس کو گھبراہٹ اور وحشت سے دوچار کر دیا۔

"وہ..... شاکرہ بھابی..... میرے لیے کپڑے نکال دیں گی آپ؟"

"ہاں ہاں کیوں نہیں..... اے لو دیکھو میں بھی کتنی پاگل ہوں، آتے ہی دوسری باتوں میں لگ گئی یہ تو پوچھا ہی نہیں تم سے کہ دولہا نے تمہارے رونمائی میں کیا دیا؟"

اُلفت نے سائیڈ ٹیبل پر ڈھیر زیورات میں سے ہیرے کی ایک خوبصورت انگوٹھی اٹھا کر چپ چاپ شاکرہ بھابی کے سامنے کر دی۔

شاکرہ بھابی نے انگوٹھی لی۔ اسے خوب اچھی طرح الٹ پلٹ کر دیکھا پھر پورے اطمینان کے بعد بولیں "ماشاءاللہ۔ اچھی ہے۔ اللہ برتنا نصیب کرے۔"

انگوٹھی میں جڑے ہیرے کی جگمگاہٹ بصورت رشک شاکرہ بھابی کی آنکھوں میں تیرتی دیکھی جا سکتی تھی۔

انگوٹھی اُسے لوٹانے کے بعد شاکرہ بھابی نے اُس سے جہیز کے ملبوسات والے سوٹ کیس کی چابیوں والی رنگ لی اور ذرا سی دیر میں اُس کے لیے وہ جوڑا نکال لائیں جس کی بابت عظمت آپا نے انھیں کل صبح جوڑے اس سوٹ کیس میں رکھتے ہوئے بتایا تھا کہ یہ اگلے دن کا جوڑا ہوگا۔

پھر انھوں نے الفت کو سہارا دے کر مسہری سے اُترنے میں اُس کی مدد کی اور اُسے ملحقہ باتھ روم تک پہنچانے کے بعد وہیں کمرے میں بیٹھ کر اُس کا انتظار کرنے لگیں۔

کچھ دیر بعد جلیس الحسن چند ثانیے کو کمرے میں آئے اور یہ دیکھ کر کہ الفت باتھ روم میں تھی اور شاکرہ بھابی اُس کی منتظر، پلٹ گئے۔

غسل خانے سے نکلنے کے بعد اُلفت ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آ بیٹھی اور شاکرہ بھابی اُس کے عقب میں کھڑی ہو کر اُس کے بال سلجھانے لگیں۔

اُلفت نے ڈریسنگ ٹیبل پر دھرے لوازمات آرائش حسن کو خائف سی نگاہوں سے دیکھا پھر اُس کی نظریں بیضوی آئینے پر جا ٹکیں۔ یکے بعد دیگرے تینوں آئینوں میں اُس نے اپنا عکس دیکھا اور اپنے اس خیال پر لرز کر رہ گئی کہ ان آئینوں میں اس سے پہلے بھی ایک عورت برسوں اپنا عکس دیکھتی رہی ہوگی۔

وہ اپنی سوچوں میں اتنی گم ہوئی کہ اُسے پتا بھی نہ چلا کب بھابی اُس کے بال چھوڑ کر اُس کے عقب سے ہٹیں اور اُس کی بری کا وینیٹی بکس اُٹھا لائیں۔

ڈریسنگ ٹیبل پر وینیٹی بکس اُس کے سامنے دھرتے ہوئے شاکرہ بھابی ڈریسنگ ٹیبل پر آراستہ لوازمات دیکھ کر چونک گئیں۔

"اے بنّے! لگتا ہے یہ سب کچھ تمہارے دولہا کی پہلی بیوی کا ہے۔ پہلی فرصت میں انھیں اٹھا کر پھنکوا دینا۔ ایک چیز بھی نہ رہنے دینا اس بدبخت کی اس گھر میں..... "شاکرہ بھابی جھکیں اور سرگوشی میں بولیں "مرد بڑے چالباز ہوتے ہیں۔ ہزار بہانوں سے جانے والی عورت کو یاد رکھنے کی کوشش کرتے ہیں..... ارے بھئی وہ تو ہی اُس کی یادیں ہی سہی..... کوئی چیز نہ رہنے دینا اس گھر میں۔"

الفت کے دل پر ایک عجیب سا ملال طاری ہو رہا تھا۔

اب کیونکر بتاتی وہ شاکرہ بھابی کو کہ اُسے تو اپنے روبرو ایستادہ تینوں آئینوں میں نظر آنے والا اپنا عکس بھی اُس عورت کا محسوس ہو رہا تھا جو اس گھر سے جا چکی تھی!

اور یہ کتنی حیرت کی بات تھی۔

ڈائننگ لاؤنج میں جلیس الحسن بچوں کو جو ناشتے کی میز پر آ چکے تھے سمجھا رہے تھے کہ جب ان کی نئی ماما ناشتے کی میز پر آئیں تو انھیں اسی طرح صبح بخیر کہا جائے جیسے وہ اپنی مام کو کہا کرتے تھے۔

تسکین

جب وہ شاکرہ بھابی کی معیت میں الفت کو ناشتے کی میز تک لاتے تو سوائے نگین کے اور کسی نے بھی گڈمارننگ نہیں کہا۔ اور نگین نے بھی سر جھکائے جھکائے سپاٹ لہجے میں کچھ اس طرح کہا جیسے دیواروں سے کہا ہو۔

اعجاز سر جھکائے بیٹھا رہا۔

فراز اور زرین ٹکر ٹکر دیکھا کیے۔

جلیس الحسن نے الفت کو کھانے کی میز کے گرد وہ مخصوص کرسی پیش کی جس پر کبھی عاصمہ بیگم بیٹھا کرتی تھیں۔

اعجاز اور نگین نے ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے باپ کے اس اقدام پر دبی دبی سی ناگواری کا اظہار کیا۔ فراز اور نگین بدستور خاموشی کی تصویر بنے رہے۔

شاکرہ بھابی نے خاصی گہری نگاہوں سے بچوں کی اس دبی دبی ناگواری کا نوٹس لیا اور الفت کے عین مقابل میز کے دوسری طرف پڑی کرسی پر پوزیشن سنبھال لی۔

ناشتہ کیا ہی جا رہا تھا کہ بھیا اور بھابی جان اُس کے لیے حسب دستور میکے کی جانب سے بھجوایا گیا پُرتکلف ناشتہ لیے آ پہنچے۔ امی نے یہ رسم بھی نباہی تھی۔

بھابی جان نے اُسے گلے سے لگایا تو وہ اُن کے شانے پر سر ٹکا کر بے اختیار رونے لگی۔ بھیا آگے بڑھ کر اس کا سر تھپتھپانے لگے۔

شاکرہ بھابی نے اپنی دانست میں بھابی جان سے نگاہوں ہی نگاہوں میں یہ کہنے کی کوشش کی، الفت کی آنکھوں سے بہنے والے ان آنسوؤں کا بنیادی سبب جلیس الحسن کے چار بچے تھے!

جلیس الحسن کا خیال تھا الفت سے بچوں کی بے تعلقی کی راہ تدریجاً ناشتے کی میز پر ہموار ہوگی اور کچھ ناشتے کے بعد۔ مگر ناشتے کی میز پر شاکرہ بھابی کی موجودگی اور پھر بھیا اور بھابی جان کی آمد اس ضمن میں حارج رہی۔

جلیس الحسن بھیا اور بھابی کی آمد سے جس قدر خوش ہوئے اسی قدر یہ جان کر ناخوش ہوئے کہ وہ حسب دستور الفت کو سسرال سے میکے لے جانے کے لیے آئے تھے۔ اُن کا پروگرام تو یہ تھا کہ ناشتے کے بعد وہ الفت اور بچوں کو اکٹھا لے کر بیٹھیں گے اور اُن کے مابین اجنبیت اور سرد مہری کی دیوار کو ڈھانے کی کوشش کریں گے۔

وہ جلد از جلد بچوں کو الفت کے نزدیک کر دینا چاہتے تھے مگر افسوس کہ اک رسم دیرینہ پہلے اپنی تسکین کا تقاضا کر رہی تھی۔

جلیس الحسن کی خوشنودی کی خاطر بھیا اور بھابی نے ناشتے کی میز پر موجود اُن کے چاروں بچوں سے بھی بظاہر خاصی گرمجوشی سے ہیلو ہائے کی۔ مگر اُن کے لہجے اور انداز سے عیاں تھا کہ وہ رسماً ایسا کر رہے تھے ورنہ ان بچوں سے انھیں قطعاً کوئی دلچسپی یا رغبت نہ تھی۔

دلچسپی یا رغبت تو ان بچوں کو بھی قطعاً نہ تھی بلکہ سچی بات تو یہ تھی کہ ان سب کو بالخصوص نگین اور اعجاز کو اپنے گھر میں ان لوگوں کی موجودگی انتہائی کھٹک رہی تھی اور اس کا واضح اظہار انھوں نے اُن کی ظاہری مگر پُرجوش ہیلو ہائے کے جواب میں بے رخی اور دبی دبی سی ناگواری کے ذریعے کر بھی دیا جس سے جلیس الحسن نے بجائے خود خفت محسوس کی۔

ناشتے کے بعد بچے خاموشی سے اٹھے اور اوپر چلے گئے۔ بھابی جان اور شاکرہ بھابی الفت کو میکے لے جانے کے لیے تیار کرنے کو اُس کے کمرے میں لے گئیں اور جلیس الحسن بھیا سے باتیں کرنے بیٹھ گئے۔

کچھ دیر بعد بھابی جان اور شاکرہ بھابی لاؤنج میں پلٹ آئیں اور بھابی جان نے جلیس الحسن سے کہا: "جلیس بھائی! الفت تیار ہیں اگر آپ اجازت دیں تو......؟"

"جی ضرور۔" جلیس الحسن اٹھ کھڑے ہوئے۔ "بس دو منٹ کی اجازت چاہوں گا آپ سے۔" انھوں نے بھیا کی جانب اجازت طلب نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

بھابی جان اور شاکرہ بھابی وہیں رکیں اور جلیس الحسن نے اپنے کمرے کا رخ کیا۔

الفت نئے سرے سے دلہن کے روپ میں سجی بیٹھی تھی۔ جلیس الحسن کمرے میں داخل ہوئے اور اپنے پیچھے دروازہ بند کرتے دیکھ کر اُس کا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔

اُس کا خیال تھا وہ اُس کے قریب آ کر اُس کے شانوں پر ہاتھ دھر دیں گے۔ پھر اُس کی ٹھوڑی تھام کر اُس کا چہرہ اونچا کر کے اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بڑی محبت سے کوئی رومان پرور اور طرب انگیز مکالمہ بولیں گے۔

مگر انھوں نے بڑے سپاٹ لہجے میں پوچھا" الفت! میں تمہیں لینے کے لیے کب آؤں بچوں؟"
الفت کو اُن کا" آپ" کے بجائے" تم" سے مخاطب کرنا اچھا لگا۔
" بھیا اور بھابی سے پوچھیے گا یہ تو" اُس نے نظریں جھکاتے ہوئے آہستگی سے جواب دیا۔
" دراصل میں تمہیں ذرا جلدی واپس لے آنا چاہتا ہوں" وہ بولے۔
الفت کے دل پر نجانے کیوں کی سی سرشاری طاری ہونے لگی۔
کیا اُن کے لہجے کی نرماہٹ اور بے تابی اُن کی چاہت کی غمازی تھی!
الفت کی نگاہوں میں غرور جھلکنے لگا اور چپکے سے اُس کے دل میں سرایت کر گیا۔
" بچوں کی چھٹی ہے میں چاہتا ہوں آج تمہارا زیادہ وقت انھی کے ساتھ گزرے تو اچھا ہے"
اُس کے دل پر طاری غرور و ناز کی جگہ یاسیت اور رقابت نے لے لی۔
پھر وہی بچے!
" اور ہاں کل ولیمے کے لیے بچوں کی تیاری بھی تو مکمل کرنی ہے۔ اس تقریب کے لیے میں نے ذہن ہی میں اُن کے لیے ملبوسات تو خرید لیے تھے مگر انھیں بتانا ضروری نہیں سمجھا کہ یہ ملبوسات کس لیے خریدے گئے ہیں۔ ہو سکتا ہے انھوں نے خود ہی اندازہ کر لیا ہو...... بہرحال تم آؤ گی تو پھر مل کر بیٹھیں گے اور دیکھیں گے کہ بچوں کے لیے کل کی تقریب کے واسطے کیا کچھ اور درکار ہے۔ وہ کیا...... بچیاں چوڑیاں بھی تو پہنتی ہیں نا...... آج تو بازار بند ہیں۔ کل ہی جا سکیں گے بازار...... بہرحال" وہ شانے جھٹک کر بولے" تم آؤ گی تو پھر بیٹھیں گے اور یہ معاملات طے کر دیں گے"
اور اُس کا رواں رواں تپنے لگا۔
لبوں کے گوشے کپکپانے لگے۔
ہیجان اور اضطراب کے عالم میں وہ اپنے ہاتھوں کی انگلیاں مروڑنے لگی۔
جلیس الحسن کی جہاندیدہ نظروں سے اُس کی کیفیت چھپی نہ رہ سکی۔ وہ اُس کی حالت کو بخوبی تاڑ گئے۔ اُس کے بے حد قریب بیٹھتے ہوئے انھوں نے اپنے دونوں ہاتھ اُس کے شانوں پر دھر دیئے۔ ایک گہری سانس لی اور بوجھل لہجے میں بولے" الفت! عاصمہ کے ساتھ اٹھارہ سالہ رفاقت کے نتیجے میں میں نے اگر اس عورت کی طرف سے کچھ پایا تو وہ محبت جو آج روز بالکل نئی اور بے کراں ثابت ہوئی یا پھر یہ چار بچے جنھیں میں اپنی اب تک کی زندگی کا حاصل سمجھتا ہوں...... تم ان بچوں کے معاملے میں مجھ سے تعاون کرو۔ میں ہر معاملے میں سر آنکھوں کے بل تمہارے آگے جھک جاؤں گا...... ان بچوں کو میں دنیا کی ہر دوسری چیز سے بڑھ کر چاہتا ہوں"
الفت نے اپنے تھرتھراتے ہوئے لبوں کو بُری طرح بھینچ لیا۔
" وہ لوگ تمہیں لے جانے کے لیے تمہارے منتظر بیٹھے ہیں"
الفت چپ چاپ اُٹھ کھڑی ہوئی۔
جلیس الحسن نے گہری نگاہوں سے اُس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا۔
" مجھے اجازت ہے؟" وہ بھیگی بھیگی آواز میں بولی۔
" الفت" جلیس الحسن کے ہاتھ دوبارہ اُس کے شانوں پر آ ٹکے" شاید یہ مرحلہ تمہارے لیے مشکل ضرور ہو۔ مگر مجھے یقین ہے کہ ناممکن ہرگز نہیں ہوگا"
پھر اُن کے ہاتھوں کا لمس رینگتے رینگتے اُس کے شانوں پر سے پشت پر اتر آیا۔ انھوں نے اپنی باہیں اُس کی کمر کے گرد حمائل کر دیں۔ آپ ہی آپ الفت کا سر اُن کے کولر سے تھلتے سینے سے لگا اور اس نے اُن کے گریبان سے اٹھتی سحر انگیز خوشبو کو اپنی سانسوں میں بساتے ہوئے ایک گھٹی گھٹی سی سرد آہ کے ساتھ انتہائی رنجور دلی سے سوچا۔
"کاش! میرے اور آپ کے درمیان کوئی دیوار نہ ہوتی"
جلیس الحسن کے چار بچے اُسے اپنے اور جلیس الحسن کے بیچ ایک سنگلاخ دیوار محسوس ہو رہے تھے۔
ان چار بچوں کا وجود اب ایسی اٹل حقیقت تھی جس کے نہ ہونے کی تمنا کر کے وہ اس حقیقت کو جھٹلا نہ سکتی تھی۔
" چلو وہ لوگ تمہارے منتظر ہوں گے" جلیس الحسن نے رسانیت سے کہا اور وہ اُن سے کچھ کہے سُنے بنا چُپ چاپ اُن کے ساتھ چل دی۔
بھیا، بھابی جان اور شاکرہ بھابی اُسے دیکھتے ہی اُٹھ کھڑے ہوئے۔
" جلیس صاحب! اب اجازت دیجیے، وہاں گھر میں سب لوگ بے چینی سے ہماری واپسی کے منتظر ہوں گے" بھیا نے کہا۔

" کچھ دیر تو اور بیٹھیے"
" نہیں...... بس اب چلیں گے۔ گھر مہمانوں سے بھرا پڑا ہے۔ کچھ لوگ رات کو ٹھہر گئے تھے۔ کچھ اب آنا شروع ہو گئے ہوں گے۔ آپ کو پتا ہے ہمارے ہاں شادی والے گھروں میں کیسا ہنگامہ مچا رہتا ہے"
بھابی جان اور شاکرہ بھابی نے الفت کو اپنے جلو میں لے لیا۔
" میں انھیں لینے کے لیے بارہ بجے تک آ جاؤں؟" جلیس الحسن نے بھیا یا بھابی جان کو بطور خاص مخاطب کیے بنا کہا۔
" اف...... اتنی جلدی!" بھابی جان نے چونکتے ہوئے کہا۔
" دس بج کر دس منٹ تو ہو ہی چکے ہیں" شاکرہ بھابی نے اپنی کلائی گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے کہا۔
" گھر پہنچتے پہنچتے ساڑھے دس سے زیادہ ہی ہو جائیں گے۔ بارہ بجے تو صرف ڈیڑھ گھنٹہ بچتا ہے" بھابی جان بولیں۔
" دراصل آج بچوں کی چھٹی کا دن ہے۔ دوست احباب تو آتے ہی رہیں گے۔ یہ گھر پر ہوں گی تو اچھا رہے گا"
الفت پر ہیجان سا طاری ہونے لگا۔
اُس کا جی چاہا کہ بلند آواز میں جلیس الحسن کا راز فاش کر دے۔ بھیا، بھابی اور شاکرہ بھابی سب کے سامنے بتا دے کہ آج چھٹی کے دن گھر پر اُس کی موجودگی کس باعث ضروری سمجھی جا رہی ہے۔
ان سب کو بتا دے کہ جس شخص سے اُس کا مقدر وابستہ کیا گیا تھا اُس کے نزدیک اُس کے چار بچے اُس کی اب تک کی زندگی کا حاصل تھے۔
انھیں بتا دے کہ کل رات اس گھر میں آنے کے بعد سے اب تک اُن کا محبوب ترین موضوعِ گفتگو اُن کے چار بچے ہی رہے تھے۔
بچے!
بچے!!
بچے!!!
اُس کے اعصاب چٹخنے لگے تھے۔
" جیسے آپ چاہیں جلیس صاحب کی مرضی" بھیا نے بھابی جان کی طرف دیکھتے ہوئے انھیں آنکھوں ہی آنکھوں میں تنبیہہ کی کہ اس مسئلے پر بحث کی نہ گنجائش تھی نہ ضرورت۔
الفت کے دل کی گہرائیوں میں احتجاج کی ایک سرکش لہر ابھری۔
" کیوں گزاروں میں شادی کے بعد اگلا ہی دن اُن کے بچوں کے ساتھ؟" اُس نے جی ہی جی میں سوچا۔ " کیا اس سے بہتر یہ نہ ہوگا کہ میں اپنے لوگوں میں رہوں...... امی، ابا اور بھائی بہنوں کے ساتھ!"
اُس کا جی چاہا کہہ دے کہ
" میں شام سے پہلے نہیں آؤں گی"
مگر حجاب مانع رہا۔
زبان نے ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔
احتجاج کی وہ سرکش لہر فصیلِ دل سے سر ٹکرا کر دل کی وسعتوں ہی میں گم ہو گئی۔
بھابی جان اور شاکرہ بھابی اُس کے دائیں بائیں اُسے سہارا دیے مائل بہ رخصت ہوئیں۔ بھیا اور جلیس الحسن بھی ساتھ ساتھ چل دیے۔
ابھی وہ برآمدے کی سیڑھیاں عبور کرنے ہی پائے تھے کہ کوٹھی کے صدر دروازے سے بختیار ہمدانی کی گاڑی احاطے میں داخل ہوتی نظر آئی۔
" لیجیے ہمارے عزیز از جان دوست اور کرم فرما تو آ گئے۔ بس آج مہمانوں کی آمد و رفت رہے گی" جلیس الحسن نے کہا۔
" قسمت بھی بے ایمانوں کا ساتھ دیتی ہے۔ ذرا دیر پہلے انھوں نے جو غلط بیانی کی تھی اُس پر مہرِ تصدیق ثبت کرنے کو اُن کے کوئی چاہنے والے بھی آ پہنچے" الفت نے جو سر جھکائے برآمدے کی سیڑھیوں سے اُتر رہی تھی، جبڑے بھینچتے ہوئے غصے سے سوچا۔
جلیس الحسن اپنے دوست اور اُن کی بیگم کے استقبال کو آگے بڑھ لیے اور وہ سب برآمدے کی سیڑھیوں کے قریب ہی تھم گئے۔
بختیار ہمدانی سے گرمجوش معانقے اور بیگم ہمدانی سے سلام دعا کے بعد جلیس الحسن نے گھر آئے ان مہمانوں کے ہمراہ

برآمدے کی سمت پیش قدمی کی۔

بیگم ہمدانی نے بھیا، بھابی اور شاکرہ بھابی سے علیک سلیک کے بعد اُلفت کی جانب توجہ کی۔ اُس کی ٹھوڑی تھام کر دوستانہ پریم سے اُسے دیکھا پھر روئے سخن جلیس الحسن کی جانب کرتے ہوئے بولیں۔ "دیکھا جلیس بھائی کیسی دھنک اُتری ہوئی ہے آپ کے گھر میں۔ ہم نہ کہتے تھے آپ سے کہ آپ شادی کر کے تو دیکھیں، روٹھی ہوئی بہاریں پھر سے پلٹ آئیں گی!"

روٹھی ہوئی بہاریں!

بیگم ہمدانی کا بے حد اپنائیت سے کہا ہوا یہ فقرہ بھی الفت کو اپنے دل میں ترازو ہوتا محسوس ہوا۔

گویا کبھی بہار جلیس الحسن کی زندگی کا ایک معتبر حوالہ تھا!

ورنہ بیگم ہمدانی روٹھی بہاروں کی بات کیوں کرتیں

کتنے بہت سے لمحے

کتنی بہت سی باتیں

اُس کے دل میں ترازو ہوتے جا رہے تھے۔

ابھی تو محض ابتدا تھی۔

نہ جانے میزانِ دل میں کتنا بوجھ اور سوار ہونے جا رہا تھا۔

وہ پہلا قدم اٹھاتے ہی اس خیال سے ہراساں ہو چلی تھی کہ کیا وہ اس سارے بوجھ کو جو میزانِ دل میں چڑھ جانے کا منتظر تھا، سہار سکے گی؟

"اچھا آپ لوگ میکے لے جا رہے ہیں انھیں؟" بیگم ہمدانی نے مسکراتے ہوئے بھابی جان سے پوچھا۔

"جی ہاں! ہمارے ہاں دستور ہے......"

اس سے پہلے کہ بھابی جان پوری بات کہتیں، بیگم ہمدانی نے کہا "جی..... جی ہاں..... ہمارے ہاں بھی یہی دستور ہے بلکہ میرا خیال ہے ہمارے بیشتر گھرانوں میں یہی دستور ہے کہ شادی کی اگلی صبح دلہن میکے جایا کرتی ہے!"

"بیگم صاحبہ! اگر یہ دستور آپ کے علم میں تھا تو اس وقت بے موقع یہاں حارج ہونے کی کیا ضرورت تھی؟" بختیار صاحب بولے۔

"بھئی ہم تو کھڑے کھڑے ملنے کو آئے تھے۔ یہ کہیے کہ بروقت پہنچ گئے ورنہ اگر یہ جا چکی ہوتیں تو شاید افسوس ہوتا کہ بے موقع پہنچے!" بیگم ہمدانی نے کہا۔

"دیکھا صاحب آپ نے!" بختیار ہمدانی نے مسکراتے ہوئے پہلے بھیا کو دیکھا پھر جلیس الحسن کو اور بولے۔ "یہ ہے خواتین کا کمال کہ جھوٹ کو سچ، غلط کو صحیح اور بے موقع کو برموقع ثابت کر دیتی ہیں!"

"اچھا!" بیگم ہمدانی نے انھیں گھورا۔

بختیار ہمدانی کان کھجاتے ہوئے زیرِ لب مسکرانے لگے۔

"اچھا بھابی! آپ کو زیادہ دیر نہیں کھڑا رکھیں گے ہم!" بیگم ہمدانی نے الفت کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

بھابی!

کسی نے پہلی بار اُسے اس رشتے سے پکارا تھا اور اُسے بہت اچھا لگا تھا۔

یہ رشتے ناتے بھی عجب کڑیاں ہیں!

یہ ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر زنجیرِ حیات کو زیادہ قوی اور مستحکم بناتے چلے جاتے ہیں۔

اور

ان رشتے ناتوں کو معنی دینے والے الفاظ کا بھی عجب کمال ہے!

بے جان مگر پُرمعنی

نزاکتوں، لطافتوں اور حلاوتوں سے عبارت۔

جذبوں کی عجیب پُرسحر دنیا تیں اپنے اندر سمیٹے ہوئے!

"کچھ دیر کو بیٹھ جاتے ہیں!" بھیا نے اخلاقاً کہا۔

"نہیں..... نہیں آپ لوگ بسم اللہ کیجیے۔ ہم تو گھر کے لوگ ہیں پھر آ جائیں گے بلکہ آتے ہی رہیں گے!" بیگم ہمدانی بولیں۔

"اب ہم بھی گھر ہی کے لوگ ہیں آتے رہیں گے اور انشاء اللہ آپ سے ملنا ہوتا رہے گا!" بھابی جان نے برجستہ کہا۔

سب ہنس دیے۔

الفت کے دل پر چھائے رنج و ملال کے بادل تیرتے ہوئے خدا جانے کس سمت نکل گئے تھے۔

اُسے یہ مہکتی مسکراتی بے ابر دنیا بے حد بڑی دلکش لگ رہی تھی۔

جب وہ بھیا کی گاڑی میں بیٹھ رہی تھی تو اُس نے جلیس الحسن کو بھیا سے کہتے سُنا: "بارہ بجے پہنچ رہا ہوں میں!"

"اینی ٹائم!" بھیا بولے "کسی بھی وقت جلیس صاحب! اب تو آپ ہی کا گھر ہے!"

وہ گاڑی میں بیٹھ چکی تھی۔

بھابی جان اس کے دائیں جانب بیٹھی تھیں اور شاکرہ بھابی بائیں جانب۔ بھیا ڈرائیونگ سیٹ پر تھے۔ جلیس الحسن گاڑی کے قریب ہی انھیں رخصت کرنے کو موجود تھے۔ بختیار ہمدانی اور بیگم ہمدانی ان سے دو قدم پرے سراپا تکلف بنے کھڑے تھے۔

بھیا نے ریورس میں گاڑی لے کر دائیں جانب کو موڑی تو الفت کی جھکی ہوئی نگاہیں بے اختیار اٹھ گئیں۔

جلیس الحسن، بختیار صاحب اور ان کی بیگم مسکراتے ہوئے اور ہاتھ ہلا کر انھیں خدا حافظ کہہ رہے تھے۔

"میری اسٹاف ممبرز تو ان کی وجاہت دیکھ کر رشک سے مر گئی ہوں گی۔ آج تو فون پر فون کھڑک رہے ہوں گے!" الفت نے نازاں ہوتے ہوئے سوچا۔

دفعتاً

اُس کی نظر اوپر اٹھی اور وہ دم بخود رہ گئی!

کوٹھی کی بالائی منزل پر ٹیرس کی آہنی ریلنگ کے نزدیک جلیس الحسن کے چاروں بچے کھڑے ادھر ہی دیکھ رہے تھے۔

اُس نے آنکھیں موند لیں۔

یوں جیسے انھیں دیکھنا نہ چاہتی ہو۔

پھر جب اُس نے آنکھیں کھولیں تو شاکرہ بھابی کو ریئر اسکرین کے اُس پار دیکھتے پایا اور ان کی گردن گاڑی کے "حسن لاج" کے صدر دروازے سے باہر نکل جانے کے بعد ہی اپنے اصل مقام پر واپس پلٹی۔ انھوں نے ترحم آمیز نگاہوں سے الفت کو دیکھا اور اُس نے گھبرا کر نگاہیں چرا لیں۔

"توبہ توبہ!" شاکرہ بھابی نے کانوں کو ہاتھ لگاتے پھر اپنے گالوں کو تڑ تڑ پیٹ ڈالا۔

بھابی جان نے چونک کر ان کی جانب دیکھا۔

بھیا کی نظریں اپنے سامنے آویزاں آئینے پر جا ٹکیں۔

"اللہ توبہ...... بھئی یہ تم لوگوں نے بے چاری الفت کو کس جنجال میں پھنسا دیا؟"

"کیا مطلب؟ کیسا جنجال؟" بھابی جان نے تیوریوں پر بل ڈالتے ہوئے کہا۔

"بھئی یہ چار بچے کوئی کم بڑا جنجال تو نہیں ہوتے!" شاکرہ بھابی بولیں۔ "رات ایک کہانہ دو، دولہا صاحب نے چاروں کو لا کر الفت کے سینے پر کھڑے کر دیے۔ صبح ناشتے پر کھڑا ہو جو اور ابھی اس وقت آپ نے تو خیر توجہ نہیں کی میں نے دیکھا اور الفت نے بھی کہ چاروں شیطان اوپر کھڑے تاک رہے تھے..... مجھے تو شکلوں ہی سے نہایت بدذات بچے لگتے ہیں اور بگڑے ہوئے بھی......" انھوں نے لحظہ بھر کو خاموشی اختیار کی پھر بولیں۔ "ارے بھئی تم لوگوں نے خود بھی دیکھا ہوگا کہ ناشتے کی میز پر کیسے گھُنے سے بیٹھے تھے جیسے زبان کھولے بنا کہتے ہوں یہ گھر ہمارے باپ کا ہے اور...... تم نے نوٹ کیا ہوگا کہ جب تم لوگوں نے ان سے حال چال پوچھا تو کیسے منہ بنا کر جواب دیے...... ٹھیک ہیں۔ خدا الفت کو ہمت دے اور حوصلہ دے کہ یہ اس عذاب کو برداشت کر سکیں!"

"شاکرہ بھابی! ابھی تو پہلا دن ہے سب ٹھیک ہو جائے گا۔ بچے ہیں رفتہ رفتہ ہی مانوس ہوں گے الفت سے بھی اور ہم لوگوں سے بھی!" بھابی جان نے بڑے تدبّر سے کہا۔

"ارے چھوڑو...... ہاں اب اتنے چھوٹے بھی نہیں ہیں بچے۔ بڑی بیٹی خدا جھوٹ نہ بلوائے پندرہ سولہ سے تو کیا کم ہوگی۔ بڑا بیٹا بھی اچھا بڑا ہے۔ سب ہی سمجھ دار ہیں۔ دودھ پیتا تو ان میں سے کوئی بھی نہیں۔ سچ پوچھو تو بچے اگر چھوٹے ہوتے تو پھر کوئی بات نہ تھی، پیار سے یا مار سے قابو میں آ ہی جاتے مگر یہ جو بڑے ہوتے ہیں نا یہ خطرناک ہوتے ہیں۔ یہ تو نہ پیار کی سنتے ہیں نہ مار کی۔ پھر ماں بھی نہیں مرنے دیتے اور پھر ماں مر گئی ہوتی تو بھی کچھ ڈھارس بندھ جاتی۔ وہ تو زندہ ہے۔ اس کا خیال تو بچوں کے دل سے جا ہی نہیں سکتا!"

بھابی جان نے دزدیدہ نظروں سے الفت کی طرف دیکھا پھر دھیمے لہجے میں قدرے ناگواری سے بولیں "یہ کیسی باتیں کر رہی ہیں شاکرہ بھابی؟"

"میں تو بھی ٹی لیٹی کی قائل ہی نہیں حق بات کہہ رہی ہوں۔" شاکرہ بھابی کا انداز دو ٹوک تھا۔ "اور میں نے تو اسی لیے الفت کو سمجھا دیا ہے کہ اول دن سے ان پر سختی کرنا، حقیر کی نگاہ سے دیکھنا ورنہ پچھتاؤ گی!"

"شاکرہ بھابی! اگر آپ نے الفت کو یہ سمجھایا ہے تو بُرا کیا ہے۔" بھابی جان بولیں۔ "بیٹے تو پیار اور محبت کے بھوکے ہوتے ہیں، بلکہ سچ کہا جائے تو ہر انسان محبت اور پیار کا بھوکا ہوتا ہے۔ محبت سے تو آپ غیروں کو اپنا بنا سکتے ہیں، جبکہ ان بچوں سے الفت کا ایک واضح اور مستقل رشتہ قائم ہو چکا ہے۔ جبکہ الفت ہماری باشعور ہے۔ خدا نے چاہا تو بچے ان کے مطیع ہو جائیں گے!"

"ابھی یاں بہت ہو لیے نطیے۔ تم لوگ اس گمان میں بھی نہ رہنا بہیں۔ میں فقط ایک رات گزار کر جا رہی ہوں اس گھر میں مگر اچھی طرح دیکھ آئی ہوں کہ چاروں بچے بد ذات، بد تہذیب، خود سر اور بگڑے ہوئے ہیں۔ یہ میری پیش گوئی ہے کہ بچے الفت کے قابو میں ہرگز اور مار دھاڑ ہی سے آئیں گے!"

الفت کے قلب و روح پر بے کلی اور ہول کے سائے منڈلانے لگے۔

بھیا نے اپنے روبرو آویزاں آئینے میں دیکھا اور ناگواری سے بولے۔ "اوہو! شاکرہ بھابی آپ کہاں بیٹھی کوڑے کے چکر میں پڑ گئیں، یہ کچھ اچھی اچھی باتیں کیجیے۔"

"اچھی؟" شاکرہ بھابی طنزیہ انداز میں ہنسیں۔ "بھیا اچھی بات تو یہ ہے کہ گھر خیر سے بہت بڑا ہے، عیش و آرام کی ہر چیز گھر میں موجود ہے، کام کاج کرنے کو نوکر چاکر موجود ہیں۔ خوش حالی اور فراغت اس گھر میں اپنے منہ سے بولتی ہے۔ الفت بی کو ہل کر پانی پینے کی ضرورت پڑے نہ آٹا دال کے بھاؤ میں الجھنے کی۔ خیر سے ایک نہیں دو دو گاڑیاں کھڑی ہیں گھر میں۔ مگر الفت متعمل مند ہوں تو سب سے پہلے تو گھر اپنے نام پر کروائیں پھر ایک گاڑی اپنے نام پر کروائیں۔ پرائی اولاد نہ کل کسی کی اپنی بنی تھی نہ آئندہ بنے گی۔ صبح میں ساشنا رہی تھی الفت کو کہ خدا بخشے ہماری بڑی خالہ نے اپنا دل نکال کر رکھ دیا سوتیلی اولاد کے سامنے۔ اسے بھیا میاں یعنی ہمارے خالو کے بعد ترکے میں اپنے حصے سے سوتیلی اولاد کے حق میں دستبردار ہو گئیں۔ مگر ان بد بختوں نے احسان مان کر نہ دیا۔ جو سے ہمارے باوا ہی کا تو تھا۔ کون سا ہماری سوتیلی اماں جان اپنے باوا کے گھر سے لائی تھیں!"

"گویا شاکرہ بھابی آپ الفت کو صبح ہی خاصا ہوا چکی ہیں۔" بھابی جان نے الفت کا چہرہ تاکتے ہوئے بظاہر ہنس کر کہا۔

"ہولانے کی بات نہیں عقل کی راہ سجھائی ہے بلکہ اب تو یہ تم سب کا فرض بنتا ہے کہ سب مل کر......"

"الفت کو جلیس صاحب اور ان کے بچوں کے خلاف حسب توفیق ورغلاؤ۔" بھیا شاکرہ بھابی کی بات اچک کر بولے۔

بھابی قہقہہ لگا کر ہنس دیں۔

بھیا اپنے سامنے آئینے میں شاکرہ بھابی کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے مسکرانے لگے۔

کس قدر خوش ہیں بھیا اور بھابی جان جیسے میں واقعی کوئی بوجھ تھی کہ سر سے اُترا تو خوش ہوئے۔ اُن سے اچھی تو شاکرہ بھابی ہیں، میرے مستقبل کے لیے فکر مند تو ہو رہی ہیں۔ ہاں ٹھیک تو کہتی ہیں۔ پرائی اولاد نہ کل کسی کی اپنی بنی تھی نہ آئندہ بنے گی۔

اُسے رعنا جمیل کی بات یاد آنے لگی۔

انھوں نے کہا تھا

"دوسرے کے بچے اپنے کب بنتے ہیں؟ میں جانتی ہوں کہ اگر میں اپنا دل بھی نکال کر اُن کے سامنے رکھ دوں گی تو وہ میرے نہیں بنیں گے۔"

کس کی بات کا اعتبار کرنا دانشمندی تھی؟

اُن کی جو بہلا پھسلا رہے تھے۔ فسانہ طرازیوں اور زبانی جمع خرچ پر اکتفا کر رہے تھے؟

یا

اُن کی جو تجربہ رکھتے تھے اور تلخ حقائق اُس کے سامنے پیش کر رہے تھے!

حقیقت تو وہی تھی جو کڑوی تھی!

"اے لو! تمہارے میاں اسے ورغلانا کہہ رہے ہیں۔" شاکرہ بھابی باقاعدہ بُرا مناتے ہوئے بولیں۔ پھر انھوں نے ناک پر انگلی رکھ کر مخصوص زنانہ انداز میں کہا۔ "توبہ! میں کیوں ورغلانے لگی کسی کو...... بھلا کہ رکعت کا ثواب ملے گا مجھے الفت کو ورغلا کر۔"

"شاکرہ بھابی! بُرا مت منائیے۔ آپ تو اچھی طرح جانتی ہیں کہ ان کی مذاق کرنے کی عادت ہے۔ آپ کو یونہی چھیڑ رہے ہیں۔" بھابی جان نے شاکرہ بھابی کی خفگی تاڑتے ہوئے بات بنانے کی کوشش کی اور اس کے ساتھ ہی انھوں نے میاں کے سامنے آویزاں آئینے کی جانب دیکھتے ہوئے انھیں نگاہوں ہی نگاہوں میں منع کیا کہ اب اس سلسلے میں شاکرہ بھابی کی مزید کھنچائی کرنے سے گریز کریں۔

بھیا نے آئینے کے توسط سے شاکرہ بھابی کا اُترا ہوا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔ "شاکرہ بھابی! یہ ٹھیک کہتی ہیں میں واقعی مذاق کر رہا تھا...... بھئی اپنے رشتے کا فائدہ حاصل کرتے ہوئے آپ کو چھیڑ رہا تھا۔ آخر کو آپ میرے بڑے بھائی نا د بھائی کی نصف بہتر ہیں اور میرا اسی رشتے سے آپ کا پکا پکا دیور۔"

الفت کے لیے بھیا کے لہجے سے یہ اندازہ کرنا چنداں دشوار نہ تھا کہ وہ شاکرہ بھابی کو منانے کی کوشش کر رہے تھے ورنہ موقف تو اُن کا وہی تھا جو کچھ دیر پہلے اُن کی زبان سے ادا ہو چکا تھا۔

کچھ دیر ماحول پر خاموشی چھا گئی۔

اگلے چوک پر سگنل بند ملا۔

بھیا نے شاکرہ بھابی کی جانب دیکھا پھر سامنے دیکھتے ہوئے بولے۔ "ایک بات کہوں شاکرہ بھابی بشرطیکہ آپ پھر بُرا نہ منا جائیں۔"

"کہو۔"

"پہلے آپ مسکرا کر دکھائیے۔" بھیا نے آئینے میں شاکرہ بھابی کے عکس پر اپنی نگاہیں مرکوز کرتے ہوئے کہا۔

"اب زیادہ اترا و مت۔"

"بھابی!" بھیا نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔

"دکھانے لگے دیوراہٹ۔" شاکرہ بھابی بولیں۔

"بہت خوب!" بھیا ہنس دیے اور سگنل کھل جانے پر گاڑی کو ٹریفک کے ریلے میں آگے بڑھاتے ہوئے بولے۔ "آج سے پہلے بانک پن، ترایہٹ، جو دھراہٹ تو سنی تھی دیوراہٹ کی ترکیب آج...... آپ کے منہ سے پہلی بار سنی ہے...... واللہ آپ نے تو اہل زبان کی زباں دانی کے چھکے چھڑا کر رکھ دیے۔ کل ہی انجمن ترقی اردو سے رابطہ قائم کر کے آپ کا پتا دیتا ہوں انھیں۔"

الفت بھی دھیرے سے مسکرا دی۔

یوں جیسے برسات کی دوپہر کو گھرے بادلوں کے پیچھے سے سورج یک بیک اپنا چہرہ دکھا دے۔

"اچھا اب بول بھی چکو کہ کیا کہنے جا رہے تھے تم مجھ سے۔"

"وعدہ کیجیے کہ جو کچھ میں کہوں گا آپ سنے آپ اس کا بُرا ہرگز نہیں منائیں گی۔"

"کوئی ٹیڑھی بات کرو گے مجھ سے تو پھر بھلا میں سیدھی کیوں رہوں گی؟" شاکرہ بھابی نے کڑے تیوروں سے کہا۔

"نہیں، ایسی کوئی ٹیڑھی بات نہیں ہے۔"

"تو پھر بولو۔"

"دست بستہ عرض کر رہا ہوں مگر اس یقین کے ساتھ کہ آپ میری اپنی ہیں اور مجھے آپ سے یہ بات کہنے کا حق بھی ہے......"

انھوں نے توقف کیا۔ بھابی جان، شاکرہ بھابی اور الفت تینوں اُن کے لہجے کی گمبھیرتا پر ہمہ تن اُن کی جانب متوجہ ہو گئی تھیں۔

"دیکھیے آپ گھر پہنچنے کے بعد ہرگز کوئی ایسی بات نہ کیجیے گا جو اہل خانہ بالخصوص امی اور بابا جان کو مزید متفکر یا آزردہ کر دے کیونکہ وہ پہلے ہی خاصے رقیق القلب ہو رہے ہیں...... امی کے لیے یہ فیصلہ کچھ آسانی کے ساتھ نہیں کر دیا گیا، بہت غور و فکر سے انتہائی سوچ بچار ہوئی۔ کتنی راتیں ہم گھر والوں نے غور و خوض میں سفید کر دیں۔ یہ مت سمجھیے کہ میں آنکھ بند کر کے اس رشتے کے لیے ہاں کی گئی تھی بلکہ بہت سوچا گیا تھا۔ حالات کا بغور جائزہ لیا گیا تب یہ فیصلہ کیا گیا۔ یقین کیجیے جلیس صاحب کے مقابلے پر دوسرا کوئی ذرا سا بھی بہتر رشتہ ہوتا تو ہم اتنا بڑا بلکہ مشکل فیصلہ نہ کرتے۔ خاندان والوں کے سامنے تو یہ بات بہت بعد میں پیش کی گئی۔ پہلے ہم سب اہل خانہ نے ضرب جمع تقسیم میں سر کھپایا اور بالآخر یہی مناسب سمجھا کہ حالات کے پیش نظر یہی فیصلہ درست ہوگا۔ بہت سے اسباب تھے اور متعدد عوامل جنھوں نے ہمیں یہ فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیا...... میں اس وقت ان اسباب و عوامل کے بیان اور ان کی توضیح سے قاصر ہوں، چونکہ آپ ایسے کسی تجربے میں براہ راست شامل نہیں رہی ہیں اس لیے آپ مجبوریوں کا بہرحال اندازہ بھی نہیں کر سکتیں مگر حقیقت ہے کہ ہم نے یہ فیصلہ نعوذ باللہ یک بیک نہیں کر دیا، بہت سوچ سمجھ کر اور اپنی مجبوریوں اور دقتوں کے پیش نظر کیا ہے۔ امی اور بابا تو ہنوز الجھے ہوئے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی ایسی بات ہو جو اُن کو مزید متفکر کر دے بلکہ دعا گو ہوں کہ آنے والا وقت اُن کی الجھنوں کو دور کر سکے...... اب اگر اس وقت ہمارے گھر پہنچنے کے بعد ہم میں سے کسی کی طرف سے کوئی تشویش انگیز بات ہوئی تو امی اور بابا پر اس کے اچھے اثرات مرتب نہ ہوں گے۔ ان دونوں کی موجودہ جذباتی کیفیت کا مجھے جتنا اندازہ ہے اتنا شاید کسی کو نہ ہوگا۔ براہ کرم آپ کوئی ایسی ویسی بات نہ کیجیے گا ورنہ وہ لوگ بلکہ شاید ہم لوگ بھی پریشان ہو جائیں گے۔"

بھیا کے خاموش ہو جانے پر شاکرہ بھابی تدرے خفت سے بولیں۔ "اے بھیا مجھے کیا پڑی ہے کوئی ایسی ویسی

بات کرنے کی..... وہ تو میں الفت کو خبردار کر رہی تھی اور تمہیں اس لیے بتا رہی تھی کہ تم ایک ہی تو بھائی ہو ان بہنوں کے، خدانخواستہ انھیں کوئی دکھ تکلیف پہنچی تو تم ہی سامنے آؤ گے۔ کیا حرج ہے اگر بات پہلے سے تمہارے کان میں ڈال دی جائے تاکہ تم ہوشیار اور باخبر رہو۔"

"آپ کی اس اپنائیت اور خلوص کا بہت شکریہ..... آپ نے کہا، میں نے سن لیا۔ میں اب گھر میں ایسی ویسی کوئی بات نہ کیجیے گا۔"

"ٹھیک ہے۔"

"آپ نے میری ان باتوں کا برا تو نہیں منایا؟"

"بس اب چپکے ہو رہو۔" شاکرہ بھابی نے انھیں محبت سے گھورا۔

"شکریہ۔"

الفت کو ایک بار پھر رعنا جمیل یاد آ گئی تھیں۔

انھوں نے کہا تھا:

ہماری بیشتر مشکلات کو یہ دنیا والے زیادہ گمبھیر بنا دیتے ہیں۔ دو بچوں کے باپ سے اپنی شادی پر مجھے جو خیالات آتی ہو سکتی، عزیز رشتے داروں اور دوستوں نے میری مشکل میں اور اضافہ کر دیا۔ میں اور میرے گھر والے چپ چاپ سنا کیے کسی کی زبان نہیں پکڑ سکے، کسی سے کچھ نہیں کہہ سکے۔ ان لوگوں سے بھلا آدمی کیا کہہ سکتا ہے جو ہمارے مسائل سے ناآشنا ہوں..... کیا میرے گھر والوں نے میرے لیے کوئی کنوارا بر تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی ہو گی۔ بس نہیں تھا کوئی کنوارا لڑکا ہماری قسمت میں، سو مجبوراً دو بچوں کے باپ سے شادی کرانی پڑی۔

وہ اپنے خیالوں میں اتنی گم ہوئی کہ اس ٹھنڈی سانس کو بھی اپنے سینے میں نہ گھونٹ سکی جس نے بھائی جان کو بے ساختہ اس کی طرف دیکھنے پر مجبور کر دیا۔

"کیا ہوا؟" بھائی جان نے پوچھا۔

"کچھ نہیں!" اس نے بہت ہی دھیمی آواز میں جواب دیا۔ اور اپنی نظریں ونڈ اسکرین کے اس پار سڑک پر بھاگتی دوڑتی گاڑیوں کے ریلے میں الجھا دیں۔

گھر اب زیادہ دور نہ رہ گیا تھا۔

بھائی جان کے ہاتھ کا لمس وہ اپنے شانے پر بخوبی محسوس کر سکتی تھی۔

وہ گھر کیا پہنچی ایک شور سا مچ گیا۔

الفت آ گئی!

الفت بیٹی آ گئی!!

اپیا جانی آ گئیں!!!

بہنیں چشم ما روشن دلِ ماشاد کی تفسیر بنی گیٹ کی سمت چلی آ ئیں۔

گھر میں وہ چہکار تھی کہ الاماں!

سگی اور رشتے کی بہنوں بھاوجوں کے جلو میں جو اس کے سواگت کو دوڑی چلی آئی تھیں، اندر پہنچی تو امی باہیں وا کیے بے تابانہ منتظر ملیں۔ وہ ان کے سینے سے لگی تو بے اختیار جی بھر آیا۔ گھٹی گھٹی سسکیوں سے ابتدا ہوئی اور پھر وہ بلک بلک کر رونے لگی۔

گھر میں موجود عزیز رشتے داروں کو اس کے بلک بلک کر رونے نے معنی خیز اشارہ بازیوں کا نادر موقع فراہم کیا۔

بہت پیار چمکار کے باوجود بھی جب اس کے آنسو نہ تھمے تو بہنیں مضطرب نظر آنے لگیں۔ تشویش کے عالم میں عظمت آپا نے بھائی جان کا ہاتھ پکڑا اور انھیں دوسرے کمرے میں لے گئیں۔ فضیلت اور تہنیت ان کے پیچھے پیچھے لپکیں۔

"بھائی! خیریت تو ہے؟" عظمت آپا نے تشویش کے ساتھ پوچھا۔

"ہاں ہاں بالکل خیریت ہے۔"

"تو ایسے کیوں رو رہی ہے الفت؟"

"بھئی لڑکیاں یونہی جذباتی ہو جایا کرتی ہیں، میں تو خیر ان دنوں یہاں بیاہ کر تمہیں آئی تھی مگر یاد کرو کیا تمہیں رونا.....

اپیں آیا تھا شادی کے اگلے دن میکے آنے پر؟ فضیلت کا تو مجھے اچھی طرح یاد ہے تب میں اس گھر میں آ چکی تھی، وہ دھواں دھار روئی تھیں کہ خدا کی پناہ!"

"ہاں مگر ہماری بات اور تھی بھائی جان..... میرا مطلب ہے میری اور عظمت آپا کی۔" فضیلت نے کہا۔

"کیوں تمہاری بات اور کیوں تھی؟" بھائی جان نے پوچھا۔

"بھئی ہم لوگ خدانخواستہ شادی شدہ اور بچوں والے مردوں سے تھوڑی بیاہے گئے تھے؟"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"کیوں نہیں پڑتا۔ الفت کو ملال تو پہلے ہی تھا۔ کیا خبر کہ وہاں کوئی ایسی بات ہوئی ہو یا دیکھی ہو جس سے الفت کا دل دکھا ہو اور ڈر گئی ہو اور اب وہ امی کے سینے سے لگ کر دل کی بھڑاس نکال رہی ہو۔" عظمت آپا نے کہا۔

"ہاں ہو سکتا ہے۔" تہنیت نے تائید میں گردن ہلائی۔

"نہیں بھئی ایسی کوئی بات نہیں ہے الفت بالکل مطمئن ہیں اور خوش بھی۔ میکے آ کر ذرا جذباتی ہو گئی ہیں اور بس۔ تم سب دیکھنا ابھی تھوڑی دیر میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہو جائیں گی، ہنسیں گی بولیں گی اور بارہ بجے جلیس صاحب انھیں اپنے گھر واپس لے جانے کے لیے آ جائیں گے۔"

"ہائے اتنی جلدی!" تہنیت تقریباً چلا دی۔

"اتنی جلدی کیوں؟" فضیلت نے پوچھا۔

"کیونکہ ان کے گھر میں مہمانوں کا آنا جانا لگا ہوا ہے۔ ہم لوگ نکل رہے تھے تب ہی ان کے دوست بختیار صاحب..... اور ان کی بیگم پہنچیں۔"

"بچوں کے سلسلے میں کوئی پریشانی؟" عظمت آپا نے استفسار کیا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ الفت نے آپ سے بچوں کے سلسلے میں کسی قسم کی تشویش کا اظہار کیا؟"

"ہرگز نہیں۔"

"تو پھر؟"

"تو پھر کیا مطلب میری جان! سب ٹھیک ٹھاک ہے۔"

"ہائے اللہ! تو پھر اپیا جانی اس قدر بلک بلک کر کیوں رو رہی تھیں؟" تہنیت نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔

"بی بی جان! جب تمہاری باری آئے گی تب آپ ہی مل جائے گا تمہارے اس سوال کا جواب تمہیں اور تب ہم تم سے پوچھیں گے کہ بی بی اب بتاؤ کیوں اس قدر بلک بلک کر رو رہی ہو؟"

"میں تو ہرگز نہ روؤں گی۔ سارا میک اپ برباد ہو جاتا ہے اور اچھی بھلی دلہن کچھ سے کچھ نظر آنے لگتی ہے تو بہ کیجیے میں تو ہرگز نہ روؤں گی۔" تہنیت نے شوخی سے کہا۔

"وعدہ؟"

"جی پکا وعدہ!"

"وعدہ وعید بعد میں کرتی رہنا پہلے نکل کر باہر کی خبر تو لو ویسے بھی ہم چاروں کے وہاں سے یوں غائب ہو کر اس کمرے میں بند ہو جانے سے لوگ اور زیادہ چہکیں گے۔"

"خیر لوگوں کی تو ہرگز پروا نہ کی جائے۔ لوگ تو کسی حال میں بھی چین سے نہیں رہنے دیتے دوسروں کو۔ باتیں بنانا تو لوگوں کا شیوہ ہے سو وہ ہر حال میں بنائیں گے۔ دور کیوں جائیں یہ اپنی شاکرہ بھابی جو ہیں ڈھائی ہزار روپیہ ماہوار مشاہرہ پانے والے چھ بچوں کے رنڈوے جہاز او بھائی کا رشتہ لے کر آئی تھیں الفت کے لیے اور نہ صرف ہم سب کی بلکہ الفت کی بھی جان کو آ گئی تھیں کہ بن ماں کے بچوں کے سر پر ہاتھ دھرو گی تو بہت ثواب ملے گا۔ ابھی کچھ دیر پہلے وہاں سے آتے ہوئے راستے میں الفت کو الٹی سیدھی باتیں کر کے ہولانے کی کوشش کر رہی تھیں مگر تمہارے بھائی جان نے ان کی بولتی بند کر دی۔"

"اپیا تو پریشان نہیں ہیں نا؟" فضیلت نے فکرمندی سے کہا۔

"بالکل اطمینان رکھو اور اس وقت الفت کے رونے دھونے کو ایک جذباتی کیفیت سمجھو جس سے شادی کے بعد تقریباً ہر لڑکی دوچار ہوتی ہے۔" بھائی نے تحمل سے جواب دیا۔

"شکر ہے ہم تو ڈر ہی گئے تھے۔" تہنیت نے کہا۔

"عافیت اسی میں ہے کہ باہر نکلو جلدی سے۔ ویسے بھی ہم لوگوں کے اس کمرے میں بند ہو جانے پر اب تک خوب فسانے بن چکے ہوں گے۔" عظمت آپا بولیں۔

وہ سب باہر نکلیں تو الفت اگرچہ رونا تو بند کر چکی تھی مگر ہنوز امی کے سینے سے لگی ہوئی تھی۔ امی دوپٹے کے پلو سے چپکے چپکے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے اس کی پیٹھ محبت سے تھپتھپا رہی تھیں۔ بابا الفت کے سر پر ہاتھ دھرے کھڑے تھے۔ تائی اماں وہ بھی جان قرب و جوار میں دل گرفتہ سی بیٹھی تھیں۔ شادی شدہ خالہ زاد بہن نعیمہ اپنے چھوٹے بچے کو شانے سے لگائے تھپکتے ہوئے بڑے مزے سے الفت اور امی پر نظریں جمائے کھڑی تھیں۔ نعیمہ کی بن بیاہی چھوٹی بہن شمیمہ اپنی ماموں زاد بہن فرح سے کھسر پھسر کر رہی تھی اور شاکرہ بھابی اپنی چھوٹی نند نرگس سے سرگوشیاں کرنے کے ساتھ معنی خیز نگاہوں سے ایک ایک کو یوں اس طرح دیکھ رہی تھیں جیسے کہتی ہوں:

کوئی مجھ سے بھی تو کچھ پوچھے!

بھیا خواتین سے ذرا پرے چچا ابا کے ساتھ بیٹھے تھے اور مطمئن نظر آ رہے تھے۔ گویا الفت کے رونے کو وہ کوئی غیر معمولی امر گردانتے ہوں۔

عظمت آپا، فضیلت، تہنیت اور بھابی جان کو اکٹھے کمرے سے واپس آتا دیکھ کر نعیمہ نے شمیمہ کو ٹہوکا دیا اور ابرو وں کی حرکت سے اس کی توجہ ان چاروں کی جانب مبذول کرائی اور شاکرہ بھابی نے نرگس سے نگاہوں ہی نگاہوں میں کہا۔

دیکھا کیسی چلتر ہیں! ذرا سی دیر میں میٹنگ کر کے چلی بھی آئیں اور ذرا دیکھو تو بھی کس صفائی سے مسکرا رہی ہیں جیسے دوسرے تو الو ہیں کچھ جان ہی نہ پائیں گے۔

عظمت آپا آگے بڑھیں اور انھوں نے امی اور الفت کے بیچ جھکتے ہوئے کہا "امی اب امی کا سارا ہی پیار مت سمیٹ لو تھوڑا سا ہم غریبوں کے لیے بھی رہنے دو۔ چلو بس رو دھو لیں۔ سیاسی ہو بیٹھو!"

شاکرہ بھابی نے نرگس کو ٹہوکا دیا اور طنزیہ انداز میں مسکرا دیں۔

"ہاں بیٹی، بہن تمہاری ٹھیک کہہ رہی ہے۔" بابا نے الفت کا سر تھپتھپانے کے بعد پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔

"ذرا رخ زیبا ہم غریبوں کو بھی دکھا دیجیے پیا جانی" تہنیت آگے بڑھی۔

ذرا دیکھو کیسی باتیں بگھاری جا رہی ہیں! شاکرہ بھابی نے آنکھوں سے زبان کا کام لیتے ہوئے نرگس کی جانب دیکھا۔

بھابی جان نے بڑے پیار سے الفت کو امی کے پاس سے ہٹایا پھر اس کے پیروں سے سینڈلیں اتاریں اور آرام سے بٹھا دیا۔

بہنیں اس کے گرد بیٹھ گئیں۔

بھابی جان لپک کر گئیں اور اس کے لیے اسکواش لے آئیں۔

اس کے حواس بحال ہوئے تو اس نے محجوب نگاہوں سے اپنے اطراف کا جائزہ لینے کی کوشش کی اور تب اسے احساس ہوا کہ وہ بہت سی سوالیہ نگاہوں کی زد میں تھی۔

امی کی نگاہیں بے بسی کی غماز تھیں۔

جیسے پوچھتی ہوں:

بیٹی! کیا بہت دل گرفتہ ہو؟

جیسے کہتی ہوں:

بیٹا! ہم بہت مجبور تھے کیا کرتے! ورنہ جانتے بوجھتے تو اپنے پیاروں کو کون کھائی میں دھکیلتا ہے؟

گو بھابی جان تینوں بہنوں کو اطمینان دلا چکی تھیں مگر پھر بھی ان کی خاموش نگاہوں میں اضطراب و تشویش کی پرچھائیاں لرزاں تھیں۔

جیسے کہتی ہوں:

بتاؤ نا کیا بات ہے؟

اتنی ملول کیوں ہو؟

شاکرہ بھابی کی جانب نظر اٹھی تو لگا یوں لگا جیسے ان کی آنکھیں کہتی ہوں:

بتا دوں سب کو؟

عجیب سی تپش رگ و پے میں سرایت کرنے لگی۔

اس کا جی چاہا علی الاعلان سب کو بتا دے کہ وہ چار پرائے بچوں کی ماں بن کر خوش نہ تھی بہت دل گرفتہ تھی۔

مگر

بھابی کی جانب نظر اٹھی تو ان کی بولتی آنکھوں نے تنبیہ کی:

ہرگز ایسی حماقت نہ کرنا امی اور بابا تو پہلے ہی متفکر ہیں۔

گھنے جنگل میں، راہ گم کردہ گھائل ہرنی کے مانند وہ خود کو ہراساں پا رہی تھی۔

بہت سی نگاہیں اس پر ٹکی تھیں۔

وہ ایک ایک سے پوچھ رہی تھی۔

مجھے کس طرف جانا ہے؟

مگر کوئی اسے کچھ نہ بتاتا نظر آ رہا تھا۔

اس پر ٹکی ہر نگاہ میں بجائے خود سوال تھے!

فکر اور تشویش تھی

رحم اور ہمدردی کی لہریں تھیں۔

اس پر مرکوز ہر نگاہ اسے یہ کہتی محسوس ہو رہی تھی کہ:

صبر کرو، تمہارے مقدر میں یہی لکھا تھا۔

وہ چلا چلا کر ایک ایک سے پوچھنا چاہتی تھی کہ اس کے مقدر میں آخر یہی کیوں لکھا تھا؟

مگر

وہ کسی سے نہ پوچھ سکی

بارہ بجنے میں ابھی آٹھ دس منٹ باقی تھے کہ جلیس الحسن اسے واپس لے جانے کے لیے اس کے میکے آ پہنچے۔

اس وقت تک کئی اور قریبی عزیز و اقارب حال چال لینے کے لیے گھر میں اکٹھے ہو چکے تھے اور ایک دوسرے سے کن سوئیاں لیتے پھر رہے تھے۔

شاکرہ بھابی کا منہ تو بند تھا مگر ان کی آنکھیں، ابرو اور ناک کے نتھنے لبوں سے زیادہ معنی خیز انداز میں بول رہے تھے۔

"کاش! انھیں گزری رات الفت کے ساتھ والی بنا کر نہ بھیجا گیا ہوتا۔ ہم آپ ہی میں سے کوئی چلا گیا ہوتا!" بالآخر عظمت آپا بھابی جان سے کہے بنا نہ رہ سکیں۔

جلیس الحسن آئے تو گھر نقار خانہ بنا ہوا تھا تہنیت نے خوب اونچی آواز میں شادی بیاہ کے گیتوں کا کیسٹ لگا رکھا تھا —

اس شور کے بیچ الفت نے دبی دبی سی کئی رشک آمیز سرگوشیاں سنیں۔

"الفت کے دولہا دیکھنے میں تو بہت اچھے ہیں!"

جب فضیلت اور تہنیت نے انھیں الفت کے نزدیک لا بٹھایا تو اس کے دل پر ایک عجیب میٹھی میٹھی سی کیفیت طاری ہو گئی۔

وہ لباس تبدیل کر کے آئے تھے۔

سکائی کا کرتا اور جاپانی کاٹن ٹیٹرون کی براق شلوار۔

پیروں میں تلے والی جوتی تھی۔

طلائی بٹن ان کے گریبان پر آراستہ تھے۔

اور گریبان سے پوشریا مہک اٹھ رہی تھی۔

"کاش! تم بلا شرکت غیرے میرے اور صرف میرے ہوتے۔" الفت نے اس مہک کو صبح کی طرح اس وقت بھی اپنی سانسوں میں اتارتے ہوئے سوچا۔

خواہران نسبتی خرم ٹھونک کر میدان میں آ گئیں۔

تلے والی جوتی انھوں نے اتاری ہی نہ تھی جو چھپانے کی کوشش کی جاتی اور ان سے نیگ کا تقاضا کیا جاتا۔

تاہم تہنیت نے ڈھیر سارا نمک گھل جائے اور اس موقع کے لیے بطور خاص گھر میں تیار کی گئی لبی ہری مرچوں سا

کھیر، گلاب جامنیں اور فضیلت نے گرم مسالے والا پان انھیں پیش کر کے اُن کے گُتّہ بنانے اور دوسروں کے ہنسنے کا سامان کیا۔

عظمت آپا اپنے بڑے پن کا لحاظ رکھے رہیں۔

جُملہ اہلِ خانہ کے پُرزور اصرار کے باوجود جلیس الحسن بہت کم وقت وہاں ٹھہرے۔ امّی، بابا اور دیگر اہلِ خانہ نے بہت چاہا کہ ظہرانہ تناول کر کے جائیں مگر انھوں نے معذرت چاہی۔

اور جب وہ مائل بہ رخصت ہوئے تو اُلفت اُن کے ہمراہ جانے کو چُپ چاپ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

بنتِ حوّا واقعی کھونٹے کی گیّاں ہی ہوتی ہیں!

جلیس الحسن کی انشکائے مارق کار انتہائی سبک رفتاری سے رواں دواں تھی اور اُلفت اگلی نشست پر اُن کے پہلو میں مٹی کی مورت کی صورت بنی چُپ بیٹھی تھی۔

اُس کی مسلسل اور مستقل خاموشی پر بالآخر جلیس الحسن کو کہنا پڑا: "خواتین اور بالخصوص ٹیچرز تو اتنی خاموش نہیں دیکھی جاتیں۔"

"جی؟" وہ چونکی اور بے ساختہ استفہامیہ نگاہوں سے اُن کی طرف دیکھنے لگی۔

"حضور!" انھوں نے بائیں رُخ گردن موڑ کر اس کی جانب دیکھا تو اُس نے محجوب ہو کر نظریں نیچی کر لیں۔

وہ دھیرے سے مسکرا دیے اور بولے: "میں نے عرض کیا، کچھ بولیے۔"

"کیا؟"

"حیرت ہے ایک خاتون کو یہ بتانا پڑے گا کہ وہ کیا بولیں! اجی آپ لوگوں کے پاس تو موضوعات کا ذخیرہ ہوا کرتا ہے اور ہر موضوع پر بے تکان بول سکتی ہیں۔"

وہ کچھ نہیں بولی۔

"آپ کی ہمشیرگان تو خاصی باتونی نظر آتی ہیں۔"

اُس نے بدستور خاموشی پر اکتفا کیے رکھا۔

"شام کو تمہارے ہاں سے کسی کے ہماری طرف آنے کا پروگرام ہے؟"

"جی پتا نہیں۔"

"کل تقریبِ ولیمہ میں تو ہم میزبان ہوں گے۔"

"جی۔"

"پتا ہے نا تمہیں کہاں ہو رہی ہے یہ تقریب؟"

"جی۔"

"کہاں بھلا؟"

جلیس الحسن کسی نہ کسی بہانے اُسے بولنے پر مجبور کر دینا چاہ رہے تھے۔

"انٹرکان میں؟"

"شکر ہے تم جی سے آگے تو بڑھیں۔" یہ کہتے ہوئے انھوں نے ڈیش بورڈ پر لگی ننھی سی گھڑی کی طرف دیکھا اور بولے۔ "اوہ! گھڑی کی سوئیاں بھی کتنی تیزی سے حرکت کرتی ہیں۔ تقریباً بارہ بجے تمہارے ہاں پہنچا تھا اور تھوڑی سی دیر بیٹھا ہوں مگر گھڑی کی سوئیاں ڈیڑھ سے آگے نکل گئیں۔"

"ذرا.....بس.....دیر اور رُک جاتے آپ.....وہاں۔" اُلفت نے کہا۔ اُسے امّی، بابا اور بھیّا کے علاوہ دیگر اہلِ خانہ کے پُرزور اصرار کے باوجود جلیس الحسن کے دوپہر کے کھانے کے لیے کچھ دیر اور نہ رُکنے کا قلق ہوا تھا۔ کتنی جلدی جلدی بہنوں اور بھاوج نے باہم مل کر اُن کے لیے پُرتکلف لوازمات تیار کیے تھے۔ بریانی، قیمہ، شامی کباب، رائتہ، شاہی ٹکڑے۔ بشیر بال اور ڈیری بھیّا برنس روڈ سے لینے دوڑے تھے اور برنس روڈ بھلا نزدیک رکھا تھا! اور اس خیال سے کہ گھر آئے دوسرے مہمانوں کا دل میلا نہ ہو، سبھی کے لیے یہ پُرتکلف کھانا تیار کیا گیا تھا کہ سب دسترخوان پر ایک ساتھ مل بیٹھیں گے مگر جلیس الحسن کے کھانے سے انکار بلکہ صاف انکار پر بہنوں اور بھائی جان کے مُنہ اُتر گئے تھے۔ اُن کی انتہائی بھاگ دوڑ کے باوجود ساری محنت رائیگاں گئی تھی۔ بھلے سے دو نوالے ہی کھا لیتے وہ، مگر انکار تو نہ کرتے اور اُن کے انکار کر دینے کے بعد وہ بھلا کیسے رُک جاتی کھانے کے لیے۔ انھیں تو بس واپسی کی جلدی پڑی ہوئی تھی!

تو جا رہا ہوں۔ کو اہلِ خانہ سے کہنا پڑا: "مجبتی اصرار مت کرو۔ ہو سکتا ہے جلیس میاں کسی خاص سبب سے جلدی میں ہوں۔ آنا جانا تو اُن کے ہاں لگا ہوگا۔ جانے دو انھیں...... کھانے کے لیے رُکنے پہ اصرار مت کرو...... اب تو ماشاءاللہ آتے جاتے ہی رہیں گے۔"

"بابا! اتنی جلدی جلدی، اتنی محنت سے اور اتنا ڈھیر سارا پکایا ہے۔" عظمت آپا نے دبی دبی آواز میں کہا۔

"کوئی بات نہیں بیٹا۔" بابا نے آہستہ سے کہا۔

چلتے سمے تہنیت نے اُس کے کان میں کہا: "اپیا! دولہا بھائی سے کہہ دیجیے گا کہ انھوں نے کھانے پر نہ رُک کر ہمارا دل توڑا ہے۔"

"ہاں اور کیا ہیں، دوسروں کو بھی تھوڑی اُٹھوائی تھیں۔ جلیس بھائی کی خاطر تو ہم نے جلدی جلدی تازہ کھانا پکایا اور بھیّا کو برنس روڈ دوڑایا ورنہ کل رات کا بہت کھانا بچا رکھا تھا فریج میں۔" فضیلت نے سرگوشی میں کہا۔

شادی کے بعد پہلا دن تھا۔

حجاب مانع رہا۔

وہ جلیس الحسن سے رُکنے کو نہ کہہ سکی۔

اور جب وہ جانے کو اُٹھے تو امّی، بابا اور گھر میں موجود دیگر بزرگانِ خاندان کی دُعائیں دامن میں سمیٹتی وہ چُپ چاپ اُن کے ساتھ ہو لی۔

مگر اُس کا دل وہیں پڑا رہ گیا تھا۔

کیا تھا اگر سب کا دل رکھنے کو دو نوالے لے لیے جاتے!

موقع پاتے ہی شکوہ دبی دبی صورت میں اُس کی زبان پہ آ گیا تھا۔

"ذرا.....بس.....دیر اور رُک جاتے آپ.....وہاں۔"

"کھانے پر؟" جلیس الحسن کے لہجے میں استفہامیہ کیفیت تھی۔

"جی۔"

"مجبتی ہفتے میں ایک ہی تو دن ملتا ہے مجھے بچّوں کے ساتھ کھانا کھانے کا، ورنہ تو ہفتے کے باقی دنوں میں دوپہر کے وقت تو میں گھر سے باہر دفتر میں ہوا کرتا ہوں۔ اب اگر یہ ایک دن بھی میں کہیں اور گزاروں کسی اور کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھا لوں تو یہ بچّوں کے ساتھ زیادتی اور ناانصافی ہوگی...... بچّے ہمارے منتظر ہوں گے۔"

اُلفت نے اپنے جبڑوں کو پُوری سختی سے باہم بھینچ لیا۔

اُس کا رواں رواں سلگنے لگا۔

اپنے بچّوں کی خاطر وہ اُس کے گھر والوں کو مایوس کر کے آئے تھے۔

اُن کے جذبات کا ذرا پاس نہ کیا تھا انھوں نے۔

اُس کا جی چاہا جلیس الحسن کے اس رویّے پر اُن سے شکوہ کرے، احتجاج کرے، اپنی خفگی اور ناراضگی کا واضح طور پر اظہار کرے۔

مگر

پھر اس خیال نے اُسے زبان بند رکھنے پر مجبور کر دیا کہ یہ ساری صورتِ حال تو وہ شادی سے بہت پہلے اس پر واضح کر چکے تھے۔

اُس سے اس امر کی یقین دہانی لے چکے تھے کہ وہ اُن کے جملہ حالات سے باخبر تھی اور اُن کے چار بچّوں کی پرورش، دیکھ ریکھ میں اُن کی شریک بننے پہ آمادہ تھی۔

اس امر کی تصدیق کر لی تھی انھوں نے کہ اس شادی پر اس کی آمادگی کسی جبر یا دباؤ کا نتیجہ نہ تھی بلکہ اُس نے اچھی طرح سوچ سمجھ کر آمادگی ظاہر کی تھی۔

اُن سے اس کی شادی کسی حادثے یا اتفاق کا نتیجہ نہ تھی۔

بہت سوچ بچار کے بعد اُس کے متعلقین نے یہ فیصلہ کیا تھا اور اُس کی آمادگی کے بعد ہی جلیس الحسن کو زبان دی تھی۔

تو پھر

ساری صورتِ حال جانتے بوجھتے آمادگی اور قبولیت کے بعد اب اسی صورتِ حال کا شکوہ کیسا!

بقیہ راستے جلیس الحسن کی باتوں کے جواب میں ہوں ہاں کہتے رہا۔
چاروں بچے کھانے پر واقعی منتظر تھے۔
کھانے کی میز پر جلیس الحسن نے اپنے تئیں الفت اور بچوں کے درمیان بے تکلفی کی فضا ہموار کرنے کی کوشش کی مگر وہ اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہوئے۔
بچوں سے الفت کی کم گوئی اور گھبراہٹ کو تو شروع کے حجاب پر محمول کرتے ہوئے اسے کچھ رعایت دی جا سکتی تھی۔
مگر
الفت کے ساتھ بچوں کی سرد مہری اور بے اعتنائی اور ان کے چہروں کے بگڑے ہوئے خطوط جلیس الحسن کو متفکر کر دینے کے لیے کافی تھے۔
جلیس الحسن اس خوش فہمی میں تھے کہ کھانے کے بعد کچھ دیر وہ بچوں کو ان کی نئی ماں کے ساتھ لے کر بیٹھیں گے اور بچوں کو اعتماد میں لینے کی کوشش کریں گے مگر کھانے کے بعد وہ چاروں چپ چاپ اٹھ کر بغیر کچھ کہے سنے اوپر چلے گئے۔
جلیس الحسن نے انہیں روک کر فضا کو مزید بوجھل کر دینا مناسب نہیں سمجھا۔
وہ الفت سے نظریں چار کرنے کی ہمت نہ پا رہے تھے!
شام تک نگین اور زرین کے مشترکہ اور اعجاز اور فراز کے علیحدہ علیحدہ کمروں کے دروازے بند رہے۔ شام کو جب بند دروازے کھلے تو جلیس الحسن اکیلے ہی اوپر پہنچے۔ چاروں بچے ٹی وی لاؤنج میں بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے تھے۔
جلیس الحسن نگین کے قریب بیٹھ گئے اور انہوں نے اِدھر اُدھر کی دو چار باتوں کے بعد کہا ”بیٹا! کل ایک چھوٹی سی تقریب ہے۔“
”کیسی تقریب پاپا؟“
”وہ....... وہ....... ولیمہ!“
”آئی سی!“ نگین نے معنی خیز لہجے میں کہا۔
”آپ سب کے جو نئے کپڑے آئے ہیں وہ اپنی ماما کو دکھا دیں تاکہ اگر ان میں کوئی کمی ہو تو کل صبح بازار جا کر پوری کرلی جائے۔“
”اچھا! تو وہ کپڑے اس لیے آئے ہیں!“ اعجاز نے طنزیہ لہجے میں کہا۔
جلیس الحسن بظاہر اس بات کو نظر انداز کرتے ہوئے بدستور نگین کی جانب متوجہ رہے۔ ”بیٹا آپ سمجھیں، میں نے کیا کہا؟“
”جی پاپا.... میرا نہیں خیال کہ ہمیں کسی چیز کی ضرورت ہے؟“
جلیس الحسن سمجھ گئے کہ وہ الفت کو کپڑے نہ دکھانا چاہتی تھی۔
”بیٹا! نئے جوتے خریدنے کے لیے تو آپ لوگوں کو کل بہرحال بازار جانا پڑے گا؟“
”ہمیں نئے جوتوں کی بھی ضرورت نہیں۔ عید والے جوتے بالکل نئے رکھے ہیں؟“
”ٹھیک ہے!“ جلیس الحسن نے اصرار کرنا مناسب نہیں سمجھا۔
”جی!“
”کوئی اور چیز جس کی ضرورت ہو؟“
”جی نہیں!“
”جاجی، فراز، زرین؟“ جلیس الحسن نے تینوں کی توجہ حاصل کرنے کی کوشش کی پھر بولے ”آپ لوگوں کو کسی چیز کی ضرورت ہے؟“
”نو...... تھینک یو“ اعجاز نے اپنی توجہ ٹی وی اسکرین پر مرکوز رکھی۔
اس کے لہجے نے جلیس الحسن کو رنج پہنچایا۔
”آپ دونوں کچھ نہیں بولے؟“ جلیس الحسن نے اپنی جگہ سے اٹھ کر فراز اور زرین کے سروں پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔
دونوں بچے چپکے نگین کو کچھ اس طرح دیکھنے لگے جیسے کہتے ہوں:
”جی کیا کہیں ہم؟“
”پاپا!“ نگین نے ان کی نگاہوں کا مطلب سمجھتے ہوئے کہا ”ہم میں سے کسی کو کچھ نہیں چاہیے۔ بس اتنا بتا دیں کہ کتنے بجے تیار رہنا ہوگا ہمیں؟“
جلیس الحسن نے بیٹی کی طرف دیکھا پھر قدرے دل گرفتہ لہجے میں بولے ”سات بجے شام!“

”میں نہیں جاؤں گا!“ اعجاز بدستور ٹی وی دیکھتے ہوئے بولا۔
اس کے لہجے کی خود سری نے جلیس الحسن کو چونکنے اور مزید دل گرفتہ ہو جانے پر مجبور کر دیا۔ تاہم انھوں نے کسی شدید ردعمل کا اظہار کرنے کے بجائے بڑے تحمل سے پوچھا ”کیوں بیٹے؟“
”مجھے اپنے ٹیسٹ کی تیاری کرنی ہے، پرسوں ٹیسٹ ہے میرا!“
نگین نے کن انکھیوں سے اعجاز کی طرف دیکھا وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اعجاز کا کوئی ٹیسٹ نہ تھا وہ تقریب میں شامل نہ ہونے کی خاطر یہ بہانہ کر رہا تھا۔
”ٹھیک ہے..... کوئی بات نہیں“ جلیس الحسن نے دل شکنی کا اظہار نہ ہونے دیا اور کھلے دل سے بیٹے کا بہانہ قبول کر لیا۔
پھر انتہائی تحمل کے ساتھ وہ کچھ دیر بچوں کے ساتھ بیٹھے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے اور بظاہر ہنستے مسکراتے ان کے پاس سے اٹھے۔
لیکن
بباطن وہ بڑی دل شکستگی محسوس کر رہے تھے۔
اگلے دن تقریبِ ولیمہ میں اعجاز کی عدم شمولیت نے انھیں بہت رنجیدہ کیا۔
دوسری شادی کا فیصلہ کرتے ہوئے انھیں یہ اندازہ تو بہرحال تھا کہ عمر کے حساس دور سے گزرتے بچے کسی دوسری عورت کو اپنی ماں کی جگہ دیکھنے پر آسانی تیار نہ ہوں گے مگر یہ ان کے گمان میں نہ تھا کہ وہ خود ان سے بھی رخ بدل لیں گے اور خود سری پر آمادہ نظر آنے لگیں گے!!

شادی کو ساتواں دن تھا۔
جلیس الحسن کی اپنے پیشہ ورانہ معمولات میں مصروفیت تو شادی کے چوتھے روز یعنی ولیمے کے اگلے روز ہی سے شروع ہو گئی تھیں۔
حسبِ دستور عزیز و اقارب کے ہاں دعوتوں کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا تھا۔
ولیمہ شادی کے بعد تیسرے دن ہوا تھا۔
چوتھے دن چوتھی ہوئی۔
شادی کے چھٹے دن جلیس الحسن کے ایک دوست نے خاص اپنی طرف سے پُرتکلف ضیافت کا اہتمام کیا۔ مدعوین میں الفت اور جلیس الحسن کے علاوہ عظمت آپا اور نفیسات مع اپنے شوہروں اور بچوں کے اور مختیار بھائی مع اہلِ خانہ شامل تھے۔
مدعو تو جلیس الحسن کے چاروں بچے بھی کیے گئے تھے مگر جلیس الحسن نے تقریبِ ولیمہ میں ان کی بادلِ ناخواستہ شرکت اور دورانِ تقریب الفت کے خاندان والوں سے ان کی سرد مہری اور بیزاری کے پیشِ نظر انہیں اس ضیافت میں اپنے ہمراہ لانا مناسب نہ سمجھا تھا۔
ان کی تجربہ کار اور زمانہ شناس نگاہوں نے دیکھ لیا تھا کہ بچے الفت کو نہ صرف ناگوار نظروں سے دیکھ رہے تھے بلکہ ناپسندیدگی اور دلی نفرت کا اظہار کر رہے تھے۔
اسی لیے انھوں نے آہستہ سے دبی زبان سے الفت سے کہہ دیا تھا۔
”بچے ابھی مانوس اور بے تکلف نہیں ہوئے ہیں آہستہ آہستہ ہو جائیں گے۔ تم ان کے رویے پر کچھ خیال نہ کرنا، بہت اچھا ہے کہ ہم ان سے دور۔ دور رہیں۔ میں انھیں مانوس اور بے تکلف کرا ہی لوں گا۔“ الفت نے دل ہی دل میں سوچا تھا۔
مگر بظاہر اس نے خاموشی سے کام لیا تھا۔
اور اس کی اس خاموشی کو جلیس الحسن نے اس کی سمجھداری اور پختہ کاری پر محمول کیا تھا۔

ہمسائی کی دعوت کے دو روز بعد یعنی شادی کے آٹھویں دن کے لیے عظمت آپا نے مع چاروں بچوں کے دعوت کا پیغام دے رکھا تھا۔

عظمت آپا کے ہاں دعوت سے ایک روز قبل جلیس الحسن شام کے بجائے سہ پہر ہی کو گھر لوٹ آئے۔

جون شروع ہو چکا تھا اور غضب کی گرمی پڑ رہی تھی۔

جلیس الحسن اُلفت کو ریشمی ملبوساتِ عروسی سے انتہائی بیزار دیکھ رہے تھے۔ گو اُس نے اپنی زبان سے کچھ نہ کہا تھا مگر جلیس الحسن تجربہ کار مرد تھے۔ عاصمہ بیگم کے ساتھ انھوں نے ایک دو نہیں تقریباً اٹھارہ برس گزارے تھے اور ایک عورت کے ساتھ اس طویل رفاقت کے نتیجے میں کسی بھی عورت کی احتیاجات سے کماحقہ واقفیت رکھتے تھے بلکہ سچی بات تو یہ تھی کہ عورت کی نظرت اُس کے دل کا بھید جان سکتے تھے۔

اس روز خلافِ معمول جلد گھر لوٹنے پر انھوں نے اُلفت سے کہا "تیار ہو جاؤ، بازار چلتے ہیں!"

اُلفت نے توضیح طلب استفہامیہ نگاہوں سے اُن کی طرف دیکھا تو وہ بولے "تمہیں ان ریشمی کپڑوں میں گرمی لگتی ہے، بازار چل کر دو چار سوتی جوڑے خرید لو۔"

اُلفت سر جھکا کر دھیرے سے مسکرا دی۔

"کیوں؟ مسکرا کیوں دیں؟" جلیس الحسن خود بھی مسکراتے ہوئے بولے۔

"آپ تو ریشمی کپڑے نہیں پہنتے پھر آپ کو کیسے معلوم کہ مجھے ان کپڑوں میں گرمی لگتی ہے؟"

"عاصمہ تو فروری مارچ میں ہوا کے گرم ہوتے ہی ریشمی ملبوسات ترک کر کے سوتی کپڑے پہننا شروع کر دیا کرتی تھی۔"

لحظہ بھر کے لیے اُلفت کے چہرے پر پھیلتی مسکراہٹ یک بیک کافور ہو گئی۔

اُس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔

یہ کیا کہہ گئے تھے وہ؟

کہ اُس کے دل کی تو نیا لرز کر رہ گئی تھی!

کیا وہ عورت اب بھی مختلف النوع حوالوں سے ان کے ذہن میں بسی تھی؟

"جب اُسے گرمی لگا کرتی تھی اس موسم میں ریشمی کپڑوں میں تو یقیناً تمہیں بھی لگتی ہوگی۔" وہ اس کی قلبی کیفیت سے یکسر بے نیاز نظر آتے ہوئے بولے۔

خدا جانے اُن کی یہ بے نیازی قدرتی تھی!

یا

وہ جانتے بوجھتے بے نیازی کا اظہار کر رہے تھے!

اُلفت یہ سمجھنے سے قاصر تھی!

"چلو بازار چلتے ہیں۔"

"نہیں..... رہنے دیجیے، مجھے گرمی نہیں لگتی۔" اُس نے ماندے جی سے کہا۔

"کیوں؟ تم عورت نہیں ہو کیا؟" وہ بولے۔ "تمہیں بازار لے جانے کے لیے ہی تو آج جلدی آگیا ہوں..... ہاں کل کے لیے تم نے اپنی بہن کو فون کر کے بتا دیا ناکہ ہم لوگ نو بجے سے پہلے نہ پہنچ سکیں گے اُن کے ہاں؟"

"جی!"

"اوّل تو میں ان دعوتوں وغیرہ کے حق میں ہی نہیں ہوں۔ کیا ضرورت ہے بھلا؟"

وہ چپ رہی۔

دل بہت مضطرب ہو چکا تھا۔

"کم آن ڈارلنگ، اُٹھو چلتے ہیں۔"

اُلفت نے شکوہ کن نگاہوں سے اُن کی طرف دیکھا۔

جیسے کہتی ہو:

"کیا اُسے بھی ڈارلنگ کہا کرتے تھے؟"

وہ بڑی محبت سے اُسے دیکھ رہے تھے مگر سچ یہ تھا کہ ذہن کے پردے پر عاصمہ بیگم کی دلکش اور دلنواز شبیہ کھل لہرا رہی تھی۔

اُن کی نظریں بظاہر اُلفت کے چہرے پر مرکوز تھیں مگر جی ہی جی میں وہ سوچ رہے تھے:

"اِس میں کوئی شک نہیں کہ عاصمہ زیادہ خوبصورت تھی!"

اور اُن کی زبان کہہ رہی تھی:

"چلو، چلتے ہیں بازار۔"

اُن کی نگاہوں میں ہلکورے لیتی محبوبیت نے اُلفت کو ایسا بہکایا کہ خواہ نیم دلی ہی سے سہی وہ اُٹھی اور اُن کے ساتھ جانے کو تیار ہونے لگی۔

"جب تک تم تیار ہو، میں ذرا بچوں سے ہیلو ہیلو کر لوں۔" وہ یہ کہتے کمرے سے نکل گئے۔

اُلفت کا بس چلا تو فقط اتنا کہ اُس نے دانت بھینچ لیے۔

کچھ دیر بعد جب وہ تیار ہو کر کمرے سے باہر نکلی تو اُس نے دیکھا جلیس الحسن زرین کا ہاتھ تھامے کارپیٹڈ زینے سے نیچے اُتر رہے تھے۔

"ہمارا بیٹا بھی چل رہا ہے ہمارے ساتھ!" انھوں نے اُلفت کو دیکھتے ہی زرین کا ہاتھ چھوڑ کر اپنا بازو اُس کے شانوں پر بصد شفقت و ناز رکھتے ہوئے کہا۔

اُلفت کا جی چاہا کمرے میں پلٹ جائے مگر وہ ایسا نہ کر سکی۔

زینہ اُتر کر وہ زرین کو لیے اُلفت کے روبرو آ کھڑے ہوئے اور مسکراتے ہوئے بولے "میں بہت خوش ہوں کہ ہمارے ساتھ بیٹی بھی بازار جا رہی ہے!"

"لیکن میں بہت ناخوش ہوں!" اُلفت نے جی ہی جی میں کہا۔

باوجود انتہائی کوشش کے وہ اپنی قلبی کیفیت کو اپنے چہرے سے ہویدا ہونے سے باز نہ رکھ سکی۔ جلیس الحسن نے کن انکھیوں سے اُس کے ناگوار تاثرات دیکھے اور دل ہی دل میں اُلفت کو مخاطب کرتے ہوئے بولے: "انھیں تو دل میں جگہ دینی ہی پڑے گی تمہیں ورنہ راہ مشکل ہو جائے گی تمہارے لیے بھی اور خود میرے لیے بھی!"

سلور گرے مزدا جو بچوں کو اُن کے اسکول کے علاوہ اُن کی ضرورت کے مطابق کہیں باہر لے جانے اور لانے کے لیے مخصوص تھی، پورچ میں کھڑی تھی جبکہ جلیس الحسن کی گاڑی لان کے پہلو میں مستعد کھڑی تھی۔

جلیس الحسن ان دونوں کے ہمراہ گاڑی تک پہنچے۔ گاڑی کا اگلا بایاں دروازہ وا کیا اور اُلفت کی طرف دیکھنے لگے جیسے کہتے ہوں:

"بیٹھو!"

لیکن اس سے پہلے کہ وہ بیٹھ پاتی زرین بڑے آرام سے اگلی نشست پر بیٹھ گئی!

اُلفت کو اُس کا ساتھ چلنا پہلے ہی کھل رہا تھا۔ اگلی نشست پر اُس کے بیٹھ جانے سے اُس کی تیوری پر بل پڑ گئے جنھیں نظر انداز کر دینا جلیس الحسن کے لیے ممکن نہ رہا۔

اُلفت کو شاکی نگاہوں سے اپنی جانب دیکھتے پا کر وہ جھینپ سے گئے۔

"بیٹھو!" انھوں نے اُلفت سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

"کہاں بیٹھوں؟"

"گاڑی میں۔"

"جگہ ہی کہاں ہے؟" اُلفت نے ناگواری سے کہا۔

"تم نے کسی سیانے کی وہ بات نہیں سُنی کہ جگہ تو دل میں ہونی چاہیے۔" جلیس الحسن نے خفت کو مسکراہٹ کی آڑ میں چھپاتے ہوئے مدھم سُروں میں معنی خیز لہجے میں کہا پھر آواز کا یہ دھیما پن برقرار رکھتے ہوئے بولے "جب فرانا و زرین آگے بیٹھنے کے لیے جھگڑنے لگتے تھے تو اُن کی ماں نہ جانے کیونکر ان دونوں کے ساتھ اپنے لیے بھی جگہ نکال لیا کرتی تھی۔"

اُلفت کا جی چاہا چلّا کر کہے: "وہ ان کی ماں تھیں، میں ان کی ماں نہیں ہوں!"

مگر وہ کچھ نہ کہہ سکی۔

گھائل نظروں سے انھیں دیکھ کر رہ گئی۔

"کم آن..... بیٹھو گی تو آپ ہی جگہ نکل آئے گی۔"

اُلفت نے جھجک نگاہوں سے گاڑی کی اگلی نشست کی طرف دیکھا۔ زرین بڑے آرام اور ٹھسّے سے بیٹھی تھی۔

بہتیا کی دعوت کے دو روز بعد یعنی شادی کے آٹھویں دن کے لیے عظمت آپا نے مع چاروں بچوں کے دعوت کا پیغام دے رکھا تھا۔

عظمت آپا کے ہاں دعوت سے ایک روز قبل جلیس الحسن شام کے بجائے سہ پہر ہی کو گھر لوٹ آئے۔

جون شروع ہو چکا تھا اور غضب کی گرمی پڑ رہی تھی۔

جلیس الحسن اُلفت کو ریشمی ملبوساتِ عروسی سے انتہائی بیزار دیکھ رہے تھے۔ گو اُس نے اپنی زبان سے کچھ نہ کہا تھا مگر جلیس الحسن تجربہ کار مرد تھے۔ عاصمہ بیگم کے ساتھ انھوں نے ایک دو نہیں تقریباً اٹھارہ برس گزارے تھے اور ایک عورت کے ساتھ اس طویل رفاقت کے نتیجے میں کسی بھی عورت کی احتیاجات سے کماحقہٗ واقفیت رکھتے تھے بلکہ سچی بات تو یہ تھی کہ عورت کی نظرت اُس کے دل کا بھید جان سکتے تھے۔

اس روز خلافِ معمول جلد گھر لوٹنے پر انھوں نے اُلفت سے کہا "تیار ہو جاؤ بازار چلتے ہیں۔"

اُلفت نے توضیح طلب استفہامیہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا تو وہ بولے "تمہیں ان ریشمی کپڑوں میں گرمی لگتی ہے نا بازار چل کر دو چار سوتی جوڑے خرید لو۔"

الفت سر جھکا کر دھیرے سے مسکرا دی۔

"کیوں؟ مسکرا کیوں دیں؟" جلیس الحسن خود بھی مسکراتے ہوئے بولے۔

"آپ تو ریشمی کپڑے نہیں پہنتے پھر آپ کو کیسے معلوم کہ مجھے ان کپڑوں میں گرمی لگتی ہے؟"

"عاصمہ تو فروری مارچ میں ہوا کے گرم ہوتے ہی ریشمی ملبوسات ترک کر کے سوتی کپڑے پہننا شروع کر دیا کرتی تھی۔"

لمحہ بھر کے لیے الفت کے چہرے پر کھیلتی مسکراہٹ یک بیک کافور ہو گئی۔

اُس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔

یہ کیا کہہ گئے تھے وہ؟

کہ اُس کے دل کی تو نیا لرز کر رہ گئی تھی!

کیا وہ عورت اب بھی مختلف النوع حوالوں سے ان کے ذہن میں بسی تھی؟

"جب اُسے گرمی لگا کرتی تھی اس موسم میں ریشمی کپڑوں میں تو یقیناً تمہیں بھی لگتی ہوگی۔" وہ اس کی قلبی کیفیت سے بےخبر بے نیاز نظر آتے ہوئے بولے۔

خدا جانے اُن کی یہ بے نیازی قدرتی تھی!

یا

وہ جانتے بوجھتے بے نیازی کا اظہار کر رہے تھے!

اُلفت یہ سمجھنے سے قاصر تھی!

"چلو بازار چلتے ہیں۔"

"نہیں..... رہنے دیجیے، مجھے گرمی نہیں لگتی۔" اُس نے مانندے جی سے کہا۔

"کیوں؟ تم موسٹ نہیں ہو کیا؟" وہ بولے "تمہیں بازار لے جانے کے لیے ہی تو آج جلدی آگیا ہوں..... ہاں کل کے لیے تم نے اپنی بہن کو فون کر کے بتا دیا تاکہ ہم لوگ نو بجے سے پہلے نہ پہنچ سکیں گے اُن کے ہاں؟"

"جی۔"

"اوّل تو میں ان دعوتوں وغیرہ کے حق میں ہی نہیں ہوں۔ کیا ضرورت ہے بھلا؟"

وہ چپ رہی۔

دل بہت مضطرب ہو چکا تھا۔

"کم آن ڈارلنگ، اُٹھو چلتے ہیں۔"

اُلفت نے شکوہ کن نگاہوں سے اُن کی طرف دیکھا۔

جیسے کہتی ہو:

"کیا اُسے بھی ڈارلنگ کہا کرتے تھے؟"

وہ بڑی محبوبیت سے اُسے دیکھ رہے تھے مگر سچ یہ بھی تھا کہ ذہن کے پردے پر عاصمہ بیگم کی دلکش اور دلنواز شبیہ بھی ابھر رہی تھی۔

اُن کی نظریں بظاہر اُلفت کے چہرے پر مرکوز تھیں مگر جس میں وہ سوچ رہے تھے:

"اِس میں کوئی شک نہیں کہ عاصمہ زیادہ خوبصورت تھی!"

اور اُن کی زبان کہہ رہی تھی:

"چلو! چلتے ہیں بازار۔"

اُن کی نگاہوں میں ہلکورے لیتی محبوبیت نے اُلفت کو ایسا بہکایا کہ خواہ نیم دلی ہی سے سہی وہ اٹھی اور اُن کے ساتھ جانے کو تیار ہونے لگی۔

"جب تک تم تیار ہو میں ذرا بچوں سے ہیلو ہیلو کر لوں۔" وہ یہ کہتے کمرے سے نکل گئے۔

اُلفت کا بس چلا تو فقط اتنا کہ اُس نے دانت بھینچ لیے۔

کچھ دیر بعد جب وہ تیار ہو کر کمرے سے باہر نکلی تو اُس نے دیکھا جلیس الحسن زرّین کا ہاتھ تھامے کاریڈور سے زینے سے نیچے اُتر رہے تھے۔

"ہمارا بیٹا بھی چل رہا ہے ہمارے ساتھ!" انھوں نے اُلفت کو دیکھتے ہی زرّین کا ہاتھ چھوڑ کر اپنا بازو اُس کے شانوں پر بےحد شفقت دراز کر کے ہوئے کہا۔

اُلفت کا جی چاہا کمرے میں پلٹ جائے مگر وہ ایسا نہ کر سکی۔

زینہ اُتر کر وہ زرّین کو لیے اُلفت کے روبرو آ کھڑے ہوئے اور مسکراتے ہوئے بولے "میں بہت خوش ہوں کہ ہمارے ساتھ بیٹی بھی بازار جا رہی ہے؟"

"لیکن میں بہت ناخوش ہوں!" اُلفت نے جی ہی جی میں کہا۔

باوجود انتہائی کوشش کے وہ اپنی قلبی کیفیت کو اپنے چہرے سے ہویدا ہونے سے باز نہ رکھ سکی جلیس الحسن نے کن انکھیوں سے اُس کے اکتاہٹ تاثرات دیکھے اور دل ہی دل میں الفت کو مخاطب کرتے ہوئے بولے: "انھیں تو دل میں جگہ دینی ہی پڑے گی تمہیں ورنہ راہ مشکل ہو جائے گی تمہارے لیے بھی اور خود میرے لیے بھی!"

سلور گرے مزدا جو بچوں کو اُن کے اسکول کے علاوہ اُن کی ضرورت کے مطابق کہیں باہر لے جانے اور لانے کے لیے مخصوص تھی، پورچ میں کھڑی تھی جبکہ جلیس الحسن کی گاڑی لان کے پہلو میں مستعد کھڑی تھی۔

جلیس الحسن ان دونوں کے ہمراہ گاڑی تک پہنچے۔ گاڑی کا اگلا بایاں دروازہ وا کیا اور الفت کی طرف دیکھنے لگے جیسے کہتے ہوں:

"بیٹھو!"

لیکن اس سے پہلے کہ وہ بیٹھ پاتی زرّین بڑے آرام سے اگلی نشست پر بیٹھ گئی!

اُلفت کو اُس کا ساتھ چلنا پہلے ہی کھل رہا تھا۔ اگلی نشست پر اُس کے بیٹھ جانے سے اُس کی تیوری پر بل پڑ گئے جنھیں نظرانداز کر دینا جلیس الحسن کے لیے ممکن نہ رہا۔

الفت کو شاکی نگاہوں سے اپنی جانب دیکھتے پا کر وہ جھینپ سے گئے۔

"بیٹھو!" انھوں نے اُلفت سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

"کہاں بیٹھوں؟"

"گاڑی میں۔"

"جگہ ہی کہاں ہے؟" اُلفت نے ناگواری سے کہا۔

"تم نے کسی سیانے کی وہ بات نہیں سنی کہ جگہ تو دل میں ہونی چاہیے۔" جلیس الحسن نے خفت کو مسکراہٹ کی آڑ میں چھپاتے ہوئے مدھم سُروں میں معنی خیز لہجے میں کہا پھر آواز کا یہ دھیما پن برقرار رکھتے ہوئے بولے "جب فرانا ور زرّین آگے بیٹھنے کے لیے جھگڑنے لگتے تھے تو ان کی ماں نہ جانے کیونکر ان دونوں کے ساتھ اپنے لیے بھی جگہ نکال لیا کرتی تھی۔"

اُلفت کا جی چاہا چلا کر کہے "وہ ان کی ماں تھیں میں ان کی ماں نہیں ہوں!"

مگر وہ کچھ نہ کہہ سکی۔

گھائل نظروں سے انھیں دیکھ کر رہ گئی۔

"کم آن..... بیٹھو گی تو آپ ہی جگہ نکل آئے گی۔"

اُلفت نے جھجکی نگاہوں سے گاڑی کی اگلی نشست کی طرف دیکھا۔ زرّین بڑے آرام اور ٹھسے سے بیٹھی تھی۔

اور اُس کے لیے پوری پالشت کمتر جگہ بچی تھی۔

"میں پیچھے بیٹھ جاتی ہوں۔" اُلفت نے گاڑی کے عقبی دروازے کے دستے کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟"

"کیونکہ میں تکلیف میں بیٹھنا نہیں چاہتی۔" اُس نے دو ٹوک لہجے میں کہا۔

اس کے لہجے کی قطعیت نے جلیس الحسن کو چونک کر اُس کی طرف دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ چند لمحے وہ جھکی پلکوں سے اُسے دیکھتے رہے پھر انھوں نے شانے جھٹکتے ہوئے کہا: "ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی۔"

لمحہ بھر کو وہ جہاں کی تہاں رہ گئی۔ اُسے جلیس الحسن سے اس قسم کے جواب کی توقع نہ تھی کیونکہ وہ ہفتہ بھر کی نئی دلہن تھی۔

ان کی خلوتوں کی امین تھی۔

اُس کے مقابلے میں اپنی بیٹی کو اہمیت دے کر انھوں نے اس کے جذبات سے کھیلنے کی کوشش کی تھی۔

اُس کے جذبات کا لحاظ رکھتے ہوئے وہ زرین سے کبھی تو پچھلی نشست پر بیٹھنے کے لیے کہہ سکتے تھے۔

یا

کم از کم اُسے سمٹنے اور جگہ بنانے کی ہدایت تو کر سکتے تھے۔

کیا عجب کہ الفت نہ چاہتے ہوئے بھی اُس کے ساتھ بیٹھ جاتی۔ فقط اس خیال سے کہ انھوں نے اس کے لیے جگہ نکلوانے کی کوشش تو کی تھی۔

مگر انھوں نے تو بڑی رکھائی سے کہہ دیا:

"ٹھیک ہے جیسی تمہاری مرضی۔"

بات اگر مرضی ہی کی تھی

تو ہاں! وہ نہیں بیٹھنا چاہتی تھی زرین کے ساتھ اس طور کہ وہ اُس کے اور اپنے باپ کے درمیان ایک دیوار! ایک خلیج! ایک رکاوٹ کی صورت حائل رہے۔

بلکہ شاید دشمن جاں کی صورت!

جلیس الحسن کے جواب نے اُسے دکھ پہنچایا تھا۔

مایوس کیا تھا۔

اور اُس کے خیال میں اُس کی توہین کی تھی۔

اُس نے تو یہ چاہا تھا کہ جلیس الحسن زرین کو یا تو پچھلی نشست پر منتقل ہو جانے کو کہیں یا اُسے سمٹ کر تمیز سے بیٹھنے اور اُس کے لیے جگہ بنانے کی تلقین کریں۔

اُس کی یہ منشا ہرگز نہ تھی کہ وہ اُسی کے جذبات کو پامال کر دیں۔

اب ایسی کوئی پڑی تو ہرگز نہ تھی کہ اس جھٹکے کے باوجود آگے بیٹھ جاتی۔

لمحہ بھر کو تو اس کا جی چاہا کہ ان کے ساتھ جانے سے انکار کر دے اور اپنے کمرے کی جانب پلٹ جائے مگر پھر اس خیال نے اُس کے قدم پکڑ لیے کہ یہ تو پسپائی کی ایک صورت ہوگی۔

اور ایک بار پسپائی کا مطلب یہ ہوگا کہ ہر دفعہ پسپائی۔

نہیں! وہ پسپا نہ ہونا چاہتی تھی۔

جلیس الحسن پر اپنی خفگی کے واضح اظہار کے لیے اُس نے اپنی تیوریوں پر پڑی شکنوں میں مزید اضافہ کیا اور گاڑی کا عقبی دروازہ کھول کر چپ چاپ پچھلی نشست پر بیٹھ گئی۔

اُس کے ہاتھ میں خنجر ہوتا اور بس چلتا تو وہ عقب سے اگلی نشست پر براجمان جلیس الحسن کی لاڈلی بیٹی کی پیٹھ میں گھونپ کر اپنے دل کی آگ ٹھنڈی کر لیتی۔

مگر

افسوس کہ اُس کے ہاتھ میں خنجر نہ تھا اور بالفرض ہوتا بھی تو وہ اپنے دل کی خواہش کی تسکین نہ کر سکتی تھی کیونکہ وہ تہذیب اور قانون کے تانے بانوں سے بنی ایسی دنیا میں رہ رہی تھی جس کے اکثر و بیشتر باسی بباطن مجرم، منافق اور قاتل تھے۔ مگر بظاہر مہذب اور شائستہ چہروں کا لبادہ اوڑھے پھر رہے تھے۔

اُس کے عقبی نشست پر بیٹھ جانے کے بعد جلیس الحسن خاموشی سے گاڑی میں بیٹھے اور انھوں نے اسٹیئرنگ سنبھالتے ہوئے اپنے سامنے نصب آئینے کو ایک مخصوص زاویے پر گھما کر الفت کے عکس کا بغور جائزہ لینے کی کوشش کی۔

اُس کے چہرے سے رنج آمیز ناگواری ہویدا تھی۔

ابھی تک تو اُن کے لیے بچوں کا رویہ ہی تشویش انگیز بنا ہوا تھا لیکن اب الفت کے طرزِ عمل نے ایک نئی فکر اور تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔

کیا اُن کے گھر کی چہار دیواری میں ایک سرد جنگ کا اعلان ہونے جا رہا تھا!

گو انھیں الفت کے رویے سے مایوسی ہوئی تھی۔

اور دکھ بھی پہنچا تھا۔

مگر

اُن کی جہاں دیدگی اور دانشمندی نے انھیں یہی مشورہ دیا کہ فی الحال یہی بہتر ہوگا کہ وہ خود اس جنگ میں شریک ہونے اور تماشا یا فریق بننے کے بجائے غیر جانبدارانہ رویہ رکھیں اور حالات کا بہاؤ پورے طور پر سمجھ میں آجانے کے بعد ہی کوئی حکمت عملی اختیار کرنے کی کوشش کریں۔

چنانچہ الفت کی خفگی پر کسی سنجیدہ ردِ عمل کے اظہار کے بجائے انھوں نے راستے میں اس سے معمول کے لہجے میں بات کر کے اُسے یہ تاثر دینے کی کوشش کی گویا اُس کے طرزِ عمل کا انھوں نے کوئی خاص نوٹس نہیں لیا تھا۔

مگر الفت نے اُن کے طرزِ عمل کا خاصی سنجیدگی سے نوٹس لیا تھا۔

بلکہ اسے دل پر لیا تھا۔

اسی لیے اُس نے جلیس الحسن کی باتوں کے جواب میں "ہوں"، "ہاں"، "جی" کرنے یا خاموشی پر اکتفا کیا۔

راستے بھر وہ چپ چاپ آنسوؤں کو پیتی رہی۔

اُسے رعنا جمیل کی وہ بات یاد آ رہی تھی۔

"بچوں والے مرد سے شادی کا بڑا نقصان یہ ہے کہ اُس کے بچے بڑی گڑبڑ کر دیتے ہیں، موقع بے موقع ٹپک پڑتے ہیں!"

واقعی!

کس قدر بے موقع تھی زرین کی شانِ نزول۔

شادی کے بعد پہلی بار تو جلیس الحسن اُسے شاپنگ کے لیے بازار لے جا رہے تھے اور اس موقع پر جلیس الحسن کی زبان سے اُن کی سابقہ بیوی کا تذکرہ سننا ہی کیا کم بڑا عذاب تھا جو زرین نے کباب میں ہڈی کے مصداق اس موقع کی لطافت کو مزید کرکرا کر دیا تھا۔

بہر حال اس شام جلیس الحسن اُسے شہر کے سب سے بڑے پُر رونق، مہنگے اور فیشن ایبل مرکز خریداری میں لے گئے۔

دکان در دکان جھانکنے کے بجائے انھوں نے مذکورہ مرکز کی ایک بہت بڑی دکان کا رُخ کیا اور جیسے ہی وہاں پہنچے سیلز مینوں نے اُن کا یوں مسکرا کر سواگت کیا جیسے جنم جنم سے اُن سے آشنا ہوں۔

"آئیے صاحب!" انھوں نے مسکرا کر کہا۔

"آئیے جناب!" براق چاندنی پر آہنی تجوری کے نزدیک بڑے ٹھسے سے آلتی پالتی مار کر بیٹھے ہوئے دو پلی ٹوپی والے کلف دار کرتے میں سے جھانکتی بڑی سی توند والے ادھیڑ عمر شخص نے جو چہرے مہرے، انداز و اطوار اور طمطراق سے مالکِ دکان نظر آتا تھا بڑی متانت سے مسکراتے ہوئے جلیس الحسن کو خوش آمدید کہا۔

پھر وہ زرین کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولا: "آہاہ! آج تو بے بی آئی ہیں۔"

ایک بار پھر اُس نے روئے سخن جلیس الحسن کی طرف کیا اور بولا: "صاحب! خیر تو ہے بہت دنوں بعد تشریف لائے؟"

"بس بھئی! بچے ریڈی میڈ ملبوسات پسند کرنے لگے ہیں۔" جلیس الحسن نے دکان پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں! یہ تو سچ ہے کہ ریڈی میڈ کی طرف خاصا رجحان ہو گیا ہے خریداروں کا...... بیٹھیے تو۔" مالکِ دکان نظر آنے والے شخص نے پہلو بہ پہلو دھری کرسیوں کی جانب اشارہ کیا۔

"کیا خدانخواستہ بیگم صاحبہ بھی ریڈی میڈ ملبوسات پسند فرمانے لگیں جو عرصہ دراز سے انھوں نے بھی چکر نہیں لگایا؟" یہ کہتے ہوئے اُس نے کن انکھیوں سے الفت کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔

جلیس الحسن نے مالکِ دکان کے اس سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے دکان کے سامنے انتہائی بائیں جانب پہلو بہ پہلو

خریداری سے نمٹنے کے بعد وہ اُلفت کو درزی کے ہاں لے گئے۔

درزی نے بھی اُنہیں دیکھ کر کم و بیش ویسی ہی گرمجوشی کا اظہار کیا جیسا بزاز نے کیا تھا اور اسی کی طرح دزدیدہ نگاہوں سے الفت کو دیکھنے لگا۔

"کہو میاں کیسے ہو؟" جلیس الحسن نے اُن سِلے کپڑوں کا بڑا سا تھیلا اُلفت کے آگے دھرتے ہوئے نوجوان درزی سے پوچھا۔

"بس صاحب آپ کی دعائیں ہونی چاہئیں۔"

"شکر ہے تم فارغ تو ملے۔ میں ڈر رہا تھا کہیں گھرے ہوئے نہ ہو۔"

درزی مسکرا دیا۔

"بس ابھی دو منٹ پہلے ہی ایک پرانی گاہک کو نمٹا کر فارغ ہوا تھا۔"

"اچھا دیکھو بیگم صاحبہ کا سائز تو تمہارے پاس لکھا ہوا ہوگا۔" جلیس الحسن بولے

• درزی سوچ میں پڑ گیا۔

"میاں پچھلے دِنوں جو جوڑے سِلے تھے۔" جلیس الحسن نے کہا پھر اُسے متذبذب دیکھ کر الفت کی جانب مڑے اور درزی سے بولے

"میاں! یہ اس وقت بھی تمہارے ہی ہاں کا سِلا ہوا جوڑا پہنے ہوئے ہیں۔"

"اوہ! وہ آپ شادی والے جوڑوں کی بات کر رہے ہیں!" درزی دائیں ہاتھ کی انگشتِ شہادت کھڑی کرتے ہوئے بولا۔ "وہ جو آپ کے ساتھ آنے والی بیگم صاحبہ سِلنے کو دے گئی تھیں۔"

"ہاں وہی..... ہمارے دوست کی بیگم ہیں وہ۔ انھیں تمہاری سلائی اتنی پسند آئی ہے کہ عنقریب جلد وہ بھی تمہارے کسٹمرز میں شامل ہونے جا رہی ہیں۔"

"بس صاحب آپ لوگوں کی عنایت ہے۔" درزی دونوں ہاتھ جوڑ کر بڑی انکساری سے بولا

"اب تو یاد آگیا سائز ہے نا ان کا تمہارے پاس؟"

"جی صاحب بالکل یاد آگیا۔" درزی اپنے سامنے دھرے رجسٹر کی ورق گردانی کرنے لگا۔

بالآخر اسے مطلوبہ صفحہ مل ہی گیا۔

"بیگم صاحبہ! آپ کے جوڑے سے سائز لیا تھا ہم نے وہی سائز رہے گا؟" درزی نے ذرا کی ذرا اُلفت کی جانب دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

"ہاں وہی رہے گا۔"

"لایئے۔" درزی اُلفت سے کپڑے لینے کو مستعد ہو گیا۔

"میرے خیال میں پہلے تو بچیوں کے کپڑے دے کر ان سے فراغت پاؤ۔" جلیس الحسن بولے۔

اُلفت کی رگ و پے میں پھر وہی آگ سی سرایت کرنے لگی

چپ چاپ اُس نے بڑے تھیلے میں موجود ایک چھوٹا تھیلا نکال کر درزی کے آگے دھر دی۔

"میاں! یہ تو ہیں دونوں بچیوں کے ایک جیسے دو جوڑے۔"

درزی نے تھیلے سے کپڑے نکال کر دیکھے پھر انہیں الٹ پلٹ کرتے ہوئے بولا۔ "ڈیزائن بتا دیجئے۔"

"بتاؤ بھئی۔" جلیس الحسن نے الفت کی جانب دیکھا۔

"میں کیا بتاؤں! ان کی پسند آپ جانیں۔" اُلفت درزی سے نظریں چُراتے ہوئے رُخ موڑ کر جلیس الحسن سے بہت دھیرے سے بولی۔

اُسے جلیس الحسن پر غصہ آ رہا تھا جنھوں نے اُسے درزی کے سامنے اس مشکل میں ڈال دیا تھا۔

اُسے بھلا کیا اندازہ ہو سکتا تھا ان کی بچیوں کی پسند ناپسند کا!

"میاں! تم اپنی پسند سے ڈیزائن کر دو۔" جلیس الحسن درزی کی جانب مڑتے ہوئے بولے۔

درزی زیرِ لب مسکرا دیا پھر کاؤنٹر پر دھری پان کی ایک پڑیا میں سے تھوڑی نکال کر گال میں دبانے کے بعد تھوڑا پیچھے جھک کے زندگی کی طرف دیکھ کر بولا۔ "چھوٹی بچیاں ہیں تو ہمیں ان سے پوچھ لیں کیسے سلوائیں گی۔"

"ارے میاں یہ کیا بتائیں گی۔ تم خود ہی ڈیزائن کر دینا۔"

"بیگم صاحبہ تو گرمیوں میں دونوں کے کُرتے ہی سلواتی رہی ہیں۔"

"بس تو کُرتے ہی سی دو۔"

"تم تو بے ہی فرما پ تو لے لوں آپ کے کُرتے کا۔" درزی نے فیتے کے ساتھ زرّین کی جانب اشارہ کیا۔

زرّین کا ناپ لینے کے بعد اُس نے پیمائش رجسٹر میں درج کرتے ہوئے پوچھا۔ "اور صاحب بڑی والی بیٹی کا ناپ؟"

جلیس الحسن سوچ میں پڑ گئے پھر بولے۔ "میاں! ایسا کرو ابھی میں بھیج دیتا ہوں، وہ نہیں ہے تو ناپ کے لئے کوئی قمیص بھی لیتے آئیں کے لیے۔"

"ہاں یاد آ گیا۔" وہ ڈھاڑی من کا سر ہلاتے ہوئے بولا پھر رجسٹر میں دیکھتے ہوئے اپنی یادداشت کی داد دیتا ہوا سا ہوتے ہوئے بولا۔ "لکھا ہوا ہے صاحب بالکل لکھا ہوا ہے..... نگین ہی نام ہے بڑی بیٹی کا؟"

"ہاں۔"

"اُن کے بھی کُرتے شلوار ہی سِلیں گے؟"

"ابھی تم خود تو بتا رہے تھے کہ گرمیوں میں بیگم صاحبہ بچیوں کے کُرتے سلواتی رہی ہیں۔"

"ہاں صاحب سلواتی تو رہی ہیں، پر فیشن کی بھی تو بات ہے نا۔"

"اچھا تم ایسا کرو بچیوں کے یہ کپڑے اپنے پاس ہی رکھو مگر کل تک کاٹنا مت۔ ہو سکا تو میں خود لے آؤں گا اُسے ورنہ وہ خود آ جائے گی ذرا تیور کے ساتھ اور بتا جائے گی تمہیں کس طرح ڈیزائن کرنے ہیں اس کے کپڑے۔"

"جیسی مرضی صاحب۔"

"بلکہ ابھی چھوٹی کے بھی مت تراشنا وہی آکر بتا دے گی۔"

"بہت بہتر۔"

درزی نے کپڑے تھیلی میں واپس رکھے اور تھیلی شوکیس میں رکھ لی۔

"اب بیگم صاحبہ کے کپڑے لے لو۔"

"جی بیگم صاحب۔"

الفت جو کہ خاموش تماشائی بنی جلیس الحسن اور درزی کا اب تک مکالمہ سن رہی تھی بڑے تھیلے سے اپنے جوڑے نکال کر درزی کے آگے رکھنے لگی۔

درزی کو نو جوڑوں کے ڈیزائن بتانے میں الفت کو گھنٹہ بھر تو لگ ہی گیا۔

ایمانداری کی بات یہ تھی کہ نو جوڑوں کی ڈیزائننگ کے سلسلے میں گھنٹہ بھر ہرگز کچھ زیادہ وقت نہ تھا بعض خواتین تو ایک جوڑے کی ڈیزائننگ پر سوچ بچار میں نو گھنٹے با آسانی صرف کر دیا کرتی ہیں!

بازار سے واپسی پر جلیس الحسن انھیں چینی ریستوران میں لے گئے۔

وہاں موم بتیوں کے پراسرار اُجالے میں کارن سوپ گھونٹ گھونٹ پیتے ہوئے جلیس الحسن کو زرّین سے لاڈ پیار کرتے دیکھ کر الفت نے بہت ماندے جی سے دل ہی دل میں سوچا "کاش! تمہارے اور میرے درمیان کوئی دیوار نہ ہوتی!"

اُسے بے اختیار رعنا جمیل یاد آ گئیں۔

اُنھوں نے کہا تھا!

"بچوں والے مرد سے شادی کا بڑا نقصان یہ ہے کہ ایسے مرد کی پوری توجہ عورت کے حصے میں آ ہی نہیں سکتی۔"

یقیناً وہ بھی اسی حقیقت کا کبھی اپنے کاشکار ہو چکی تھی۔

* * * * * * *

عظمت آپا کے ہاں دعوت بڑی شاندار رہی

ایک تو مغلئی اور چینی کھانوں کا امتزاج

اُس پر مستزاد عظمت آپا کا سلیقہ!

اگلی دعوت فضیلت کے ہاں ٹھہری۔

فضیلت کے ہاں دعوت میں بس اپنے ہی اپنے لوگ تھے یعنی دو ہا دلہن، اتّی، بابا، حنیف بھیا، بھابی اور بچے، عظمت آپا، اُن کے میاں اور بچے، فضیلت کی دونوں نندیں مع اپنے شوہروں اور بچوں کے، فضیلت کے دیور دیورانی، ہمدانی صاحب مع اہل و عیال اور فضیلت کے بنگالی میاں کے دو تین قریبی احباب۔ جن میں سے ایک صاحب شوقیہ مگر بہت اچھے گلوکار تھے انھوں نے گھنٹہ سوا گھنٹہ فقط ہارمونیم پر چند غزلیں اور گیت سنا کر اس دعوت کا لطف دوآتشہ کر دیا۔

بھیا والی ضیافت کی طرح عظمت آپا اور فضیلت نے بھی اپنی دعوتوں میں جلیس الحسن کے پیاروں بچوں کو بھی مدعو کیا

تھا مگر پہلی دعوت کی طرح جلیس الحسن ان دو دعوتوں میں بھی بچوں کو نہ لائے۔

فضیلت کے اِن دعوت کے بعد پھوپی جان نے دعوت کی۔ شاکرہ بھابی بلاوا دینے آئیں اور بڑے لاڈ و ما اصرار سے جلیس الحسن سے کہہ گئیں کہ بچوں کو ضرور اپنے ہمراہ لائیں مگر انھوں نے پچھلی تین دعوتوں کی طرح اِس دعوت میں بھی بچوں کو لے جانے سے احتراز کیا۔

شاکرہ بھابی تو جان کو آگئیں!

" اے بیٹے بھیّا بچوں کو کیوں نہ لائے؟" انھوں نے جلیس الحسن سے کہا۔

" بس جی وہ اپنی پڑھائی میں مصروف ہیں آج کل۔" جلیس نے گھڑا گھڑایا بہانہ پیش کیا۔

" تھوڑی دیر کی تو بات تھی نہ لے آتے۔"

" میں نے اُن سے کہا تھا مگر وہ اپنے ٹیسٹ کی تیاری کرنا چاہتے تھے۔"

" ہاں تو کون گھڑی بھر ذرا دیر کو بلوا لیں تو اچھا ہے۔" شاکرہ بھابی نے بات تو جلیس الحسن سے کہی مگر اپنی ساس کی طرف دیکھتے ہوئے معنی خیز انداز میں آنکھ دبائی۔

اُلفت اس وقت اُن ہی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

" نہیں میرا خیال ہے اُن کی پڑھائی زیادہ ضروری ہے۔" جلیس الحسن بولے۔

الفت کو اُن کے جواب سے ایک گونہ مسرت ہوئی۔

وہ بھی دیکھی کہ شاکرہ بھابی کے دل کا بھید نہ پا سکتی۔ دراصل وہ بچوں کو اپنے ہاں بلا کر الفت کے تیور دیکھنا چاہتی تھیں اور شاید ان بچوں سے کچھ سوتیاں لینا بھی!

جلیس الحسن کے جواب پر شاکرہ بھابی کا منہ لٹک گیا اور وہ بڑی دلسوزی سے بولیں "اے بھیّا! اب الفت اور تم ساتھ لے کر نکلا کرو انھیں بھی۔ میں نے سنا ہے تم لوگ عارف میاں، عظمت اور فضیلت کی دعوتوں میں کاہے نہیں لائے انھیں۔ بھیّا وہ بچے ہیں آخر کو اُن کا بھی تو جی چاہتا ہوگا باہر آنے جانے کو..... سچ کہتی ہوں مجھے تو تمہارے بچے بہت ہی اچھے لگے۔ بڑے تمیزدار اور سمجھ دار۔ الله اُن کو حیات و صحت بخشے۔"

اُلفت کو شاکرہ بھابی پر بڑا تاؤ آیا۔

اُن کی منافقت پر وہ جل کر ہی تو رہ گئی۔

کیسی بنتی نہ جانے بول رہی تھیں وہ جلیس الحسن کے بچوں کو دعوت میں بلوانے کے لیے جیسے اُن کی سب سے بڑی ہمدرد، بہی خواہ اور چاہنے والی وہی تو تھیں۔

کتنی چاپلوسی سے کہہ رہی تھیں:

' مجھے تو تمہارے بچے بہت ہی اچھے لگے۔ بڑے تمیزدار اور سمجھ دار!'

الفت بھولی تھوڑی تھی۔

جمعہ جمعہ آٹھ دن ہی تو ہوئے تھے شاکرہ بھابی کو اُس کے کان میں یہ صور پھونکے کہ:

' تمہارے دولہا کے بچے تو مجھے بہت ہی چھٹے ہوئے اور بدذات لگتے ہیں!'

اُسے وہ تمام باتیں یاد تھیں جو شادی کے اگلے دن شاکرہ بھابی نے اُس کے کان میں پھونکی تھیں اور اُسے انتہائی کبیدہ خاطر کر دیا تھا۔

اور

اب اس وقت کیسی منافقت دکھا رہی تھیں:

' تم اور الفت ساتھ لے کر نکلا کرو انھیں، بچے ہیں آخر کو اُن کا بھی تو جی چاہتا ہوگا باہر آنے جانے کو!'

جیسے جلیس الحسن کے بچوں کی ایک سگی وہی تو تھیں۔

الفت کو جی ہی جی میں سخت غصہ آ رہا تھا۔

لوگ بھی خوب ہیں۔

آستینوں میں خنجر چھپا کر اور چہروں پر نقاب اوڑھ کر چلتے ہیں۔

جہاں موقع دیکھا نقاب اُتار پھینکی اور خنجر نکال کر دوسرے کی پیٹھ میں گھونپ دیا۔

شاکرہ بھابی بھی ان ہی میں سے تھیں!

افسوس کی بات یہ تھی کہ وہ اپنوں میں سے تھیں!

اور جب اپنے آستین میں خنجر چھپا کر اور چہرے پر نقاب اوڑھ کر سامنے آئیں تو دکھ ہوتا ہے۔ یہی شاکرہ بھابی کے رویے پر الفت بھابی کو ہوا۔

شاکرہ بھابی کے اسی رویے کا ردعمل تھا کہ عظمت آپا نے بڑی رازداری سے الفت سے پوچھا "ہاں دلہن جان! یہ بتاؤ تو سہی کہ جلیس الحسن آپ دعوت میں بھی تمہارے دولہا بچوں کو کیوں نہیں لائے؟"

" یہ تو آپ ان ہی سے پوچھیے آپا جان۔" الفت نے کہا۔

" اے لو بھلا۔ میں کون ہوتی ہوں پوچھنے والی۔" عظمت آپا بولیں۔ " یہ تو تمہارے پوچھنے کی بات ہے تم نے پوچھا ہوتا!"

" میں نے ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔" اُس نے بڑے سادگی بھرے لہجے سے کہا۔

امر واقعہ یہ تھا کہ اگرچہ الفت جلیس الحسن سے کافی بے تکلف ہو چکی تھی اور میاں بیوی کے رشتے کا تقاضا بھی تھا جو اُس کے اور جلیس الحسن کے مابین استوار ہو چکا تھا مگر اُس نے اپنے میکے میں ہونے والی دعوتوں میں بچوں کے مدعو کیے جانے کے باوجود اُن کی عدم شرکت کے سلسلے میں جلیس الحسن سے کوئی استفسار نہ کیا تھا۔

وہ استفسار کرنا ضروری بھی نہ سمجھتی تھی۔

بلکہ سچی بات تو یہ تھی کہ وہ بچوں کے شرکت نہ کرنے ہی میں خوش تھی!

پھوپی جان کے ہاں دعوت کے بعد اگلی دعوت خالہ بی بی کے ہاں ٹھہری۔

مگر درمیانی وقفے میں بختیار ہمدانی اور ان کی بیگم نے اپنے وسیع و عریض سبزہ زار پر جلیس الحسن اور الفت کے اعزاز میں ایک پر تکلف استقبالیے کا اہتمام کر ڈالا جس میں جلیس الحسن اور بختیار ہمدانی کے چند مشترکہ احباب اور اُن کے اہل و عیال کے علاوہ الفت کے میکے سے امی، ابا، ہنیت، بھیّا، بھابی اور اُن کے بچے، عظمت آپا، فضیلت، دونوں کے میاں اور بچے بھی مدعو تھے۔

اس استقبالیے میں چاروں بچوں کی شرکت کا بلاوا بیگم بختیار ہمدانی نے نہ صرف الفت اور جلیس الحسن کو دیا تھا بلکہ بچوں سے بطور خاص خود بھی کہہ گئے تھے۔

چونکہ ہمدانی گھرانے سے جلیس الحسن کے گھرانے کے مراسم عاصمہ بیگم کے زمانے سے بلکہ اس سے بھی پہلے سے چلے آ رہے تھے۔ چنانچہ اس تقریب میں بچوں کی شرکت جلیس الحسن نے بھی ضروری سمجھی اور اُن کے استفسار پر بچوں نے بھی آمادگی ظاہر کی۔

اگرچہ اعجاز کی آمادگی نگین سے سمجھانے بجھانے کی رہینِ منت تھی۔

ویسے تو چاروں بچوں میں سے کسی ایک کے پاس بھی کسی تقریب میں شرکت کے لیے کسی چیز کی کمی نہ تھی مگر کچھ تو بچوں کو خوش کرنے کی خاطر اور کچھ اس لیے بھی کہ اس بہانے الفت اور بچوں میں قدرے یگانگت کی فضا پیدا ہو جائے جلیس الحسن انھیں بختیار ہمدانی کی جانب سے دیے جانے والے استقبالیے میں شرکت کے لیے سلائے نئے ملبوسات، جوتے اور دیگر چھوٹی موٹی چیزیں خریدوانے کے لیے بازار لے گئے۔ اعجاز کو نگین نے زبردستی کھینچا تھا۔

جلیس الحسن نے الفت کو ہمراہ چلنے کے لیے کہا تو وہ بھی انکار نہ کر سکی۔

اس روز بھی نہ جانے کیا ہوا کہ نگین گاڑی کی اگلی نشست پر بیٹھ گئی اور نگین کے کہنے پر ہی عقبی نشست پر جانے پر آمادہ نہ ہوئی۔ عقبی نشست پر نگین، اعجاز اور فراز کے براجمان ہو جانے کے سبب الفت کو بادلِ ناخواستہ نگین کے ساتھ اگلی نشست پر ہی بیٹھنا پڑا۔

اسٹیئرنگ سنبھالتے ہوئے جلیس الحسن نے دزدیدہ نگاہوں سے اپنے برابر والی نشست کی جانب دیکھا۔ الفت کے چہرے کے خطوط تنے ہوئے تھے اور وہ اس طور بیٹھی تھی کہ جگہ کے زیادہ گھیراؤ سے اُس نے نگین کو سمٹنے اور دب کر بیٹھنے پر مجبور کر دیا تھا۔

جلیس الحسن نے چپ چاپ اپنی بیاضِ دل میں لکھا:

" تال دونوں ہاتھوں سے بجنے والی ضرب المثل غلط تو نہیں..... رویہ الفت کا بھی نامناسب ہے!"

بازار میں خریداری کے دوران جلیس الحسن کو بچوں کے لیے بے دریغ پیسے خرچ کرتے دیکھ کر الفت اندر ہی اندر کھولتی رہی۔

حالانکہ اُس کی یہ کوفت قطعاً بے معنی اور سراسر حماقت تھی۔

نہ تو پیسہ اُس کی جیب سے یا اُس کے حصے کا جا رہا تھا نہ ہی بچے پرائے تھے۔

جن پر پیسہ خرچ کیا جا رہا تھا وہ پیسہ خرچ کرنے والے کے بچے تھے جو اُس کی زیرِ کفالت تھے اور اس ناتے یہ اُن کا حق بنتا تھا۔

پھر الفت کا کوفت اُٹھانا بھلا کیا معنی رکھتا تھا!

افسوس!

رعنا جمیل نے اُسے اس قسم کے اسرار و رموز نہ سمجھائے تھے۔

اور نہ ہی شاکرہ بھابی نے کوئی اشارہ دیا تھا!

اس روز جلیس الحسن نے بزاز کے توسط سے رنگائی کے لیے دیے جانے والے الفت کے دوپٹے بھی اس کی دکان سے لیے اور درزی کے ہاں بھی پھیرا لگایا۔ الفت کے نو جوڑوں میں سے تین سل چکے تھے وہ لے لیے گئے تھے۔ نگین اور زرین کے کپڑے ابھی تراشے بھی نہ گئے تھے حالانکہ نگین اگلے ہی روز باپ کی ہدایت کے مطابق اُسے اپنے اور زرین کے کپڑوں کے ڈیزائن بھی بتا گئی تھی۔

الفت کو نگین اور زرین کے کپڑے نہ سلنے سے یک گونہ خوشی ہوئی۔

حالانکہ اُس کی یہ خوشی بے معنی تھی۔

اُن کے کپڑے آج نہیں تو کل اور کل نہیں تو ایک دو روز بعد سلنے تو بہر حال تھے ہی!

اس رات جلیس الحسن نے ان سب کو کھانا باہر ہی کھلایا۔

رات کو گھر لوٹنے پر جب الفت تصویرِ بے نیازی بنی اپنے کمرے کی طرف اور بچے زینے سے اوپر جانے لگے تو جلیس الحسن کی گمبھیر آواز نے ان سب کے قدم پکڑ لیے۔

"بھئی آپ لوگ ایک دوسرے کو شب بخیر تو کہہ دیجیے۔"

اپنی اپنی جگہ وہ سب ہی متذبذب نظر آنے لگے۔ چند لمحے ٹھٹکے کھڑے رہے پھر نگین نے اس سکوت کو توڑنے میں پہل کی۔

"گڈ نائٹ!" اس نے نظریں جھکا کر آہستہ سے کہا۔

پھر فراز کے لبوں نے حرکت کی۔

اور زرین بھی منمنائی۔

مگر اعجاز نے سپر نہیں ڈالی۔

"گڈ نائٹ!" الفت نے بادلِ ناخواستہ کہا اور دوسرے ہی لمحے مڑ گئی۔

جلیس الحسن کو اس کا انداز ناگوار گزرا مگر وہ اُسے نظر انداز کرتے ہوئے اعجاز کی جانب بڑھے اور دوستانہ انداز میں اُس کے شانے پر ہاتھ دھرتے ہوئے زینے سے اوپر پیش قدمی کرنے لگے۔ نگین، زرین اور فراز نے اُن کی پیروی کی۔ ملازم شاید پہلے ہی اوپر سے جا چکا تھا۔

جلیس الحسن کا ارادہ تھا کہ اوپر جانے کے بعد بچوں بالخصوص اعجاز کو کچھ ہدایتیں، کچھ نصیحتیں اور الفت کے ساتھ اپنا رویہ بدلنے کی تلقین کریں گے۔

مگر اوپر پہنچتے ہی ان کا ارادہ بدل گیا۔ نگین، زرین اور فراز کے اُن کے کمروں میں جانے کے بعد انھوں نے اعجاز سے اُس کے کمرے کے دروازے پر رُک کر کہا ——— "اچھا بیٹے اب صبح ملاقات ہوگی!"

اعجاز جو اُن سے نصیحتوں کی توقع کر رہا تھا متذبذب نگاہوں سے انھیں دیکھنے لگا۔

جلیس الحسن کے چہرے پر گمبھیر سی مسکراہٹ عود کر آئی۔ انھوں نے اعجاز کی پیشانی کو بوسہ دیا اور بولے "گڈ نائٹ!"

"گڈ نائٹ پاپا!" اعجاز نے کہا۔

"یہی دو الفاظ بیٹا...... صرف یہی دو... اگر آپ نے وہاں بھی کہہ دیے ہوتے تو میں بھی خوش اور مطمئن ہو جاتا اور اس عورت کے دل میں بھی آپ کے لیے جگہ پیدا ہو جاتی جو آپ کی ماں نہیں ہے مگر آپ کی ماں بننے والی ہے!"

اعجاز کچھ نہیں بولا۔

لمحہ بھر پہلے اُس کے چہرے پر جو خفت عود کر آئی تھی اُس کی جگہ دبی دبی سی ناگواری نے لے لی۔

"گڈ نائٹ!" انھوں نے ایک دفعہ پھر کہا اور اعجاز کو اُس کے کمرے کے دروازے پر چھوڑ کر پلٹے تو نگین کو اُس کے کمرے کی کھڑکی سے جھانکتے پایا۔ زرین اُس کی آڑ میں کھڑی تھی۔

وہ جلیس الحسن نگین کے کمرے میں در آئے۔

انھیں کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر نگین زرین کا ہاتھ تھامے کھڑکی کے پاس سے ہٹ گئی۔ جلیس الحسن ایک لمبی سانس کھینچتے ہوئے تھکے تھکے سے کمرے کی مشرقی دیوار کے ساتھ پڑے دیوان پر بیٹھ گئے اور زرین کو اپنے پاس بلا کر اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے اور اُس کے بال سنوارتے ہوئے نگین کو مخاطب کر کے بولے "نگین بیٹے آپ لوگ اپنی ممی کو بھی تو ہر رات گڈ نائٹ اور ہر صبح گڈ مارننگ کہا کرتے تھے نا؟"

"جی پاپا!" اُس نے سر جھکا کر کہا۔

"میں بہت خوش ہوں گا بیٹے اگر آپ اس معمول کو اپنی ماما کے ساتھ بھی برقرار رکھیں!" انھوں نے کہا پھر وہ نگین کی جانب دیکھتے ہوئے بولے "کیا میں اُمید رکھوں بیٹے جی کہ ایسا ہی ہوگا اور آپ چھوٹے بہن بھائیوں کو بھی اس کا پابند کرنے کی کوشش کریں گی؟"

نگین نے گھائل نظروں سے اُن کی طرف دیکھا پھر سر جھکا کر اپنے ہاتھوں کی انگلیاں باہم مروڑنے لگی۔

جلیس الحسن اپنی جگہ سے اُٹھ کر اُس تک پہنچے اور انھوں نے اس کے سر پر ہاتھ دھرتے ہوئے کہا "میری خوشی کی خاطر بیٹا!"

"آل رائٹ پاپا! پاپا!" اُس نے گھٹی گھٹی سی آواز میں کہا۔

"تھینک یو بیٹے!" وہ اُس کا سر تھپتھپاتے ہوئے بولے پھر انھوں نے زرین کی جانب مڑتے ہوئے کہا "بیٹے جان اب آپ سو جایئے گا!"

"پاپا......" زرین کہتے کہتے رُک گئی۔

"ہاں بولو!" جلیس الحسن سمجھتے بوجھتے انجان بن گئے۔

"پاپا اب آپ روز کیوں نہیں سُلاتے ہیں؟"

عاصمہ بیگم کے جانے کے بعد زرین کو تھپکیاں دے کر سُلانا اور اُس کے سونے تک اُس کے پاس ہی بیٹھے رہنا جلیس الحسن کا معمول بن چکا تھا۔ الفت سے شادی کے بعد بھی وہ چار دن تک یہ معمول نباہتے رہے تھے مگر جب دعوتوں کا سلسلہ شروع ہوا تھا رات گئے واپسی کے باعث ہر دوسرے تیسرے دن اُن کے اس معمول میں رخنہ پڑ رہا تھا۔

مگر آج تو وہ گھر پر ہوتے ہوئے بھی زرین کو آپ ہی سو جانے کی ہدایت کرتے ہوئے جانے کے لیے پر تول رہے تھے! کیونکہ اوپر آتے ہوئے وہ الفت کے تیور دیکھ آئے تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ اُن کے زیادہ دیر اوپر رُکنے سے الفت کا موڈ اور زیادہ بگڑے۔

وہ حالات کو بگڑنے نہیں دینا چاہتے تھے اور یہی سبب تھا کہ چند روز قبل یہ فیصلہ کر لینے کے باوجود کہ وہ الفت یا بچوں کو اُن کے طرزِ عمل پر روکنے ٹوکنے یا کسی قسم کی تنبیہ کرنے کے بجائے حالات کا رُخ دیکھتے اور سمجھنے کے بعد ہی کوئی حکمتِ عملی اختیار کریں گے حالات کو بگڑنے سے بچانے کی خاطر اپنے سابقہ فیصلے پر خطِ تنسیخ کھینچ کر وہ دونوں فریقوں کو ہلکی سی تنبیہ کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

اُنھوں نے جھک کر زرین کے سر کو بوسہ دیا پھر پیار کی بار کی دونوں بیٹیوں کو دیکھتے ہوئے شب بخیر کہا اور کمرے سے نکل گئے۔

نیچے جاتے جاتے اُنھوں نے ذرا کی ذرا فراز کے کمرے میں جھانکا وہ سرہانے کے کچھ مغموم کچھ متفکر سا بیٹھا تھا۔ اُسے یوں بیٹھا دیکھ کر جلیس الحسن کو دکھ ہوا کہ یہ دن تو اُس کے کھیلنے کودنے اور فکرِ فردا و امروز سے بے نیازی کے دن تھے یوں متفکر و مغموم ہو کر بیٹھنے کے تو نہیں!

عاصمہ بیگم کے جانے سے پہلے فراز اُن کے چاروں بچوں میں سب سے زیادہ شرارتی اور کھلنڈرا ہوا کرتا تھا۔ نچلا ہو کر بیٹھنا تو اُس کی سرشت میں شامل ہی نہ تھا۔

اور وہ عاصمہ بیگم کا لاڈلا بھی بہت تھا۔

تب ہی تو ان کے جانے کے بعد وہ دونوں گم صم رہا اور بمشکل تمام زندگی کے اس نئے اور تکلیف دہ رُخ سے سمجھوتا کر پایا تھا۔

لیکن باپ کی دوسری شادی، گھر میں ایک نئی عورت کی آمد اور بدلتے ہوئے حالات نے اُسے ایک بار پھر ذہنی انتشار سے دوچار کر دیا تھا جیسے وہ ماں کے جانے کے بعد دوچار ہوا تھا۔

جلیس الحسن ایک ٹھنڈی سانس بھرتے فراز کے کمرے میں داخل ہو گئے۔ ان کے قدموں کی آہٹ سُن کر فراز چونکا۔

"بیٹے ابھی سونے کی تیاری نہیں ہو رہی ہمارے؟ آپ نے تو ابھی جوتے بھی نہیں اُتارے۔"

فراز نے گہری سوچ سے بوجھل نگاہوں سے اُن کی جانب دیکھا تو جلیس الحسن کا جی کٹ کے رہ گیا۔

جن نگاہوں میں خوشیوں اور شرارتوں کے جگنوؤں کی دمک دکھائی دینی چاہیے تھی وہاں اندیشوں کی پرچھائیاں لرزاں تھیں۔

"کیا بات ہے بیٹا؟" جلیس الحسن اُسے متفکر اور قدرے خائف نگاہوں سے اپنی طرف دیکھتے پا کر اُس کے قریب آ کھڑے ہوئے۔

"پاپا......" اُس نے سر اُٹھا کر انھیں دیکھا۔

"ہاں بولو رُک کیوں گئے؟"

"آپ..... نے..... بھائی کو ڈانٹا؟" وہ دکھ اور تفکر سے عبارت لہجے میں بولا۔

"نہیں..... نہیں تو..... تم سے کس نے کہا کہ میں نے بھائی کو ڈانٹا؟" جلیس الحسن اُس کے قریب بیٹھ گئے۔ اور اُنھوں نے اپنا بازو اُس کے شانوں پر دراز کر دیا۔

"کسی نے نہیں۔"

"تو پھر؟"

"میں سمجھا شاید ڈانٹا ہوگا۔"

"کیوں؟ تم نے یہ کیوں سمجھا؟"

"کیونکہ......"

"پھر رُک گئے..... بولو نا۔"

"کیونکہ بھائی نے گڈ نائٹ نہیں کہا تھا نا۔"

"کسے؟" جلیس الحسن انجان بن گئے۔

وہ چپ ہو رہا۔

"کسے گڈ نائٹ نہیں کہا تھا بھائی نے؟"

"مما کو۔" وہ بہت مشکل سے کہہ پایا۔

جلیس الحسن اس کی زبان سے یہی سننے کو تو انجان بن گئے تھے۔

"بیٹا جی! میں نے بھائی کو ڈانٹا تو نہیں مگر آپ کا کیا خیال ہے بھائی کو گڈ نائٹ کہنا تو چاہیے تھا نا؟"

وہ چپ بیٹھا رہا۔

"بولو بیٹے۔"

"جی پاپا۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

"کہنا چاہیے تھا نا؟"

"جی پاپا۔" اُس نے پھر تائید کی۔

"خیر آپ نے تو کہا تھا اور میں آپ سے بہت خوش ہوں۔"

فراز نے چونک کر اُن کی جانب دیکھا۔

وہ جھکے اور انھوں نے اُس کی پیشانی چومتے ہوئے کہا۔ "تم بہت اچھے بیٹے ہو اور میں تم سے واقعی بہت خوش ہوں۔"

"تھینک یو پاپا۔" اُس نے دھیرے سے کہا۔

"او کے بیٹا۔ اب آپ جوتے اُتاریں، کپڑے بدلیں اور سونے کی تیاری کریں۔ پاپا بھی تھک گئے ہیں انھیں بھی اب آرام کرنا ہے۔" وہ اُٹھ کھڑے ہوئے جاتے جاتے فراز کی پیشانی کو ایک بار پھر چوما شب بخیر کہا اور اُس کے کمرے سے نکل گئے۔

کاش! تم نے ان بچوں کے بارے میں سوچا ہوتا عاصمہ! جلیس الحسن نے شکستہ قدموں سے زینہ عبور کرتے ہوئے دکھے دل سے سوچا۔

وہ اپنی خواب گاہ میں پہنچے تو اُلفت کو اپنا منتظر پایا مگر قدرے بگڑے ہوئے تیوروں کے ساتھ!

"بہت جلدی آ گئے آپ!" اُلفت نے دو دھاری تلوار کی طرح کٹیلے لہجے میں کہا۔

جلیس الحسن نے اُس کے چہرے پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالی پھر اُس کے طنزیہ لہجے کو نظر انداز کرتے ہوئے بولے۔ "بچے ذہنی طور پر کچھ اُلجھ سے گئے ہیں!"

اُلفت ایک گہری اور ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی۔

کاش! وہ جان سکتے کہ اُن سے شادی کے بعد وہ بھی کچھ کم اُلجھی ہوئی نہ تھی۔

وہ تھکے تھکے سے اُس کے قریب بیٹھے اور اُنھوں نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھامتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔

اُلفت مضطرب ہو کے رہ گئی۔

حالات خواہ کیسے بھی سہی۔

جلیس الحسن اُس کا خدائے مجازی ہونے کا شرف رکھتے تھے۔

اور سچی بات یہ تھی کہ اگر چاہ بچوں کا کانٹا اُس کے دل میں نہ اٹکا ہوتا تو جلیس الحسن جیسے شریک سفر کی رفاقت پر وہ بجا طور پر نازاں ہوتی۔

وہ اُس کی ہر ضرورت کا پورا خیال رکھ رہے تھے۔

اُسے مستقبل میں بہت سی خوشیاں دینے کے وعدے کر رہے تھے۔

خلوتوں میں وہ بہت ٹوٹ کر چاہنے والے شوہر بن جاتے۔

اُن کی ان مہربانیوں کا تقاضا تھا کہ وہ اُن کے اضمحلال پر مضطرب ہو جاتی اور اُن کی پژمردگی کا سبب دریافت کرتی سو اُس نے پوچھا۔

"کیا بات ہے؟ بہت تھک گئے ہیں کیا؟"

"نہیں۔" انھوں نے دھیرے سے کہا۔

"تو پھر اس طرح دونوں ہاتھوں سے سر کیوں تھام رکھا ہے؟"

"بس ایسے ہی ذرا سر میں درد ہے۔" یہ کہتے ہوئے وہ جوتوں سمیت بستر پر دراز ہو گئے۔

اُلفت نے اُن کے جوتے اُتارے پھر اُن کے سرہانے بیٹھ کر اُن کا سر دبانے لگی۔

عجب اسرار و لطافت سے گندھا رشتہ ہے یہ بھی!

جلیس الحسن کو یوں لگا جیسے اُن کی پیشانی اور اُن کی کنپٹیوں پر حرکت کرتی اُلفت کی انگلیاں اُن کی ساری تھکان اور اضمحلال اپنی پوروں میں جذب کرتی جا رہی ہوں۔

کافی دیر وہ آنکھیں بند کیے چپ پڑے رہے پھر اُن کے بازوؤں نے اُلفت کو اپنے حصار میں کھینچ لیا۔

"اُلفت!" اُنھوں نے دھیرے سے کہا۔ "بچے عاصمہ سے بہت پیار کرتے تھے۔"

اُف خدایا!

عاصمہ کا نام اُن کی زبان پر کیسے وقت آیا تھا!

اُلفت کے تیور سے کھنچ سے گئے۔

اور
گھر کی بالائی منزل پر نگین اور رزینہ یہ اطمینان کر لینے کے بعد کہ پاپا نیچے چلے گئے ہیں اور اُن کے کمرے کی بتی بھی بجھا دی گئی تھی دبے پاؤں اپنے کمرے سے باہر نکل آئیں۔

فراز نے جو ہر آہٹ پر کان لگائے بیٹھا تھا اپنے کمرے سے ملحق بہنوں کے کمرے کا دروازہ بہت آہستگی سے کھلنے اور پھر بند ہونے کی آواز اور پھر پا مال کی میں قدموں کی آہٹ سن کر کھڑکی سے جھانکا اور دونوں بہنوں کو دبے پاؤں اعجاز کے کمرے کی سمت جاتے دیکھ کر اُن کے پیچھے لپکا۔

اعجاز کے کمرے کے نیم وا دروازے سے انھوں نے اندر جھانکا۔ وہ منہ پھلائے غصے میں بھرا کسی گہری سوچ میں بیٹھا تھا۔

نیم وا دروازہ وا ہوتے پر وہ چونکا اور اُس نے دروازے کی سمت دیکھا۔ وہ تینوں جھجک سے اُس کے کمرے میں در آئے۔

"ہائے!" نگین نے اپنی دلفریب مسکراہٹ سے بھائی کے چہرے پر لرزاں رنج و ملال کی پرچھائیوں کو دھونے کی کوشش کی۔ مگر وہ بدستور منہ پھلائے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے آنکھیں اوپر کیے پاؤں میز پر دھرے بیٹھا رہا۔

نگین آگے بڑھیں اور اُس نے آہستہ سے پوچھا۔ "بہت ڈانٹ پڑی پاپا سے؟"

"شٹ اپ!" اعجاز چیخا اور اُس نے دونوں پیروں سے میز کو اوندھا دیا۔

فراز اور رزینہ سہم سے گئے۔

"آر یو میڈ؟" نگین نے اپنا بڑا پن دکھانے کی کوشش کی۔ "کیا پاگل ہو گئے ہو تم؟"

"ہاں۔" اعجاز بھڑک کر بولا اور اُس نے اوندھی پڑی میز کو پوری قوت سے ٹھوکر ماری اور کتھوا بگاڑ۔

"بیوقوف مت بنو۔"

نگین نے اس کا بازو تھام لیا اور اُسے بڑی دلسوزی اور دردمندی سے دیکھنے لگی۔

اعجاز مٹھیاں بھینچتا آگے بڑھا اور دیوانہ وار دیوار پر مکے برسانے لگا۔

نگین نے فرزانہ اور زرین کی طرف دیکھا۔ دونوں بھائی پر طاری جنونی کیفیت سے خائف نظر آ رہی تھیں۔ وہ آگے بڑھی اور اعجاز کو اس کی دیوانہ وار حرکت سے روکنے کی کوشش کرنے لگی۔

"گیٹ آؤٹ۔" اعجاز دہاڑا۔

"پاگل ہو گئے ہو...... میں تمہاری بہن ہوں تمہاری اور تم مجھے دفع ہو جانے کو کہہ رہے ہو...... ذرا دیکھو تو فرزانہ اور چھوٹی کتنے خوفزدہ ہو رہی ہیں؟"

"ہونے دو...... مجھے کسی کی پروا نہیں ہے۔"

اعجاز بدستور دیوار پر مکہ آزمائی کیے گیا۔

"فار گاڈ سیک جانی!" نگین نے پوری طاقت سے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھڑی ہو گئی۔ "یہ کیا بیوقوفی کر رہے ہو تم؟"

"وچ" وہ دانت پیس کر بولا۔

"کیا؟ تم مجھے وچ کہہ رہے ہو؟ کیا میں تمہیں جادوگرنی لگتی ہوں؟"

"ناٹ یو۔" وہ اس کے ہاتھ جھٹکتے ہوئے بولا۔ "تمہیں نہیں...... میں اسے کہہ رہا ہوں جو نیچے رہتی ہے۔"

"جانی!" نگین کے لہجے میں ہلکی سی تنبیہہ تھی۔ "یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟ اگر کبھی پاپا نے سن لیا تو بہت خفا ہوں گے۔"

"ہونے دو...... مجھے پروا نہیں۔"

"اتنا غصہ کیوں؟ کیا پاپا نے ڈانٹا ہے؟"

"نہیں۔" وہ تڑپ ہو کر بولا۔

"تو پھر؟"

"میں کسی کو گڈ مارننگ، گڈ نائٹ نہیں کہہ سکتا۔"

"بھائی کیا فرق پڑتا ہے اگر تم کہہ دو تو؟"

"وہ مجھے بالکل اچھی نہیں لگتی۔"

اعجاز نے توضیح طلب نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں مجھے بھی اچھی نہیں لگتیں وہ...... مگر گڈ مارننگ یا گڈ نائٹ کہہ دینے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اگر پاپا چاہتے ہیں کہ ہم انہیں گڈ مارننگ، گڈ نائٹ کہا کریں تو ٹھیک ہے۔ میں تو ماننڈ نہیں کرتی تم بھلا کیوں کرتے ہو اور غصے ہوتے ہو!"

"میں نے کہا نا وہ مجھے اچھی نہیں......"

"اوہ! آئی ایم جانی...... میں جانتی ہوں کہ وہ تمہیں تمہاری پرنسپل مسز ہاشمی اور میتھس کے مسٹر اپلٹے بھی نہیں لگتے مگر کیا تم انہیں گڈ مارننگ، گڈ آفٹر نون نہیں کہتے؟"

اعجاز لاجواب سا ہو کر اس کا منہ تکنے لگا۔

"ہاں...... ہاں جانی۔" نگین نے خوابیدہ محبت سے اسے دیکھا پھر اس کا بازو تھپتھپاتے ہوئے بولی۔ "اچھا بیٹھو تو جاؤ۔"

اعجاز صوفے پر بیٹھ گیا اور اس کا انداز ایسا تھا جیسے ان کی محبت آمیز لہجے سے پگھل گیا۔

"فرزانہ اور چھوٹی تم دونوں وہاں ڈرے سہمے کیوں کھڑے ہو؟ یہاں آؤ۔" نگین نے چھوٹے بھائی اور بہن کی جانب توجہ دی۔

وہ سب اکٹھے مل بیٹھے۔

اور نگین اپنے بڑے ہونے کا حق ادا کرنے کے لیے اعجاز کو سمجھانے بجھانے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر دوسرے پہلو پہ آمادہ نہ ہوا۔

"تو...... آئی ہیٹ ہر۔" بالآخر اس نے فیصلہ سنا دیا۔

"فرزانہ کیا تمہیں اچھی لگتی ہیں وہ؟" نگین نے فرزانہ سے پوچھا۔

جواب نفی میں آیا۔

"اور تمہیں چھوٹی؟ کیا تمہیں اچھی لگتی ہیں؟"

زرین نے پہلے کچھ اس طرح دیکھا جیسے کہتی ہو:

"مذاق کر رہی ہو!"

پھر منہ بنا کر بڑی قطعیت کے ساتھ بولی "نو!"

"مجھے بھی نہیں۔" نگین نے اعجاز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "دیکھو بھائی ہم چاروں میں سے کوئی بھی انہیں پسند نہیں کرتا۔ مگر کیا ہم انہیں گھر سے نکال سکتے ہیں؟"

اعجاز نے بے بس نگاہوں سے انہیں دیکھا۔

"نہیں نا؟" نگین نے کہا۔ "تو پھر اپنا دل جلانے سے فائدہ؟" وہ پل بھر کو تھمی پھر بولی "ہمیں تو بس اپنے پاپا سے مطلب ہونا چاہیے جس بات میں وہ خوش ہوں وہ کرو۔"

"مجھے بیوقوف بنانے کی کوشش مت کرو۔ میں تم سے چھوٹا ضرور ہوں مگر تمہاری طرح بیوقوف نہیں ہوں...... جو بات مجھے اچھی نہیں لگتی وہ میں کسی کی خاطر بھی نہیں کر سکتا...... وہ مجھے بالکل بھی اچھی نہیں لگتی اور میں اس سے بات کرنا تو کیا اس کی طرف دیکھنا بھی نہیں چاہتا۔"

"پاپا کی خاطر بھی نہیں؟"

"نہیں۔" اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا پھر منہ بگاڑ کر بولا۔ "صورت دیکھی ہے تم نے اس کی؟"

"بری بات بھائی صورت میں عیب نہیں نکالتے۔ صورت تو اللہ کی بنائی ہوئی ہے۔"

"ہاں مگر بعض لوگ اللہ کی بنائی ہوئی صورت کو اپنی حرکتوں سے بگاڑ لیتے ہیں۔ دیکھا تھا تم نے جب وہ پاپا سے چک کر رہی تھی تو کیسے منہ بنا رہی تھی...... یوں کر کے۔" اعجاز نے الفت کی یوں نقل اتاری کہ فرزانہ اور زرین کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

"خود تو اتنی ساری جگہ گھیر لی سیٹ پر اور مجھے دبا کر سینڈوچ بنا دیا۔" زرین نے اتنی بے ساختگی سے یہ بات کہی کہ نگین بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔

اعجاز کی ہذیانی کیفیت کے باعث ماحول پر چھائی سختی اب دھیرے دھیرے پر سمیٹ رہی تھی۔

پھر وہ چاروں دیر تک اکٹھے بیٹھے الفت کی چال ڈھال، حرکات و سکنات اور انداز تکلم کا مذاق اڑاتے اور نقل اتارتے رہے۔

گو ان کا ایسا کرنا اخلاقی اعتبار سے کسی طور بھی مستحسن نہ تھا مگر اب اس کا کیا علاج کہ وہ اسی طور تسکین پا رہے تھے۔ اور انہیں سمجھانے بجھانے والا کوئی نہ تھا۔

اگرچہ نگین نے اپنے طور پر یہ فرض ادا کرنے کی کوشش کی تھی مگر بہر حال وہ ابھی پختہ کاری کی منزلوں سے بہت دور ایک نو عمر لڑکی ہی تو تھی جسے گھر میں اس کی ماں کی جگہ ایک نئی عورت کی آمد نے شاید اعجاز سے بھی زیادہ ملول کر رکھا تھا مگر کچھ تو اس کے لڑکی ہونے کا فطری تقاضا اور کچھ چھوٹے بہن بھائیوں کا خیال کہ وہ اپنی جذباتی کیفیت کو اعتدال میں رکھے ہوئے تھی۔

لیکن کچھ اپنی جذباتی تسکین کی خاطر اور کچھ بہن بھائیوں کی خوشی کے لیے وہ اس وقت سنجیدگی اور بڑے پن کے خول سے نکل آئی تھی اور الفت کی ایسی ایسی نقلیں اتار رہی کہ فرزانہ اور زرین ہی کیا اعجاز بھی جی کھول کر ہنس رہا تھا۔

کاش عاصمہ بیگم دیکھ پاتیں کہ جن بچوں کی تربیت انہوں نے محبت، توجہ اور انہماک سے کی تھی، ان کی ایک بھول سے وہ کتنے بکھر کے رہ گئے تھے۔

خدا جانے ان بچوں کی خوشیوں کو کس بد نظر کی نظر لگ گئی تھی!!

٭٭٭٭٭٭

چاروں کے چاروں بہت پیارے تھے۔

اور ان میں سے ہر ایک میں کوئی نہ کوئی وصف ایسا ضرور تھا جو اُسے دوسرے سے ممتاز کرتا تھا۔

نگین سب سے بڑی اور ہر اعتبار سے شکل و صورت اپنی ماں کا نقش ثانی تھی۔ اس کی قامت دراز اور سراپا انتہائی متناسب تھا۔ اس کی اجلی رنگت پر کلاوں رخسار انتہائی بھلے لگتے۔ اس کے چہرے کے نقوش مغلئی شہزادیوں کی طرح تیکھے تھے۔ بڑی بڑی گہری سیاہ آنکھوں میں تیرتی کاجل کی لکیر اس کی آنکھوں کو اور دلفریب بنا دیتی۔ اس کی لانبی اور ریشمی سیاہ زلفوں پر اس کی ساتھیاں فدا تھیں جب وہ انہیں ایک مخصوص انداز سے جھٹکتی تو اس کی سہیلیاں اسے رشک سے دیکھتی رہ جاتیں۔

بحیثیت مجموعی نگین ایک خوبصورت لڑکی تھی۔

مہذب اور سمجھدار تو وہ اپنی ماں کے زمانے ہی سے تھی مگر ماں کے جانے کے بعد اس نے سنجیدگی اور بڑے پن کا

زیادہ اُداس رہا تھا۔ وہ خود کو بہت بڑا سمجھنے لگی تھی اور چھوٹے بہن بھائیوں بالخصوص زرّین کے ساتھ اُس کا رویہ خواہ مخواہ کی نسبت مادرانہ ہو گیا تھا۔

اُس نے میٹرک کا امتحان دے رکھا تھا اور اب اپنے نتیجے کی منتظر تھی۔ اُسے اچھے نمبروں سے کامیابی کا یقین تھا۔ نتیجے کے بعد وہ شہر کے ایک معروف کالج میں داخلہ لینے کی خواہش مند تھی۔

باپ کی دوسری شادی نے اُسے بھی ناخوش ہی کیا تھا۔ مگر کبھی اپنے بڑے پن کا لحاظ رکھتے ہوئے اور کچھ اپنے لڑکی ہونے کے سبب وہ اعجاز کی طرح مشتعل نہ ہوتی تھی اور سوتیلی ماں کے خلاف اپنے دل میں ناپسندیدگی بلکہ نفرت کے جذبات ہوتے ہوئے بھی اُن کا واضح طور پر اظہار کرنے سے گریز کر رہی تھی۔

البتہ اس سلسلے میں اُسے اعجاز کی طرف سے خاصی تشویش بھی تھی اور خوف بھی کیونکہ وہ اُس کی طبیعت سے اچھی طرح واقف تھی۔

اعجاز عمر میں تو نگین سے چھوٹا تھا مگر بہ اعتبار قد و قامت وہ نہ صرف اُس سے بلکہ اپنے ہم سِن لڑکوں سے بھی بڑا لگتا تھا۔ شکل و صورت میں وہ اپنے ماں باپ کا ملا جلا عکس تھا۔ بلا کا ذہین مگر بے پناہ غصہ ور۔ تھا اُس کا غصہ ور ہونا کوئی نئی بات نہ تھی بچپن ہی سے وہ ایسا تھا۔

عاصمہ بیگم اکثر ہنس کر اسے اور اُس کے دوسرے بھائی بہنوں کو بتایا کرتی تھیں کہ اُس کے غصے کا شیر خوارگی کے زمانے میں بھی یہ عالم تھا کہ اگر دودھ کی بوتل ملنے میں دیر ہو جاتی یا دودھ میں شکر کم گھولی جاتی تو وہ بوتل کی نپل کو دانتوں سے چبا کر کاٹ دیا کرتا تھا۔ اور یا تو دودھ منہ میں بھر جانے کے سبب اسے اچھو لگ جاتا تھا پھر اُس کا منہ اور گردن تک نپل سے بہہ نکلنے والے دودھ میں لت پت ہو جایا کرتے تھے۔

خلافِ مزاج باتوں پر مشتعل ہو جانا اعجاز کی عادت بن چکی تھی۔ اشتعال میں وہ عجیب و غریب حرکتیں کرنے لگتا تھا۔ اپنے کمرے کی چیزیں الٹ پلٹ کر رکھ دیتا تھا چیزوں کو ٹھوکریں مار مار کر اوندھا دیتا۔ مٹھیاں بھینچ کر دیواروں پر مکے مارنے لگتا۔

عام حالات میں تو وہ بھی نگین کی طرح بڑا مہذب اور سنجیدہ دار نظر آتا تھا۔ باتیں ایسی عقل کی کرتا کہ بڑوں کو لاجواب کر کے رکھ دیتا۔

بلا کا ذہین تھا۔ اسکول میں اساتذہ سے ایسے سوالات کرتا تھا کہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کبھی کبھی تو وہ بغلیں جھانکنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ اسکول میں شرارتیں بھی کرتا تو ایسی کہ ساتھی اُس کی ذہانت کی داد دیے بنا نہ رہتے۔ گو بیشتر اساتذہ اس کی شرارتوں سے محظوظ ہوا کرتے تھے مگر پرنسپل مسز ناز آپا اپنے فطری چڑچڑے پن کے سبب اسے ناپسندیدہ بچوں کی فہرست میں رکھتی تھیں۔ اور خود بھی وہ اعجاز کے رویے ناپسندیدہ استادوں کی فہرست میں شامل تھیں۔ ریاضی کے سر پانڈے تو کلاس میں داخل ہوتے ہی انگلی اعجاز کی جانب اٹھاتے ہوئے تنبیہ کر دیا کرتے تھے کہ وہ اُن سے کوئی الٹا سیدھا سوال نہ کرے۔ حالانکہ سوال تو وہ سیدھے ہی کیا کرتا تھا البتہ جواب ذرا ٹیڑھے ہوا کرتے تھے جن پر اکثر سر پانڈے اُلجھ جایا کرتے تھے اور جھنجلا کر نگین بیشتر کہا کرتے تھے:

"اعجاز! اپنی بہن نگین سے سبق سیکھو۔ دیکھو کتنی اچھی تمیزدار لڑکی ہے۔"

اعجاز کا اکثر جی چاہتا کہ وہ سر پانڈے کو بتائے کہ اُس کی بہن بھی اُس سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھی فرق تھا تو صرف اتنا کہ وہ چپ رہنا جانتی تھی جبکہ وہ چپ نہیں رہ سکتا تھا۔

غصہ ور ہونے کے علاوہ اعجاز میں کوئی اور عیب نہ تھا۔

عاصمہ بیگم اُس کی تربیت میں پورے عزم و احتیاط سے کام لینے کے باوجود اُس کے غصے کو زائل کرنے میں ناکام رہی تھیں۔ وہ اُن کے دوسرے بچوں کی طرح مہذب تھا سمجھ دار اور ذہین بھی تھا مگر خلافِ مزاج بات پر یک بیک بھڑک اٹھنے پر قابو نہ رکھ سکتا تھا۔

ماں کے جانے کے بعد نگین نے اعجاز سے اور پتلے کے بہن بھائیوں والے تمام فطری اختلافات ختم کر کے مکمل مفاہمت کر لی تھی اور وہ بھی خاصا سنبھل گیا تھا۔ اپنے غصے پر قابو رکھنے کی کوشش کرنے لگا تھا۔

مگر باپ کی دوسری شادی نے بُری طرح گڑبڑ کر دی تھی۔

سوتیلی ماں سے اُسے ایک عجیب سی رقابت کا احساس ہوتا تھا۔ وہ اُسے ذرا بھی نہ بھاتی تھی اور اُسے اپنی ماں کی جگہ دینے کے لیے وہ قطعاً آمادہ نہ تھا۔

فراز پتا پر پُوت کی روز بروز متواتی تصویر تھا۔ قرائن گواہ تھے کہ وہ بڑا ہو کر ہو بہو باپ کی تصویر بننے جا رہا تھا۔ بڑے بھائی اعجاز کے برخلاف وہ دھیمے مزاج کا بچہ تھا۔ شاید اسی لیے جب وہ اعجاز کو کسی سبب سے غصے میں دیکھتا تو

سہم جایا کرتا تھا۔

وہ تمیزدار اور کم گو لڑکا تھا۔ دوسرے بھائی بہنوں کی طرح ذہین تھا۔ اُس کے مزاج کے دھیمے پن کے سبب اُس کے اساتذہ حیران ہوا کرتے تھے کہ کیا وہ واقعی اعجاز کا سگا بھائی تھا؟

فراز کو ماں سے حد درجہ پیار تھا جتنا نچہ اُن کے جانے کے بعد وہ کسی سبب سے زیادہ مضطرب بھی ہوا تھا اور دونوں اُلجھا اُلجھا سا رہا تھا۔ زبان سے تو کچھ نہ بولتا مگر دل ہی دل میں ماں کو یاد کیے جاتا تھا۔ بہ وقت تمام وہ ماں کی جدائی کا عادی ہو رہا تھا۔ مگر نئی ماں کی آمد نے اُس کی ذہنی کیفیت کا شیرازہ ایک بار پھر بُری طرح بکھیر کر رکھ دیا تھا۔ وہ نئے حالات سے سمجھوتا نہ کر پا رہا تھا۔

لیکن کچھ ابھی کم عمری اور کچھ مزاج کے فطری پن کے سبب وہ اعجاز کی طرح کھل کر احتجاج بھی نہ کر پا رہا تھا۔ اُس کی حالت اِن دنوں ایسی ہی تھی جیسے کوئی معصوم بچہ بھٹک کر کسی اور طرف آ نکلا ہو اور اب بیچ راستے میں کھڑا حیرانی سے یہ جاننے کی کوشش کر رہا ہو کہ اُسے جانا کہاں ہے؟

زرّین چھوٹی ہونے کے سبب سب کی لاڈلی تھی۔

ماں کے جانے کے بعد اُسے پوری دنیا ہی بے معنی محسوس ہونے لگی تھی۔ رات کو پاپا کا ہاتھ پکڑ کر سونے لگی تھی۔ وہ باپ کی لاڈلی اور چہیتی تو ماں کے زمانے میں بھی رہی تھی مگر ماں کے جانے کے بعد تو انھوں نے اُسے اپنی مسند دل پر پوری محبت کے ساتھ بٹھا لیا تھا۔

مگر نئی ماں کی آمد نے اُس کے ساتھ بھی گڑبڑ کر دی تھی۔ اب اُسے ہر دوسرے تیسرے دن پاپا کا انتظار کرتے کرتے ہی سو جانا پڑتا تھا۔ وہ ڈراؤنے خواب دیکھنے لگی تھی۔

نئی ماں اُسے بھی اتنی ہی ناپسند تھی جتنی کہ اُس کی بڑی بہن اور بھائیوں کو مگر وہ خود اس سلسلے میں کچھ زیادہ بولنے کے بجائے بہن بھائیوں کی سننے پر زیادہ اکتفا کرتی تھی۔

بڑے بھائی اعجاز نے اُسے ہدایت کی تھی کہ پاپا کے ساتھ اُن کی گاڑی میں کہیں باہر جاتے ہوئے وہ پہلے کی طرح اب بھی اگلی نشست پر ہی بیٹھا کرے گی اور ہرگز ہرگز اپنی جگہ نہیں چھوڑے گی۔ سو وہ اس کی پابندی کر رہی تھی۔

چاروں کو ماں سے پیار تھا

مگر وہ اُن سے دُور چلی گئی تھی

تاہم دُور جانے کے بعد بھی اُن کے دل میں رہی تھی۔

انھیں باپ سے پیار تھا۔

اور وہ انھیں کسی اور کا ہوتے دیکھنا برداشت نہیں کر پا رہے تھے۔

پیار جلیس الحسن کو بھی اُن سے بہت تھا۔

وہ انھیں مطمئن اور مسرور دیکھنا چاہتے تھے۔

اور اسی باعث اپنی دوسری شادی کے چند ہی دنوں میں سامنے آنے والی صورتِ حال سے خاصے متفکر تھے۔ سرد مہری اگر صرف بچوں کی طرف سے ہوتی تو وہ حالات میں بہتری کی توقع بھی کر سکتے تھے مگر مشکل یہ تھی کہ الفت بھی دوسرے کنارے پر کھڑی نظر آتی تھی۔

بختیار رہائش کے استقبالیے میں جاتے ہوئے اُن کے اور الفت کے مابین اس وقت کچھ سی بدمزگی ہو گئی جب وہ بچوں کو لینے کے لیے اوپر جانے لگے اور الفت نے تیکھے لہجے میں اُن سے کہا "ہمارے اِن نوابزادوں کی حقیقی دعوتیں ہوتی ہیں آپ اُن میں سے تو آج بھی نہ لے گئے اپنے بچوں کو؟"

جلیس الحسن جاتے جاتے رک گئے اور انھوں نے قدرے تلخی سے کہا "کیا تم خوش ہوتیں اگر میں انھیں لے جاتا؟"

کیسی چبھتی ہوئی بات کہہ گئے تھے وہ!

وہ جز بز ہو کے رہ گئی۔

"اور اِن بیاہے بچوں والی بھلا کیا بات! اچھا اب تم دونوں کے ہی تسلیم کر لینے ہی میں عافیت ہے!"

اُن کے تنبیہی تیوروں نے اُسے لرزا کر رکھ دیا۔

اس ہلکی سی بدمزگی کا اثر اُس پر نہ صرف تقریب کے دوران رہا بلکہ اگلے دو دن وہ جلیس الحسن سے باقاعدہ خفا رہی اور اُس کی اس خفگی نے انھیں شدید کوفت سے دوچار رکھا۔

اُن کی اس کوفت میں اس وقت مزید اضافہ ہو گیا جب اُن کے ہمدم دیرینہ بختیار ہمدانی نے اُن سے پوچھا۔

"کیا بات ہے بھائی اس روز لفٹ میں بھابی کا موڈ کچھ ...."

جلیس الحسن تو گویا منتظر تھے کہ کوئی پوچھے اور وہ دل کھول کر اُس کے سامنے دھر دیں۔

"تم اصرار تو کرتے تھے مجھ سے دوسری شادی کے لیے، دیکھ لو یہ کیا ہو رہا ہے۔" جلیس الحسن کے لہجے سے شکستگی و ملال عیاں تھا۔

"ابھی ... ابھی میرے بھائی!" بختیار ہمدانی نے اُن کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا پھر ہمدردانہ لہجے میں بولے: "ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں جو تم گھبرا گئے..... دونوں کو وقت دو، میرا مطلب ہے بچوں کو بھی اور بھابی کو بھی... سیانوں نے کہا ہے کہ گھاٹے کو بھی اگر تم نے کھونٹے سے باندھو تو وہ بھی شروع شروع میں رسی تڑانے کی کوشش کرتی ہے.... میرے بھائی یہ تو انسان ہیں۔ نفرتوں اور محبتوں کی پوٹ ہیں یہ...... انھیں وقت دو اور صبر و تحمل کے ساتھ اس وقت کا انتظار کرو جب دونوں ایک دوسرے کے لیے اپنی اپنی بانہیں وا کر دیں یا دونوں فریق ایک دوسرے کو مسترد کر دیں یا پھر ایک جھک جائے اور اپنی برائی تسلیم کر لے۔"

جلیس الحسن سوچ میں پڑ گئے۔

تادیر سوچتے رہے۔

پھر انھوں نے جھکا ہوا سر اُٹھایا۔ سوچ میں ڈوبی نگاہوں سے بختیار ہمدانی کی جانب دیکھا۔ ایک گہری سانس کھینچی اور بولے:

"شاید تم ٹھیک کہتے ہو..... مجھے انتظار کرنا چاہیے۔"

اُلفت کو زندگی کے نئے راستے پر گامزن ہوئے تین ماہ ہو چکے تھے۔

اور

جب وہ پیچھے پلٹ کر دیکھتی تھی تو اُس کا دل سوائے مایوسی کے اور کسی احساس سے دوچار نہ ہوتا تھا۔

یوں بظاہر تو اسے وہ سب کچھ میسر تھا جو فی زمانہ خوشیوں کا ضامن سمجھا جاتا ہے۔

وسیع و عریض آراستہ و پیراستہ گھر

زندگی کو سہل بنانے والی جدید طرز کی آسائشیں۔

ایک نہیں دو دو گاڑیاں جن میں سے ایک مع ڈرائیور کی پیشہ ورانہ مہارت کے ہمہ وقت اُس کی اور بچوں کی خدمت کے لیے مستعد رہتی تھی، اب رہ اور بات تھی کہ وہ اس گاڑی کو شاذ ہی اپنے استعمال میں لاتی تھی۔ اُس کا باہر آنا جانا تو زیادہ تر... جلیس الحسن کے ساتھ ہی ہوا کرتا تھا۔

ہر حکم بجا لانے کو چاق و چوبند اور مستعد نوکر چاکر۔

ملبوسات کا روز افزوں ذخیرہ۔

بیش قیمت اور دلکش زیورات۔

بقول خاندان کی بڑی بوڑھیوں کے سونے میں پیلی ہو رہی تھی۔

ایک وجیہہ و پروقار، اعلیٰ تعلیم یافتہ، مہذب اور لاکھوں کماتا ہوا شریک سفر!

بے یقینی کی جس کیفیت سے وہ دوچار تھی اُس کے پیش نظر اُس نے ملازمت کو برقرار رکھتے ہوئے مزید رخصت لے لی تھی۔ اُس کے اسکول کی چند ساتھیاں ایک روز اُس سے ملنے آئیں تو اُسے رشک سے دیکھا کیں۔

نوکروں کی فوج ظفر موج کو دیکھ کر مس راحیلہ نے کہا۔

"الفت جی! آپ کو تو پانی پینے کو بھی نہیں اٹھنا پڑتا ہوگا..... ہے نا؟"

مسز الٰہی بخش نے اس کی ہاتھ بھر بھر سونے کی چوڑیاں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ماشاءاللہ کتنے تولے کی ہیں؟"

مس انجم ہنس کر بولیں:

"مسز الٰہی! سیروں میں وزن پوچھیے تولے میں نہیں۔"

مس نسرین نے اُس کے جسم پر سجی مہین ساڑی کا کنارا بڑی احتیاط سے چٹکی میں دباتے ہوئے سرگوشی میں پوچھا۔

"باہر کی ہے نا؟"

مسز نیاز بولیں:

"بہت خوش قسمت ہو گھر میں آرام کی ہر چیز موجود ہے۔"

مسز زبیری نے رشک آمیز لہجے میں کہا:

"بھئی الفت بہت ہی خوبصورت گھر ہے تمہارا!"

"کیوں نہ ہوگا بھلا! آخر کو الفت کے صاحب بہادر معمول انجینئر جو ٹھہرے!" مس نسرین کے لہجے سے رشک چھپائے چھپا نہ رہ سکا۔

مسز تصور حسین بولیں:

"الفت! تمہارے شوہر تمہیں چاہتے تو بہت ہوں گے۔"

"کیوں نہ چاہتے ہوں گے بھئی.... دوسری بیوی کے شوہر تو پاؤں دھو دھو کر پیتے ہیں۔" مسز صدیقی نے خیال آرائی کی۔

وہ چپ چاپ سب کی سنتی رہی۔

ان سب کو دکھانے کی خاطر بظاہر لبوں پر مسکراہٹ سجائے رکھی۔

مگر

اندر ٹوٹا اندھیرا تھا

کاش وہ انھیں بتا سکتی کہ خوشی انہی چیزوں کے ساتھ مشروط نہیں جن کا عکس وہ اُن کی آنکھوں میں بصورت رشک تیرتے دیکھ سکتی تھی۔

کاش! وہ انھیں بتا سکتی کہ ان تین ماہ میں جو اُس نے ان سب سے جدا ہو کر خاموشی سے گزار دیے تھے، ایک دن بھی تو ایسا نہ تھا جو اُس نے صحیح معنوں میں سچی خوشی کے ساتھ گزارا ہو۔

رعنا جمیل نے سرگوشی میں پوچھا:

"خوش ہو؟"

اور اُس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

مگر

آنکھوں کے کنارے چپکے سے بھیگ گئے۔

اور وہ اس نمی کو پنہاں رکھنے کے لیے آنکھیں موند کر یوں مسکرا دی جیسے اپنے بے اندازہ مطمئن اور مسرور ہونے کا اظہار مقصود ہو!

دفعتاً

مسز زبیری نے ٹہوکا دیتا ہوا سوال کر ڈالا:

"ارے ہاں بھئی یہ تو بتاؤ ہنی مون منانے کہاں گئی تھیں؟"

اُس کے دل میں ڈھیروں درد اُمڈ آیا۔

کیسے بتاتی وہ انھیں کہ شادی کے بعد جب اُس کی چھوٹی بہن فضیلت نے اُن کے شریک سفر سے پوچھا تھا:

"جلیس بھائی! آپ اپیا جانی کو ہنی مون منانے کے لیے کہاں لے جائیں گے؟"

تو انھوں نے ہنس کر کہا تھا:

"بی بی! یہ نوجوانوں کے شوق ہیں جبکہ آپ کی اپیا اور ہم ٹھہرے بچوں والے لوگ۔"

پھر انھوں نے عینی مومن اپنے بچوں کی تعطیلات کے ساتھ مشروط کر دیا تھا۔
مگر جب اُن کی تعطیلات ہوئیں تو انھوں نے آرٹ کلاس میں شمولیت اختیار کر لی۔ اعجاز جوڈو کراٹے کے داؤ پیچ سیکھنے کے لیے ایک نجی کلب میں جانے لگا۔ اور فراز کے چند دن پڑا تو ایک روز تیرنے سے تیراکی میں اترتے ہوئے گر کر اپنا بازو تڑوا بیٹھا۔
اور جلیس الحسن نے اُٹھتے والے انداز میں کہا تھا: "الفت! پھر کبھی ہم تمہارا یہ دن آدھا رہا!"
اونہہ!
یہی دن کبھی کوئی لمحہ ایسا نہیں کہ آدھا رہا! اُس نے تب ہی سوچا تھا۔
پھر مسز نیازی نے پوچھا:
"اچھا الفت! ایک بات بتاؤ۔"
"جی پوچھیے۔"
مسز نیازی نے باری باری اپنی تمام ساتھیوں کی جانب کچھ اس انداز سے دیکھا جیسے کسی بڑی مہم پر نکلنے سے پہلے ان کی خیروعافیت چاہتی ہوں۔ پھر گہری نگاہوں سے الفت کو دیکھتے ہوئے مشروط انداز میں پوچھا:
"سچ سچ بتانا!"
"آپ پوچھیے تو سہی۔"
بڑی حد تک بے باکانہ رکھتے ہوئے بھی کہ وہ کیا پوچھنے جا رہی ہیں، الفت کا دل بُری طرح دھڑکنے لگا۔ خدا جانے کتنا ٹیڑھا سوال پوچھنے جا رہی تھیں وہ!
"بچوں کے ساتھ تمہارے تعلقات کیسے ہیں؟"
"آپ کے خیال میں کیسے ہونے چاہئیں؟" الفت نے الٹا سوال داغ ڈالا۔
مسز نیازی نے گہری نگاہوں سے اُس کے چہرے کے تاثرات کھوجتے ہوئے کہا:
"دستورِ زمانہ کے مطابق تو کچھ زیادہ اچھے نہیں!"
"یعنی سوتیلی اولاد تو سوتیلی ہی ہوتی ہے، کچھ بھی کر لو اپنی نہیں بنتی!" مسز صدیقی نے خیال آرائی کی۔ "اور یہ کیوں رعنا تمہارا کیا خیال ہے؟" کہتے ہوئے رعنا جمیل سے تائید چاہی۔
"آپ بالکل ٹھیک کہتی ہیں!" رعنا جمیل نے تائید میں تردد نہ کیا۔
غنیمت ہوا کہ مسز نیازی کا سوال خیال آرائیوں میں گم ہو گیا ورنہ اس سوال کا جواب دینا الفت کے لیے کچھ آسان نہ ہوتا۔
طویل نشست کے بعد رخصت ہوتے سمے مسز صدیقی نے پورے وفد کی ترجمانی کرتے ہوئے الفت کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا:
"بہرحال ہم سب کو یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ تمہیں خدا کے فضل سے سب کچھ میسر ہے اور تم اپنے گھر میں بہت خوش ہو!"
"بہت خوش!" اُس نے جی ہی جی میں مسز صدیقی کا فقرہ دہرایا۔ اور اُس کے لبوں پر دکھ آمیز مسکراہٹ پھیل گئی۔
ان سب کو رخصت کرنے کے بعد وہ اپنے کمرے میں آ کر نیم جان سی بستر پر ڈھے گئی اور اُس نے ایک سرد آہ کھینچتے ہوئے سوچا: خوشی کو لوگ مادی آسائشوں کے ساتھ مشروط کیوں سمجھتے ہیں!
ادھر
خاندان والے سب یہی سمجھتے تھے کہ وہ بہت خوش تھی۔
تائی اماں ایک روز بیٹیا اور بھابی کے ہمراہ اُس کے ہاں آئیں۔ گھر کا چپہ چپہ گھوم پھر کر دیکھا۔ ایک ایک شے دیکھی۔
پھر بولیں: "خیر سے سبھی کچھ ہے گھر میں۔ ایک عورت کو خوش ہونے کے لیے اور بھلا کیا چاہیے!"
تب بھی اُس نے یہی سوچا تھا کہ لوگ خوشی کو چیزوں کے ساتھ مشروط کیوں سمجھا کرتے ہیں؟
خوشی باہر تو نہیں بکھری ہوتی۔
نہ باہر سے آتی ہے
خوشی تو من میں ہوتی ہے۔
اُس کے سوتے تو دل کے نہاں گوشوں میں پھوٹتے ہیں اور من میں بسیرا کرتے ہیں۔
چھوٹی بہنیں کہتی تھیں:

"دیکھا جانی! ہم نے کہا تھا نا کہ آپ بہت خوش رہیں گی، دیکھا؟"
"ہاں دیکھا!" وہ جی ہی جی میں سوچتی۔ ان چار ماہ میں زندگی کا وہ تکلیف دہ روپ دیکھا جس کا میں نے کبھی گمان بھی نہ کیا تھا۔
عظمت آپا، بجیا، بھابی بھی اپنی دانست میں یہی سمجھتے تھے کہ وہ بہت خوش تھی
البتہ امی اور ابا کچھ فکرمند نظر آتے تھے اور جب وہ ان سے ملتی اُن کی جہاں دیدہ نظریں اُس کا چہرہ کھوجنے میں مصروف ہو جاتیں۔
ایک روز امی نے بڑی رازداری سے پوچھا: "بیٹی! جلیس تمہارے ساتھ کیسے ہیں؟"
"ٹھیک ٹھاک ہیں امی!" اُس نے دھیرے سے جواب دیا۔
ابا جو قریب ہی بیٹھے تھے بولے: "عظمت کی ماں! جلیس الحسن شریف آدمی ہیں اور شریف آدمی اگر کسی کو خوشی نہ دے پاتا تو اُسے دکھ بھی نہیں دیتا۔ اگر کسی کو سکھ نہیں پہنچا پاتا تو اُسے دکھ دینے کی کوشش بھی نہیں کرتا۔"
کاش!
اے کاش! جلیس الحسن کے ساتھ چار بچوں کا غم جھیلنا لگا ہوتا تو وہ بے مثال آدمی تھے۔
الفت کا بس چلتا تو اُن کی کتابِ زندگی سے ان بچوں کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دیتی جو ہمہ وقت اُس کے اعصاب پر سوار رہا کرتے تھے۔
اگر وہ نہ ہوتے تو جلیس الحسن کی سنگت میں زندگی کتنی شاداں و فرحاں گزرتی۔

• • • • • • • • • •

کس چیز کی کمی تھی جلیس الحسن کے گھر میں!
جدید طرزِ زندگی کی بے شمار آسائشوں اور بہت کو متعدد ملازموں کی موجودگی میں الفت کو کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑتی تھی۔
صبح آنکھ کھلنے پر بیڈ ٹی حاضر۔
باتھ روم سے نکلنے اور نوک پلک سنوارنے کے بعد کمرے سے باہر نکلتی تو ناشتہ تیار ملتا۔ اب وہ اور بات تھی کہ ناشتے کی میز پر بچوں کی موجودگی اُسے انتہائی گراں محسوس ہوا کرتی تھی۔ اگرچہ پرستار ذکیہ فراز اور ثمرین کی "گڈ مارننگ" کے جواب میں اپنے دل پر جبر کر کے "گڈ مارننگ" کہتا اور ناشتے کے دوران دزدیدہ نگاہوں سے انھیں دیکھے جاتا اور اعجاز کو بدستور اپنے محاذ پر ڈٹے دیکھتا۔
اعجاز بھی بقول شخصے جوان کا بچہ ثابت ہوا تھا۔ مستقل اپنے محاذ پر ڈٹا ہوا تھا اور ہتھیار ڈالنے پر ذرا آمادہ نظر نہ آتا تھا۔
تعطیلات سے قبل اور تعطیلات کے بعد اُن کا یہی دستور رہا تھا کہ وہ الفت کو "خدا حافظ" کہے بغیر یوں گزر جاتے جیسے گھر کے در و دیوار کو خدا حافظ کہے جا رہے ہوں۔
البتہ پاپا کو بطورِ خاص مخاطب کر کے کہا کرتے تھے — "خدا حافظ پاپا!"
جلیس الحسن انھیں.... رخصت کرنے برآمدے کی سیڑھیوں تک جاتے جہاں ڈرائیور اُن کے اسکول بیگ گاڑی میں رکھ چکنے کے بعد اُن کا منتظر ہوا کرتا تھا۔
ثمین نے میٹرک بدرجہ اوّل پاس کر لیا تھا اور اُس کا اسی کالج میں داخلہ بھی ہو چکا تھا جس میں کہ وہ داخلہ لینے کی خواہشمند تھی۔ تاہم کالج میں ابھی کلاسیں شروع نہ ہوئی تھیں۔
صبح ناشتے کی میز پر بچوں کی "گڈ مارننگ" کے جواب میں "گڈ مارننگ" — اور اُن کے اسکول جاتے سمے "خدا حافظ" کہنا الفت کو ایک منزل گراں عبور کرنے کے مترادف لگتا۔
پھر اخبار کی ورق گردانی شروع ہو جاتی۔
جلیس الحسن کو کسی خاص معاملے میں کوئی بات کرنی ہوتی تو اسی دوران کرتے۔
گزشتہ تین ماہ کے دوران وہ اُسے بارہا بچوں کی چھوٹی چھوٹی ذمے داریاں تفویض کرنے کی کوشش کر چکے تھے اور اس نے اکثر ہی اُن سے رُوگردانی کی تھی۔
مثلاً
تعطیلات کے بعد جب اسکول کھلے تو انھوں نے الفت سے چاہا کہ وہ بچوں کے اسکول جا کر اُن کے اساتذہ سے ایک تعارفی ملاقات کر آئے۔

مگر وہ ٹال گئی تھی۔

پھر جب اُن کے اسکول میں والدین اور اساتذہ کی مشترکہ تنظیم کے پہلے اجلاس کے لیے دعوت نامہ آیا تب انھوں نے الفت کو اس اجلاس میں شرکت کرنے کی ہدایت کی۔

مگر وہ تاریخِ مقررہ سے ایک روز قبل ہی شدید سر درد کا بہانہ کر کے بستر پر پڑ گئی۔

نگین کے کالج میں داخلے کا مرحلہ آیا تو انھوں نے داخلہ فارم کے حصول کے لیے اُلفت سے نگین کے ہمراہ چلے جانے کی استدعا کی تھی۔

لیکن وہ اُس کے ہمراہ جانے کے بجائے میکے چلی گئی تھی اور جب جلیس الحسن نے شام ڈھلے گھر واپسی پر اُس سے پوچھا "نگین کے ساتھ گئی تھیں تم؟"

تو اُس نے بڑے آرام سے کہا: "نہیں...... آپ کے دفتر جاتے ہی امّی کا فون آگیا تھا، انھوں نے بلا بھیجا تھا۔"

"خیریت؟"

"تہنیت کے ایک دو جوڑوں پر کام بننے کے لیے دینا تھا۔"

جبکہ حقیقت یہ تھی کہ امی کا فون نہ آیا تھا بلکہ اُس نے خود ہی انھیں فون کر کے کہا تھا کہ وہ اُن کے پاس آ رہی ہے اور آج تہنیت کے ان جوڑوں پر کام کرنے دینے کے لیے اُن کے ہمراہ بازار جائے گی جو اُس کی فراغت کے منتظر پڑے تھے۔

اور جب نگین کالج جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی تو اُس نے ڈرائیور سے کہا "پہلے ذرا مجھے گھر چھوڑ آؤ۔"

ڈرائیور تو حکم کا بندہ تھا سو اُس نے تعمیل کی۔

"کیا نگین کا داخلہ اس کام سے زیادہ ضروری نہیں تھا؟" جلیس الحسن نے قدرے تلخی سے کہا۔

"وہ بھی ضروری کام تھا۔" اُس نے...... بڑی بے نیازی سے جواب دیا۔ پھر ڈرائیور سے حاصل کردہ معلومات کے تحت بولی "کام تو وہ بھی ہو ہی گیا۔ فارم تو مل گیا ہے۔"

"ہاں فارم تو خیر مل گیا ہے، یہ تو میں بھی جانتا ہوں۔ نگین نے مجھے فون کر کے بتا دیا تھا لیکن تم چلی جاتیں تو میں......"

انھوں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

جلیس الحسن کے دفتر چلے جانے کے بعد شام ڈھلے اُن کی واپسی تک اُلفت کے پاس وقت ہی وقت ہوتا تھا۔ اور کرنے کو کبھی کچھ نہیں۔

اُن کے دفتر جانے کے بعد وہ امورِ سلطنت کا جائزہ لینے کے لیے گھر کا ایک چکر لگاتی۔ کھڑے کھڑے باورچی خانے میں بھی جاتی۔ خانساماں دوپہر اور رات کے کھانے کی بابت ہدایات حاصل کرتا۔

پھر وہ وقت گزاری کے لیے رسائل و جرائد، وی سی آر یا ٹیلیفون کا سہارا لیتی یا کہیں باہر نکل جاتی۔

جلیس الحسن کی جانب سے اُس کے کہیں آنے جانے پر کوئی پابندی نہ تھی۔ ڈرائیور بچوں کو اسکول چھوڑ کر آنے کے بعد گاڑی گھر ہی میں لا کھڑی کرتا تھا۔ اُلفت کا جب جی چاہتا میکے چلی جاتی اور جب جی چاہتا تہنیت کو بلوا بھیجتی یا اُسے ساتھ لیتی اور شاپنگ کو نکل جاتی۔

ایک تہنیت ہی تھی جسے فراغت تھی۔ ورنہ سب کی اپنی اپنی مصروفیات تھیں۔ عظمت آپا اور نجمیات کی اپنی گھرداریاں تھیں۔ بھابی کو امورِ خانہ داری اور بچوں کی تعلیم و تربیت کی ذمے داریاں گھیرے رکھتی تھیں۔ رہیں امی تو وہ بیٹیوں کے ہاں آنے جانے کے سلسلے میں بزرگوں کی روش پر کاربند تھیں۔ الفت کے ہاں بس وہ ایک دو بار ہی آئی تھیں، وہ بھی اُس کا گھربار دیکھنے کو اور شربت کا ایک گلاس تک نہ پیا تھا۔

تہنیت کی فراغت بھی بس اب مہمان ہی تھی۔ الفت کی شادی کے بعد سے خالہ بی بی نے جلد از جلد شادی کی رٹ لگا رکھی تھی۔

دوپہر کا کھانا جلیس الحسن دفتر ہی میں کھاتے تھے ماسوا چھٹی والے دن کے۔ چنانچہ اُلفت دوپہر کو اپنے کمرے ہی میں کھانا منگوا لیا کرتی تھی۔

شام کو بچے چائے پیتے نہ تھے اور جلیس الحسن اس وقت دفتر میں ہوا کرتے تھے اس لیے اگر اُلفت کے میکے سے کوئی آیا ہوا نہ ہوتا تو وہ شام کی چائے بھی اپنے کمرے ہی میں پیتی۔

گھر میں بچوں کی موجودگی اور جلیس الحسن کی عدم موجودگی کے دوران وہ زیادہ تر اپنے کمرے میں محصور رہنا ہی پسند کرتی۔ مگر اس لیے نہیں کہ بچوں سے خائف تھی یا ایسی کوئی بات بلکہ وہ کم سے کم انھیں دیکھنا چاہتی تھی۔

دیکھنے کو تو بچے بھی اُسے کم سے کم ہی دیکھنا چاہتے تھے۔ اسی لیے اس کے گھر میں آنے کے بعد سے وہ صبح ناشتے پر اور رات کے کھانے پر ہی نیچے آیا کرتے تھے یا پھر کسی ضرورت کے تحت۔ ورنہ ان کا بیشتر وقت گھر کی بالائی منزل پر یا تو اپنے کمروں میں گزرتا یا پھر اکٹھے بیٹھ کر اُلفت کا مذاق اُڑاتے اور اُسے برا بھلا کہتے۔

جب ان چاروں میں سے ایک بھی گھر میں نہ ہوتا تو اُلفت نہ صرف زیریں منزل پر بے باک وہاں گھومتی پھرتی بلکہ بالائی منزل پر بھی جا پہنچتی اور بچوں کے کمروں میں تاکا جھانکی اور صفائی کروا لینے کے بہانے دخل در معقولات میں تردد نہ کرتی۔

یہ صفائی کروانے کا بہانہ بھی خوب تھا۔ ایک بار جو بچے چڑھتا تو موقع تاکتے ہی اُلفت اُس کی گردن دبوچ لیتی۔

تعطیلات ختم ہونے کے بعد اعجاز، فراز اور زرتمن تو باقاعدگی سے اسکول جانے ہی لگے تھے۔ کالج میں داخلے کے سلسلے میں نگین کا باہر آنا جانا لگا تو اُلفت کو دخل در معقولات کا بہانہ گاہے گاہے اپنی دسترس میں لینے کا موقع ملنے لگا۔

جس روز بھی نگین موجود نہ ہوتی اُلفت اوپر جا پہنچتی اگر ملازمہ صفائی کر رہی ہوتی تو اُسے ہدایات دینے لگتی۔

اور اگر وہ صفائی کر چکی ہوتی تو اُسے یہ تاثر دینے کی کوشش کرتی کہ گویا وہ اُس کے کام کا جائزہ لینے کو اوپر آئی تھی۔

حالانکہ جائزہ تو وہ بچوں کے کمروں کا لینے کو آیا کرتی تھی۔

اوپر بھی مکمل گھر آباد تھا۔

ڈرائنگ اور ڈائننگ ہال بھی موجود تھا جس کے استعمال کی ضرورت شاذ ہی پیش آتی تھی۔

آراستہ و پیراستہ ٹی وی لاؤنج بھی۔

علیحدہ سے اسٹڈی روم بھی تھا۔

اور ایک گیسٹ روم بھی۔

بچوں کے کمروں میں اُن کی ضرورت کی ہر شے موجود تھی۔ نگین اور زرتمن کا کمرا مشترک تھا۔ اعجاز اور فراز کے کمرے علیحدہ علیحدہ۔ ان میں سے ہر کمرے میں نفیس اور آرام دہ فرنیچر پڑا تھا۔

ہال نما ڈرائنگ کم ڈائننگ میں بڑا سا ریفریجریٹر اشیائے خورد و نوش سے بھرا رہتا تھا۔ اور اسی لیے بچوں کو دو وقت کھانے کے درمیانی وقفے میں نیچے اُترنے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی تھی۔

ویسے بھی انھیں نیچے اُترنے کی ضرورت کیا تھی۔ گھر میں نوکر چاکر موجود تھے اور بالائی منزل سے زیریں منزل پر رابطے کے لیے انٹرکام موجود تھا۔

گھر کے احاطے میں پچھواڑے سرونٹ کوارٹر تھے۔ خانساماں اور اُس کی بیوی ہاجراں جو ماماگیری پر مامور تھی اپنے بچوں کے ساتھ وہیں رہا کرتے تھے۔ میاں بیوی کا زیادہ تر وقت کوٹھی ہی میں گزرتا۔ بچے پچھواڑے کھیلتے رہتے تھے۔ ماسوا بڑے لڑکے سلیم کے۔

چوکیدار کل وقتی ملازم تھا۔ ہزارہ کا رہنے والا تھا۔ گزشتہ پندرہ برس سے جلیس الحسن کا ملازم تھا۔ چھٹے ساتویں مہینے دس پندرہ دن کی چھٹی لے کر اہل و عیال کے پاس ہو آیا کرتا تھا۔ پچھواڑے ایک کمرا اُس کے لیے بھی مخصوص تھا۔

مالی جز وقتی ملازم تھا۔ صبح شام گھنٹا ڈیڑھ گھنٹے کو حاضری دیتا۔ گملوں میں آراستہ اور کیاریوں میں ایستادہ پودوں اور درختوں اور سبزہ زار کی آبیاری اور تراش خراش کرتا اور بہ اعتبارِ موسم اُن میں ردّوبدل کرتا رہتا تھا۔

ڈرائیور صبح ساڑھے سات بجے آتا اور شام کو سات بجے چھٹی کر جاتا۔ اُس کی نوکری خاصے ٹھاٹ کی تھی۔

چھوٹے موٹے کاموں اور اُٹھائی دھرائی کے لیے خانساماں کا بڑا لڑکا سلیم صبح سے رات تک کوٹھی میں رہتا تھا بلکہ اکثر رات کو بھی برآمدے ہی میں پڑ رہتا۔

خانساماں کی بیوی ہاجراں خاصی تیز طرار عورت تھی اور گھر کے بہت سے رازہائے درون کی امین معلوم ہوتی تھی۔ اُلفت اُسے دھیرے دھیرے اپنے اعتماد میں لینے کی کوشش کر رہی تھی۔ ایسا کرنا بچوں کے کمروں میں دخل در معقولات کرنے کے لیے بھی ناگزیر ہو گیا تھا جو جلیس الحسن کے ماضی کے بہت سارے اوراق اپنے سینے میں سمیٹے نظر آتے تھے۔ نگین کے کمرے میں سائیڈ ٹیبل پر ایک سبز مخملیں البم دھری تھی جس کو ایک روز اُس نے ہاجراں کی کمرے میں موجودگی کے دوران یونہی ذرا کھول کر دیکھا تھا اور ایک عورت کے ساتھ جلیس الحسن کی تصویر دیکھ کر چونک گئی تھی۔ بلاشبہ وہ ناصرہ ہی تھی۔ اس کا دل دھک دھک کرنے لگا تھا۔ کمرے میں ہاجراں کی موجودگی البم کی ورق گردانی میں حارج رہی۔

اُس روز ہاجراں کے صفائی ستھرائی کر کے اپنے کوارٹر میں چلے جانے تک وہ انتہائی بے کل رہی۔ وہ البم میں چسپاں اس تصویر کو بغور دیکھنا چاہتی تھی بلکہ پوری البم دیکھنا چاہتی تھی۔ اُسے یقین تھا کہ اس البم میں جلیس الحسن کے ماضی

یا داستان محفوظ تھی۔

باجراں کے جاتے ہی وہ بے تحاشا دھڑکتے دل کو قابو میں کرنے کی کوشش کرتی دبے پاؤں نگین کے کمرے میں پہنچی اور البم کی جانب ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ سناٹے میں کچھ سرسراہٹ سی سنائی دی اور وہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اعجاز اور زہرہ بین کے اسکول سے واپس آنے میں ابھی بہت وقت پڑا تھا اور نگین کہیں باہر گئی ہوئی تھی۔ بُری طرح گھبرا کر سے باہر نکل آئی اور ملجہ لیے ڈگ بھرتی نیچے اُتر آئی۔

خدا جانے وہ ہوا کی سرسراہٹ تھی یا کھڑکی کے نزدیک سے کوئی پرندہ پھڑپھڑا تا گزر گیا تھا۔ بہرحال وہ جو کچھ بھی تھا اُلفت جب نیچے اُتری تو اُس کا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔ سر تا پا ہلکی سی لرزش طاری تھی اور دل ایک نامعلوم سے سائیں مجرم سے دوچار ہوتا جا رہا تھا۔

اپنے ہی گھر میں وہ خود کو چور محسوس کر رہی تھی۔

بہرحال

شوقِ تجسس اس البم کے ایک ایک ورق کو دیکھنے کی قسم کھا بیٹھا تھا۔

پھر ایک روز جب باجراں نے اعجاز کے بستر کی چادر بدلنے کے لیے پلنگ پر بچھی میلی چادر اتاری تو اُس نے رہانے ایک فریم اوندھا رکھا دیکھا۔ اُلفت نے اُسے اُٹھا کر دیکھا تو دھک رہ گئی۔

وہ یقیناً جلیس الحسن کی سابقہ بیوی کی تصویر تھی۔

"تاہم اُلفت نے جانتے بوجھتے بھی انجان بنتے ہوئے باجراں سے پوچھا" باجراں! ذرا دیکھو تو یہ کس کی تصویر ہے؟"

باجراں مسکرا دی۔

" بیگم صاب جی آپ نئیں جانتیں جی انھیں ؟"

" نہیں ۔"

" کون ہو سکتی ایں جی یہ سوائے صاب جی کی پہلی بیگم صاب کے ۔"

" چڑیل!" اُلفت نے جی ہی جی میں کہا اور شدید نفرت کے ساتھ تصویر کو دیکھا۔

تصویر بزبانِ حال سے جلیس الحسن کی پہلی بیوی کے خوبرو ہونے کی گواہی دے رہی تھی۔

اُس کا چہرہ ماہتابی، آنکھیں غزالی، ناک ستواں اور دہانہ تنگ تھا۔

" یہ تصویر یہاں کیوں رکھی ہے ؟" اُلفت نے فریم شدہ تصویر پلٹ کر دوبارہ وہیں رکھ دی جہاں سے اُٹھائی تھی۔

" بیگم صاب جی! یہ تصویر تو میں جب کبھی اعجاز بیبے کے بستر کی چادر بدلتی ہوتی ہوں اِدھر ہی پڑی ہوتی ہے جی !"

" مگر کیوں ؟"

" کیونکہ جی اعجاز بیبے اِدھر ہی رکھتے ہوتے ہیں ۔"

" وہی تو میں پوچھ رہی ہوں کہ کیوں ؟"

" کیونکہ جی اپنے اعجاز بیبے بہوتی پیار کرتے سی اپنی ممی جی کے ساتھ ۔"

اُلفت نے نشتعلی کیفیت کے ساتھ اپنے جبڑے باہم بھینچ لیے۔

قرائن بتا رہے تھے کہ باجراں بہت کچھ جانتی تھی۔

اس گھر کے ماضی سے آشنا تھی۔

جلیس الحسن کے ماضی سے آشنا تھی۔

اُن کے بچوں کے کمروں میں سربستہ رازوں کی امین تھی۔

جلیس الحسن کی سابقہ بیوی کے بارے میں بہت کچھ جانتی تھی۔

اور اُلفت کو بہت کچھ بتا سکتی تھی۔

اس گھر کی نئی پرانی کہانیاں سننے کے لیے باجراں کو اعتماد میں لینا بہت ضروری ہو گیا تھا۔

* * * * * * * * * * *

دوسری شادی جلیس الحسن نے اس خیال کے تحت کی تھی کہ بکھرتے ہوئے گھر کی شیرازہ بندی ہو سکے بچوں کا پیار اور توجہ میسر آ سکے۔ اور خود انھیں ایک ایسی ہمدرد رفیقِ سفر اور دکھ سکھ کی ساتھی مل جائے جو اُن کے مسائل کو سمجھے اور اُن کے حل میں تعاون کی کوشش کرے۔

وہ گھر کی رونقیں ہوئی خوشبوؤں کو دوبارہ ہم رکاب دیکھنے کے متمنی تھے۔ اور یہی تمنا اُن کی دوسری شادی کا محرک
...ی تھی۔

لیکن
اُن کی دوسری شادی کے بعد سامنے آنے والی صورتِ حال اُن کی توقعات پوری کرنے میں قطعاً ناکام رہی تھی۔
تین ماہ سے زائد عرصہ ہونے کو آیا تھا۔
نہ بکھرے ہوئے گھر کی شیرازہ بندی کے آثار نظر آتے تھے۔
نہ بچوں کو ماں کی توجہ اور پیار ملنے کی اُمید بندھ سکی تھی۔
نہ ہی اُن کی رفیقِ سفر نے اُن کے مسائل کو سمجھنا اور اُن کے حل کے ضمن میں اُن کی مدد و معاون ہونے کی کوشش
...کی تھی۔

بلکہ حقیقت یہ تھی کہ
گھر کا شیرازہ دوبارہ منتشر ہوتا نظر آ رہا تھا۔
بچوں کو ماں کا پیار ملنا تو دُور کی بات وہ تو باپ کی محبت اور شفقت سے بھی محروم ہوتے دکھائی دے رہے تھے۔
کیونکہ دوسری شادی سے قبل تو جلیس الحسن کا گھر میں گزرنے والا تمام وقت بچوں کے لیے وقف ہوتا تھا بلکہ بچوں کی خاطر وہ اپنی پیشہ ورانہ مصروفیات میں سے وقت کشید کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ فاطمہ بیگم کے جانے کے بعد انھوں نے شام کو جلدی گھر لوٹ آنا اپنا معمول بنا لیا تھا۔ بچوں کو زیادہ وقت دینے کی کوشش کرتے اور اُن کے جذباتی مسائل کی تسکین کی حتی الامکان کوشش کرتے۔
مگر دوسری شادی کے بعد وہ اپنے آپ کو بٹا ہوا سا محسوس کرنے لگے تھے کبھی بچوں کو زیادہ وقت دینے کی کوشش کرتے تو اُلفت کو اپنے سے دُور کھڑا پانے لگتے اور اُلفت کو خوش اور مطمئن کرنے کی کوشش کرتے تو بچے انھیں دوسرے کنارے پہ کھڑے نظر آتے۔

عجیب مشکل تھی۔
نہ وہ پورے طور اُلفت کو مطمئن کر پاتے تھے۔
نہ بچوں کو۔
بلکہ سچ تو یہ تھا کہ اپنی اپنی جگہ دونوں فریق انھیں اپنے سے بدگمان دکھائی دیتے تھے۔
اُن کی نگاہوں میں بدگمانیاں ڈولتی دکھائی دیتی تھیں۔
اور تو یہ لب شکایتیں، حکایتیں تھیں۔
جلیس الحسن اُلجھ کے رہ گئے تھے۔
گھر کی شیرازہ بندی کا خواب تو شرمندہ تعبیر ہوتا نظر نہ آتا تھا۔ البتہ اپنا ذہنی شیرازہ ضرور بکھرتا محسوس
ہوتا تھا۔
اُلفت اُن کی رفیقِ سفر اُن کے مسائل کو سمجھنے اور اُن کے حل کے ضمن میں اُن کی مدد و معاون ہونے کے بجائے خود
مسائل کا شکار نظر آتی تھی۔
بلکہ سچ تو یہ تھا کہ بجائے خود مسئلہ بن گئی تھی!
تین ماہ سے زائد عرصے میں اُس نے ایک قدم بھی تو بچوں کی جانب بڑھانے کی کوشش نہ کی تھی بلکہ وہیں کھڑی
تھی جہاں اوّل دن تھی۔
یا شاید اس جگہ سے بھی دو قدم پیچھے ہٹ گئی تھی!
بچوں سے اُس کی ذرا ذہنی مفاہمت نہ ہو سکی تھی۔
صبح ناشتے کی میز پر "گڈ مارننگ" اسکول جاتے ہوئے "خدا حافظ" اور رات کے کھانے کے بعد اوپر جانے سے
قبل "گڈ نائٹ" اُس کے اور بچوں کے مابین فقط اتنا ہی رابطہ تھا۔
وہ اُن سے لاتعلق، اُن کی ہر ذمے داری سے بے نیاز اور اُن کے جذباتی مسائل سے نا آشنا رہنا چاہتی تھی
اُسے اُن کی کسی بات سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔
اور انھیں نظر انداز کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتی تھی۔

لیکن طرفہ تماشا یہ تھا کہ اس اظہارِ لاتعلقی کے باوجود جلیس الحسن کے چاروں بچے اُسے ہمہ وقت اپنے اعصاب پر سوار محسوس ہوتے تھے۔

جس قدر وہ اُن کے خیال سے فرار حاصل کرنے کی کوشش کرتی تھی اُسی قدر اُن کا خیال اُس کے ذہن کا گھیراؤ کیے جاتا تھا۔

وہ اُسے زینبِ روسیاہ اور دشمنِ جاں لگتے تھے۔

جلیس الحسن سے اُن کا ہم کلام ہونا، اُن کے ہمراہ کہیں آنا جانا، کوئی فرمائش کرنا اُسے زہر لگتا تھا۔

جلیس الحسن کو اُن سے محبت سے بات کرتے یا انہیں پدری شفقت سے معمور نگاہوں سے مسکراتے دیکھ کر اُس کا رواں رواں سلگنے لگتا تھا۔

جس رات وہ اُن کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کے بعد اُس کے پاس آتے تو وہ اُن سے کروٹ لیے پڑی رہتی۔ وہ منانے کی کوشش کرنے تو مات کر دیتی، اُس کا قرب حاصل کرنے کی کوشش کرتے تو انہیں بری طرح جھڑک دیتی اور اُن کے سوجانے کے بعد بھی انگاروں پر لوٹتی رہتی۔

دو چار مرتبہ اُس کی اس نوعیت کی خفگی کے بعد جلیس الحسن سمجھ گئے تھے کہ وہ بچوں کو نہ صرف اپنے التفات سے محروم رکھنا چاہتی تھی بلکہ اُن سے بھی بچوں کے ساتھ بے رخی برتنے کی طلب گار تھی۔

چنانچہ اب وہ یا تو رات کے کھانے سے پہلے ہی کچھ وقت بچوں کے ساتھ اوپر گزار کر آتے تھے یا اگر رات کے کھانے کے بعد اوپر جاتے تو دس پندرہ منٹ بعد ہی نیچے لوٹ آیا کرتے تھے۔

اُلفت اس گھر میں بچوں کو عاصمہ کی زندہ پرچھائیاں سمجھتی تھی۔

ویسے ان پرچھائیوں سے خوف آتا تھا۔

اُن سے جلیس الحسن کا اظہارِ انسیت اُس کے دل میں اس وسوسے کو زیادہ مضبوطی سے قدم جمانے پر اکساتا کہ اس بہانے وہ دراصل عاصمہ سے اپنے لگاؤ کا اظہار کرتے تھے۔

دن بھر میں بیسیوں مرتبہ اُس کے دل میں یہ وسوسہ سر اُٹھاتا کہ عاصمہ اس گھر سے چلے جانے کے باوجود بھی ان بچوں کے روپ میں اسی گھر میں بستی تھی۔

اُسے یہ خیال ستاتا کہ جب تک بچے اس گھر میں موجود تھے، عاصمہ کا خیال جلیس الحسن کے دل سے محو ہو جانا ناممکنات میں سے تھا۔

بار بار یہ خدشہ اُسے آنکھیں دکھاتا کہ عاصمہ واپس بھی آسکتی تھی!

اُس کا دل گواہی دیتا تھا کہ اس گھر میں اُس کے چاروں بچوں کی موجودگی ایک نہ ایک دن اسی گھر میں اُس کی واپسی کا سبب بن جائے گی۔

اگر وہ اپنے عمزاد کی محبت کی اسیر ہو کر بچوں کو چھوڑ کر جا سکتی تھی تو اس محبت کا سحر ٹوٹ جانے پر بچوں کی طرف واپس بھی لوٹ سکتی تھی۔

اور بچوں کی جانب اس کی واپسی کا مطلب تھا جلیس الحسن کی جانب واپسی!

دوسرے مرد سے نکاح اور پھر اُس سے خلع یا طلاق کے بعد وہ بغیر کسی رکاوٹ کے پہلے شوہر کی جانب لوٹ سکتی تھی۔

قانون اور شریعت دونوں اس کی اجازت دیتے تھے۔

جلیس الحسن کی سابقہ بیوی کی واپسی کا خدشہ یوں تو الفت اپنے میکے ہی سے دل میں بسا کر آئی تھی لیکن شادی کے بعد اس گھر میں آنے کے بعد یہ خدشہ دھیرے دھیرے یقین کا روپ دھارتا جا رہا تھا۔

اس گھر میں عاصمہ کے بچوں کی موجودگی اُسے بُری طرح کھٹکتی تھی اور اگر اُس کا بس چلتا تو وہ جلیس الحسن کو اُن سے ہمیشہ کے لیے چھین لیتی۔

اور

بچوں کا اگر بس چلتا تو وہ اپنے باپ کو اس عورت سے ہمیشہ کے لیے چھین لیتے جو موقع پاتے ہی انھیں دشمن کی طرح گھورنے لگتی تھی۔

جس کی گھر میں آمد نے اُن کے باپ کو اُن سے کس قدر دور کر دیا تھا۔

جس کی کوئی ادا انھیں ایک آنکھ نہ بھاتی تھی بلکہ وہ اکثر اُس کا باجماعت مذاق اُڑایا کرتے تھے۔

اعجاز تو اُسے "وچ" یعنی جادوگرنی کہا کرتا تھا اور جب کبھی بہت ناخلفی دکھانے پر آمادہ ہوتا تھا تو اُسے "بچ" کہنے

سے بھی نہ چوکتا!

حالانکہ یہ سراسر بدتمیزی تھی کیونکہ

اُلفت کا رویہ اُن کے ساتھ کتنا ہی نامناسب کیوں نہ سہی بہرحال وہ اُن کی بڑی تھی اور اُن کی ماں کی جگہ آئی تھی۔

اب وہ اور بات تھی کہ اُس نے ماں نہ ثابت ہوسکنے کی ہر ممکن تدبیر آزما رکھی تھی۔

علاوہ ازیں ایمانداری کی بات یہ تھی کہ اگر الفت کا رویہ اُن کے ساتھ نامناسب تھا تو وہ کون سا اُس کے آگے جھکے اُس کی راہ میں بچھے جا رہے تھے۔

دونوں ایک دوسرے کے روبرو ڈٹے کھڑے تھے۔

مقابلہ اظہارِ نفرت کا تھا۔

برابر کا تھا۔

اور بہت سخت تھا!

جلیس الحسن بختیار ہمدانی کی رائے کے مطابق انھیں وقت دے کر آزما رہے تھے۔

• • • • • • • • • • • •

باجراں کو اعتماد میں لینے میں الفت کو چنداں دشواری نہ ہوئی

ہر دوسری عورت کی طرح الفت کو بھی جلیس الحسن کی سابقہ بیوی کے بارے میں انتہائی تجسس تھا اور وہ اُس کے بارے میں سب کچھ جان لینے کی خواہاں تھی۔

اُس کی خوبیاں بھی اور خامیاں بھی۔

تاکہ اُس کی خوبیوں کو نیچا دکھانے کی تگ و دو کر سکے۔

اور اُس کی خامیوں کو جلیس الحسن اور اُن کے بچوں کی کمزوری بنا کر ہر اُٹھتے وقت اس کمزوری پر اپنا پاؤں دھر کر انھیں تڑپنے اور بلبلانے پر مجبور کر سکے۔

تہمینہ کے کمرے میں ایک نہیں چار البمز تھے۔ جن کی جائے وقوع سے باجراں بخوبی آگاہ تھی اور اسی نے الفت کو وہ البمز دکھائے۔

ان البمز میں جلیس الحسن اور عاصمہ کی شادی سے قبل سے لے کر عاصمہ کی جلیس الحسن سے علیحدگی سے چند دن قبل تک کی تصویریں چسپاں تھیں۔

جلیس الحسن کے والدین اور اُن کے عزیز و اقارب کی تصویریں بھی تھیں۔ خود جلیس الحسن کی تو اُن کے عہدِ طفولیت تک کی تصویریں موجود تھیں اور ان تصاویر سے عیاں تھا کہ والدین کی واحد اولاد ہونے کے سبب اُن کے ساتھ انتہائی لاڈ و پیار روا رکھا گیا تھا۔

عاصمہ سے اُن کی منگنی اور پھر شادی کی تصاویر ایک علیحدہ البم میں لگی تھیں اور اس امر کی غماز تھیں کہ عاصمہ کو بہت چاہت سے بیاہ کر لایا گیا تھا۔

چاروں بچوں کی اُن کی عمر کے مختلف ادوار کی تصویریں بھی تھیں۔ اُن کی مختلف سالگرہوں کے خوش رنگ مناظر... دوستوں کے ساتھ بیسیوں تصاویر..... اور والدین کے ساتھ مختلف مواقع اور مختلف مقامات کی ان گنت تصویریں۔

جلیس الحسن، عاصمہ کے ساتھ ایک تصویر میں اُس کے روبرو کھڑے بہت پریم کے ساتھ اُس کی گردن میں اپنی باہیں حمائل کیے نظر آتے تھے۔ اس جذبہ حسد و رقابت سے قطع نظر جو الفت جلیس کے ساتھ عاصمہ کی تصاویر دیکھ کر محسوس کر رہی تھی کھینچنے والے نے یہ تصویر اس درجہ کمال کے ساتھ کھینچی تھی کہ اُڑتے لمحوں کو جوں کا توں کیمرے کی آنکھ سے ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لیا تھا۔ دیکھنے والے کو یوں لگتا تھا جیسے دونوں ابھی بول اٹھیں گے!

بچوں کے ساتھ جلیس الحسن اور عاصمہ کی تصاویر زبانِ حال سے گواہی دے رہی تھیں کہ اس کنبے نے زندگی کی مسرتوں کا بھرپور لطف اٹھایا ہوگا۔

وہ خوشیوں کے ہنڈولوں میں جھولے ہوں گے۔

اور گھر خوشیوں کا گہوارہ ہوا کرتا ہوگا۔

یہ تصویریں اس امر کی عکاس تھیں کہ جلیس الحسن، عاصمہ اور بچوں کو ٹوٹ کر چاہتے تھے۔ ہر تصویر میں اُن کی آنکھوں سے عاصمہ اور بچوں کے لیے محبت اور چاہت کا امرت چھلکتا محسوس ہوتا تھا۔

پہلی بچی ثمین کی پیدائش پر وہ عاصمہ کی آغوش میں پڑی بچی کو اس محبت اور مسرت کے ساتھ دیکھتے نظر آتے تھے جیسے کوئی مصور اپنی شاہکار تخلیق کو فخریہ نگاہوں سے دیکھا کرتا ہے۔
یہ تصاویر جلیس الحسن کے ماضی کی منہ بولتی داستان تھیں۔
ماجراں اس داستان کی کڑیوں سے کڑیاں ملاتی چلی گئی تھی۔ گو اپنی ناقص معلومات کے سبب وہ کہیں کہیں اٹک بھی جاتی تھی۔
شاید یہ تصویر فلاں موقع کی ہوگی۔
نہیں شاید فلاں موقع کی۔
اُس نے اندازوں سے کام چلانے کی کوشش بھی کی تھی۔
بہرحال ان تصویروں سے جلیس الحسن کے ماضی اور عاصمہ سے اُن کے تعلقات کے خدوخال پوری طور نہ سہی کافی حد تک واضح ہو گئے تھے۔

اور
ان تصاویر سے قطع نظر ماجراں نے اُسے زبانی بھی بہت کچھ بتانے کی کوشش کی تھی۔
اُس نے اُلفت کو بتایا تھا کہ:۔
عاصمہ دیکھنے میں اپنی تصویروں سے زیادہ خوبصورت دکھائی دیتی تھی۔
جلیس الحسن نے اُس سے اپنی پسند سے شادی کی تھی۔
اکلوتے بیٹے کی بیوی ہونے کے ناتے اُسے جلیس الحسن کے والدین سے بہت محبت ملی تھی۔ اور وہ دونوں جب تک حیات رہے عاصمہ کو انھوں نے اپنے سرآنکھوں پر بٹھائے رکھا۔
جلیس الحسن کے والد کا انتقال اعجاز کی پیدائش کے بعد جسم کے بائیں حصے پر فالج پڑ جانے کے سبب ہوا تھا۔
جبکہ اُن کی والدہ کا انتقال زرین کی پیدائش سے ڈیڑھ دو ماہ قبل ہارٹ فیل ہو جانے کے باعث ہوا تھا۔
جلیس الحسن کے بیشتر قریبی رشتے دار بیرونِ ملک مقیم تھے اور جو کراچی یا پاکستان کے دوسرے شہروں میں مقیم تھے اُن سے اُن کا پہلے بھی کچھ زیادہ ملنا جلنا نہ تھا اور جو تھوڑے بہت روابط تھے بھی تو وہ عاصمہ کے جانے کے بعد متروک ہو گئے تھے کیونکہ انھوں نے باتیں بنانا شروع کر دی تھیں اور جلیس الحسن بچوں کو ان الٹی سیدھی باتوں سے دور رکھنا چاہتے تھے۔
عاصمہ کے بھائی بہن امریکا میں مقیم تھے اور قریب و دور کے دیگر عزیز رشتے دار لاہور یا پنجاب کے دیگر شہروں میں مقیم تھے۔

عاصمہ بیگم کی خواہش تھی کہ جلیس الحسن بھی مستقلاً امریکا نقل مکانی کر جائیں تاکہ وہ اپنے بھائی بہنوں کے قریب رہ سکیں مگر جلیس الحسن اس پر آمادہ نہ ہوتے تھے کیونکہ وہ پاکستان میں ہر لحاظ سے مطمئن تھے اور فقط اس کی خاطر عاصمہ اپنے بھائی بہنوں کے نزدیک رہنا چاہتی تھی وہ اپنے بچوں کو مغرب کی فضاؤں میں مادر پدر آزاد معاشرے کی بھینٹ چڑھا کر مغرب کی تاریک راہوں میں اُلجھنے کے لیے چھوڑنے کے حامی نہ تھے۔
عاصمہ کی امریکا میں مستقل قیام کی خواہش اُسے اُن کے امریکا سے آنے والے اسد علیم کے نزدیک کر دینے کا سبب بنی اور موقع پاتے ہی وہ جلیس الحسن کے ساتھ اپنی اٹھارہ سالہ رفاقت کو ٹھوکر مار کر نہ صرف انھیں بلکہ بچوں کو بھی چھوڑ گئی۔
جلیس الحسن اور عاصمہ کو اُن کے دوست احباب چاند سورج کی جوڑی کہا کرتے تھے۔
اُس کے زمانے میں کوٹھی میں بڑی رونق رہا کرتی تھی۔
آئے دن دعوتیں اور گانے بجانے کی محفلیں منعقد ہوتیں جو رات بھر جاری رہا کرتی تھیں۔
وہ بے حد سگھڑ تھی۔
اُسے نوکروں پر مہربان رہ کر انھیں اپنا مطیع بنا لینے کا فن آتا تھا۔
کھانا بہت عمدہ بناتی تھی اور اُس کے زمانے میں خانساماں زیادہ تر اُس کا ہاتھ بٹانے کا کام ہی کرتا تھا جلیس الحسن کے لیے وہ خود کھانا پکاتی تھی اور انھیں اُس کے ہاتھ کی لذت سے ایسی آشنائی ہو گئی تھی کہ آئے دن گھر میں ہونے والی دعوتوں میں وہ چیلنج کر کے بتا دیا کرتے تھے کہ کون سی ڈش عاصمہ بیگم کے ہاتھ کی بنی ہوئی ہے اور کون سی خانساماں کے ہاتھ کی۔
عاصمہ بہت دلکش تھی۔
اُس کی زبان بلا کی میٹھی تھی۔

اپنی شیریں بیانی سے وہ غیروں کو بھی اپنا بنا لیتی تھی۔
اُس پر ہر لباس سجتا تھا۔
اُس کے پاس زیورات بہت تھے۔
وہ پھولوں اور خوشبوؤں کی بہت شوقین تھی اور اُس کے کمرے میں پھول آراستہ اور خوشبو مہکتی رہتی تھی۔
جلیس الحسن اُس کے بندۂ بے دام تھے اور سوائے امریکا نقل مکانی والی بات کے شاید ہی کوئی بات ایسی ہو جو عاصمہ نے کہی ہو اور انھوں نے نہ مانی ہو۔
اُسے گاڑی چلانا بھی آتی تھی۔
جلیس الحسن نے اُسے پوری آزادی دے رکھی تھی۔
وہ گھر کے سیاہ و سفید کی مختار تھی۔
اسد علیم جو عاصمہ کا چچا زاد بھائی تھا امریکا سے آ کر مہمان ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے عاصمہ کی دلکشی اور شیریں بیانی کا اسیر ہو گیا۔
باوجودیکہ وہ عمر میں عاصمہ سے چھوٹا تھا اُس نے عاصمہ سے بے تکلفانہ مراسم استوار کیے۔ پھر اُس نے نہ عاصمہ کی عمر کی پروا کی اور نہ عاصمہ نے بسے بسائے گھر کا شیرازہ بکھیر دینے میں دیر دکھائی۔
جلیس الحسن نے اُسے سمجھانے بجھانے اور اُس کے ارادے سے باز رکھنے کی بہت کوشش کی مگر وہ نہ مانی۔
اُس کے جانے کے بعد وہ دنوں کھوئے کھوئے سے رہے۔
گھر کے نوکروں نے ان دنوں انھیں بچوں کو سینے سے لگا کر چپکے چپکے کئی مرتبہ روتے بھی دیکھا۔
وہ دوسری شادی پر آمادہ نہ ہوتے تھے۔
دوستوں نے بہت سمجھایا بجھایا تب کہیں مانے۔
اُن کی دوسری شادی میں اُن کے دوست بختیار ہمدانی اور اُن کی بیگم کا بہت ہاتھ تھا۔
جلیس الحسن عاصمہ سے بہت محبت کرتے تھے۔
علی الصبح اُس کے شانوں پر اپنا بازو دراز کر کے اُسے اپنے ساتھ ساتھ لیے لان پر گھنٹا ڈیڑھ گھنٹا چہل قدمی کیا کرتے تھے اور چپکے چپکے نہ جانے کیا راز و نیاز ہوا کرتے تھے اُن کے درمیان۔
جلیس الحسن اُس پر یوں جان چھڑکتے تھے کہ وہ میاں بیوی کم، عاشق و معشوق زیادہ نظر آیا کرتے تھے۔
ماجراں نے اُسے یوں تو اور بھی بہت کچھ بتایا۔
لیکن جب اُس نے یہ کہا کہ "بیگم صاب جی! میں نے سُنا ہے جی کہ مرد اپنی پہلی عورت کو نہیں بھولتا، پیار کرتا ہے۔"
تو لحظہ بھر کو الفت دم بخود رہ گئی۔
کیا ماجراں کی بات کا ڈھکا چھپا مطلب یہ تھا کہ اُس کا صاحب اپنی پہلی بیوی سے زیادہ محبت کیا کرتا تھا!
"کیا مطلب ہے؟" اُس نے مردہ سی آواز میں پوچھا۔
"مطلب یہ ہے جی کہ اپنے صاب جی بہوں پیار کرتے تھے پہلی بیگم کو۔۔۔۔۔ میرا مرد کہتا ہے جی کہ۔۔۔۔۔" وہ کہتے کہتے رک گئی۔
"کیا کہتا ہے تیرا مرد؟"
"وہ جی کہتا ہے کہ بندہ پہلی عورت کو کدی بھلا ہی نہیں سکدا جی!"

اوہ
تو کیا ماجراں جو اس گھر کے بہت سے اسرار و رموز سے آگاہ تھی اُسے محتاط الفاظ میں یہ بتانے کی کوشش کر رہی تھی کہ جلیس الحسن اپنی پہلی بیوی کو ہنوز یاد رکھے ہوئے تھے۔
یہ وسوسہ تو الفت کا پلو تھامے جیسے ہی سے اُس کے ساتھ آیا تھا۔ ماجراں کی خیال آرائی نے اس وسوسے کو ادھیڑ دیا۔
رہی سہی کسر ماجراں نے پوری کر دی کہ:
"بیگم صاب جی! جس عورت کے بچے بندے کول ہر ویلے اپنے گھر میں گرشے فردے نظر آئیں اس نوں بندہ بھلانا چاہے تے نئیں نا بھلا سکدا۔ جیہڑی عورت بچے چھوڑ کر گئی ہووے اس سے تو بندے کا ساری زندگی تعلق نہیں ٹٹ سکدا جی!"
اُلفت کا رواں رواں ان دیکھی دشمنِ جاں عاصمہ کے خیال سے سلگنے لگا اور یہ خیال اُس کے ذہن میں کنڈلی مار کر بیٹھ گیا کہ:

جلبیس الحسن کے بچے اُن کے اور عاصمہ کی یادوں کے بیچ رابطے کی کڑی بنے ہوئے تھے!

• • • • • • • • • • •

محبت اور نفرت دو متضاد جذبے!
اور دونوں کا چلن ایک دوسرے سے جُدا۔
محبت کا دستور گلاب کے دستوریات سے مطابقت رکھتا ہے۔
کانٹوں کے درمیان بھی گلاب کی صورت مہکتی اور مسکاتی ہے!
نفرت کا چلن امر بیل کا چلن ہے۔
دوسروں کے جسم سے زندگی چوس کر خود نمو پاتی ہے!
حسد اور رقابت دو منفی جذبے!
حسد کی آگ حاسد کے دل کو جلاتی ہے۔
رقابت کی عینک سے دیکھنے والے اچھائی اور بُرائی کی تمیز سے محروم ہو جاتے ہیں۔
وہم اور وسوسہ دو لا علاج امراض!
وہم کا اگر علاج ہوتا تو حکیم زمانہ لقمان نے تو ضرور بتایا ہوتا۔
وسوسہ دل میں جڑ پکڑ لے تو تار عنکبوت کے مانند پھیلتا چلا جاتا ہے۔
خدشہ اور خوف بازی گر ہیں!
ایک بار قلبِ انسانی میں تل بھر جگہ پا جائیں تو رائی کا پہاڑ بنا دیتے ہیں۔ روپ بدل بدل کر سامنے آتے ہیں۔ دل لوڑاتے سہاتے اور پاؤں پسارتے چلے جاتے ہیں۔
الفت کا عجیب حال تھا!
دو متضاد و منفی جذبوں کے بیچ روز بروز زیادہ سے زیادہ الجھتی چلی جا رہی تھی۔
وہ جلبیس الحسن سے محبت کرنا اور انہیں بلا شرکت غیرے اپنا نا چاہتی تھی مگر اُن کے بچوں سے شدید نفرت اُسے اُن سے محبت کرنے کی مہلت بھی نہ دے پا رہی تھی۔
عاصمہ کے تصور سے حسد اور بچوں کے خلاف جذبۂ رقابت اُس کے دل کے نرم و گرم گوشوں کو بھی سخت اور سرد کیے دے رہے تھے۔
بے اختیاری کا خوف اُسے ہولائے دیتا تھا۔
کبھی کبھی تو اُسے یوں لگتا جیسے وہ ریگِ ساحل پر کھڑی ہے۔ ایک سرزور لہر پوری شدت کے ساتھ سر اٹھائے گی اور اُس کے قدموں تلے سے زمین کھینچ لے جائے گی۔
بے یقینی خوف کو جنم دیتی ہے۔
اور خوف بڑھ کر جھنجلاہٹ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔
جھنجلانے والے کے ہاتھ اکثر دوسرے کے گریبان کی طرف بڑھتے ہیں لیکن کبھی کبھی وہ خود اپنا گریبان بھی تار تار اور اپنا ہی چہرہ لہولہان کر ڈالتا ہے۔
الفت کے دل میں جگر پکڑنے والی بے یقینی نے پاؤں پسارے تو جھنجلاہٹ کا روپ دھار لیا اور اُس کے ہاتھ جلبیس الحسن کے بچوں کے گریبانوں کی جانب بڑھنے لگے۔
الفت کے خلاف نفرت اور رقابت نے ان بچوں کے معصوم اور الھڑ دلوں کو پہلے ہی اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا الفت کے ہاتھ اپنے گریبان کی جانب بڑھتے دیکھ کر وہ بھی کمربستہ ہو گئے۔
اُس کے اور بچوں کے مابین خاموش اور سرد جنگ نے ایک نئی جون اختیار کرنا شروع کر دی۔
پہلے دونوں جانب سے سرد مہری کا اظہار ہوا کرتا تھا۔
خاموش رسہ کشی اور سرد جنگ تھی۔
اب چوٹیں لڑائی جانے لگیں۔
پہلے ایک دوسرے کو نظر انداز کرنے اور انجان بن جانے کی کوشش کی جاتی تھی۔
اب ایک دوسرے کو گھور کر دیکھا جانے لگا!

الفت جو بچوں کی موجودگی میں تو کجا اُن کی عدم موجودگی میں بھی ادھر جاتے ہوئے ہچکچاتی تھی اب اُن کی موجودگی میں دیدہ دلیری سے نہ صرف اودھر جانے لگی بلکہ دل ہی دل میں دخل اندازیاں اور اعتراضات بھی شروع کر دیے مثلاً:
باجیراں بے چاری جان تو ہر کام صفائی کر کے جاتی مگر ذرا سی دیر میں ساری صفائی کا ستیاناس کر دیا جاتا ہے۔
قالین تو دیکھو کتنا گندا کر رکھا ہے!
لاؤنج اتنا بکھیر کے رکھ دیا جاتا ہے کہ خدا کی پناہ!
جا بجا دیکھو کتابیں کاپیاں بکھری پڑی ہیں۔
کوڑا ڈسٹ بن میں ڈالنے کی زحمت ہی نہیں کی جاتی جیسے ڈسٹ بن تو فقط نمائش کو رکھے گئے ہیں۔
کل فریج میں ڈھیر آئس کریم رکھوائی گئی تھی آج ختم۔ پیٹ ہیں یا کنویں!
بچے اُس کے ان اعتراضات اور دخل اندازیوں پر ناک منہ چڑھاتے ناگواری کا اظہار کرتے۔ اُس کی موجودگی میں منہ چھپا چھپا کر آنکھوں سے ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے زیر لب مسکرا کر اس کا مضحکہ اڑانے کی کوشش کرتے اور جب وہ نیچے چلی جاتی تو سب باہم مل کر اُس کی حرکات و سکنات اور لب و لہجہ کی نقلیں اتارتے اور اس کا باجماعت مذاق اڑاتے۔
پھر بالواسطہ مداخلت اور دبے دبے اعتراضات کی بجائے وہ اُن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اُن سے مختلف سوالات کے ضمن میں پرسش کرنے لگی۔
لاؤنج گندا کیوں پڑا ہے؟
کوریڈور میں کس نے کاغذ پھاڑ کر پھینکا ہے؟
شور کیوں مچایا جا رہا ہے؟
ہنگامہ کیوں ہے؟
میز پر پاؤں کیوں رکھے ہوئے ہیں؟
اخبار پڑھنے کے بعد تہ کر کے کیوں نہیں رکھا گیا؟
اسٹیریو اتنی اونچی آواز میں کیوں چل رہا ہے؟
پڑھائی کے وقت ٹی وی کیوں دیکھا جا رہا ہے؟
دوپٹہ صوفے پر کیوں پڑا ہے؟
چادر کا کونا کیوں لٹک رہا ہے؟
پائن ایپل کیک رات کے رات ہی چٹ کر ڈالا؟
کل رات بارہ بوتلیں کھولی گئی تھیں فریج میں کیا سب پی ڈالیں؟
ماسٹر صاحب کے جانے کے بعد کتابیں کاپیاں سمیٹیں کیوں نہیں؟
اور
اس نوعیت کے ان گنت دوسرے سوالات۔
بچے جدید دور کے تیز و طرار بچے تھے ان کے پاس ہر سوال کا جواب تھا۔
مگر یہ جواب زیر لب دیے جاتے۔
اور جوابات بھی چبھتے ہوئے۔
لاؤنج ہمارا ہے اگر گندا پڑا ہے تو آپ کو تکلیف!
کوریڈور میں کاغذ زرین نے پھاڑ کر پھینکا ہے بُرا لگ رہا ہے تو اُٹھا کر ڈال دیں ڈسٹ بن میں۔
شور مچانے کو جی چاہ رہا ہے اس لیے مچا رہے ہیں آپ کو تکلیف ہو رہی ہے تو کانوں پر ہاتھ دھر لیں اور رہنے دو رہنے...
ہنگامہ اس لیے ہے کہ ہماری مرضی!
کرسی پر اس لیے جھول رہے ہیں کہ دل چاہ رہا ہے اگر آپ کو شوق آ رہا ہے تو آپ بھی جھول لیں!
میز بھی ہماری ہے اور پاؤں بھی ہمارے تو پھر آپ کو تکلیف کیوں؟
اخبار پڑھنے کے بعد تہ کر کے اس لیے نہیں رکھا کہ کوئی خاص خبر نہیں۔
اسٹیریو اونچی آواز میں اس لیے چل رہا ہے تاکہ آپ بھی سنیں!

پڑھائی کے وقت ٹی وی اس لیے دیکھا جا رہا ہے کہ پڑھائی کے ساتھ تفریح بھی ضروری ہے۔
دوپٹا صوفے پر اس لیے پڑا ہے کہ گندا ہے ذرا دھو دیں پلیز!
چادر کا کونا لٹکنے سے آپ کو کچھ تکلیف ہو رہی ہے تو آ کے ٹھیک کر دیں!
ہمارے پائن ایپل کیک کھانے سے آپ کو تکلیف ہے؟
تو ٹلیں پینے کے لیے نہیں پی ڈالیں کیا آپ تو ٹلیں پیتی نہیں کھاتی ہیں؟
ماسٹر صاحب کے جانے کے بعد کتابیں کا پیال اس لیے نہیں سمیٹیں کہ آپ کی تعلیم و تربیت کا بھی تو خیال ہے ہمیں!

پھر
زیر لب دیے جانے والے یہ جوابات بالائے لب دیے جانے لگے۔
وہ بھی بڑی بے باکی اور ڈھٹائی سے۔
وہ پہلو اور بڑی بسہولت زوری کے ساتھ۔
اعجاز تو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سینہ تان کر سامنے آ کھڑا ہونے لگا۔
الفت ان چاروں میں اگر کسی سے انتہائی درجہ خائف تھی تو وہ اعجاز ہی تھا۔ مگر خائف ہونے کے باوجود وہ اس سے کبھڑنے سے احتراز نہ کرتی تھی۔
رفتہ رفتہ
نوبت باقاعدہ جھڑپوں تک جا پہنچی۔
ہمی چپقلشیں ہونے لگیں۔
ملازمین دیکھتے سنتے اور مسکراتے
جلیس حسن سے شکایتوں حکایتوں کا سلسلہ چل نکلا۔
وہ تھکے ماندے گھر لوٹتے تو الفت اُن سے اُن کی پوچھے بغیر اپنی لن ترانی شروع کر دیتی۔
"آج نگین نے یہ کہا؟"
"اعجاز یوں آنکھیں نکالتا چڑھ آیا؟"
"فراز نے بدتمیزی سے جواب دیا۔"
"آپ کی لاڈلی زرین نے میری نقل اتاری۔"
وغیرہ وغیرہ۔
الفت کی حکایتیں شکایتیں سننے کے بعد جب وہ بچوں کے پاس اوپر پہنچتے تو وہ الفت کے خلاف گلے شکووں کے دفاتر کھول کر بیٹھ جاتے۔
"آج انھوں نے یہ کہا۔"
"آج انھوں نے وہ کہا۔"
الفت کے لیے بچے اب تک "وہ"، "اُن" اور "انھوں" کے صیغے استعمال کرتے تھے اور جلیس الحسن کی یہ خواہش کہ بچے اُسے "ماما" یا "ممی" کہہ کر پکاریں، اب تک تو وہ حسرت ناتمام ہی رہی تھی۔
الفت کے خلاف بچوں کے گلے شکوے سُن کر جلیس الحسن سر پکڑ کر رہ جاتے۔
عاصمہ بیگم جب تک اُن کے گھر میں رہیں انھوں نے بچوں کی تربیت میں کوئی سقم نہ رہنے دینے کی حتی الامکان کوشش کی تھی۔
انھوں نے بچوں کو اپنے سے بڑوں کا احترام اور ادب کرنا سکھایا تھا۔ اُن کے ساتھ تمیز سے پیش آنے اور اُن کا لحاظ کرنے کی تربیت دی تھی۔ بڑوں کے لیے زبان سے بے ادبی کی کوئی بات نکالنا ممنوع قرار دیا گیا تھا اور کسی قیمت پر بھی بڑوں کی برابری نہ کرنے کی ہدایت کی گئی تھی۔
بچے ان کے زمانے میں بھی اس قرینہ ادب کی پابندی کیا کرتے تھے اور اُن کے جانے کے بعد بھی اس قرینے کی پابندی کرتے رہے تھے۔
مگر الفت کی آمد کے بعد وہ اس قرینے کی پابندی سے کم از کم الفت کی حد تک تو گویا بے لگام ہی نظر آنے لگے تھے نہ انھوں نے اس کا ادب و احترام کرنا لازم سمجھا نہ اُس کے ساتھ تمیز سے پیش آنا اور لحاظ کرنا ضروری جانا۔

احترام تو انھوں نے اُسے اوّل دن سے ہی نہ دیا تھا بس لبوں پر سرد مہری کا قفل لگا لیا تھا۔ الفت کے موجودہ رویّے نے اس قفل کو بھی توڑ ڈالا تھا
پہلے اگر وہ اس کے پیٹھ پیچھے نقلیں اتارا کرتے تھے اور مذاق اُڑاتے تھے تو اب بیانگ دہل اُس کا مذاق اُڑانے اور بُرا بھلا کہنے لگے تھے۔
جس پیچھے ہیں وہ جلیس الحسن سے الفت کے رویّے کی بابت شکوہ و شکایت کیا کرتے تھے اس سے وہ اُن کی اخلاقی کیفیت کے بارے میں انتہائی متفکر تھے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اخلاقی بگاڑ آہستہ آہستہ شروع ہوتا ہے اور بتدریج بڑھتا چلا جاتا ہے۔
آج اگر وہ الفت کو بُرا بھلا کہہ رہے تھے تو کل کسی اور کے لیے بھی وہ ویسا ہی درشت لہجہ اختیار کر سکتے تھے۔
کیا عجب کہ خود انھی کے لیے!
کیونکہ ان کی نگاہ میں چغلی کھاتی تھیں اور بدلا ہوا رویّہ گواہی دیتا تھا کہ اپنی ماں کی جگہ ایک دوسری عورت کو بٹھا لانے کا سزاوار وہ انھی کو سمجھتے تھے۔
حالات کے بگاڑ کا زیادہ ذمے دار جلیس الحسن الفت ہی کو سمجھتے تھے۔ اُس نے بچوں کے ساتھ نامناسب رویہ اختیار کر کے نہ صرف اپنے سوتیلے پن بلکہ عاقبت نااندیشی کا بھی ثبوت دیا تھا۔
اگر وہ صبر سے کام لیتی، بچوں کے ساتھ غلط رویّہ اختیار کرتے اور اُن سے درشت لب و لہجے میں بات کرنے کی غلطی نہ کرتی تو اُن کے مابین سرد جنگ بالآخر اپنی موت آپ مر جاتی۔
آخر اتنے دن بھی تو وہ اپنے تمام تر اضطراب کے باوجود خاموش رہے ہی تھے
انھیں کھل کر سامنے آنے کا موقع خود الفت کی بے صبری نے فراہم کیا تھا اور ایک بار دو بدو آ کھڑے ہونے کے بعد وہ نگاہیں جھکانے کے لیے آمادہ نظر نہ آتے تھے بلکہ روز بروز الفت کی جانب اُن کے رویّے میں درشتی اور خودسری آتی جا رہی تھی۔
بچے انھیں عزیز از جان تھے۔
بقول اُن کے حاصلِ زیست تھے۔
اگر بختیار ہمدانی نے انھیں صبر و تحمل سے انتظار کرنے کی رائے نہ دی ہوتی تو وہ کب کے قدرے جانب داری سے کام لیتے ہوئے الفت کی جانب بچوں کی سرد مہری سے تنظر پوشی کرتے ہوئے الفت سے دو ٹوک بات کر چکے ہوتے۔
وہ آخر کب تک خاموش تماشائی بنے رہ سکتے تھے!
حالات دن بدن بگڑتے چلے جا رہے تھے۔

* * * * * * * * * * *

الفت نے بچوں کے معاملات میں پہلے دبی دبی دخل اندازیوں اور ڈھکے چھپے اعتراضات سے اپنی جھنجلاہٹ کے اظہار کی ابتدا کی۔
پھر آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اُن سے سوالات کرنا شروع کیے۔
اس کے بعد اُن کے ذاتی معاملات میں براہِ راست مداخلت کا آغاز ہوا۔
چھوٹی چھوٹی ناراضگیاں ہونے لگیں۔
پھر باقاعدہ جھڑپیں
اور چپقلشیں!
جو الفت کی جانب سے بچوں کو طعن و تشنیع کی تکلیف دہ صورت اختیار کر گئیں۔
وہ اُن کی ذرا ذرا سی بات پر نظر رکھنے لگی۔
طعنہ زنی اُس کا اوڑھنا بچھونا بن گیا۔
"گڈ مارننگ"، "گڈ نائٹ" اور "خدا حافظ" کا رابطہ تو کب کا ٹوٹ چکا تھا۔
الفت کی جانب سے طعن و تشنیع شروع ہوئی تو باقاعدہ ٹھن گئی۔
بچوں کو سب سے زیادہ کوفت اس وقت ہوتی جب الفت اُن کی کمزور ترین کمزوری پر پاؤں دھرنے کی کوشش کرتی۔

اُن کی ماں کو جس کی یادوں سے بھی وہ اُس کے وجود کی طرح محبت کرتے تھے' بُرا بھلا کہہ کر اُس میں عیب جوئیاں کرکے وہ انھیں بلبلانے پر مجبور کر دیتی۔

جب وہ اُن کی اس کمزوری پر پاؤں دھر دیتی تو اُن کے لب سل سے جاتے۔ آنکھیں چپکے سے بھیگ جاتیں اور وہ پہلو تہی کرنے لگتے۔

اُن کو اس کیفیت سے دوچار دیکھ کر الفت کو یک گونہ قلبی سکون ملتا اور اُس کی جھنجھلاہٹ ایک عجیب سی تسکین میں بدل جاتی۔

لیکن

کب تک؟

کب تک بچے اُسے اپنے کمزور پہلو پر حملہ کرنے کی اجازت دیے جاتے۔

ایک روز جب اُس کے دل کا چور ان الفاظ کی صورت زبان پر آیا کر:

"ماں خود تو چلی گئی اپنی جنم دی ہوئی مصیبتیں دوسروں کے بھگتنے کو چھوڑ گئی۔"

تو اعجاز اُس کے روبرو آکھڑا ہوا۔ اور اُس نے چلا کر کہا "یو وچ! شٹ یور ماؤتھ..... بکواس بند کرو تم اپنی۔"

"کیا!" الفت دہاڑی۔ "تو نے مجھے وچ کہا..... بدمعاش..... کیا کہا تو نے بکواس بند کرو۔"

"ہاں یہی کہا ہے میں نے۔" اعجاز نے کڑے تیوروں سے کہا۔

"ذلیل کمینے زبان چلاتا ہے۔"

"شٹ اپ!" اعجاز نے حقارت سے کہا۔

"جاجی پلیز تم چپ رہو۔" نگین نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

فراز منہ بسورنے لگا۔

زرین سہم کر ایک جانب کو دبک گئی۔

"باپ کو تم اپنے گھر آلینے دو اُن سے شکایت کروں گی۔" الفت نے سگی سوتیلی ہر قسم کی ماؤں کی مخصوص دھمکی آزمائی۔

"کوئی نئی بات نہیں ہوگی۔" اعجاز نے کہا۔ "پاپا سے تو آپ روزانہ ہی ہم لوگوں کی شکایتیں کیا کرتی ہیں۔"

"دفع ہو جاؤ میں تمہارے منہ ہی نہیں لگنا چاہتی۔"

"ارے آپ تو منہ لگنے کی بات کر رہی ہیں' ہم تو آپ کا منہ ہی نہیں دیکھنا چاہتے' خدا جانے کیوں نیچے سے اوپر آجاتی ہیں۔" اعجاز نے بھبک کر کہا۔

"میرے میاں کا گھر ہے' میں تو پورے گھر میں پھروں گی تمہیں تکلیف!"

"ہمارے بھی باپ کا گھر ہے۔" اعجاز سینہ تان کر بولا۔

"جاجی! میرے بھائی تم ہی چپ ہو جاؤ۔" نگین نے لجاجت سے کہا۔

"باجی! بھائی کو اُن کے کمرے میں لے جائیں۔" فراز پر رقت طاری ہو رہی تھی۔

فراز اور زرین کی حالت خاصی قابلِ رحم ہو رہی تھی۔ مگر الفت کو اُن پر ذرا رحم نہ آیا اور نہ ہی وہ پسپا ہونے پر آمادہ نظر آئی۔

"اونہہ بڑا آیا باپ کے گھر والا۔ اسی ایک باپ کے گھر پر زور ہے تمہارا ارے ایک اور باپ بھی تو بنا رکھا ہے تمہارے لیے تمہاری ماں نے وہاں کیوں نہیں چلے جاتے۔" الفت نے تعلقاً جاہل عورتوں کے سے انداز میں کہا۔

اعجاز جو بڑی بہن کے اصرار اور چھوٹے بھائی اور بہن کے ہراساں ہو جانے کے پیشِ نظر اپنے کمرے کا رُخ کرنا ہی چاہتا تھا کہ الفت کے اس اوچھے ہتھیار نے اُسے تڑپ کر پلٹنے پر مجبور کر دیا۔

وہ مڑا اور بڑے فیصلہ کن انداز میں قدم اُٹھاتا اُس کے روبرو آکھڑا ہوا اور اُسے خونخوار نگاہوں سے دیکھتے ہوئے دانت پیس کر بولا "کیا کہا تم نے؟" وہ "آپ" سے "تم" پر اُتر آیا۔

الفت کو اُس کے تیوروں سے خوف سا آنے لگا آخر کو وہ گرم خون کا ایک نوجوان لڑکا تھا۔

مگر اُس نے اعجاز پر اپنے خوف کا اظہار نہ ہونے دینے کی حتی الامکان کوشش کرتے ہوئے بظاہر بڑے دبنگ انداز میں کہا "مجھے جو کہنا تھا میں کہہ چکی۔"

"اگر آئندہ ایسی بات کی نا تو......"

"تو کیا کرے گا تو میرا؟" الفت نے اُس کے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے اُسے پرے دھکیلنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

اعجاز اُس کی اس حرکت کے لیے تیار نہ تھا۔ وہ لڑکھڑایا مگر پھر سنبھل گیا۔ بجلی کی سی سُرعت سے وہ الفت کی طرف بڑھا اور اُس کے دونوں بازو دبوچ کر اُسے شدید نفرت اور غصے سے دیکھتے ہوئے بولا "اگر آئندہ تم نے ایسی بات کی تو میں شوٹ کر دوں گا۔"

زرین کے منہ سے چیخ نکلی اور وہ بُری طرح رونے لگی۔

"جاجی! میرے بھائی! پلیز!" نگین نے اعجاز کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

"تمہیں کیا ہو رہا ہے؟" اعجاز اُس پر غرایا۔

"ذرا دیکھو تو فراز اور چھوٹی رو رہے ہیں۔"

اعجاز زرین کو دلاسہ دینے کے لیے اُس کی طرف بڑھ گیا۔

الفت نے موقع غنیمت جان کر ناک پھلاتے اور بڑبڑاتے ہوئے وہاں سے کوچ کیا۔

"بچ!" اعجاز نے حقارت سے کہا۔

شام کو جب جلیس الحسن گھر واپس ہوئے تو الفت اپنے کمرے میں بستر پر منہ اوندھائے پڑی تھی۔ انھوں نے پوچھا۔

"خیریت تو ہے؟"

بس پھر کیا تھا۔

آہ و زاری اور شکوہ و شکایات کا طوفان سا اُمڈ آیا۔

الفت اعجاز کو جس قدر بُرا بھلا کہہ سکتی تھی اُس نے کہا اور رو رو کر اپنی آنکھیں سجا لیں۔

جلیس الحسن اُس کی سننے کے بعد حسبِ معمول بچوں کے پاس اوپر پہنچے تو اعجاز کو بپھرا ہوا اور نگین' فراز اور زرین کے چہروں کو اُترا ہوا پایا۔

"کیوں بیٹے آج کیا ہوا؟" جلیس الحسن نے اعجاز سے پوچھا۔

"پاپا! آپ ان سے کہہ دیں آئندہ اوپر نہ آئیں۔" اعجاز تنبیہی اور فیصلہ کن انداز میں بولا۔

"پاپا! جب بھائی کی ان سے لڑائی ہوئی تو میں ڈرنے لگی تھی۔" زرین نے بتایا۔

جلیس الحسن تھکے تھکے سے نگین کے قریب آ بیٹھے اور انھوں نے ایک گہری سانس کھینچتے ہوئے انتہائی متفکر لہجے میں نگین سے کہا۔ "نگین بیٹا! آپ بتاؤ کیا کیا جائے؟"

نگین نے سر جھکا لیا۔

آج اس کا دل بہت دکھا ہوا تھا۔

"تم چاروں بھائی بہنوں میں سب سے بڑی ہو بیٹا گھر کے حالات تمہارے سامنے ہیں بتاؤ کیا کیا جائے؟"

"پاپا!" اُس نے بوجھل آواز میں کہا "کیا آپ ہم لوگوں کے ہاسٹل میں رہنے کا بندوبست کر سکتے ہیں؟"

جلیس الحسن دم بخود رہ گئے۔

نگین کے الفاظ تیغ کی صورت اُن کے دل میں اُترتے چلے گئے تھے!!

"نہیں بیٹے!" انھوں نے نگین کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "اگر مجھے آپ لوگوں کو ہاسٹل ہی میں رکھنا ہوتا تو گھر میں یہ عورت نہ آتی۔"

بچوں کی دلجوئی کی خاطر وہ ان سب کو لے کر کچھ دیر کے لیے گھر سے باہر چلے گئے۔

باہر گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سُن کر الفت نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر جھانکا تو جلیس الحسن کو بچوں کے ہمراہ گھر سے باہر جاتے دیکھا۔

کمرے سے باہر نکل کر اُس نے ملازم لڑکے سے سُن گن لینے کی کوشش کی تو اُس نے بتایا کہ صاحب ہنستے مسکراتے بچوں کے ساتھ باہر گئے ہیں۔

الفت آزردہ خاطر بستر پر آ پڑی۔

جلیس الحسن نے بچوں کے ساتھ جتنا وقت بھی باہر گزارا بظاہر تو اُن سے ہنستے بولتے رہے مگر بباطن بہت اُلجھے ہوئے تھے۔

انھوں نے الفت سے دوٹوک بات کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔
بختیار بھائی سے پہلے مشورہ لینا وہ ضروری نہ سمجھتے تھے کہ انھی کے مشورے پر تو انھوں نے الفت کو اتنا وقت دیا تھا۔
اور یقیناً بچوں کو بھی!
وہ اس حقیقت سے بھی آگاہ تھے اور اسے تسلیم کرتے تھے کہ غلطی دونوں جانب سے ہوئی تھی مگر بہت سے اسباب۔ عمل، حالات اور شواہد کی بنا پر الفت کے مقابلے میں بچوں کو زیادہ قابلِ رعایت سمجھتے تھے۔
بچوں کو کچھ دیر باہر گھمانے پھرانے اور آئس کریم کھلانے کے بعد جب وہ گھر واپس لوٹے تو الفت کو تکیے میں منہ چھپائے بستر پر دراز دیکھا۔
وہ سمجھ گئے کہ اس کی خفگی بچوں کو باہر لے جانے کے سبب تھی۔
انھوں نے اُسے منانے کی کوشش نہیں کی۔
اور بچوں کو اور پریشان ہونے سے بچانے اور اس وقت گھر کی فضا کو مزید کشیدہ ہونے سے بچانے کی خاطر انھوں نے اُسے اس وقت تو نہ چھیڑنا ہی مناسب سمجھا۔
رات کو کھانے کا وقت ہوا تو انھوں نے اُسے جھوٹ موٹ کی نیند سے بیدار کرنے کے بعد کھانے کے لیے اُٹھنے کو کہا۔
مگر اُس نے اپنا بازو موڑ کر آنکھوں پر دھرتے ہوئے کہا "بھوک نہیں ہے"
بھوک تو جلیس الحسن کی بھی اُڑ ہی ہوئی تھی مگر بچوں کی خاطر وہ نہ چاہتے ہوئے بھی کھانے کی میز تک چلے آئے۔

اگلی صبح وہ معمول کے مطابق اٹھی مگر نماز پڑھ کر دوبارہ بستر پر پڑ گئی۔ دیوار کے رُخ کروٹ لیے پڑے ہونے کے سبب جلیس الحسن اس کے چہرے کے تاثرات نہ دیکھ پائے۔
انھوں نے اُسے حسبِ معمول لان پر چہل قدمی کے لیے چلنے کو کہا تو وہ اُن کی جانب دیکھے بنا تلخ لہجے میں بولی "آپ کو میری بھلا کیا ضرورت۔ آپ کے بچے ہیں تو سہی آپ کے ساتھ واک کرنے کو"
اُس کے جواب نے انھیں ایک تلخی کی کیفیت سے دوچار کردیا۔
جی میں تو آیا کہ بنا کچھ کہے سنے اُس کے ساتھ دو دو باتیں کرنے بیٹھ جائیں مگر پھر اس خیال نے کہ اور بچے بھی جاگ چکے ہوں گے اور کچھ دیر بعد ان کے اسکول جانے کا وقت ہو جائے گا انھیں صبر و ضبط سے کام لینے پر مجبور کردیا۔
وہ رنج اور غصے کی حالت میں تنہا ہی چہل قدمی کو نکل گئے۔
ہیجان کے عالم میں کچھ دیر سبزہ زار پر ننگے پاؤں چہل قدمی کرتے رہے۔
انھیں الفت پر غصہ آرہا تھا کہ وہ کوئی ناسمجھ اور نو عمر لڑکی نہ تھی۔ اچھی خاصی عمر کی پڑھی لکھی اور سمجھدار لڑکی تھی۔ بروقت شادی ہوگئی ہوتی اور خدا نے اپنی رحمت سے محروم نہ رکھا ہوتا تو آج بڑے بڑے بچوں کی ماں ہوتی۔ اُسے تو چاہیے تھا کہ سمجھداری سے کام لیتے ہوئے اُن کے بچوں کو اپنا بناتی۔ خود بھی سکھ سے رہتی اور اُن کو بھی شانت رکھتی۔
مگر افسوس کہ اس نے سمجھدار ہوتے ہوئے بھی ناسمجھی اور تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود روایتی جہالت کا ثبوت دینے کی کوشش کی تھی بلکہ ثبوت دے دیا تھا!
اگر وہ بچوں کو موقع فراہم نہ کرتی تو مجال تھی کہ اعجاز اس کی برابری کرنے کی ہمت کرپاتا یا بقول اُس کے اُس کا مذاق اُڑایا جاتا یا لقلیں اتاری جاتیں۔

وہ بچوں کی جانب دوستی، محبت اور اپنائیت کا ہاتھ بڑھا کر دیکھتی تو سہی اگر وہ محبت کا جواب نفرت سے اور دوستی کا دشمنی سے اور اپنائیت کا غیریت سے دیتے تو بلاشبہ قصوروار گردانے جاتے۔
مگر وہ تو اوّل دن سے ان سے دور اور کھنچی کھنچی رہی تھی۔
جلیس الحسن کی تجربہ کار اور زمانہ شناس نگاہوں نے اُسے بچوں سے ہمیشہ سرد مہری برتتے اور انھیں نظرانداز کرتے ہی دیکھا تھا۔
چار ماہ ہونے کو آرہے تھے مجال تھی کہ اُس نے ایک دن کبھی ان سے بچوں کے سلسلے میں ماں بن کر بات کی ہو۔ بلکہ اُن کے خلاف شکایتوں شکایتوں کا ایک دفتر اکٹھا کردیا تھا جو بالآخر جلیس الحسن کے نزدیک خود اس کو اس کے مقام سے گرا گیا تھا۔
وہ مٹھیاں بھینچے، انھی خیالات میں گم رنج و غصے کی ایک ناقابلِ بیان بلکہ اذیت ناک کیفیت سے دوچار سبزہ زار پر ٹہلتے رہے۔
اُدھر
اُلفت اپنے کمرے میں اپنے مقدر پر دل گرفتہ پڑی تھی۔
رنج اور ملال نے اس کا دل بھی اپنی مٹھی میں دبوچ رکھا تھا۔
غصہ اُسے بھی آرہا تھا۔
بچوں پر بھی
اور جلیس الحسن پر بھی!
بچوں سے بازپرس کرنے اور گوشمالی کے بجائے انھوں نے تو اُلٹا انھیں شہ دی تھی۔ گھمانے پھرانے کے لیے باہر لے گئے گویا کہ انھوں نے کوئی بڑا کارنامہ سرانجام دیا تھا جس کا انعام وہ انھیں اس صورت میں دے رہے تھے۔
خدایا!
زندگی کتنی مشکل ہوگئی تھی اُس کے لیے!
اس زندگی کی دقتیں تو شادی سے قبل ہی اُس کے مطمحِ نظر تھیں مگر اتنی اذیت تو اس کے گمان میں بھی نہیں تھی۔
روز مرنا اور روز جینا پڑتا تھا۔
ہولا کے رکھ دیا تھا زندگی کے اس روپ نے اُسے۔
سکون درہم برہم ہو کے رہ گیا تھا۔
اعصاب ہر وقت تنے رہتے تھے۔
دماغ پھٹتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔
کبھی کبھی تو یوں لگتا تھا کہ پاگل ہو جائے گی۔
دل!
گویا دل نہ رہا تھا دھیرے دھیرے رستا ہوا پھوڑا بن گیا تھا جس سے اُٹھنے والی ٹیسیں اُسے بے کل کرکے رکھ دیتی تھیں۔
اپنے پرائے یہی سمجھتے تھے کہ وہ بہت خوش تھی۔
اور وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چہار اطراف دیکھتی تھی کہ:
خدا جانے خوشی کہاں جا چھپی تھی؟
دل کے اندر رستا پھوڑا ہی سمجھو کم تھا جو آج جلیس الحسن بھی بڑی غیریت سے اپنے راستے پر ہولیے تھے۔ خود تو سبزہ زار پہ ٹہلتے ہوئے حسبِ معمول لمبی لمبی گہری سانسیں لے رہے ہوں گے اور اُسے اس کمرے میں پڑا چھوڑ گئے تھے۔
وہ تو رات بھی آرام سے سوگئے تھے..... گہری نیند سونے سے مگر تھوڑی ہی سکتے تھے وہ رات بھر جاگتی اور کروٹیں بدلتی رہی تھی۔ ایک دوبار وہ ذرا کی ذرا جاگے بھی مگر بندۂ خدا نے پلٹ کر اتنا پوچھنے کی بھی زحمت نہیں کی کہ:
"آج اتنی بے کل کیوں ہو؟"
"کیا دکھ ہے تمہیں؟"

اوں ہوں!
مجال ہے جو دو بول ہمدردی کے بولے ہوں۔
کیا ہوا اگر انہوں نے غصے میں آ کر یہ کہہ دیا کہ:
"آپ تو میری بھلا کیا ضرورت آپ کے بچے ہیں تو ہی آپ کے ساتھ واک کرنے کو!"
وہ ذات منا تو سکتے تھے۔
یاں بالکل مان جاتی۔
ارے عورت تو ہے ہی سدا کی دیوانی!
اپنے مرد کی زبان سے محبت کے دو بول سُن کر موم ہو جاتی ہے پگھل کر اُسی کے قدموں میں ڈھیر ہو جاتی ہے!
مگر وہ محبت کے دو بول بولتے تو سہی۔
انہوں نے ایک کہا: وہ سیدھے کمرے سے نکل گئے۔
اُن کے پاس تو راستوں کی کمی نہیں۔
مرد جو ٹھہرے۔
مرد ذات کے لیے راستوں کی بھلا کیا کمی۔
ع تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی!

یہ نہ سوچا انہوں نے کہ یہ دیوانی اور روگن بھلا کہاں جائے گی؟
اُس کے پاس تو بس ایک ہی راستہ ہے۔ یا تو اسی پہ چلتی رہے گی، ورنہ مر جائے گی!
آنسو اُس کی بائیں کنپٹی کو بھگوتے تکیے میں جذب ہوتے چلے جا رہے تھے۔
"اس زندگی سے تو موت بہتر...... اے کاش! مجھے موت ہی آ جائے..... ہاں ابھی اور اسی وقت!" اُس نے دکھے دل سے دعا کی۔
"جب آ کے دیکھیں گے کہ مری پڑی ہے تب میری قدر جانیں گے!"
"پھر تو دنیا والوں کو خوب رو رو کر دکھائیں گے؟"
"یہ بھی کہیں گے کہ بڑی صبر والی تھی!"
"تب ہی میری قدر بھی کھلے گی اُن پر!"
اُس نے اپنے داہنے ہاتھ کی تیسری انگلی میں پڑی ہیرے کی اس انگوٹھی کو جو جلیس الحسن نے شبِ عروسی کو رونمائی میں دی تھی، اپنی بھیگی ہوئی آنکھوں کے نزدیک کر لیا۔ کچھ دیر آنسوؤں کی رَو کے پیچھے سے اُسے دیکھتی رہی پھر مرغِ بسمل کی طرح تڑپنے لگی۔
"ہاں!
اس تو ہین!
اس ہتک سے تو اچھا ہے کہ میں انہی کی عطا کردہ انگوٹھی کے ہیرے سے اپنی زندگی کا خاتمہ کر لوں۔
خودکشی حرام ہے مگر اس اذیت دہ زندگی سے تو بہتر ہو گی!"
گرم گرم آنسوؤں کی ایک نئی رَو آنکھوں میں اُمڈ آئی۔
دروازے پر ہلکی سی دستک سنائی دی۔
یقیناً وہ نہیں تھے کوئی اور تھا۔
انہیں بھلا دستک دینے کی کیا ضرورت!
اُن سے تو سارا تکلف اور حجاب ختم ہو گیا تھا۔ وہ اتنے قریب تھے کہ کوئی دوسرا اُن کی جگہ اس قدر نزدیک آ ہی نہیں سکتا تھا۔
"کون؟" اُس نے کروٹ موڑے موڑے بھیگی ہوئی آواز میں پوچھا۔
پھر وہی دستک!
اُس نے سرہانے پڑے دوپٹے سے آنکھیں پونچھیں اور لیٹے ہی لیٹے گردن موڑ کر ذرا بلند آواز میں پوچھا۔
"ہاں کون ہے بھئی؟"

دروازہ دھیرے سے وا ہوا۔ ملازم لڑکے کا چہرہ نظر آیا اور اُس کی آواز سنائی دی۔
"بیگم صاحب! صاحب جی آپ کو ناشتے کے لیے بلا رہے ہیں۔"
"جا کے کہہ دو بیگم صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"
دروازہ دوبارہ دھیرے سے بند کر دیا گیا۔ اور لڑکا چلا گیا۔
"لو اب یہ اوقات ہو گئی ہماری کہ نوکر سے بلوا کر بھیجا جا رہا ہے!" اُس نے سوچا۔
اور ایک بار پھر آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔
کوئی ہمدرد اور نہیں تو وہ اُس کے نزدیک ہوتا اور اُس کی قلبی کیفیت سے آگاہ ہوتا تو وہ سمجھاتا کہ:
"بی بی! ہوش کے ناخن لے۔ گھر تیرا، مرد تیرا..... گرہستی تیری..... مرد تیرا تو اُس کی..... تجھے ناشتے کی میز پر اُس کا استقبال کرنا چاہیے نہ کہ وہ تجھے بلوا بھیجے..... بھئی یہی..... تیری بات..... جو عورتیں گھر بسائے رکھنا چاہتی ہیں وہ یہ نہیں اپناتیں!"
مگر افسوس کہ کوئی ہمدرد اور نہیں خواہ اُس کے نزدیک نہ تھا جو اُسے سمجھاتا۔ اپنی دانست میں وہ خود کو اس گھر بلکہ شاید اس دنیا کی مظلوم ترین عورت سمجھ رہی تھی۔
اور جو خود کو مظلوم سمجھتا ہے وہ خود کو حق بجانب بھی تصور کرتا ہے۔
خواہ وہ کتنا ہی غلط کیوں نہ ہو!
کچھ دیر بعد دروازے پر پھر دستک سنائی دی۔ چند لمحوں کے توقف سے دروازہ وا ہوا اور سلیم ناشتے کی ٹرالی دھکیلتا اندر داخل ہوا۔
"بیگم صاحب! ناشتا!" سلیم نے ٹرالی مسہری کے نزدیک لا روکی۔
"ٹھیک ہے۔"
"صاحب جی نے بولا تھا کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو پوچھ لینا..... کچھ اور لانا ہے جی؟"
"نہیں تم جاؤ۔"
اُس نے ٹرالی کی جانب دیکھنے تک کی ضرورت محسوس نہیں کی۔
"اچھا جی۔" سلیم نے کہا اور چلا گیا۔
جاتے ہوئے وہ دروازہ بند کر گیا۔
ناشتے کی میز پر جلیس الحسن بظاہر تو بچوں کے ساتھ ہنس بول رہے تھے مگر اندر سے آزردہ خاطر تھے۔
مگر بچے خوش تھے کہ آج ناشتے کی میز پر ان کی دشمنِ جان نہیں تھی۔
"نگی بیٹے کا کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے؟" جلیس الحسن نے خود اپنا دھیان بٹانے کو پوچھا۔
"جی پاپا!"
"اعجاز میاں! آپ کو بہن کی طرح فرسٹ ڈویژن لانی ہے۔"
"جی پاپا!"
"فراز بیٹے! مولی نئی تصویر بنائی آپ نے؟"
نگین، اعجاز اور زرتین تینوں نے دبی دبی مسکراہٹ کے ساتھ فراز کی جانب دیکھا اور فراز اس خیال سے خائف نظر آنے لگا کہ کہیں ان تینوں میں سے کوئی پاپا کو یہ نہ بتا دے کہ اُس کی تازہ ترین تخلیق ایک مضحکہ خیز کارٹون تھا ان کی سوتیلی ماں کا!
جلیس الحسن نے ان تینوں کو مسکراتے اور فراز کو خائف ہوتے دیکھا تو بولے "کیوں بیٹا لگتا ہے کوئی بہت ہی معرکۃ الآرا تصویر بنا ڈالی ہے تم نے؟"
"نہیں تو پاپا!" فراز منمنایا۔
"جی پاپا!" زرتین چہکی۔
لیکن بڑی بہن کی تنبیہی نگاہوں نے اُسے چپ ہو کر بیٹھ جانے پر مجبور کر دیا۔
"چھوٹی بس اب کھانا پینا بند بھی کرو تم روزانہ دیر کروا دیتی ہو۔"
"نہیں تو بھائی!" زرتین نے منہ بنا کر کہا۔

"تمہیں تو بھائی کی کیا بات، دیر تم ہی کرواتی ہو۔"
"آل رائٹ جاجی! بس ایک دفعہ کہہ دیا تم نے کافی ہے۔" تمکین نے بہن کی حمایت کی۔
اس نئی بحث میں فراز کی تازہ ترین تخلیق والی بات آئی گئی ہو کر رہ گئی۔
بچے ناشتے کی میز سے خوش خوش اُٹھے کہ آج بہت دنوں بعد پاپا نے اُن سے ناشتے پر خاصے خوشگوار موڈ میں اُن کی دلچسپی کی باتیں کی تھیں اور اُن کی سوتیلی ماں ناشتے کی میز پر غیر حاضر تھی۔
بچوں کو خدا حافظ کہنے تک جلیس الحسن نے اپنے کمرے کا رُخ نہیں کیا۔
جب ڈرائیور، اعجاز، فرانا اور رزین کو اُن کے اسکول اور تمکین کو اُس کے کالج چھوڑنے چلا گیا تو جلیس الحسن نے اپنے کمرے کی جانب پیش قدمی کی۔ ابھی وہ راہداری میں تھے کہ اُن کے بھاری قدموں کی مخصوص آہٹ سُن کر الفت نے پھر دیوار سے رُخ کروٹ موڑ لی۔
جلیس الحسن نے کمرے میں داخل ہونے کے بعد ایک طائرانہ جائزہ لیا۔
ٹرالی پر آراستہ لوازماتِ ناشتہ جوں کے توں دھرے تھے اور الفت رُخ موڑے لیٹی تھی۔
گویا اُس سے دو ٹوک بات کرنے کا موقع آ چکا تھا۔
انھوں نے دروازہ اچھی طرح بند کیا۔ زور سے کھنکھارے اور سیدھے اُس کی جانب بڑھ گئے۔ الفت نے ذرا حرکت نہ کی۔
"الفت" انھوں نے آہستہ سے پکارا اور مسہری کے کنارے اُس سے قدرے فاصلے پر ٹک گئے۔
وہ بدستور کروٹ لیے لیٹی رہی۔
"تم نے ناشتہ کیوں نہیں کیا؟"
"آپ کو میرے ناشتہ کرنے نہ کرنے سے کیا مطلب؟"
"مطلب ہے تب ہی تو پوچھ رہا ہوں۔"
"آپ کو تو صرف اپنے بچوں سے مطلب ہے۔"
"ہاں اُن سے بھی ہے مگر تم سے بھی۔" انھوں نے گھمبیر آواز میں کہا پھر اُس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولے۔ "اٹھو، میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔"
خدا جانے یہ اُن کے لمس کا اثر تھا یا مجبوری کہ وہ اُٹھ بیٹھی۔
جلیس الحسن نے گہری نگاہوں سے اُس کے چہرے کا جائزہ لیا۔ پھر سر جھٹک کر بوجھل آواز میں بولے۔ "تمہیں علم تھا الفت کہ میرے چار بچے بھی ہیں۔ پھر شکوہ کیسا؟"
"اس قدر نالائق اور بدتمیز بچے!" وہ بھڑک کر بولی۔
"بچے سارے ہی نالائق اور بدتمیز ہوا کرتے ہیں۔ انھیں لائق اور تمیزدار بڑے بناتے ہیں...... میں نے تم سے اول روز ہی کہہ دیا تھا کہ ان بچوں کو حالات نے ضرورت سے زیادہ حساس اور زخم خوردہ بنا دیا ہے۔ تمہیں ان کے زخموں پر اپنی محبت کے پھاہے رکھنا ہوں گے۔ اُن کے مسائل کو سمجھنا ہوگا اور ان کے دکھ درد کو بانٹنے کی کوشش کرنا ہوگی۔ ان سے غلطیاں بھی ہوں گی لغزشیں بھی سرزد ہوں گی۔ اُن کے لیے کوئی سزا تجویز کرنے سے پہلے لحظہ بھر کو تم نے ضرور سوچ لینا کہ اگر ان بچوں نے تمہارے بطن سے جنم لیا ہوتا تو اُن کی غلطی یا لغزش پر تمہارا کیا ردعمل ہوتا؟" وہ لحظہ بھر کو رُکے پھر بولے۔ "الفت تم ان کی ماں بن کر اس گھر میں آئی تھیں۔ تمہیں ان کے سروں پر دستِ شفقت رکھنا چاہیے تھا۔ اُن کے نزدیک آنا چاہیے تھا۔ اُن کے جذبات، مسائل کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے تھی...... یقین کرو محبت کے پیاسے ہیں بچے۔ ناصرہ نے اپنی زندگی کی بابت جو فیصلہ کیا وہ جُدا بات ہے لیکن اُس کی اس خوبی کا اعتراف نہ کرنا ناانصافی ہوگی کہ وہ ایک اچھی ماں تھی اور جب تک بچوں کا اور ماں کا ساتھ رہا، اُس نے اُن کی تربیت میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی......"
"جی ہاں، دیکھا ہے میں نے اس تربیت کا عملی مظاہرہ۔" الفت نے ناگواری سے کہا۔ "آپ کے صاحبزادے میرے سامنے سینہ تان کر کھڑے ہو گئے تھے...... مجھے ویمپ کہا...... مجھے شوٹ کر دینے کی دھمکی دی۔ یہی تربیت سکھائی تھی اُن کی ماں نے انھیں؟"
جلیس الحسن نے یوں سر جھکا لیا جیسے اعجاز کی ان لغویات پر شرمسار ہوں پھر بولے۔ "مجھے افسوس ہے کہ اس نے ایسا کہا لیکن میں یہ کہنے میں کوئی تردد نہیں کروں گا کہ بنیادی غلطی تمہاری ہے۔"
"اچھا!" الفت نے بڑی ٹیڑھی نظروں سے انھیں دیکھا۔
"ہاں!" وہ قطعیت کے ساتھ بولے۔ "اگر تم بچوں سے کھنچی کھنچی نہ رہتیں۔ اُن کے ساتھ ماؤں والا رویہ رکھتیں تو ان میں سے کسی کی

مجال نہ تھی کہ وہ تمہارے ساتھ بدتمیزی کر سکتا۔"
"وہ تو جیسے بہت واری نثار ہوتے تھے مجھ پر!" وہ تڑخ کر بولی۔
"بابا! یہی بات تو میں تمہیں سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ اگر تم اُن کے سر پر ہاتھ رکھنے کی کوشش کرتیں تو وہ کیونکر دور دور رہتے تم سے؟"
"آپ اُن کی بے جا حمایت کر رہے ہیں۔"
"اُن کی حمایت نہیں بلکہ تمہیں سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ تمہاری غلطی کی نشاندہی کر رہا ہوں۔" وہ بڑی رسانیت سے بولے۔
"اچھا تو گویا قصوروار میں ہوں، غلطی میری ہے؟"
"بالکل!" وہ بولے۔ "میرا عقیدہ ہے کہ چھوٹوں کی غلطیوں میں بڑوں کا حصہ زیادہ ہوتا ہے۔" وہ تھمے پھر بولے۔ "بہرحال ابھی بھی کچھ بگڑا نہیں ہے۔ تم اگر بچوں کے ساتھ اپنے رویے میں تبدیلی پیدا کر لو تو پھر کوئی مسئلہ نہیں۔ تمہیں کچھ انتظار ضرور کرنا ہوگا مگر میں سمجھتا ہوں حالات بہتر ہو جائیں گے۔"
"میں آپ کے بدتمیز اور نالائق بچوں کی صورت دیکھنے کی بھی روادار نہیں۔" الفت نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔
جلیس الحسن نے تیور بدل کر اُس کی طرف دیکھا پھر بولے۔ "سوچ لو۔"
"سوچ لیا ہے۔" وہ بلاتامل بولی۔
"کیا تم جانتی ہو کہ تم کتنی بڑی غلطی کر رہی ہو؟"
وہ جلیس الحسن کو ٹیڑھی نگاہوں سے دیکھ کر رہ گئی۔
"بچے مجھے بہت عزیز ہیں۔"
"کیوں نہ ہوں گے جان۔ بیگم کے جو ہوئے۔"
"کیا مطلب؟"
"مطلب یہ کہ آپ اس عورت کو بھلانا نہیں چاہتے۔ اُس کے بچوں کے توسط سے اُس کی یادوں میں کھوئے رہنا چاہتے ہیں۔" اُس نے توقف کیا پھر بولی۔ "صاحبزادیوں کے کمرے میں اُس کی ڈھیروں تصویریں ہیں، صاحبزادے کے سرہانے اُس کی تصویر اور......"
لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتی وہ اُس کی بات کاٹتے ہوئے بولے۔ "وہ اُن کی ماں تھی، اُن کی ماں ہے۔ ہم اُن سے اس سے محبت کرنے کا حق چاہیں بھی تو نہیں چھین سکتے۔ ماں سے اُن کا محبت کرنا بالکل فطری بات ہے...... وہ انگریز نے کہا ہے نا 'اِٹ از جسٹ نیچرل' بالکل وہی بات ہے یہ۔"
"اچھا اُن کی تو وہ ماں ہے اس لیے اس سے اُن کا محبت کرنا فطری بات ہے اور وہ جو آپ کی الماری میں رکھے لاکٹ میں اُس کی تصویر لگی ہے......!"
جلیس الحسن نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا اور دھیمے سُروں میں بولے۔ "تو تم نے الماری کی تلاشی لے ڈالی!"
"تلاشی لینے کی کیا بات؟ میں آپ کی بیوی ہوں۔ آپ کے تمام معاملات سے باخبر رہنا میرا حق بنتا ہے......" اُس نے توقف کیا پھر انھیں گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "یا نہیں؟"
وہ سر جھکائے گہری سوچ میں گم بیٹھے تھے۔
"اس لاکٹ میں اُن محترمہ کی تصویر محفوظ رکھنے کی بابت آپ کیا جواز پیش کریں گے؟"
"دیکھو!" انھوں نے بے حد رسان بھرے لہجے میں کہا۔ "اس لاکٹ کا قصہ یہ ہے کہ اس کے جانے کے بعد میں نے اپنے گلے سے اُتار کر الماری میں رکھ دیا تھا اور وہ اب تک وہیں پڑا ہے۔"
"آپ اس میں سے تصویر نکال بھی تو سکتے تھے۔"
"بندی خدا! مرد اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں کو نہ اہمیت دیتے ہیں نہ اُن کے لیے متفکر ہوتے ہیں۔ مرد تم عورتوں کی طرح چھوٹی چھوٹی باتوں کو اہمیت دینے اور ان کے لیے متفکر ہونے لگیں تو دنیا کے ان گنت بڑے کام رُک جائیں۔"
"اوہ! یہ چھوٹی بات! اپنی گانٹھ کے پورے ہوتے ہیں آپ مرد حضرات۔ کس خوبصورتی سے پردہ ڈالا ہے آپ نے اپنی کمزوری پر؟"

"تم غلط سمجھ رہی ہو۔"
"میں بالکل صحیح سمجھ رہی ہوں..... آپ اس عورت کو بھلانا نہیں چاہتے۔ وہ اب تک آپ کے خیالوں میں بسی ہوئی ہے۔"
"اوہ! نو! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" انھوں نے پوری شدت سے اس کی بات رد کرنی چاہی۔
"بالکل یہی بات ہے۔"
"خدا کے واسطے عقل کی بات کرو۔"
"اگر اسی کو یاد رکھنا تھا تو میری زندگی برباد کرنے کی کیا ضرورت تھی؟" الفت کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو امڈ آئے۔
"تمھیں بدگمانی ہے اور کچھ نہیں۔"
"ہاں اپنی چوری پکڑے جانے کو آپ بدگمانی اور غلط فہمی پر محمول کرنے کی کوشش کریں گے۔"
"پلیز!" جلیس الحسن گڑگڑائے اور انھوں نے اس کے دونوں بازو پکڑ کر اس کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی۔
"مت ہاتھ لگائیں مجھے۔" وہ ان کے بازو جھٹکتے ہوئے بولی۔
"میں تمہارا شوہر ہوں اور مجھے اس حق سے کوئی نہیں روک سکتا۔" انھوں نے بڑے بھرپور اور زعم کے ساتھ کہا۔
"میں روک سکتی ہوں۔" اس نے اپنے بازوؤں کو ان کی گرفت سے چھڑانے کی دوبارہ کوشش کی۔
انھوں نے بے یقینی سے اُسے دیکھا اور بولے۔ "تم جانتی ہو کہ تم کیا کہہ رہی ہو؟"
"ہاں جانتی ہوں۔"
جلیس الحسن کے ہاتھ اُس کے بازوؤں کو اپنی گرفت سے آزاد کرتے ہوئے میکانکی انداز میں نیچے آ رہے۔
"مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم جیسی پڑھی لکھی عورت بھی ایسی بے عقلی کا مظاہرہ کر سکتی ہے۔"
"ہاں..... ہاں میں بے عقل ہوں، ناسمجھ ہوں، بدگمان ہوں، جاہل ہوں۔ سارے عیب مجھ میں ہیں..... ساری خوبیاں تو آپ کی پہلی بیگم میں تھیں جو شاید واپس آ جائے تو آپ اُسے پھر سر آنکھوں پہ بٹھانے اور اس کے سارے عیبوں کو ثواب اور خرابیوں کو خوبیاں سمجھنے پر تیار ہو جائیں گے۔"
"اگر ایسا ہوا تو قصوروار تمھی ٹھہرو گی۔" انھوں نے بڑی متانت سے کہا۔
"کیوں؟ میں کیوں قصوروار ٹھہروں گی؟"
"کیونکہ پہلی عورت سے مرد کا تعلق ٹوٹ جانے کے بعد دوسری عورت کے ہوتے ہوئے بھی اُس کی پہلی مطلقہ کی واپسی کا امکان ہوا اور واپسی ہو جائے تو اس کا واضح مطلب یہی ہوگا کہ دوسری نااہل تھی جو مرد کے دل سے پہلی کا خیال محو نہ کرا سکی۔"
"چاہے مرد بے ایمان اور بد دیانت ہو قصور بے چاری دوسری ہی کا ٹھہرے گا!"
"کیا مطلب؟"
"دوسری عورت کے ہوتے ہوئے مرد کو سوتے کے دل میں پہلی کی تصویر لگا کے رکھنے کی کیا ضرورت؟ کیا یہ مرد کی بددیانتی اور بے ایمانی کی دلیل نہیں ہے؟"
"نہ وہ بددیانتی ہے نہ وہ بے ایمانی فقط ایک سہو ہے۔ ہجوم روزگار میں مجھے یہ سوچنے کی مہلت ہی نہ ملی کہ لاکٹ میں لگی عاصمہ کی تصویر ایک دن کسی کو مجھ سے بدگمان کر دینے کا سبب بھی بن سکتی ہے۔"
"اونہہ! پھر وہی اپنے عیب کی پردہ پوشی۔"
"اچھا بفرض محال میں مان بھی لوں کہ تم درست کہہ رہی ہو تب بھی میں قصوروار تمھی کو سمجھوں گا۔"
"کیوں؟" وہ تیوریاں چڑھا کر بولی۔
"کیونکہ تم اگر دانشمند ہوتیں تو ایسے حالات پیدا کرتیں کہ میں اس لاکٹ میں سے عاصمہ کی تصویر نکال کر اس کی جگہ تمہاری تصویر لگانے پر مجبور ہو جاتا۔"
"آپ کے دل میں تو اول دن سے بے ایمانی تھی..... آپ کو تو اپنے بچوں کے لیے ایک نوکرانی درکار تھی اور بس۔"
"یہ سراسر بہتان ہے۔ نوکروں کی اس گھر میں کیا کمی تھی!" انھیں غصہ آ گیا۔ "مجھے اپنے بچوں کے لیے ماں کی ضرورت تھی اور تمہیں ان کی ماں بنا کر ہی لایا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ ہم سب کی عافیت اور بقا کا واحد راستہ یہی ہے کہ تم اپنے دل سے تمام بدگمانیاں، وسوسے اور خدشات دھو کر صدق دل سے بچوں کی ماں بننے کی کوشش کرو۔"
"میں تھوکتی ہوں ان پر۔"
"الفت!" جلیس الحسن کا چہرہ تمتمانے لگا۔

"مجھے نفرت ہے آپ کے نالائق اور بدتہذیب بچوں سے۔"
"کچھ ہوش کی دوا کرو۔"
"میں ان سے نفرت کرتی ہوں۔" اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔
"آل رائٹ!" جلیس الحسن اپنے جبڑوں کو باہم بھینچتے غصے سے سرخ چہرہ لیے فیصلہ کن انداز میں اُس کے قریب سے اٹھ کھڑے ہوئے۔
کچھ دیر تشنجی کیفیت سے دوچار کھڑے رہے پھر انھوں نے گمبھیر آواز میں کہا: "مجھے اپنے بچوں سے محبت ہے جبکہ تم ان سے نفرت کا اعلان کر رہی ہو۔ گویا ہمارے راستے ایک دوسرے سے جدا ہیں اور ہمارا ایک ساتھ چلنا مشکل قرار پا سکتا ہے۔"
پھر وہ امید طلب نظروں سے اُس کی طرف دیکھنے لگے۔
"ہاں۔" وہ پیشانی پر بل ڈالتی ہوئی بولی۔
"پھر بھی میں تمہیں ایک موقع اور دینا چاہتا ہوں..... سوچ لو کہ ہمیں ساتھ چلنا ہے یا علیحدہ علیحدہ اپنے اپنے راستے پر۔"
"میں نے سوچ لیا ہے۔"
"بعد میں پچھتانا ہوگا۔"
"نہیں ہوگا کیونکہ میں اس کے لیے تیار تھی۔ اور اسی لیے میں نے اپنی ملازمت کو برقرار رکھا ہوا تھا۔" اُس نے بڑے زعم سے کہا۔
"کیا؟" جلیس الحسن نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔
"جی ہاں محترم جلیس الحسن صاحب..... آپ نے تو احکامات صادر فرمائے تھے کہ میں ملازمت ترک کر دوں مگر میں نے استعفیٰ نہیں دیا تھا بلکہ چھٹی لی تھی اور تین ماہ بعد اس میں مزید تین ماہ کا اضافہ کروا لیا تھا۔"
"مگر جب شادی کے بعد میں نے تم سے پوچھا تو تم نے یہ بتایا تھا کہ تم استعفیٰ دے چکی ہو۔ گویا تم نے جھوٹ بولا تھا مجھ سے!"
"مصلحتاً۔"
"اس کا مطلب یہ ہوا کہ بددیانتی اور بے ایمانی تو تمہارے دل میں تھی نہ کہ میرے دل میں۔"
"اب آپ جو بھی کہیں..... میں تو آپ کو یہ بتانا چاہتی تھی کہ عورت اس قدر بے وقوف اور نادان نہیں ہوتی جتنا کہ آپ مرد لوگ اُسے گردانتے ہیں..... میں اگر آپ کے حکم کی پابندی کرتے ہوئے اپنے حصے کی زمین داؤ پر لگا دیتی تو آج اتنے اعتماد سے یہ فیصلہ نہ کر سکتی جو کر چکی ہوں۔"
"سراسر احمقانہ فیصلہ!" وہ سر جھٹک کر بولے۔
اور الفت ان کے غصے کو جھلاہٹ پر محمول کرتے ہوئے زیر لب مسکرا دی۔
وہ جی ہی جی میں رعنا جمیل کی مشکور تھی جنھوں نے اُسے نہ صرف ملازمت برقرار رکھنے کا مشورہ دیا تھا بلکہ پہلی بار تین ماہ کی چھٹی ختم ہو جانے کے بعد مزید تین ماہ کی رخصت کے سلسلے میں اس کی بھرپور مدد کی تھی۔
رخصت میں اضافے کے سلسلے میں الفت کو اسکول اور دفتر تعلیم کے دو تین چکر بھی لگانا پڑے تھے۔ اور جلیس الحسن کی اپنی مصروفیت کے سبب انھیں کانوں کان اس کارروائی کی خبر نہ ہوئی تھی۔ انھوں نے تو الفت کو ہر معاملے میں پوری آزادی اور اختیار دینے اور گھر کے جملہ امور اس کے سپرد کر کے اُسے بھرپور اعتماد دینے کی حکمت عملی اختیار کی تھی۔
اُن کے گمان میں نہ تھا کہ ایک روز وہ انھی کے اعتماد کو دھچکا پہنچائے گی!
"دیکھو اب بھی وقت ہے۔"
"وقت گزر چکا ہے۔" الفت نے بڑی سرد مہری سے کہا
کچھ دیر وہ ملول و دل گرفتہ سے کھڑے رہے پھر انھوں نے ایک اچٹتی ہوئی نظر الفت کے چہرے پر ڈالتے ہوئے مغموم لہجے میں کہا: "تو کیا میں..... سمجھ لوں کہ ہمارے راستے واقعی مختلف ہو گئے ہیں؟"
وہ زبان سے کچھ نہیں بولی۔
چپ چاپ اٹھی۔ مسہری کے نیچے سے اپنے جہیز کا بڑا سا خالی سوٹ کیس کھینچ کر نکالا اور اُسے مسہری پر رکھنے کے

بعد اُسے کھول کر اپنی کپڑوں کی الماری میں سے اپنے ملبوسات چھانٹ چھانٹ کر سوٹ کیس میں تہ بہ تہ رکھنے لگی۔

جلیس الحسن کچھ دیر چپ چاپ کھڑے اُس کی حرکات و سکنات دیکھتے رہے پھر آہ بھری سانس کھینچتے ہوئے انھوں نے دروازے کا رُخ کیا۔

اُلفت نے مسہری کے سرہانے دھرا چابیوں کا وہ گچھا اُٹھایا جو جلیس الحسن نے ولیمے کے بعد اگلے روز.... اُس کی تحویل میں دیتے ہوئے کہا تھا۔

"آج سے اس گھر کے سیاہ و سفید کی مالک تم ہو۔"

اور اس کی آواز نے اُن کے قدم روک لیے۔

"یہ اپنے گھر کی چابیاں اپنی تحویل میں لیتے جائیے۔ میں اس وقت فقط اپنے کپڑے لیے جا رہی ہوں اور اگر آپ کی طرف کے کچھ زیورات پہنے ہوئے ہوں تو میرے میکے کے زیورات بھی آپ کے بینک لاکر میں ہیں اس لیے آپ کو اپنے زیورات کے سلسلے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ بعد میں فیصلہ ہو جائے گا۔"

اتنا کہہ کر اس نے چابیوں کا گچھا اُن کی طرف اُچھال دیا جو اُن کے قدموں میں جا گرا۔

چند ثانیے جلیس الحسن متذبذب سے کھڑے رہے جیسے فیصلہ کرنے سے قاصر ہوں کہ چابیوں کا گچھا انھیں اٹھانا چاہیے یا نہیں۔

پھر وہ جھکے اور انھوں نے چابیوں کا گچھا اُٹھانے کے بعد زہر خند نگاہوں سے اُلفت کی جانب دیکھتے ہوئے کہا: "ٹھیک ہے اُلفت صاحبہ۔"

شدید رنج و ملال اور دل گرفتگی کے عالم میں راہداری سے لاؤنج کا رُخ کرتے ہوئے انھوں نے جی ہی جی میں کہا۔

"عورتیں بھی ایک جیسی ہوتی ہیں! محبت کرتی ہیں تو موم کی شمع کی مانند پگھل کر قدموں میں ڈھیر ہو جاتی ہیں۔ نفرت کرنے پہ آتی ہیں تو بھڑک کر سب کچھ خاکستر کر دیتی ہیں۔"

زخم خوردہ جلیس الحسن کے لیے یہ دوسرا زخم زیادہ کاری ثابت ہونے جا رہا تھا۔

....

اُلفت کو اُس کے میکے جلیس الحسن کے ڈرائیور نے پہنچایا۔ بھاری بھرکم سوٹ کیس ساتھ نہ ہوتا تو شاید اُس نے میکے جانے کے لیے جلیس الحسن کی گاڑی مع ڈرائیور کی خدمات سے اپنے مصرف میں لینے کا احسان ہرگز گوارا نہ کیا ہوتا۔

چلتے سمے اُس نے جلیس الحسن سے اجازت لینے یا انھیں خدا حافظ کہنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

ڈرائیور سے ڈگی میں سوٹ کیس اور جوتوں والا چرمی تھیلا رکھوایا اور اُسے اپنے میکے چلنے کا حکم دیتے ہوئے پچھلی نشست پر براجمان ہو گئی۔

وہ مع اسباب کے گھر پہنچی تو اہلِ خانہ کے چہرے تشویش میں ڈوب گئے اور وہ سب اُس کے اردگرد جمع ہو گئے۔ جلیس الحسن کا گھر تو وہ چھوڑ آئی تھی مگر دل گرفتہ بھی تھی۔

"بیٹی خیریت تو ہے؟" سب سے پہلے بابا نے سوال کیا۔

اُس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

"میری بچی ہوا کیا؟" امی نے تڑپ کر اُسے گلے سے لگا لیا۔

"آپیا جانی! کیا ہوا؟" تہنیت نے کپکپاتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"الّو! میری جان بولو تو کیا ہوا؟" بھابی نے اُس کے شانے پہ ہاتھ دھرتے ہوئے انتہائی تشویش کے ساتھ سوال کیا۔

اُس کے لبوں پر لرزش سی طاری ہو گئی۔

"ہاں..... ہاں بیٹے بتاؤ۔" بابا نے تحریک دلائی۔

مگر رقت نے اُس کی آواز گھونٹ کر رکھ دی۔

"ارے! اب اس سے کیا پوچھتے ہیں؟ اسی لیے میں بار بار کہتی تھی کہ اچھی طرح سوچ بچار کر لیں کہیں بعد کو کوئی تکلیف نہ ہو۔" امی نے کہا۔

"عظمت کی ماں! برائے خدا تم چپ رہو..... پہلے بیٹی کی زبان سے سننے دو۔" بابا بولے۔

"ارے اس بے زبان کی زبان کیا سنائے گی! اس کا تو چہرہ بتا رہا ہے سب کچھ۔" امی نے سینے پر دو ہتڑ جماتے اور دوپٹے کے پلو میں منہ چھپا کر سسکنے لگیں۔

"امی جی! آپیا جانی تو پہلے ہی پریشان ہیں آپ تو رو دھو کے انھیں مزید پریشان نہ کیجیے۔" تہنیت نے جھلا کر کہا۔

"تم میری بڑی بننے کی کوشش مت کرو۔" امی نے اُسے جھڑکا پھر روتے ہوئے بولیں۔ "میں ماں ہوں تم میرے دل کا درد کیا جانو..... جب خود ماں بنو گی تب پتا چلے گا کہ اولاد کی تکلیف کیا ہوتی ہے۔"

"آپ بجا کہتی ہیں۔" بھابی نے امی کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "لیکن امی پہلے ہمیں اُلفت سے معلوم تو کرنا چاہیے کہ قصہ کیا ہے۔"

"بالکل۔" بابا نے تائید کی۔

"تہنیت! تم اُن کے لیے آدھے گلاس پانی میں گلیکسوز ڈی تو گھول کر لاؤ۔" بھابی نے کہا۔

"میرے لیے بھی لے آنا۔" امی اپنا بایاں ہاتھ سینے پر دھر کر آنکھیں موندتے ہوئے مسہری کے سرہانے سے سر ٹکاتے ہوئے نیم جان سی نظر آنے لگیں۔

تہنیت کے واپس لوٹ آنے تک استفسارات کا سلسلہ موقوف رہا۔ اس دوران بھابی نے بڑی محبت سے اُس کے چہرے پر آ جانے والے بال سمیٹے اور اپنے دوپٹے کے پلو سے اس کا چہرہ تھپتھپایا اور آنسو پونچھے۔

تہنیت پلٹی تو بھابی نے اُلفت کو اور تہنیت نے امی کو گلیکسوز ڈی گھلا پانی پلایا۔

بابا تصویرِ حسرت و یاس بنے بیٹھے رہے۔

اُلفت کی حالت کچھ سنبھلی تو امی بھی سیدھی ہو بیٹھیں۔

بابا اُس کے پاس آ بیٹھے اور اُس کے سر پہ ہاتھ دھرتے ہوئے شفقتِ پدری سے معمور لہجے میں گویا ہوئے۔

"ہاں بیٹی اب بتاؤ کیا بات ہوئی؟"

"کچھ نہیں۔" وہ مغموم لہجے میں بولی۔

"نہیں یہ تو تیرا وہم ہے سے کوئی کبھی نہیں مان سکتا۔ تمہارا سسرال سے صندوق کے ساتھ میکے آنا اور رونا بے معنی نہیں ہو سکتا خیر اسباب کے ساتھ بھی لڑکیاں میکے آیا کرتی ہیں۔ اگر تم ہنستی مسکراتی آتیں تو ہمیں نہ فکر ہوتی نہ ملال مگر جب بیٹیاں اسباب کے ساتھ روتی دھوتی سسرال سے میکے پہنچیں تو ماں باپ اور دیگر اہلِ خانہ کا متفکر اور ملول ہونا لازم ہوتا ہے..... شاباش بتاؤ کیا بات ہے؟"

"ہاں بیٹی بتاؤ..... تم ہمیں نہیں بتاؤ گی تو پھر کسے بتاؤ گی؟" امی پھر آگے سرک آئیں۔

اُلفت کی آنکھوں میں مسلسل آنسو اُمڈے چلے آ رہے تھے اور وہ بار بار اپنی ناک کے اگلے سرے کو اپنے دوپٹے کے پلو میں دبا کر سلنے لگتی تھی۔

"الّو..... کچھ بتاؤ تو سہی..... امی کی پریشانی ہی کا خیال کرو۔" بھابی بولیں۔

"آپیا جانی! بتائیں نا پلیز!" تہنیت گڑگڑائی۔

"کیا بتاؤں؟" وہ منمنائی۔

"کیا جلیس بھائی سے کوئی جھگڑا ہوا؟"

وہ کچھ نہیں بولی۔

"آپیا! بولیں ورنہ میں بھی بلکہ ہم سب ہی رونے لگیں گے آپ کے ساتھ۔" تہنیت نے دھمکی دی۔

"بیٹی! قصہ کیا تھا؟"

"میں..... بابا..... میں اس گھر میں..... نہیں رہ سکتی۔" وہ بدقت بولی۔

"میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ سوچ لیں اچھی طرح..... گزارا بہت مشکل ہے۔" امی نے کہا۔

"خدارا تم تو خاموش رہو۔" بابا نے امی کو باقاعدہ ڈانٹ دیا۔ پھر اُلفت کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولے۔ "کیوں نہیں رہ سکتیں بیٹا تم اس گھر میں؟"

اُلفت پہ اضطراب سا طاری ہو گیا۔

"بولو بیٹی۔"

"بابا۔ انھیں صرف اپنے بچوں سے دلچسپی ہے اور کسی سے نہیں۔"

"میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ......" امی پھر بولیں۔

"بیگم! تم چپ رہو۔" بابا نے امی کے آگے ہاتھ جوڑ دیے پھر اُلفت کی جانب دوبارہ متوجہ ہوتے ہوئے گویا ہوئے۔

لہجے میں بولے۔ "جیسی! بظاہر تو جلیس میاں بہت ہی نفیس، باشعور، تکلف اور شریف النفس نظر آتے ہیں۔"

"جی ہاں بظاہر۔" الفت اپنی رقت پر قابو پا چکی تھی۔

بابا سوچ میں پڑ گئے۔

"درحقیقت وہ شخص بہت ہی خود غرض اور دوغلا ہے۔" الفت نے کہا۔

"خدا اُسے غارت کرے۔" امی بڑبڑائیں۔

"اگر آج اُس کی پہلی بیوی واپس آ جاتے تو وہ اُسے دوبارہ اپنے گھر میں رکھ لے۔" الفت نے یقین کے ساتھ کہا۔

"لاحول ولاقوۃ۔" بابا بولے۔

"کیا واقعی؟" تہنیت نے آنکھیں پھیلا کر کہا۔

"میں غلط تھوڑی کہہ رہی ہوں۔ گھر اُس کی تصویروں سے بھرا پڑا ہے.... اور وہ بظاہر نفیس اور شریف نظر آنے والا شخص اپنے لاکٹ میں اُس کی تصویر لگائے پھرتا ہے۔"

"میرے خدا!" امی نے دل ہاتھوں سے تھام لیا۔

"میں تو اتنے دن برداشت کرتی رہی اور آپ لوگوں کو اس خیال سے نہ بتایا کہ آپ سب کو رنج ہوگا۔ آپ سب یہ سمجھتے ہے کہ میں بہت خوش ہوں اور وہ میرا بہت خیال رکھتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ میری حیثیت اس گھر میں نوکروں سے بھی بدتر تھی..... اُس کے بچے میری نقلیں اُتارتے تھے، میرا مذاق اُڑاتے تھے، گالیاں دیتے تھے اور انتہا یہ ہوئی کہ کل مجھے سامنے تان کر مارنے کو چڑھ آئے۔" الفت نے رقت آمیز لہجے میں بتایا۔

"بیٹی! تم اتنے دن چپ چاپ جھیلتی رہیں اور ہمیں کچھ نہ بتایا۔ پہلے بتایا ہوتا تو ہم مردود جلیس کا گریبان پہلے ہی نہ پکڑ لیتے۔ افسوس کہ تم نے ہمیں بتانے میں دیر کی اور ہم سے اتنے دن چھپائے رکھا۔" امی نے کہا۔

"اچھی بیٹیوں کا یہی قرینہ ہوا کرتا ہے۔" بابا بولے۔

"چاہے بیٹیاں اپنی جان سے گزر جائیں۔" امی نے تیوری پر بل ڈالتے ہوئے کہا۔

"خدا نہ کرے۔" بابا نے دھیمے سُروں میں کہا۔

"جائیں اور جا کر اس مردود سے اُس کا گریبان پکڑ کر پوچھیں کہ ہماری بچی کے ساتھ اُس نے کیا ظلم کیے؟" امی نے بابا کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"جذباتی مت ہو.... کریں گے.... ضرور کریں گے جلیس الحسن سے بات مگر ابھی تازہ تازہ معاملہ ہے، ذرا ٹھنڈا ہو لینے دو پھر بات کریں گے۔"

"نہیں بابا! کوئی ضرورت نہیں ہے بات کرنے کی۔ وہ بہت ہی خود غرض آدمی ہے۔ میں اس کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔"

"الفی میری جان! ایسی باتیں نہیں کرتے۔" بھابی نے رسانیت سے کہا۔

"آپ کو نہیں پتا بھابی کہ اس گھر میں ان چند دنوں میں میں نے کتنے دکھ اُٹھائے ہیں۔" وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔

"تم یقیناً درست کہہ رہی ہو مگر الفی جان یہ بڑے مشکل راستے ہوتے ہیں ان پر بہت سوچ سمجھ کر اور سنبھل کر چلنا پڑتا ہے.... بابا ٹھیک کہتے ہیں۔ معاملہ ٹھنڈا ہو جائے پھر جلیس صاحب سے بات کی جائے۔"

"کوئی ضرورت نہیں ان سے زیادہ بات کرنے کی۔ میرا ایک فیصلہ ہے کہ اب میں اس گھر واپس نہیں جاؤں گی۔" وہ فیصلہ کن لہجے میں بولی۔

بھابی نے بابا کو دیکھا اور بابا نے الفت کو۔

"بیٹی! بات کریں گے ہم جلیس الحسن سے۔ یہ کوئی کھیل تو نہیں ہے کہ وہ اپنی نادانیوں اور نادانی سے تمہیں ایک تکلیف دہ فیصلے پر مجبور کر دیں..... ہم بات کریں گے اُن سے۔"

امی دوپٹے میں منہ چھپا کر رونے لگیں۔

"امی جی پلیز!" تہنیت نے لجاجت سے کہا۔

"میری بچی چپ چپ سہتی رہی اور کچھ بھی نہ بول سکی۔" امی نے روتے ہوئے کہا۔

"اوہو! بھئی ایسے اتار چڑھاؤ تو زندگی میں آتے ہی رہتے ہیں۔" بابا بولے۔

"اب کیا ہوگا؟"

"امی!" الفت نے اپنا ہاتھ بڑھا کر امی کے شانے پر دھرتے ہوئے انہیں تسلی دی۔ "آپ پریشان کیوں ہوتی ہیں....

جو ہونا تھا وہ ہو چکا ہے۔ میں اپنے گھر لوٹ آئی ہوں۔ اپنے پیروں پر کھڑی ہوں، میری ملازمت برقرار ہے اور میں مطمئن ہوں۔"

"بھئی عظمت کی ماں! تم تو ذرا سی دیر میں پریشان ہو جاتی ہو..... ابھی تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو۔ تم سے کہا ہے ہم نے کہ بات کریں گے ہم جلیس الحسن سے۔ یہ زندگی کے معاملے ہوتے ہیں کھیل یا مذاق تو نہیں۔" بابا نے انہیں سمجھایا۔

"الفی! تم اٹھو اور ہاتھ منہ دھو لو۔" بھابی نے الفت کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

"صبح سویرے ہی نکال دیا بدبخت نے میری بچی کو گھر سے۔" امی کلپ کر بولیں۔

"امی! نکالا مجھے کسی نے نہیں۔ آئی تو میں خود ہوں۔"

"بہت اچھا کیا تم نے اس جہنم سے نکل آئیں۔"

"چلو شاباش تم ہاتھ منہ دھو لو۔" بھابی الفت کو لیے کمرے سے نکل گئیں۔

"عظمت کی ماں! تمہارا بھی جواب نہیں۔ بیٹی سسرال سے ناراض ہو کر آئی ہے اور تم کہتی ہو بہت اچھا کیا۔"

"تو کیا یہ کہوں کہ اسی جہنم میں جل کر خاک ہو جاتیں۔"

"یہ تو میں نہیں کہہ رہا۔"

"تو اور کیا مطلب ہے آپ کا؟"

"مطلب یہ کہ بیٹیوں کے معاملات بہت نازک ہوتے ہیں۔ گھروں کا بسنا بہت مشکل ہے اُجڑنا مشکل نہیں۔ ہمیں جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں صبر و تحمل اور عقل و سمجھ سے کام لینا ہوگا۔ ابھی معاملہ گرم ہے۔ الفت رنجیدہ بھی ہے اور غصہ میں بھی۔ ممکن ہے یہی کیفیت جلیس الحسن کی بھی ہو کیونکہ سیانوں کا کہنا ہے کہ تالی ہمیشہ دو ہاتھ سے بجتی ہے۔ معاملہ ٹھنڈا ہو لینے دو۔ رنج اور غصہ ادھر بھی رفع ہو جاتے اور اُدھر بھی حالات نارمل ہو جائیں۔ پھر ہم معاملہ سلجھانے کی کوشش کریں گے۔ مرد و زن کا رشتہ عجیب پُراسرار رشتہ ہے۔ لڑ جھگڑ تو لیتے ہیں خفگیاں بھی ہوتی رہتی ہیں مگر پھر یوں دل صاف ہو جاتے ہیں جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ یاد کرو ہمارے درمیان خفگیاں نہیں ہوتی تھیں کیا؟"

"ہاں ہوتی تھیں مگر ہماری آپ کی بات دوسری تھی۔ خدا نہ کرے آپ کے سوتیلے بچے تو نہ تھے جو میری نقلیں اُتارتے، مذاق اُڑاتے، گالیاں دیتے یا مارنے کو کھڑے ہو جاتے۔ اور نہ ہی آپ اپنے دل میں دوسری عورت کا خیال لیے پھرتے تھے۔ یہ سب کچھ تو میری الفت ہی کیا کوئی عورت کبھی برداشت نہیں کر سکتی۔"

"ہاں یہ سنجیدہ معاملات ہیں اور ان کے سلسلے میں جلیس الحسن سے بات کرنی پڑے گی۔ ہو سکتا ہے آج کل میں وہ خود ہی یہاں آ جائیں۔"

"اور اگر نہ آئے تو؟"

"تو ہم خود رجوع کریں گے ایک دو روز انتظار کرنے کے بعد۔"

"ہرگز نہیں..... اس سے تو وہ اور شیر ہوں گے۔ اُن کی غرض ہو تو سو مرتبہ ناک سے لکیریں کھینچتے آئیں۔ اگر وہ خود آئیں تو ٹھیک ورنہ آپ تو ابھی چپ لگا جائیے۔"

"اچھی بات ہے۔" بابا نے بحث و تمحیص میں اُلجھنے کے بجائے معاملہ چند الفاظ میں مختصر کیا۔

****

دوپہر کو جب ڈرائیور حسبِ معمول اعجاز، فراز اور زرین کو اُن کے اسکول سے اور نگین کو اُس کے کالج سے لینے گیا تو اُس نے ان تینوں کو نگین کے کالج جاتے ہوئے راستے میں اعجاز کو بتایا۔

"آج بیگم صاحب تو اپنے گھر چلی گئیں۔"

"اپنے گھر؟"

"جی چھوٹے صاحب۔"

"تمہارا مطلب ہے جہاں سے آئی تھیں وہیں؟"

"جی ہاں۔"

"گڈ!" اعجاز نے زیرِ لب کہا۔

فراز جو پچھلی نشست پر بیٹھا سُن رہا تھا بولا۔ "بھائی! کیا کہہ رہے ہیں ڈرائیور صاحب؟"

"تمہاری ما اپنے گھر گئیں۔"

"رئیلی بھائی!"

"ہاں!" اعجاز نے کہا۔

"تھینکس گاڈ" فراز نے ایک اطمینان بھری سانس لی۔

"کہیں؟" زرین کو یقین نہ آیا۔

"ہاں!"

زرین مسکرا دی اور گاڑی کی کھڑکی سے باہر بھاگتی دوڑتی دنیا کو دیکھنے لگی۔

اُس کے چھوٹے سے دل کی دنیا یکایک بڑی خوبصورت لگنے لگی تھی۔

کتنی عجیب بات ہے!

اور افسوس کی بھی!!

کہ

بعض لوگوں کے جانے سے دوسرے عمومی دستورِ دنیا کے مطابق اُداس اور دل گرفتہ نہیں ہوتے بلکہ طمانیت اور خوشی محسوس کرتے ہیں۔

قصور سراسر اُنھی کا ہوتا ہے جو اپنے پیچھے اچھی یادیں نہیں چھوڑ کر جاتے!!

"گئیں کیسے؟" اعجاز نے ڈرائیور سے پوچھا۔

"گاڑی میں۔"

"کس وقت؟"

"بس جب میں آپ لوگوں کو چھوڑنے کے بعد گھر پہنچا تو تھوڑی دیر بعد ہی انھوں نے مجھے بلایا اور اپنا سامان ڈگی میں رکھنے کو کہا۔"

"سامان؟"

"جی صاحب..... ایک سوٹ کیس تھا اور ایک بیگ۔"

"اچھا تو پھر؟"

"جب سامان رکھ چکا تو انھوں نے مجھ سے اپنے گھر چلنے کو کہا۔ ہم تو صاحب حکم کے بندے ہیں لے گئے انھیں ان کے گھر اور چھوڑ آئے۔"

"اور پاپا کہاں تھے؟"

"وہ لاؤنج میں تھے..... خانساماں بتا رہا تھا کہ وہ جھگڑا ہوا تھا بیگم صاحب اور صاحب میں۔ جاتے وقت بیگم صاحب نے صاحب کو خدا حافظ تک نہیں کہا۔"

"ڈرائیور اب واپس تو نہیں آئیں گی وہ؟" فراز نے عقبی نشست سے پوچھا۔

ڈرائیور بے ساختہ ہنس دیا پھر بولا "میرے کو کیا پتا فراز صاحب..... صاحب لوگوں کی باتیں صاحب لوگ ہی جانیں۔"

"سِلی ہو!" اعجاز نے گردن موڑ کر فراز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "ڈرائیور کو کیا پتا؟"

فراز خفیف سا ہو کر دبک کر بیٹھ گیا۔

وہ گھر کے بجائے اس کے کالج پہنچے تو جونہی وہ کالج گیٹ سے نکل کر گاڑی میں بیٹھی اعجاز نے اُس سے انگریزی میں کہا "ایک اچھی خبر تمہارا انتظار کر رہی ہے۔"

"اچھا! وہ کیا بھلا؟"

"تمہاری نئی ماں اپنے گھر چلی گئی ہیں۔"

نگین حیرت و مسرت سے اچھل پڑی۔

"کیا واقعی؟" اُس نے انگریزی میں پوچھا۔

"ہاں۔"

"تم سے کس نے کہا؟"

"ڈرائیور نے۔"

"کیا کہتا ہے؟"

"خانساماں کے بیان کے مطابق شاید کوئی جھگڑا ہوا تھا اُس کا پاپا سے۔ اُس نے اپنا سامان اٹھایا اور چل گئی۔"

"یہ تو اچھی خبر ہے!"

ڈرائیور دونوں بھائی بہن کے درمیان ہونے والی اس گٹ پٹ کا عشرِ عشیر بھی نہ سمجھ سکا۔ تاہم اُسے یقین تھا کہ وہ اپنی سوتیلی ماں کے اپنے میکے چلے جانے کے بارے میں ہی باتیں کر رہے تھے۔

نگین نے چھوٹے بھائی اور بہن کی طرف دیکھا۔

اُن کے چہرے خوشی سے دمکتے دکھائی دے رہے تھے۔

اعجاز نے گاڑی میں نصب کیسٹ پلیئر آن کر دیا تھا اور اُس کی انگلیاں اُس کے زانو پر رقصاں تھیں۔

اور

اُس روز گھر پہنچنے کے بعد وہ چاروں بہت روز بعد گھر میں اُڑے اُڑے پھر رہے تھے۔

فضاؤں میں جلترنگ سی بج رہی تھی۔

دنیا انھیں بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔

"تھینکس خدا!" اُن میں سے ہر ایک کا دل چپکے چپکے بس یہی ایک راگ الاپ رہا تھا۔

مگر

جلیس محسن کا دل بہت بے کلی میں گھرا۔

اُن کا دھیان بار بار بھٹک کر کام سے الفت کی طرف جا رہا تھا۔

اُن کے خیال میں الفت نے انتہائی غیر دانشمندی اور عاقبت نااندیشی کا ثبوت دیا تھا۔

اُن کے گمان میں بھی یہ نہ تھا کہ اُن کی دوسری شادی انھیں طمانیت اور سکون بخشنے کے بجائے اُن کا رہا سہا سکون بھی اُن سے چھین لے گی۔

نیا زخم اتنی تکلیف دے رہا تھا کہ وہ بختیار بھائی کو آج سارا حال بتانے پر مجبور ہو گئے۔ بختیار ہمدانی نے فون پر کہا "یار محسن! شام کو تمہاری بھابی کو لے کر آؤں گا تمہاری طرف۔"

"نہیں یار بھابی کو تکلیف مت دینا..... میں نے تو تمہیں اس لیے فون کیا ہے تاکہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر سکوں اور تمہیں بتا دوں کہ دیکھو تمہارے مشورے کے مطابق بہت وقت دے کر دیکھا اس عورت کو مگر افسوس کہ نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات رہا۔"

"تو الفت کی دونوں بچوں سے اَن بن بھی ہو گئی؟" بختیار ہمدانی بولے۔

"میں بچوں کو زیادہ دوش نہیں دوں گا کیونکہ بچوں اور الفت کے مابین عمر، تجربہ، عقل و شعور اور حالات، ہر لحاظ سے زمین آسمان کا فرق تھا۔ بچے بہت اُلجھے ہوئے تھے، اُس کا فرض تو یہ تھا کہ اُن کے مسائل کو سمجھتی، اُن کے سر پر ہاتھ رکھنے کی کوشش کرتی۔ میں مانتا ہوں بچے شروع میں بالخصوص اعجاز اسے اپنی ماں کی جگہ دینے پر آمادہ نہ تھے مگر میں وثوق سے کہتا ہوں کہ اگر الفت اُن کے سر پر دستِ شفقت رکھتی تو وہ پہلے نہ چاہتے ہوئے بھی جھکتے پھر دل سے تسلیم کر جاتے۔ میں تو اُس سے شادی کے چند روز بعد ہی دو ٹوک بات کرنے والا تھا مگر تم نے کہا انتظار کرو سو میں نے انتظار کیا مگر اس انتظار کا کچھ ثمر نہ ملا۔"

"یار بھائی! تم نے اس درمیان میں تو کوئی تذکرہ نہ کیا جب میں نے پوچھا یہی کہا ہاں سب ٹھیک ہے اور میرا اور بیگم کا تم سے اور بھابی سے جب بھی ملنا ہوا..... تم لوگ بظاہر مطمئن اور خوش ہی نظر آئے۔"

"ہاں کیونکہ تم نے ہمیں اکثر بچوں سے علیحدگی میں ہی دیکھا، ورنہ بچوں کی موجودگی میں تو اس عورت کے چہرے کے خطوط بگڑے ہی رہا کرتے تھے۔"

"تم تو ذکر کر سکتے تھے مجھ سے..... آخر فون پر بات ہوتی رہتی تھی ہماری۔"

"بھائی! دوستوں سے اپنے مسائل کا رونا انسان ایک حد تک ہی رو سکتا ہے۔ وہ بھی بیزار ہونے لگتے ہیں۔"

"خیر مجھے تو تم اس سلسلے میں دیگر دوستوں سے مستثنیٰ قرار دے سکتے تھے۔" بختیار ہمدانی نے کہا "بہرحال اب بتاؤ کہ بھابی سے تمہاری مفاہمت کی کیا صورت بنے گی؟"

"فی الحال تو میں اس سلسلے میں سوچنا ہی نہیں چاہتا۔"

"کیوں بھئی؟"

"کیونکہ بچے کچھ عرصے سے خاصے ڈسٹرب رہے ہیں۔ میں بھی انھیں کچھ زیادہ وقت نہیں دے سکا ہوں۔ اب اس کا ازالہ کرنا چاہتا ہوں..... اور اس دوران الفت والا باب کچھ عرصے کے لیے بند کر کے اس پر اپنی خاموشی سے یہ واضح

کر دینا چاہتا ہوں کہ اگر اُسے میرے بچوں سے کوئی دلچسپی یا غرض نہیں تو مجھے بھی اس کی پروا نہیں۔"

"کیا تمہارے خیال میں تمہاری خاموشی کچھ رنگ لا سکے گی؟"

"بھائی! رنگ لاتے یا اُڑاتے میں فی الحال اس مسئلے پر ایک لمحے کے لیے بھی غور و خوض نہیں کرنا چاہتا۔"

"اگر تم اجازت دو تو میں اور بیگم ثالث کا کردار ادا کرنے کی کوشش کریں؟"

"نہیں میرے بھائی..... بالکل نہیں..... ویسے تمہارے خلوص اور محبت کا بہت شکریہ۔"

"سوچ لو۔"

"اتنا سوچا ہے کہ اب تو دماغ کی رگیں بھی جواب دے چکی ہیں۔ کچھ عرصے کے لیے میں بھی پُرسکون رہنا چاہتا ہوں اور اپنے بچوں کو بھی کسی جھنجھٹ میں نہیں پڑنے دینا چاہتا۔"

"اچھا! تو پھر ہم دعا ہی کر سکتے ہیں۔"

"مجھے ضرورت بھی اسی کی ہے۔"

اس شام جب جلیس الحسن گھر پہنچے تو ایک گمبھیر سناٹے نے اُن کا سواگت کیا۔ بچے دوپہر سے سہ پہر ڈھلنے تک تو گھر بھر میں اُڑتے اُڑے پھرتے رہے تھے لیکن باپ کی واپسی کے متوقع وقت سے کچھ پہلے ہی اس خیال سے اپنے کمروں میں محصور ہو گئے تھے کہ کہیں اُن کی سوتیلی ماں سے باپ کے جھگڑے کا غصہ اُن پر نہ اُترے اور اُن سے بازپرس کی جائے۔

جلیس الحسن گھر لوٹتے ہی سیدھے اوپر پہنچے۔ بچوں کے چہرے پر لکھی تحریر پڑھنا اُن کے لیے چنداں دشوار نہ تھا!

انھوں نے انھیں کمروں سے نکالا اور نیچے سبزہ زار پر لے گئے۔ کچھ دیر اُن کے ساتھ بیٹھے گپ شپ کرتے رہے۔ پھر اُٹھے، نہا دھو کر تازہ دم ہوئے۔ بچوں کو ہمراہ لیا اور انھیں اپنے ساتھ باہر لے گئے۔

اس رات انھوں نے رات کا کھانا گھر سے باہر ایک چینی ریستوران میں کھایا اور تقریباً دس بجے شب گھر واپس لوٹے۔

اس تمام دورانیے میں انھوں نے بچوں سے اُن کے خدشے کے مطابق الفت یا اُس سے اُن کے تعلقات اور باہمی رویوں کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔

بچوں کو اُن کے کمروں تک پہنچانے اور انھیں شب بخیر کہنے کے بعد وہ زینے سے نیچے اُترے ہی تھے کہ اُن کے عقب سے آنے والی اعجاز کی آواز نے اُن کے قدم روک لیے

"پاپا!" اُس نے دھیمی آواز میں پکارا تھا۔

انھوں نے گردن موڑ کر سوالیہ نگاہ اٹھاتے ہوئے زینے کی طرف دیکھا۔ اعجاز سر اٹھائے زینے سے نیچے اُتر رہا تھا۔ وہ تھم گئے۔

اعجاز زینے سے نیچے اُترنے کے بعد سر جھکائے آنکھیں نیچی کیے اُن کے روبرو آ کھڑا ہوا۔

"کیا بات ہے بیٹے؟"

"آئی ایم سوری پاپا!" وہ معذرت خواہانہ لہجے میں بولا۔

"کس لیے بیٹا جی؟" جلیس الحسن نے اُس کے شانے پر ہاتھ دھرتے ہوئے پوچھا۔

"پاپا!" وہ مدھم سُروں میں بولا۔ "میں آپ سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ وہ مجھے اچھی نہیں لگتی تھیں مگر میں اُن سے بدتمیزی نہیں کرنا چاہتا تھا..... لیکن پاپا..... جب وہ مم کے لیے الٹی سیدھی باتیں کرتی تھیں تو ہم سب کو بہت بُرا لگتا تھا..... بہت مشکل تھا اُن کی ایسی باتوں کو سُننا اور برداشت کرنا۔ کل بھی..... وہ مم کے طعنے دینے لگی تھیں۔ مجھے غصہ آ گیا اور میں نے اُن سے بدتمیزی کی۔ آئی ایم سوری پاپا!"

اعجاز کی یہ معذرت جلیس الحسن کے سوا تسفّرات سوچ کا دل پر بھاری تھی!

"بیٹا! کیا میں نے تم سے کوئی سوال کیا؟ کچھ پوچھا تم سے؟" جلیس الحسن نے پوچھا۔

"نہیں پاپا!"

"تو پھر؟ پھر اس وضاحت کی کیا ضرورت بیٹے؟"

اعجاز نے اپنا جھکا ہوا سر اُٹھایا۔ قدرے بے یقینی سے باپ کی جانب دیکھا پھر دھیمے سُروں میں اُن سے بولا۔

"آپ ناراض تو نہیں ہیں نا پاپا؟"

"تھوڑا سا تھا۔"

اعجاز نے چونک کر اُن کی طرف دیکھا۔

"بیٹا جی!" جلیس الحسن نے کھنکھارنے کے بعد کہا۔ "تمہیں یاد ہوگا کہ میں نے تم سے ارنگی سے کہا تھا کہ کسی تیسرے شخص کے مقابلے میں آپ لوگ ہمیشہ میرے لیے زیادہ اہم رہیں گے۔ آپ لوگوں کی خوشی، اطمینان اور سہولت میری پہلی ترجیح رہے گی۔ آپ کی مم کے بعد میں کسی اور کو اس بات کی اجازت نہیں دوں گا کہ وہ ہمارے لیے کسی پریشانی کا سبب بنے..... یاد ہے تمہیں؟"

"جی پاپا!"

"تو بیٹے پاپا کی بات کا اعتبار کرنا چاہیے تھا تمہیں۔" انھوں نے ایک گہری سانس کھینچی پھر بولے۔ "بہرحال بیٹے میں اپنے وعدے پر قائم رہا ہوں..... آئی لو یو بیٹا..... میں تم چاروں سے پیار کرتا ہوں۔ چاروں کو عزیز رکھتا ہوں۔ تم میری زندگی ہو میرا دل ہو..... جاؤ۔ اب جا کے سو جاؤ۔"

"سوری پاپا!"

"آل رائٹ..... جاؤ..... صبح اسکول کے لیے بھی اُٹھنا ہے۔" جلیس الحسن شفقت آمیز لہجے میں بولے۔

"شب بخیر پاپا!"

"شب بخیر بیٹے!"

اعجاز چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا زینے سے اوپر چلا گیا۔

جلیس الحسن اپنے کمرے میں واپس آئے تو کمرا اتھاہ تاریکی اور سناٹے میں ڈوبا ہوا تھا۔ انھوں نے ٹٹول کر سوئچ آن کیا۔ بتی جلتے ہی نہ جانے کہاں سے ڈھیروں درد دل میں اُمڈ آیا۔

بستر خالی پڑا تھا۔

اس کمرے میں

اور

اس بستر پر

یکے بعد دیگرے دو عورتیں اُن کی خلوتوں کی امین رہی تھیں۔

پہلی عورت ایک دو نہیں اٹھارہ برس اُن کی ہمدم رہی تھی۔ اُس کی چاہتوں نے انھیں برسوں مخمور کیے رکھا تھا۔ زندگی انھیں بہت دلفریب اور دلربا محسوس ہوتی تھی۔

مگر جب نگاہیں بدلنے پر آئی تو اُس نے برسوں کی رفاقت کو دفعتاً قطع تعلقی کی نذر کر دیا اور یوں انجان ہو کر چلی گئی جیسے کبھی کوئی تعلق ہی نہ رہا تھا۔

دوسری عورت بمشکل چار ماہ اُن کی شریکِ سفر رہی۔ خلوت میں وہ بھی پہلی عورت کی طرح من تو شُدم تو من شُدی کی تفسیر بن جایا کرتی تھی۔

مگر وہ بھی جب بے مہری دکھانے پر آئی تو سارا تعلق بالائے طاق رکھ کر یوں اپنی راہ ہو لی گویا کوئی واسطہ ہی نہ تھا۔

پہلی گئی تو اپنے پیچھے چار بچے اور یادوں کا ایک ہجوم چھوڑ گئی تھی۔

جبکہ

دوسری اپنے پیچھے خلش اور کسک چھوڑ گئی تھی۔

وہ ایک سرد آہ کھینچتے نڈھال سے ایزی چیئر پر ڈھے گئے اور انھوں نے آنکھیں موند لیں۔

شہرِ دل میں ایک چراغ روشن ہوا۔

پھر یکے بعد دیگرے چراغ جلتے چلے گئے۔

بام و درِ دل اس چراغاں سے منوّر ہو گئے۔

اور تب انھوں نے جانا کہ:

اُن کی زندگی میں آنے والی دوسری عورت اپنے پیچھے فقط خلش اور کسک ہی نہ چھوڑ گئی تھی بلکہ یادوں کا ایک مختصر سا قافلہ اُس کے خیال کے پیچھے پیچھے چلا آ رہا تھا۔

شہرِ دل میں چراغاں انھی یادوں کا تو تھا!

تا دیر وہ اس خشبن چرا نماں میں گم سے بیٹھے رہے۔
پھر دل دُکھنے لگا۔
بیچ بیچ کر کانچ کے پُل پر چلتی اس عورت کی یاد اُن کے دل کو مضطرب کرنے لگی۔
انھوں نے آنکھیں کھولیں۔ ایک گہری سانس لی اور متلاشی نگاہوں سے چہار اطراف دیکھنے لگے۔
کمرا روشن تھا
مگر ویران!
دل تنہا تنہا
اور اُداس!
وہ جیسی بھی تھی اُس کے دم سے اس کمرے میں رونق تو رہتی تھی۔ دل اتنا تنہا اور اس قدر اُداس تو نہ ہوتا تھا! انھوں نے دل گرفتہ ہوتے ہوئے سوچا۔
پھر
انھیں تصور ہی تصور میں اُس کے حمق پر پیار آنے لگا۔
"پگلی! اس عورت سے خائف تھی جس سے میرا اب کوئی بھی تعلق نہیں!
اور انھیں اپنی سوہنی بھی یاد آئی۔
وہ اُٹھے اپنی الماری تک پہنچے اُسے کھولا اور ایک چور گوشے سے دل نما طلائی لاکٹ نکال کر اُس کا ٹھنکا دبا دیا۔
عاصمہ بیگم کی خوبصورت تصویر مجل نظر آئی۔
کچھ دیر وہ اُسے دیکھتے رہے۔
پھر انھوں نے تصویر کو نکالا اُسے مٹھی میں دبایا اور طلائی دل کے دونوں پٹ بند کرنے کے بعد لاکٹ کو الماری کے چور گوشے میں واپس رکھ دیا۔
اور الفت اُن سے بہت دُور اپنے میکے میں تہنیت کے تیم تاریک کمرے میں ذرا دیر قبل ہی نیند کی باہوں میں اپنا سر دبکا لینے والی تہنیت سے ذرا پرے بستر پر چت پڑی کینڈل پاور بلب کے برائے نام اجیارے میں چھت سے آویزاں پنکھے کو چک پھیریاں کھاتے دیکھ کر اپنے دل کو اس سے زیادہ مضطرب محسوس کر رہی تھی!
دن تو دل جوئیوں اور دلاسوں میں گزر گیا تھا۔
امی جلیس الحسن کی شان میں فی البدیہہ قصیدے پڑھتی رہیں۔
اُن کے بچوں کو بُرا بھلا کہتی رہیں۔
الفت کو اپنے پاس بٹھا کر اُس کے سر میں ڈھیر سارا روغن آملہ ٹھونکا۔
اُسے بہت دلاسہ دیا۔ پیار کیا۔ دل چھوٹا نہ کرنے کی تلقین اور اُسے یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ وہ تنہا نہیں تھی بلکہ سب تھے اُس کا خیال رکھنے اُس کے دکھ سکھ میں شریک ہونے اور اُس کے ساتھ جلیس الحسن کی زیادتیوں اور اُن کے بچوں کی نالائقیوں کے خلاف آواز بلند کرنے والے۔
بابا عصر کی نماز پڑھ کر مسجد سے لوٹے تو انھوں نے کہا:
"بیٹی حوصلہ رکھو۔ زندگی میں ایسے اُتار چڑھاؤ آتے ہی رہتے ہیں..... ہیں انسان کو یہ لازم ہے کہ ایسے موقعوں پر جذبات کو عقل پر حاوی نہ آنے دے۔ تم دل مضبوط رکھو اور خدا سے دعا کرو کہ وہ تمھیں اس ابتلا سے بخیر و خوبی نکالے۔ بہت ہیں تمھارے لیے دعا کرنے والے۔ ظہر کی نماز کے بعد میں نے گڑگڑا کر مولا سے دعا کی اب بھی دعا کر کے آرہا ہوں خدا بڑا کارساز ہے۔ بگڑی بنا تا ہے۔ انشاء اللہ العزیز سب ٹھیک ہو جائے گا۔"
بھابی نے دوپہر کے کھانے پر اُس کی مرغوب چیزیں بنائیں۔
ارہر کی دال، خشکہ، املی اور پودینے کی چٹنی اور ماش کی دال کے پاپڑ۔ میٹھے میں قوامی سویاں تھیں۔
تہنیت نے خود جھوٹ نہ بولتے دن بھر میں سات آٹھ پیالی کڑک چائے پلا ڈالی۔ سہ پہر کو اُس نے گھر میں ڈھیروں تل والے گرم گرم اندرسے بھی چائے کے ساتھ سامنے لا دھرے۔
دونوں بھتیجے جب اسکول سے واپس لوٹے تو گھر پر پھپھو کو پا کر بہت نہال ہوئے مگر جب اُن کی ماں نے دھیرے سے سمجھایا کہ آج الفت پھپھو کو تنگ نہیں کرنا اور نہ ہی اُن سے کوئی فرمائش کرنا ہے۔ تو وہ سوچ میں پڑ گئے۔

بابا کے عصر کی نماز پڑھ کر مسجد سے لوٹ آنے کے بعد جب وہ امی اور بابا کو جلیس الحسن کے بچوں کی نالائقیوں کا احوال سُنا رہی تھی گھر کے باہر آٹو رکشا رکنے کی آواز آئی اور ذرا دیر بعد ہی تہنیت ہاتھ پاؤں پھلاتے کمرے میں در آئی۔
"امی جی! خالہ بی بی آئی ہیں۔"
"اے بئے معصومہ برسوں ہی تو ہو گئی تھیں آج پھر آ گئیں۔ کبھی کبھی دو دو ہفتے گزر جاتے تھے آتے ہوئے اور آج ایک دن کے وقفے سے دوبارہ آ گئیں۔ کیا پیل پھوڑ کر گئی ہیں" امی نے سگی بہن کی آمد پر ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے کہا پھر الفت سے بولیں "بیٹی! جلدی سے جا کر منہ ہاتھ دھولو وہاں خالہ کے سامنے کوئی بات نہیں ہونی چاہیے۔"
"جلدی کریں ایسا جاتی" خالہ بی بی سیدھی امی کے کمرے ہی میں آ جائیں گی" تہنیت بولی۔
وہ اُٹھی اور کمرے کے عقبی دروازے سے پچھلی طرف برآمدے میں نکل کر باورچی خانے کا رُخ کیا۔
ابھی منہ دھو ہی رہی تھی کہ بھابی نے غسل خانے میں جھانکتے ہوئے کہا "اپنی آنکھ ہاتھ دھو کر بال سنوار لینا ذرا۔"
اُن کے عقب سے تہنیت جھانکی اور گھٹی گھٹی آواز میں بولی "لپ اسٹک ضرور لگا لیجیے گا۔"
وہ منہ ہاتھ دھونے، بال آراستہ کرنے اور لپ اسٹک کی تہ ہونٹوں پر جمانے کے بعد امی کے کمرے میں جانے لگی تو تہنیت نے کہا "ایسا مسکراتی ہوئی کمرے میں داخل ہو جیے گا۔"
جونہی وہ کمرے میں داخل ہوئی امی کے چہرے کا رنگ متغیر نظر آنے لگا۔
"تم کب آئیں؟" خالہ بی بی نے اُسے دیکھ کر پوچھا۔
"صبح جلیس میاں دفتر جاتے ہوئے چھوڑ گئے تھے۔ شام کو لینے آئیں گے" امی نے اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اُس کی مشکل آسان کر دی۔
"کیسی ہو؟" خالہ بی بی نے پوچھا۔
"جی اچھی ہوں" اُس نے مسکرانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔
"آج جلیس میاں سے کہوں گی کہ میاں جب سے بیاہ ہی ہے ہم نے تم نے ایک رات اُسے میکے میں نہیں چھوڑا۔ اب دس پندرہ دن کو اُسے یہاں چھوڑ دو بلکہ..... آج ہی سے چھوڑ جاؤ" امی نے حفاظتی بند باندھنے کی کوشش کی۔
خالہ بی بی شانتی سے رکیں۔
اور ان سب کے سروں پر گویا تلوار لٹکتی رہی۔
اُن کے جانے کے بعد سب نے اطمینان کا سانس لیا۔
شام ڈھلے بھتیا دفتر سے واپسی پر معمول کے مطابق امی اور بابا کی قدم بوسی کو حاضر ہوئے تو الفت کو خلافِ توقع گھر پر دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔
"کیسی ہو بھئی؟" بھتیا نے برادرانہ چاہت سے کہا۔
"اچھی ہوں" اُس نے دھیرے سے کہا۔
بھائی بہن کے بیچ بھی محبت کا عجیب رشتہ ہے۔
دکھ ہو یا سکھ بہنیں بھائی کے سامنے پگھل جاتی ہیں۔
سو الفت کا بھی جی بھر آیا۔
"اور سناؤ" بھتیا نے کہا۔
لیکن اس سے پہلے کہ وہ انھیں کچھ سُنا پاتی بھابی نے انھیں آنکھوں سے معنی خیز اشارہ کیا۔ اور بھتیا تصویرِ حیرت بنے چپ چاپ اُن کے پیچھے پیچھے چلے گئے۔
رات کو کھانے کے بعد بھتیا دوبارہ امی اور بابا کے کمرے میں آئے۔ الفت بھی وہیں تھی۔ بھتیا نے اُن میں سے کسی کو بطور خاص مخاطب کیے بغیر کہا "بہت افسوس ہوا یہ سُن کر کہ الفت کا جلیس بھائی سے کچھ......"
"میاں! ایسی کوئی بہت زیادہ فکر کی بات نہیں انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا" بابا نے بڑے تحمل سے جواب دیا۔
"خدا کرے ایسا ہی ہو" بھتیا نے کہا۔ وہ خاصے متفکر نظر آ رہے تھے۔
دس بجے شب کے قریب وہ امی اور بابا کے کمرے سے تہنیت کے کمرے میں چلی آئی تھی۔ تہنیت تو حسبِ عادت بستر پر پڑنے کے بعد دس پندرہ منٹ کے اندر ہی سو گئی مگر الفت کی آنکھوں سے نیند گویا کوسوں دُور تھی۔
دن تو گزر گیا تھا۔

رات پہاڑ کی طرح سر پر کھڑی تھی۔
وہ جس قدر اپنے خیال، اپنی سوچوں کو جلیس الحسن کی طرف جانے سے باز رکھنے کی کوشش کر رہی تھی اسی قدر اس کا دھیان ادھر جا رہا تھا۔

ابھی ادھر جلیس الحسن کی آراستہ و پیراستہ، صندلیں اَمر فریشنر سے مہکتی، سحر انگیز ماحول والی خوابگاہ کے مقابلے میں اُسے یہ کمرا ایک قفس نما معلوم ہو رہا تھا۔
کتنی گھٹن تھی اس کمرے میں!
یا شاید اسی کو محسوس ہو رہی تھی۔
جلیس الحسن اپنے معطر سراپا اور وجیہہ شخصیت کے ساتھ بار بار اُس کے دل میں در سے چلے آ رہے تھے!
ان کے گھر سے تو وہ تہی دامنی کا احساس دل میں لیے نکل تھی۔
دن بھر وہ یہی کھجتی رہی تھی
مگر اب وہ احساس اک احساسِ خام محسوس ہو رہا تھا۔
اس گھر سے تو بہت سی یادیں دل کا دامن تھامے اُس کے ساتھ ساتھ چلی آئی تھیں۔
اُسے جلیس الحسن کی قربت میں گزارے ہوئے ان گنت لمحے یاد آ رہے تھے!
تنہائی اور رات کا قرب زندگی کو کس قدر پُرنشاط، پُرسحر اور دلفریب بنا دیا کرتے تھے!!
اگر اس سے پہلے ایک اور عورت اُن کے دل کے راستے سے نہ گزر چکی ہوتی تو شاید اس سے بڑھ کر معزز عورت اس دنیا میں کوئی اور نہ تھی۔
اُن کی قربت میں وہ خود کو کتنا شانت محسوس کیا کرتی تھی۔

اور
اُن سے دُور آ کر دل کیسا مضطرب ہو رہا تھا۔
'ساری گڑبڑ بچوں کی وجہ سے ہوئی ورنہ وہ خود تو بہت اچھے تھے؛ دل نے کہا اور اُس کی آنکھوں سے بہہ نکلنے والے آنسو تکیے کو بھگونے لگے۔
جلیس الحسن کی یاد میں روتے روتے اُس کی آنکھ لگ گئی۔
لیکن طرفہ تماشا یہ ہوا کہ اگلی صبح یہی دلِ کمبخت طوطا چشمی دکھاتے ہوئے انھیں پورے شد و مد سے بُرا بھلا کہنے لگا۔

اور پھر
اس بدبخت نے یہ روزانہ کا معمول بنا لیا کہ رات کو ہجر و فراق کے نغمے الاپتا اور دن میں دشنام طرازیوں پر اُتر آتا۔

بابا جلیس الحسن کے بیانات سے منتظر تھے۔
امی کا دعویٰ تھا کہ وہ ناک گھسیٹتے آئیں گے۔ چار بچوں کے باپ کو اب تیسری تو ملنے سے رہی تھی!

قسم روٹھے ہم چھوٹنے کے مصداق جلیس الحسن نے تو ایسی چپ سادھی کہ پلٹ کر خبر ہی نہ لی اور یوں لاتعلق ہوئے جیسے اُلفت سے کوئی رشتہ ہی نہ تھا۔
فقط اُلفت ہی پر کیا موقوف کسی سے بھی تعلق نہ رکھا۔
آنا مشروط نہ تھا۔
دونوں گھروں میں فون لگے تھے۔ فون پر رابطہ قائم کر سکتے تھے۔ اُلفت سے نہ سہی امی، بابا یا بھیا ہی سے سہی گھر پر فون نہ کرنا چاہتے تو بھیا سے اُن کے دفتر کے نمبر پر بات کر لی جاتی لیکن جب تعلق نہ رکھنا مقصود ٹھہرے تو پھر فون کیا، رابطے کا ہر ذریعہ دھرا رہ جاتا ہے۔
امی کا یہ دعویٰ بھی کہ جلیس الحسن ناک کے بل گھسٹتے آئیں گے، دھرا رہ گیا۔
بابا جو اوّل دن سے ہی جلیس الحسن کا بےتابانہ انتظار کر رہے تھے اُن کا انتظار ناقابلِ بیان اضطراب میں بدل گیا۔
فکر بھیا اور بھابی کو بھی تھی۔ مگر مصلحتاً اس فکر کا زیادہ اظہار کرنے سے گریز کرتے تھے۔
عظمت آپا تو الفت کے خفا ہو کر میکے آ جانے کی خبر سے ایسی متوحش ہوئی تھیں کہ دل تھام کے بیٹھ گئی تھیں اور انھوں نے گھر میں ہر ایک کو فوراً تاکید کی تھی کہ اُن کے میاں کو اس بات کی خبر نہ ہونے دی جائے ورنہ وہ اپنی ماں بہنوں کو بتائے بنا نہ رہیں گے اور وہ باتیں بنانے میں ایسی ماہر کہ اُن کا ناطقہ بند کر دیں گی۔ کچھ عجب نہیں کہ دو کی چار کر کے بات کو کہیں سے کہیں پہنچا ئیں۔
اس روز کی گئی عظمت آپا اب تک تو میکے آئی نہیں تھیں کہ جب وہ میکے آئیں گی تو میاں کبھی انھیں چھوڑنے اور لینے کو ضرور اُن کے میکے پہنچیں گے۔ خدا نہ خواستہ ذرا سی بھی بھنک پڑ گئی اُن کے کان میں تو بڑی مصیبت ہو جائے گی۔
انھوں نے اُلفت سے بات کی تو اس کے تیوروں نے انھیں ہولا کر رکھ دیا کہ وہ تو جلیس الحسن سے مفاہمت پہ قطعاً آمادہ نہیں بلکہ بقول اُس کے وہ تو دو چار روز میں اسکول سے اپنی رخصت قبل از وقت ختم کروانے کے بعد اپنی ڈیوٹی جوائن کرنے جا رہی تھی۔

بابا نے عظمت آپا سے کہا "بیٹی! میں تو جس روز الفت گھر آئی ہے اُسی دن جلیس میاں سے رابطہ قائم کر لیتا مگر تمہاری والدہ نے مجھے سختی سے منع کر دیا۔ الفت نے کہا ' بابا اگر آپ نے جلیس کو یہاں بلایا تو میں یہ گھر بھی چھوڑ کر چلی جاؤں گی شادی شدہ بیٹی ہے اب اگر وہ ایسا کوئی قدم اٹھا جائے تو کوئی بعید بھی نہیں چنانچہ میں خاموش ہو رہا۔ تمہاری امی کا خیال تھا کہ دو ایک روز میں وہ خود ہی ناک کے بل گھسٹتے آئیں گے۔ آج پانچواں روز ہے اب تک تو انھوں نے پلٹ کر خبر لی نہیں ہے۔"

جاتے جاتے عظمت آپا نے امی سے کہا "امی جی! بات کو زیادہ آگے مت بڑھنے دیجیے گا ورنہ بڑی جگ ہنسائی ہو گی۔ اپنے پرائے سب ہنسیں اڑائیں گے۔ بابا جلیس بھائی کو بلا کر سمجھا بجھا دیں اور الفت کو اُن کے ساتھ کریں۔"
"تمہارے بابا کیوں بلائیں جلیس کو؟" امی نے تیوری چڑھا کر عظمت آپا کو دیکھا۔ "اُن کو ضرورت ہو گی تو خود آئیں گے سو مرتبہ۔"
"امی کوئی حرج نہیں اگر بابا خود بلا لیں انھیں۔"
"اے واہ! حرج کیوں نہیں۔ جلیس تو اکڑ جائیں گے آئندہ کو اور شیر ہو جائیں گے۔"
"امی جی بات بنانے سے بنتی ہے بگاڑنے سے بگڑتی ہے۔ بہتر ہے کہ بنانے کی کوشش کریں۔ آپ دیکھ لیجیے، کتنی

مشکل سے ملا تھا اُن کے لیے یہ رشتہ۔ جلیس بھائی مرد ہیں خدانخواستہ بات بگڑ گئی تو اُن کو تو پھر کوئی کمی نہ ہوگی الفت مشکل میں پڑ جائے گی۔"

"اجی ہاں..... چار بچوں کے باپ کو تیسری شادی کے لیے اب تو کوئی آنکھ کا اندھا عقل کا کورا ہی بیٹی دے تو دے۔"

"بہر حال امّی میں تو الفت کے جانے تک اب یہاں آؤں گی نہیں ورنہ آپ کے داماد کو بھی پتا چل جائے گا۔"

"تمہاری مرضی..... مگر یہ طے کر رکھا ہے میں نے کہ جلیس آئیں گے تو اپنے آپ سے یہاں سے نہ کوئی انھیں بلانے جائے گا نہ انھیں کوئی پیغام بھجوایا جائے گا۔"

عظمت آپا چپ ہو رہیں۔

فضیلت جو اپنے سسرالی عزیزوں سے ملنے اور سیر و تفریح کرنے اپنے میاں اور بچوں کے ساتھ راولپنڈی گئی ہوئی تھی واپس لوٹی تو سوغاتیں لیے میکے بھی آئی۔ الفت کو میکے آئے بارھواں دن تھا اور وہ اسکول بھی جوائن کر چکی تھی۔

فضیلت کو الفت کے گھر بیٹھ جانے کی خبر ہوئی تو اُسے اتنا ملال ہوا کہ بجائے الفت کی غم خواری کے خود دھواں دھار رونے بیٹھ گئی۔ اور اپنے ساتھ امّی کو بھی خوب رُلایا۔

جب ہوش قدرے ٹھکانے آئے تو بولی۔ "اب ہو گا کیا؟"

"ہوا کیا ہے پگلی میں نے اسکول جوائن کر لیا ہے۔ خود کفیل ہوں بلکہ دو ایک کو پال سکتی ہوں۔ بس یہ ہے کہ وہ جو تم سب لوگ فکرمند رہا کرتے تھے کہ ہائے الفت کی شادی نہیں ہوتی وہ ہو گئی۔ اب کوئی امّی، بابا یا گھر کے کسی اور فرد سے یہ سوال نہیں کرے گا کہ الفت کی شادی کیوں نہیں کرتے آپ لوگ؟" الفت نے کہا۔

"وہ تو ٹھیک ہے آپا۔ مگر لوگ تو اب بھی چین سے نہ رہنے دیں گے۔ باتیں بنائیں گے۔"

"لوگوں کی باتوں کی تم نے کبھی پروا کی۔ وہ تو کسی حال میں بھی چین سے نہیں رہنے دیتے۔"

"ایسا حال مجبوری ہے پروا کرنی پڑتی ہے۔"

"بھئی جب میں مطمئن ہوں تو کسی اور کی پروا کرنے کی ضرورت کیا؟"

"ایسا جانی بُرا مت ماننا کہ آپ بھی ابھی مطمئن ہیں کیونکہ شروع شروع کی بات ہے جیسے جیسے دن بڑھتے جائیں گے آپ بھی گھبرا جائیں گی۔ شوہر کے گھر کی اللہ نے بات ہی کچھ اور بنائی ہے۔ سچ کہتی ہوں کہیں چلی جاؤں میرا تو اپنے گھر کے علاوہ اور کہیں جی نہیں لگتا۔"

"تمہاری اور میری بات میں بہت فرق ہے فضی۔" الفت نے قدرے دکھ آمیز لہجے میں کہا۔ "تمہارا گھر تمہارا ہے تمہارے لیے ہے۔ میاں تمہارا ہے بچے تمہارے ہیں گھر میں تمہارا حکم چلتا ہے جبکہ میرا تو معاملہ ہی کچھ اور ہے۔ نہ اپنا گھر لگتا تھا نہ شوہر۔ بچے تو تھے ہی غیر۔" الفت نے ایک سرد آہ کھینچی پھر بوجھل آواز میں بولی۔ "سچ کہتی ہوں جتنے دن اس گھر میں گزارے ہر قدم پھونک پھونک کر اُٹھایا۔ یوں لگا کرتا تھا جیسے کانچ کے ٹکڑوں پر چل رہی ہوں۔"

الفت کی اس بات پر فضیلت اور امّی دونوں کی آنکھیں بھر آئیں۔ تہنیت اپنی آنکھوں کی نمی چھپانے کو باہر دوڑی اور غسل خانے میں گھس کر اپنی آنکھوں پر پانی کے چھپاکے مارنے لگی۔

چلتے سمے فضیلت نے امّی سے کہا۔ "امّی آپ کے داماد سے تو میں فی الحال یہی کہوں گی کہ آپا چند دن رہنے کے لیے آئی ہوئی ہیں کیونکہ اللہ بچائے یہ اکیلے ہی دس ساس نندوں پر بھاری ہیں۔ طعنے دے دے کر کھا جائیں گے۔ آپ کو میں نے بتانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ یہ تو شرط لگائے بیٹھے ہیں مجھ سے کہ آپا کا اس گھر میں گزارا نہیں ہو گا۔"

"ٹھیک ہے یہی کہہ دینا۔"

"لیکن امّی آپ یہ ضرور سوچیے گا کہ اس قسم کے بہانے سے زیادہ سے زیادہ کتنے دن کام چلا سکوں گی میں۔"

"جتنے دن چلا سکتی ہو اتنے دن تو چلاؤ۔"

"اور ہاں تہنیت کی شادی بھی تو اب بہت دُور نہیں۔ میں راولپنڈی جانے سے دو روز قبل خالہ بی بی سے ملی تھیں مجھے بازار میں۔ کہہ رہی تھیں رجب میں تاریخ لینے کا ارادہ ہے۔ اور رجب کوئی زیادہ دور تو نہیں اب۔"

"انشاء اللہ تب ہے۔"

"اچھا ویسے ارادہ تو ہے۔ خالہ بی بی کا رجب تک؟"

"ہاں ہے تو یہی۔"

"اور خاندان میں اب تک کس کس کو پتا چل چکی ہے آپا کے گھر بیٹھنے کی بات؟ یہ میں اس لیے پوچھ رہی ہوں تاکہ جن لوگوں کو پتا ہے اُن سے آپ کے داماد کو فی الحال دُور ہی رکھا جائے ورنہ اس کا اگلا طعنہ دیں گے کہ فلاں کو پتا ہے مگر مجھ سے چھپایا گیا۔"

"ابھی تک اپنی زبان سے تو ہم نے کسی کو بتایا نہیں۔"

"پھر بھی آنا جانا تو لگا ہی رہتا ہے اپنے پرایوں کا۔"

"شروع شروع میں تو یہی کہا ہے ہر ایک سے کہ چند دن رہنے کو بلایا ہوا ہے۔ اب یہ کہ صبح سے دوپہر تک تو الفت اسکول میں ہوتی ہیں۔ شام کو کوئی آجائے تو ادھر اُدھر ہو جاتی ہیں۔ اور اگر بروقت ادھر اُدھر نہ ہو سکیں تو یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی میاں چھوڑ کر گئے ہیں۔"

"ایسے کتنے عرصے کام چلے گا؟"

"جب تک خدا چلائے۔"

"میں تو بہت ہی فکرمند ہو کر جا رہی ہوں۔ خوش خوش آئی تھی کہ آپ لوگوں کو پنڈی کے قصے سناؤں گی۔ مگر یہاں سے دل پر بوجھ لے کر جا رہی ہوں۔ خدا جانے رات کو نیند بھی آئے گی کہ نہیں..... ہاں یہ لیجیے اس بیگ میں سب کے لیے چھوٹے چھوٹے تحفے ہیں۔ میں نے ہر ایک پر چٹ لگا رکھی ہے کہ یہ چیز فلاں کے لیے ہے آپ ہی دے دلا دیجیے گا اور ہاں آپا۔ جلیس بھائی اور اُن کے بچوں کے لیے جو سوغاتیں لائی تھی وہ گھر پر ہی دھری ہیں سوچا تھا کہ اُن کے گھر جا کر دوں گی مگر اب تو......."

امّی ٹھنڈی سانس بھر کے رہ گئیں۔

اور فضیلت جو بہت خوش خوش میکے آئی تھی بقول اُس کے دل پر بوجھ لیے اپنے گھر واپس لوٹی۔

■■■■■■■■■■■■■

جلیس الحسن چند دن تو اندر سے بہت مضطرب رہے۔

گھر میں الفت کی کمی محسوس کرتے رہے۔

دن تو مصروفیات میں گزر جاتا۔

شام بچوں کے ساتھ۔

مگر رات کاٹنا مشکل ہو جاتی۔

سگریٹ پر سگریٹ پھونکے جاتے۔

اور ادھر سے اُدھر بے تابانہ ٹہلے جاتے۔

الفت کے جانے سے عاصمہ بیگم کے جانے کا زخم بھی ہرا ہو گیا تھا۔

کچھ ایسے ہی روز و شب گزارے تھے انھوں نے ان دنوں بھی۔

فرق اگر تھا تو بس اتنا کہ؛

عاصمہ بیگم کے جانے کے بعد بچے خود اُن سے بڑھ کر مضطرب اور پریشان رہتے تھے۔ دنوں تو وہ روتے ہی رہتے تھے۔ ثمین نے اسکول جانا ترک کر دیا تھا۔ ہر وقت تکیے میں منہ دبائے اوندھی پڑی رہتی تھی۔ جلیس الحسن جب دلجوئی کو اُس کے پاس جاتے اُس کی آنکھیں سرخ اور بھیگی ہوئی پاتے۔

اعجاز زیادہ تر کمرے میں بند رہنے لگا تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر جھنجھلا جاتا، دیواروں پر مکے برسانے لگتا۔ کمرے کی چیزیں اُلٹ پلٹ کر کے رکھ دیتا۔ ان دنوں اُس کی حالت جنونیوں کی سی ہو گئی تھی۔

فراز کو چُپ سی لگ گئی تھی۔ خاموش بیٹھا خلاؤں میں کچھ اس طرح گھورے جاتا جیسے اُسے یقین ہو کہ اُس کی ماں ان خلاؤں کے بیچ کہیں گم ہو گئی تھی۔

زرین تو صدمے سے بیمار پڑ گئی تھی۔ پہلے بخار چڑھا پھر یرقان نے آلیا تھا۔ دو روز اسپتال میں داخل رہی۔ اسپتال سے گھر آنے کے بعد بھی کئی روز بستر پر پڑی رہی اور جلیس الحسن نے اُس کی دیکھ بھال میں دن رات ایک کر دیا تھا۔

لیکن الفت کے جانے کے بعد وہ چار دن ایک دو روز تو تکلفاً محتاط رہے مگر پھر یوں وہ فارم میں آئے تو یوں لگا جیسے سوتیلی ماں کے گھر چھوڑ جانے کی خوشی نے اُن کی سگی ماں کے جانے کا صدمہ بھی اُن کے دلوں سے دھو ڈالا ہو۔

اُن کے چہروں پر گزشتہ کئی ماہ سے چھائی رہنے والی یاسیت اور پژمردگی بشاشت اور تازگی میں بدل گئی تھی۔

اپنے کمروں میں محصور رہنے کے بجائے وہ وسیع و عریض گھر کے طول و عرض میں چونچالیاں کرتے شاداں و فرحاں پھرتے۔

"حسن لاج" کے بام و در اُن کی زندگی کے بھرپور قہقہوں سے گونجنے لگے۔

اُن کے ایناک چہرے دیکھ کر اور اُن کی مسرتوں سے معمور قہقہے سُن کر جلیس الحسن کو کبھی کبھی تو یہ گمان گزرتا، جیسے عاصمہ بیگم گھر لوٹ آئی ہوں اور گھر ہی کے کسی کونے میں چھپی ہوں۔

سب سے اہم تغیر جو اُن کے حساب سے الفت کے جانے کے بعد رونما ہوا یہ تھا کہ بچے جو الفت کے آنے کے بعد خود اُن سے بھی کھنچے کھنچے سے رہنے لگے تھے ایک بار پھر اُن کے نزدیک آگئے تھے بلکہ غالباً پہلے سے بھی زیادہ نزدیک آگئے تھے۔

انھیں ایک انجانے سے دکھ میں ڈوبی خوشی کا احساس ہوتا کہ چند ماہ کے کھنچاؤ کے بعد نئے حالات نے بچوں کو اُن کے اس قدر نزدیک کر دیا تھا کہ اُن کے مابین محبت کی کایا کلپ ہو گئی تھی۔

پہلے وہ بچوں کا ہر ممکن خیال رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔

اب بچے اُن کی دلداری میں لگے رہتے۔

نگین ایک دم کسی خانہ دار خاتون کی طرح ذمے دار ہو گئی تھی۔

وہ باپ کے کھانے پینے، آرام و سکون کا ہر ممکن خیال رکھتی اور ملازموں کو مناسب ہدایات جاری کرتی۔ بابا کو ہر چیز وقت پر ملنا گویا کہ اس کا نصب العین ہو گیا تھا۔

انھیں ذرا مضمحل دیکھ کر وہ چاروں بالخصوص نگین اور اعجاز مضطرب ہو جاتے۔ کوئی اُن کا سر دبانے بیٹھ جاتا کوئی اُن کی ٹانگیں۔

اُن کے ساتھ لوڈو، شطرنج اور کیرم کی بازیاں جمتیں اور اُن کی دلداری کے خیال سے بچے خود جان بوجھ کر ہارتے۔

اُن کی خوشنودی کی خاطر اعجاز اپنی پڑھائی کے بہتر نتائج دکھانے کی خاطر پوری توجہ اور انہماک سے اپنی پڑھائی کی جانب راغب ہو گیا تھا۔

فرزانہ نے اپنے حسابوں اُن کی بہترین قلمی اور آبی تصاویر بنائیں اور اپنے کمرے کو ان تصاویر سے آراستہ کیا۔

نگین نے بیڈ سائیڈ کو سنہرے فریم میں جڑی اُن کی تصویر سے سجایا۔

اور نہ جانے ہر صبح کون؟ کوئی پھول دامنِ تصویر میں لا دھرتی۔

محبت کی قلب ماہیت یوں بھی ہو سکتی ہے یہ جلیس الحسن کے گمان میں بھی نہ تھا۔

بچوں کی خوشی اور طمانیت خود اُن کے لیے بھی باعثِ اطمینان تھی مگر جب وہ تنہا ہوتے اور فرصت بھی ہوتی تو سوچوں کا ایک لامتناہی ہجوم انھیں گھیرتا۔

عاصمہ بیگم اور الفت بحرِ تصور میں اُبھرنے اور ڈوبنے لگتیں۔

وہ ان دونوں کا باہم موازنہ کرنے لگتے، اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچتے کہ:

"الفت"

محبت اور نفرت، شبہات اور خوف کے بیچ اُلجھی ہوئی عورت تھی۔

وہ ان سے محبت کرتی تھی اور بلا شرکتِ غیرے انھیں پا لینے کی متمنی تھی۔

اُن کے بچوں سے اُسے نفرت تھی کیونکہ انھیں وہ اُن کے اور اپنے بیچ ایک دیوار تصور کرتی تھی۔

اور المیہ یہ تھا کہ وہ انھیں جلوت میں ہی نہیں بلکہ اکثر خلوت میں بھی عاصمہ بیگم کے تصور سے نتھی کر دیا کرتی تھی۔

اور اس کا یہی ذہنی اُلجھاؤ بالآخر اُسے اُن سے دُور کھینچ لے گیا تھا۔

بچھڑنے کے بعد وہ شرمندہ تھی یا نہیں وہ اس امر سے بے خبر تھے مگر اپنی جگہ خاصے دل شکستہ اور رنجیدہ تھے۔

انھوں نے اس کا ہاتھ ساتھ چلنے کے لیے تھاما تھا جُدا ہونے کے لیے نہیں۔

کاش! اُس نے اتنی عجلت اور ایسی عاقبت نااندیشی نہ دکھائی ہوتی۔

پایا جی کی چاہ تھی تو۔

دوسروں کو وقت دیتی

اور خود صبر و تحمل کے ساتھ انتظار کرتی

زندگی کے بحرِ ذخار میں غوطہ زن ہر نفس تو اتنا نصیب ور نہیں ہوتا کہ ایک ہی ڈبکی میں گوہرِ مقصود پا جائے۔

بلکہ اُدھر ڈوب کر اِدھر نکلنا اور اِدھر ڈوب کر اُدھر نکلنا، پاتال کی گہرائیوں کو کھوجنا پڑتا ہے، تب کہیں جا کے گوہرِ مقصود ہاتھ لگتا ہے۔

بلکہ کبھی کبھی تو تب بھی نہیں لگتا!

جب وہ تنہائی میں دونوں عورتوں کے بارے میں سوچتے تو عاصمہ بیگم کی حیثیت بمقابلہ اُلفت اس اعتبار سے انھیں قطعاً بے معنی اور غیر مستحکم محسوس ہونے لگتی کہ وہ اُن کے اور اپنے مابین تعلق کی ڈور کو قطع کر گئی تھیں جب کہ اُلفت سے اُن کا تعلق مستحکم تھا۔

عاصمہ بیگم اُن کے لیے غیر قرار پا چکی تھیں۔

جبکہ اُلفت دُور ہو کر بھی اپنی تھی۔

اسی لیے الفت کا خیال اُن کی خلوت میں بے محابا دل میں در آتا تھا۔

دن کبھی یوں ہوا ہوتے ہیں کہ پتا نہیں چلتا۔

دوسرا مہینہ بھی ختم ہونے کو آ رہا تھا۔

سسرال سے الفت کے میکے آ بیٹھنے کی خبر اپنے پرایوں سب میں مشتہر ہو چکی تھی۔

حالانکہ گھر والوں نے تو سو سو طرح سے اس بات پر پردے ڈالنے کی کوشش کی تھی۔

شروع شروع میں امی کے ایما پر ہر پوچھنے والے کو اہلِ خانہ نے یہی بتایا کہ الفت کو چند دن میکے میں رہنے کے لیے سسرال سے بلایا گیا ہے۔

پھر چند دن الفت کی ناسازئ طبع کے بہانے سے کام چلانے کی کوشش کی گئی۔

بعد ازاں کبھی الفت کے گھر ہی میں چھپنے دبکنے سے اس راز پر پردہ ڈالا گیا اور کبھی اس غلط بیانی سے کام لیا گیا کہ بس ابھی ابھی تو آئی ہیں الفت یہاں اپنے گھر سے!

مگر وہ جو کہا ہے کسی شاعر نے کہ ع "تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں"...... سو تاڑنے والے تاڑ ہی گئے کہ دال میں کچھ کالا نہیں نیلا پیلا ضرور ہے!

لوگوں کے پیٹ میں وہ کھد بد مچی کہ الاماں!

شاکرہ بھابی جن کی دوسروں کی ٹوہ میں رہنے اور اِدھر کی اُدھر کرنے کی عادات اُن کی دوسری بہت سی خوبیوں کا کبھی بیڑا غرق کر گئی تھیں چاروں ہاتھ پاؤں سے الفت کے اس کے میکے میں لمبے پڑاؤ کا راز معلوم کرنے پر ایسی جُتیں کہ ایک روز ماؤتھ پیس پر دوپٹے کا پلو ڈال کر تو آواز بدل کر جلیس الحسن کے ہاں فون تک کر ڈالا اور جھوٹ بھی ایسا بولا کہ خدا کی پناہ!

"میں بیگم جلیس الحسن کی ایک قریبی دوست بات کر رہی ہوں ذرا انھیں فون پر بلا دیں۔"

وقت بھی بندی خدا نے ایسا تاکا تھا کہ جلیس الحسن گھر پر تھے نہ بچے۔ بس نوکر چاکر ہی تھے۔ فون ہاجراں نے اُٹھایا اور بولی "بیگم صیب جی تو گھار ہیں نہیں!"

"آپ کون بول رہی ہیں؟" شاکرہ بھابی نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

"میں جی ہاجراں۔"

"کون؟"

"جی میں نوکرانی ہوں۔"

"اچھا اچھا! یہ بتاؤ بیگم صاحب گھر کب تک آئیں گی؟"

"وہ تو جی اپنے گھار چلی گئی ہیں۔"

"اپنے گھر!" انھوں نے مصنوعی حیرت کا اظہار کیا اور بولیں "بھئی کون سے گھر؟ اُن کا اپنا گھر تو یہی ہے۔"

"وہ جی اپنے ماں پیو کے گھار۔"

"واپس کب تک آئیں گی؟"

"پچھ خبر نہیں ہے گی جی۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ ہے جی کہ کچھ پتا نہیں۔"

"کیوں بھئی ؟"

"بس جی کچھ ایسی بات ہوگی ہے گی ۔ آپ رات توں نہیں تے فیر سویرے صیب ہوراں نوں فون کرکے بلوا لیا اے۔"

"بھئی ایسی کیا بات ہوگئی ہے؟ میں اُن کی گہری سہیلی ہوں مجھے تو پریشانی ہونے لگی ہے ۔ کچھ تو بتاؤ کیا بات ہوئی ؟"

"وہ جی ...."

"ہاں ہاں بولو نا رک کیوں گئیں ؟"

"وہ جی بیگم صیب جی رُوس کے گئی ہیں جی ۔"

"کیوں ؟"

"یہ تو جی آپ صیب جی کو یوں پُچھنا ..... ہم نوکر لوگوں نے کیا پتا اے۔"

شاکرہ بھابی نے اپنے اس معرکے کا احوال اپنے سسرالیوں کے سامنے بارہ مسالوں کی چاٹ بنا کر پیش کیا اور سننے والوں نے حسب توفیق بات آگے بڑھائی۔

الفت کے اسکول جوائن کر لینے کی بھنک تابوت میں آخری کیل کے مصداق ثابت ہوئی۔

گھر والوں کی تمام پیش بندیاں دھری رہ گئیں۔

بہانہ سازیوں کے پردے چاک ہو گئے۔

....

ادھر اسکول جوائن کرنے کے بعد سے الفت کی ساتھیاں اُس کی جان کو آئی ہوئی تھیں۔

سوال پر سوال!

استفسار پر استفسار!

"بھئی الفت اب تمہیں نوکری کی کیا ضرورت ؟" زیادہ تر کا یہی سوال تھا۔

"گھر میں کرنے کو کچھ ہے نہیں۔ سارا دن فارغ بیٹھے بیٹھے بور ہو جاتی ہوں اس لیے اسکول جوائن کر لیا۔" اُس نے اسی ایک جواب سے سب کی تشفی کی۔

جواب معقول تھا۔

سو اس کے اسکول جوائن کر لینے کے متعلق تو زیادہ بحث و تمحیص نہیں کی گئی۔

لیکن صبح امّی کے ہاں سے اسکول آتے اور وہیں واپس جاتے ہوئے پڑے تواتر کے ساتھ مسز نیاز اور مس راحیلہ سے اُس کے ٹکراؤ نے مسز نیاز اور مس راحیلہ کے علاوہ اُس کی دیگر ساتھیوں کو بھی متجسس کر دیا۔

پہلے اُن کے مابین چہ میگوئیاں ہوئیں۔

پھر الفت کو کریدنے کی کوشش کی گئی تو اُس نے اس جواز سے کام چلایا کہ۔

"چھوٹی بہن کی شادی کی تیاریاں کی جا رہی ہیں امّی نے ہاتھ بٹانے کو بلا رکھا ہے۔"

مگر اس بہانے سے آخر کتنے دن کام چلایا جا سکتا تھا؟

اُس کی ساتھیوں کی جانب سے نوع بنوع استفسارات ہونے لگے۔

"الفت! بہن کی شادی کی تیاریوں میں تمہارا اپنا گھر نظر انداز نہیں ہو رہا کیا؟"

"مجھے وہاں کرنا ہی کیا پڑتا ہے۔ ہر کام کے لیے تو نوکر موجود ہیں۔"

"مگر میاں اور بچوں کو تو تمہاری ضرورت ہوگی۔"

"بس کام چل رہا ہے وہ چار گھنٹے وہاں بھی گزار آتی ہوں۔"

"تمہارے میاں تو اس حساب سے مثالی شوہر ہوئے ورنہ ہمارے میاں کا تو یہ حال ہے کہ ساتھ چپک کر جاتے ہیں ہمارے میکے اور ساتھ ہی واپس لے آتے ہیں۔" مسز الٰہی بخش بولیں۔

"ہاں واقعی۔" چہار جانب سے پُر زور تائید ہونے لگی۔

"بہن کی شادی کب ہو رہی ہے؟"

"ابھی تاریخ تو نہیں ٹھہری ہے لیکن رجب میں متوقع ہے۔"

ہنسی کے فوارے چھوٹے۔

"واہ بھئی! ابھی تاریخ طے ہوئی نہیں ہے بہن کی شادی کی اور تم ابھی سے میاں کا گھر چھوڑ کر میکے آگئیں۔ تاریخ ٹھہر جانے کے بعد تو شاید تم میکے سے ہلو گی بھی نہیں۔"

شکوک و شبہات بڑھنے لگے۔

کھوجی فطرت کی ساتھیاں بال کی کھال نکالنے کی کوشش میں لگ گئیں۔

اور وہ اُن کے اُلٹے سیدھے استفسارات اور معنی خیز نگاہوں سے بچنے کی خاطر اپنے فری پیریڈز اور وقفے کے دوران اسٹاف روم میں بیٹھنے کے بجائے اسکول لائبریری، کینٹین یا سائنس لیبارٹریز میں وقت گزارنے لگی۔

رعنا جمیل نے سچ ہی کہا تھا کہ:

"ہماری مشکلات کو دنیا والے اور مشکل بنا دیتے ہیں۔"

xxxxxxxxxxxx

بات چھپنے والی تھی نہ چھپ سکی۔

جب خالہ بی بی نے جو عنقریب نسبت کی نسبت سے جلد ہی امی اور بابا کی پکی سمدھن بننے جا رہی تھیں امی کو اپنی جان کی قسم دے کر پوچھا۔

"اے ابھی آپا! تمہیں میری قسم بتاؤ تو الفت جہاں اتنے دنوں سے یہیں کیوں ہیں؟"

تو امی خالہ بی بی سے اپنے موجودہ رشتے کی پائیداری اور آئندہ رشتے کی نزاکت کے پیش نظر انہیں اصل صورت حال سے آگاہ کرنے پر مجبور ہو گئیں۔

کچھ تو اس لیے کہ خالہ ماں کی پرچھائیں ہوا کرتی ہے۔

کچھ اس لیے کہ خالہ بی بی دل کی موم عورت تھیں۔

اور کچھ امی سے اپنے موجودہ رشتے کے استحکام اور آئندہ رشتے کا لحاظ رکھتے ہوئے خالہ بی بی الفت کو گلے لگا کر خوب ہی تو روئیں۔

خالہ بی بی نے اپنے گھر میں تذکرہ کیا۔

اُن کے گھر سے بڑی خالہ کے ہاں بات پہنچی مگر اس ہدایت کے ساتھ کہ کسی اور سے نہ کہنا۔

تائی اماں کو چچی جان نے بتایا تھا۔

چچی جان کو پھوپھی جان کے ہاں سے خبر ملی تھی۔

اور

یوں گویا شہر بھر کو خبر ہو گئی کہ الفت جہاں کا میاں سے بگاڑ ہو گیا ہے اور وہ گھر آ بیٹھی ہیں

پھر

تصدیق و تائید کا سلسلہ شروع ہوا۔

شہر کا شہر تصدیق کے لیے امی کے پاس دوڑا چلا آیا۔

نہ ہوئیں امی بزنس مائنڈڈ ورنہ موقع تو دھندے کا تھا۔

اپنے دستخطوں کے ساتھ ایسا اعلامیہ کچھ اس مضمون کا جاری کرتیں کہ:

"ہر خاص و عام کو مطلع کیا جاتا ہے کہ میری بیٹی الفت جہاں ولد ریاست علی اپنے خاوند مسمی جلیس الحسن ولد نبیل الحسن سے اختلافات کے بعد باپ کے گھر آ بیٹھی ہے۔ یہ اعلامیہ ہر خاص و عام کو دردِ سر سے محفوظ رکھنے کے لیے کیا جا رہا ہے تاکہ سند رہے اور بوقتِ ضرورت کام آئے الفت جہاں کے جلیس الحسن سے بگاڑ کے سلسلے میں اگر کسی کو کوئی اعتراض ہو تو سات دن کے اندر اندر متعلقین الفت جہاں سے رجوع فرمائیں۔ بعد ازیں کوئی اعتراض نہ سنا جائے گا۔"

اور

اس اعلامیے کی ڈھیروں فوٹو کاپیاں بنوا لیتیں کہ کچھ تو کسی غریب کا بھی بھلا ہوتا۔

پھر

کسی اوتھ کمشنر کو ٹھیکا دے کر دروازے پر بٹھا دیتیں کہ میاں جو آئے تصدیق کا ٹھپا لگاؤ دستخط کرو معقول

فیس وصول کر کے آنے والے کو چلتا کرو۔

بات فقط تصدیق و تائید تک ہی نہ رہی بلکہ پھر باقاعدہ تعزیتی وفود تعزیت کے لیے آنے لگے۔

بظاہر تو ان وفود نے انتہائی رنج و ملال کا اظہار کیا۔

متاثرہ خاندان سے ہمدردیاں بھی جتائیں۔

الفت کے سر پر ہاتھ دھر کر، اُسے گلے سے لگا کر، سینے سے چپٹا کر دھواں دھار رونا دھونا بھی مچا اور خوب خوب بین بھی ہوئے۔

"اے ہتے پھول سی لڑکی کو چھ مہینے میں کملا کر رکھ دیا!"

"کیا مقدر دیا یا اللہ میاں نے بے چاری لڑکی کا کہ پورے چھ مہینے بھی تو نہ بس سکی۔"

"اے مرے جلیس الحسن تیرا ستیاناس...... بیڑا غرق ہو تیرا۔" دامن پھیلا پھیلا کر کوسا پیٹا گیا۔

"سچ سچ اب کیا ہوگا؟"

"الفت جوان جہان ہے کیسے کاٹے گی پہاڑ سی زندگی!"

مگر

انھی اظہار افسوس کرنے، ہمدردیاں جتانے اور بین کرنے والوں نے متاثرہ خاندان کے پیٹھ پیچھے سر جوڑ کر وہ چہ میگوئیاں کیں کہ خدا کی پناہ!

"اے بھئی شادی تھوڑی کی تھی الفت جہاں کی، وہ تو سودا بازی تھی۔ حق مہر تقریباً تین لاکھ لکھوایا گیا ہے۔ بصورت طلاق ایک مکان کم از کم چار سو مربع گز پر بنا ہوا خرید کر دینا پڑے گا جلیس الحسن کو۔"

"جلیس الحسن کا مال و دولت دیکھ کر ہی تو چار بچوں پر الفت جہاں کو بیاہ گیا تھا۔"

"قسم لے لو جو ذرا سی گھر والے کے چہرے پر رنج و ملال ہو سب خوش ہیں ہاں بھئی طلاق ہوگی تو پانچوں گھی میں ہوں گی اور سر کڑاہی میں۔"

"الفت کو دیکھا رنج کا شائبہ تک نہیں اُس کے چہرے پر!"

"بلکہ مسکرا رہی تھی۔"

"اے بھئی دانت نکال رہی تھی۔"

"کنوار پن کی تنخواہ بتاتی تھی سو بتا دی اب بے مہار ہیں جو مرضی آئے کرتی پھریں۔"

"نوکری پر تو جانے ہی لگی ہیں اب کمائیں گی کھائیں گی اور عیش کریں گی الفت جہاں۔"

"بہت ہی قطامہ ہوتی ہیں آج کل کی لڑکیاں۔"

"ہاہ! لڑکیاں! الفت جہاں تو پکی چھتیسی لگنے لگی ہیں شادی کے بعد۔"

"قسمت تو بے چارے جلیس الحسن کی خراب تھی، اب جو طلاق کا معاملہ ہوگا تو منھی بھر بلکہ جھولی بھر رقم دینی پڑے گی انھیں۔"

"اللہ توبہ!"

غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔

بلکہ اس سے زیادہ۔

کیونکہ ایک منہ سے بیک وقت دس دس خیال آرائیاں کی جا رہی تھیں!

خاندان والوں کی ان خیال آرائیوں سے قطع نظر الفت کی ساتھیوں میں علیحدہ چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ فری پیریڈز اور وقفے میں اسٹاف روم کے بجائے اُس کے اِدھر اُدھر وقت گزارنے پر معنی خیز استفسارات اور طنزیہ جملے کسے جا رہے تھے۔

"کیوں بھئی، کہاں رہتی ہو تم اپنے فری پیریڈز اور انٹرول کے دوران؟"

"ہاں بھئی، تم تو ٹھہریں بیگم صاحب، اب ہم چھوٹے لوگوں کے ساتھ بیٹھنا کب پسند کرو گی؟"

"کہیں فری پیریڈز اور انٹرول میں تمہارے صاحب بہادر تو نہیں ملنے آ جاتے تم سے جو تم ان کے ساتھ اِدھر اُدھر جا چھپتی ہو؟"

"یار! مانا کہ تمہارے میاں کی کوٹھی تین ہزار مربع گز پر محیط ہے مگر کبھی ہم چھوٹے چھوٹے گھر والیوں کی محفل کو بھی رونق بخش دیا کرو۔"

"ہاں بھئی بہن کی شادی کی تاریخ طے ہو گئی کہ نہیں؟"

"کب جا رہی ہو تم اپنے گھر؟"

"دو چار گھنٹے وہاں گزارنے کے لیے نہیں بلکہ دن رات وہاں رہنے کے لیے!"

"جان! اب تو تمہارے میاں کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا ہوگا!"

"حیرت ہے دو دو گاڑیاں گھر میں ہوتے ہوئے بھی بس سے اسکول آتی جاتی ہیں آپ!"

"جانِ من! کیوں نوکری کے چکر میں خوار ہو رہی ہو جتنی تنخواہ تمہیں ملتی ہے اتنی تو تمہارے میاں شاید تمہارے خانساماں اور اُس کی بیوی کو دے دیتے ہوں گے۔"

"کن چکروں میں پڑ گئی ہیں گھر بیٹھیے اور عیش کیجیے۔"

ایک جھوٹ چھپانے کی کوشش میں اُسے اپنی ساتھیوں سے دس جھوٹ بولنے اور اُن کے طنزیہ جملوں کے وار بھی ہنستے ہوئے سہنے پڑ رہے تھے۔

پھر ایک اتفاق نے اُس کی ساتھیوں کو بھی پاس پڑوس اور خاندان والوں کی طرح حقیقت احوال سے آشنا کر دیا۔

ہوا یوں کہ خالہ بی بی کی سب سے چھوٹی بیٹی روشن سے جو ایک مقامی کالج میں سیکنڈ ایئر کی طالبہ تھی اُس کی دوستوں نے تقاضا کیا کہ وہ انھیں اپنی ہونے والی بھابی کی تصویر تو لا کر دکھائے۔ اُن کے ہاں الفت کی شادی کی چند تصویریں تھیں جن میں تہنیت بھی موجود تھی۔ روشن وہ تصویریں اپنے کالج لے گئیں۔ سوئے اتفاق ایک تصویر میں الفت کی اسکول کی ساتھی مس انجم بھی موجود تھیں۔ مس انجم کی سگی بہن روشن کی کلاس فیلو نکلی اُس نے جوان تصویروں میں سے ایک تصویر میں اپنی بہن کو دیکھا تو اچھل کر بولی "اے! یہ تو میری باجی ہیں۔"

روشن نے جھک کر دیکھا اور بولی "اے! پھر تو میں تمہاری باجی سے مل چکی ہوں۔"

"اچھا!"

"ہاں یہ میری ان کزن کی شادی میں آئی تھیں جو میری ہونے والی بھابی کی سگی بہن بھی ہیں۔" روشن نے تصویر میں دلہن کے روپ میں نظر آنے والی اُلفت پر انگلی دھرتے ہوئے بتایا۔

"یقیناً یہ باجی کی کوئی قریبی دوست ہوں گی۔"

"بھئی ایک ہی اسکول میں پڑھاتی ہیں۔"

"اوہ! آئی سی...... بائی دی وے کیا نام ہے تمہاری ان کزن کا؟"

"الفت جہاں۔"

"اے ہاں میں نے باجی کے منہ سے اکثر یہ نام سنا ہے۔ بھئی واہ عجیب اتفاق ہے پھر تو ہم دونوں کی دوستی اور پکی ہو گئی۔"

"بالکل۔"

"آج ہی انجم باجی کو بتاؤں گی کہ جناب آپ کی دوست میری دوست کی کزن اور ہونے والی بھابی کی سگی بہن نکلیں۔ ویسے یار تصویروں سے لگتا ہے کہ تمہاری ان کزن کی کسی اونچی فیملی میں شادی ہوئی ہے!"

"ہاں ہوئی تو تھی مگر بے چاری الفت آپا کی قسمت خراب نکلی۔"

"کیوں؟ کیا ہوا؟"

"بھئی ان کے میاں کی دوسری شادی تھی۔ پہلی بیوی نے طلاق لے لی تھی اُن سے اور اپنے پیچھے چار بچے چھوڑ گئی تھیں۔ بہرحال صاحب کی شادی ہماری کزن الفت آپا سے ہوئی۔ بے چاری چند مہینے بھی اپنے گھر میں نہیں بس پائیں۔ وہ صاحب بہت خراب آدمی نکلے۔ کچھ جھگڑا وگڑا ہوا اور الفت آپا میکے آ گئیں۔ دوبارہ اسکول جانے لگی ہیں۔ اب شاید طلاق ولاق ہوگی۔"

"بے چاری!" مس انجم کی بہن نے اظہار افسوس کیا اور بولی "اچھا باجی اپنی تین دوستوں کا گھر میں بہت ذکر کیا کرتی ہیں اُن میں سے ایک تمہاری کزن بھی ہیں...... اور مجھے ذرا گمان نہ تھا کہ وہ تمہاری کزن ہوں گی...... بہرحال وہ اُن کا اکثر ذکر کرتی ہیں مگر میں نے یہ سارا قصہ نہیں سنا اُن کی زبان سے البتہ ہو سکتا ہے کہ انھوں نے امی وغیرہ کو بتایا ہو۔"

روشن اور مس انجم کی بہن کے مابین ہونے والی یہ بات آئی گئی ہو گئی۔

مس انجم کی بہن نے گھر جا کر مس انجم کو بتایا کہ اس کی دوست اُن کی فلاں ساتھی کی خالہ زاد بہن ہے اور اس کے

سبھائی کی شادی آپ کی اپنی دوست کی بہن سے ہونے والی ہے۔

"ارے بھئی واہ! ان کا بھی کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ اچھے بھلے آدمی سے شادی ہوئی۔ گھر میں دو دو گاڑیاں ہیں نوکر چاکر ہیں۔ مگر خدا جانے انہیں کیا مار ہے ان پر کرائیوں کے دھکے کھاتی اسکول آتی جاتی ہیں۔ جب سے بہن کی شادی کا قصہ چلا ہے زیادہ تر میکے میں رہتی تھیں۔ کہتی تو یہ ہیں کہ میں روزانہ دو چار گھنٹے کو اپنے گھر جایا کرتی ہوں مگر ہماری زیادہ ساتھیاں اس بات کو ان کی غلط بیانی سے تعبیر کرتی ہیں"۔

"اچھا وہ آپ لوگوں سے یہ کہتی ہیں!" مس انجم کی بہن نے حیرت سے کہا۔

"ہاں!" مس انجم بولیں۔

"مگر روشن تو کچھ اور بتا رہی تھی"

"کیا؟" مس انجم جو پہلے ہی الفت کی بابت اپنے ساتھیوں کے اجماعت تجسس میں شریک تھیں انتہائی متجسس نظر آنے لگیں۔

اُن کی بہن نے وہ سارا قصہ جو روشن اپنے الفاظ میں اُسے سنا گئی تھی من و عن انہیں سنا دیا۔

اگلے روز مس انجم "میں نے پا لیا! میں نے پا لیا" کی تفسیر بنی اسکول پہنچیں اور وقفے تک یہ بات جملہ اسٹاف ممبران میں مشتہر ہو چکی تھی۔

اس روز الفت کو طنزیہ جملے تو کم سننے کو ملے مگر نگاہوں کی بڑھتی ہوئی معنی خیزی کا اُسے زیادہ سامنا کرنا پڑا۔ اگلے دو چار دن وہ اس نوعیت کے استفسارات اور دبی دبی زبان سے دیے جانے والے مشوروں کی زد میں رہی:۔

"الفت! گھر کب جا رہی ہو اپنے؟"

"بھئی بس اب بہت ہو چکی۔ اپنے گھر چلی ہی جاؤ"

"بہن کی شادی کی تیاریوں کے چکر میں کہیں اپنے میاں کو خفا مت کر بیٹھنا"

"دیکھو اپنا گھر پھر اپنا ہوتا ہے"

"اپنا گھر چھوڑ کر زیادہ دن میکے میں رہنا دانشمندی نہیں"

"یہ جو اتنے دن سے تم اپنے میکے میں ہو کہیں کوئی گڑ بڑ تو نہیں ہو گئی؟"

"ارے بھئی! تمہارے میاں کی پہلی بیگم نے تو کچھ چکر نہیں چلا دیا؟"

"ہوشیار خبردار رہنا خود گھر نہ بسانے والی عورت دوسری عورت کو بھی نہیں بسنے دیتی اس گھر میں"

"یار! تم کچھ کھوئی کھوئی سی رہنے لگی ہو کیا بات ہے؟"

الغرض اسی نوعیت کے اور بہت سے استفسارات اور مشورے ہونے لگے جو الفت کو سانس روک لینے پر مجبور کر دیتے تھے۔ اس صورتِ حال نے اُسے بولا کر رکھ دیا۔

اور

شاید اس سے کہیں زیادہ متوحش عظمت آپا اور فضیلت تھیں جو بہن کے اُس کے میاں سے بگاڑ کی خبر اپنے پرایوں میں مشتہر ہونے کے باوجود اپنے شوہروں اور سسرالیوں سے اس خبر کو پنہاں رکھنے کی کوشش میں ہلکان ہوئی جا رہی تھیں۔

یوں زبانی کلامی تو تہنیت کی شادی سولہ رجب کو ہونا قرار پا چکی تھی مگر وجہ رسم و رواج کے مطابق خالہ بی بی اُن کے گھر والے اور چند قریبی عزیز گیارہ جمادی الثانی کو تاریخ شادی باقاعدہ مقرر کرنے کے لیے آ رہے تھے۔

طے پایا تھا کہ تہنیت کے ننھیالی بزرگ دولہا والوں کی طرف سے تاریخ لینے آئیں گے۔ اور دو ددھیالی بزرگ ادھر سے شریک ہو جائیں گے۔

خالہ ماموں [illegible] پھوپی ہر گھرانے سے ایک یا دو افراد کو لیا گیا تھا۔

امی نے عظمت اور فضیلت کے ہاں بھی دعوت بھجوائی تھی دونوں بیٹیوں، دامادوں اور اُن کے بچوں کے علاوہ عظمت آپا کی ساس اور فضیلت کی بڑی نند کو بھی مدعو کیا گیا۔

تقریب تاریخ سے ایک دو روز قبل عظمت آپا دوپہر کے وقت تنہا ہی میکے پہنچیں اور انھوں نے امی سے کہا۔ "آپ نے میری ساس کو دعوت بھجوائی ہے اور وہ ضرور یہ بات پوچھیں گی مجھ سے بتائیے، الفت کا کیا ہو گا؟"

"الفت کا کیا ہو گا!" امی نے استعجابیہ لہجے میں اُن کا سوال دہرا دیا۔

"میرا مطلب ہے جب تقریب میں اُن کے میاں کو شریک نہ دیکھا جائے گا تو میری ساس اور آپ کے داماد ضرور پوچھ گچھ کریں گے اُن کے بارے میں تو کیا کہا جائے گا اُن سے؟"

"لو یہ کون سا بڑا مسئلہ ہے کہہ دیا جائے گا کہ وہ بیمار ہیں یا یہ کہا جا سکتا ہے کہ کاروبار کی دورے پر باہر گئے ہوئے ہیں"

"اچھا ٹھیک ہے۔۔۔۔ لیکن خدانخواستہ اپنے عزیز رشتے داروں میں سے کسی نے بھنک اڑا دی تو؟"

"تم فکر مت کرو میں سب کو سمجھا دوں گی کہ کوئی ایسی ویسی بات نہ کریں"

"بس امی یہ احتیاط رکھیے گا کہ کسی طرح بھی آپ کے داماد اور اُن کی والدہ کو پتا نہ چلنے پائے ورنہ کہیں گے کہ ہم سے اب تک چھپائے رکھا"

"تم فکر نہ کرو" امی نے انھیں اطمینان دلایا۔

الفت اسکول سے لوٹی تو عظمت آپا کو تشویش میں گرفتار امی کے پاس بیٹھے دیکھا۔ اُن سے وجہ گرانی دریافت کی تو عقدہ کھلا کہ وجہ گرانی خود اس کی اپنی ذات تھی!

اگلے روز شام کے وقت فضیلت اپنے میاں کے ساتھ اگلے دن کے پروگرام کی تفصیل معلوم کرنے کے لیے آئی۔ میاں تو مصروف ہو گئے بابا اور بھیا سے باتوں میں اور وہ متفکر سی امی کے پاس آ بیٹھی۔ الفت امی کے پاس ہی بیٹھی تہنیت کا دوپٹا ٹانک رہی تھی۔

"امی جی جلیس بھائی کو بلاوا بھیجا کہ نہیں؟"

"نہیں" امی نے کہا۔

"کیوں؟"

الفت نے دزدیدہ نگاہوں سے امی کو دیکھا۔ فضیلت کی "کیوں" پر وہ متذبذب نظر آنے لگی تھیں۔

"کیوں کا کیا مطلب؟" الفت نے امی کی مشکل آسان کرنے کی کوشش کی۔ "جس شخص سے تعلق نہیں رکھنا اس کی فکر کیوں کر لی؟"

"اچھا!" فضیلت نے گمبھیر آواز میں کہا۔ "آپ اکیلی نہیں ہیں بہت سے لوگ ہیں جو آپ سے متعلق ہیں۔۔۔۔۔ اور ان لوگوں کا بھی دوسرے بہت سے لوگوں سے تعلق ہے۔۔۔ شادی کے بعد آپ کا تو فقط میاں ہی سے سابقہ رہا۔ مجھ سے اور عظمت آپا سے پوچھیے کہ بھری پری سسرال میں رہ کر ہمیں میکے کی بابت سسرال والوں کے کیسے کیسے سوالوں کا جواب دینا پڑتا ہے۔ جیسے مرتبہ تو مجھ سے یہ پوچھ لیجیے پہننا کیا بات ہے جب تمہارے گھر جاؤ تمہاری اپیا ضرور آئی ہوئی ہوتی ہیں۔ مگر اُن کے میاں نہیں ہوتے۔ اب تک تو خیر جیسے تیسے پردہ ڈال رہی ہوں لیکن کل جب یہ جلیس بھائی کو تقریب میں شریک نہ پائیں گے تو پھر طرح طرح کے سوالات کریں گے اور اس پر طرہ ہماری نند صاحبہ ثابت ہوں گی جو شادی نہ ہونے کے باعث بیالیس سال کی عمر میں بھی خود کو بچی سمجھتی ہیں مگر خدا کی پناہ کیا خرانٹ ہیں۔۔۔۔ اور ان کو دوش کیوں دوں یہ اکیلے دس ساس نندوں سے بڑھ کر کھوجی ہیں۔۔۔۔ آپ تو یہ کہہ کر چھوٹیں کہ جس شخص سے تعلق نہیں رکھنا اس کی فکر کیوں کرنی۔ مجھ سے پوچھیے کہ میں اس فکر سے کتنی گھبرائی جا رہی ہوں کہ کل جب یہ جلیس بھائی کو تقریب میں نہ پائیں گے یا گھر واپسی پر مجھ سے عجیب و غریب الٹے سیدھے سوالات کریں گے تو میں کس حد تک جھوٹ بول پاؤں گی۔۔۔۔ اور پھر کل کے لیے تو مجھے یہ فکر بھی ہے کہ اپنے خاندان والوں ہی میں سے کوئی اُن کے یا اُن کی بہن کے کان میں الٹی سیدھی نہ پھونک دے"

فضیلت کے اس طویل مکالمے نے الفت کے چودہ طبق جھنجھنا کے رکھ دیے۔

امی جو چپ چاپ سُن رہی تھیں فضیلت کے چپ ہو جانے پر بولیں "تم خاندان والوں کی تو فکر نہ کرو۔ سگے چہیتے تو لوگ ہوں گے میں نے ایک ایک کو فرداً فرداً تنبیہ کر دوں گی کہ الفت اور جلیس الحسن کے جھگڑے کا تمہارے اور عظمت کے میاؤں یا عظمت کی ساس اور تمہاری نند سے تذکرہ نہ کیا جائے بلکہ اگر وہ کچھ سُن گن لینے کی کوشش بھی کریں تو نہ بتائیں۔ رہی جلیس الحسن کی عدم حاضری کی بات تو تم بھی عظمت کی طرح اپنے میاں سے یہی کہہ دینا کہ جلیس کی طبیعت خراب تھی اس لیے نہیں آ سکے"

"اچھا چلیے کل تو یہ ہو جائے گا مگر پھر بھی پچیس روز بعد شادی، ولیمہ اور دوسری تقریبات جو سر پر کھڑی ہیں آپ کہاں کہاں غلط بیانیوں اور جھوٹ کے بند باندھیں گی؟"

الفت نے تڑپ کر اُس کی طرف دیکھا۔

وہ خاصی الجھی ہوئی نظر آتی تھی۔

"اللہ مالک ہے۔" امی نے کہا۔

"اللہ تو خیر ہے ہی، لیکن معاف کیجیے گا امی آپ فقط اپنی انا کی خاطر دوسروں کو صلیب پر مت لٹکا دیجیے۔ آر یا پار کسی ایک طرف معاملہ کر دیجیے۔ یہ کیا کہ بیچ میں لٹکا رکھا ہے۔ بابا جلیس بھائی سے خود رابطہ قائم کرنے کو کہتے ہیں تو آپ کیوں روکتی ہیں انہیں۔ بھئی انہیں بلا کر دو ٹوک بات کرنے دیجیے۔ اول تو معاملہ مت کا راستہ نکالیے تاکہ آپ کے دوسرے داماد دوں کو گڑ بڑ کا موقع نہ ملے ورنہ آج تو اپیا گھر بیٹھی ہیں کل کو ہمارے والے بھی ہمیں لڑ جھگڑ کر نکال باہر کریں گے۔"

الفت کو یوں لگا جیسے نفیلیت نے یہ ساری باتیں فقط اسی کو سنانے کے لیے کہی تھیں!

اس کے دل پر چوٹ سی لگی۔

جس دریچے پر تکا فی کر رہی تھی اُسے سنبھالتی اٹھی اور کچھ کہے سنے بنا چپ چاپ کمرے سے نکل گئی۔

اس رات وہ تہنیت کے سو چکنے کے بعد رات گئے تک اپنے مقدر پر آنسو بہاتی رہی۔

نفیلیت آج ڈھکے چھپے لفظوں میں کتنی باتیں سنا گئی تھی۔

اگلے روز تاریخ ٹھہرانے کی تقریب میں الفت دونوں بہنوئیوں، عظمت آپا کی ساس اور نفیلیت کی نند سے یوں منہ چھپاتی پھر رہی تھی جیسے اُس نے کوئی چوری کر رکھی ہو۔

لیکن کھانے کے وقت عظمت آپا کی ساس نے اُسے آ ہی گھیرا اور پوچھا "بیٹی تمہارے دولہا کے بارے میں پتا چلا کہ اُن کی کچھ طبیعت خراب ہے؟"

"جی..... جی ہاں۔"

"کیا طبیعت خراب ہے؟"

"وہ...... وہ...... انہیں..... بخار ہے۔" اس نے اس غیر متوقع سوال پر بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

فوری طور پر اُسے یہی جواب سوجھ سکا۔

اس کی نظریں اٹھیں تو عظمت آپا کی ساس کی آڑ میں کھڑی تائی اماں بڑے معنی خیز انداز میں اُسے دیکھ رہی تھیں۔

ان نگاہوں کی تاب نہ لا کر وہ آگے ہو لی۔

بہرحال تقریب بخیر و عافیت انجام پذیر ہوئی۔

پھر تہنیت کی شادی کی تیاریوں نے زور پکڑ لیا۔

ڈھیروں کام تھے۔

خریداری۔

تہنیت کے جوڑوں کی سلائی۔

بہنا کو نیاں حزم و احتیاط سے خریدنا۔

برتن بھانڈے

فرنیچر کا انتخاب

دولہا کے ملبوسات کی تیاری۔

اور بھی بہت کچھ۔

الفت کے اسکول سے آنے کے بعد اُس کا اور بھابی کا ایک پاؤں گھر میں ہوتا تو دوسرا بازار میں۔ کبھی کبھی تہنیت بھی اُن کے ہمراہ ہوتی۔

عظمت آپا اور نفیلیت بھی شادی کی تیاریوں میں شریک تھیں مگر الفت کی شادی کی طرح ہر شام پھیرا لگانا فرض نہ سمجھ رہی تھیں۔ الفت کی بار تو انہوں نے انتہائی دلچسپی اور جوش و خروش کا مظاہرہ کیا تھا۔

عظمت آپا اور نفیلیت کو آئندہ دنوں کی دہشت سوار تھی۔ وہ دونوں بابا کو بار بار سمجھاتیں کہ تہنیت کی شادی سے پہلے جیسے تیسے الفت کا اُس کے میاں سے سمجھوتا کروانے کی کوشش کریں۔

مگر بابا بے چارے کیا کرتے۔

امی اور الفت کے آگے بے بس تھے۔

اگرچہ حالات کا رخ اور اہلِ خانہ کی مرضی دیکھتے ہوئے امی کے موقف میں قدرے لچک آ گئی تھی۔ اب وہ یہ دعویٰ تو نہ کرتی تھیں کہ جلیس الحسن ناک کے بل گھسٹتے چلے آئیں گے مگر یہ ضرور کہتی تھیں کہ جلیس الحسن کو خود آنا چاہیے نہ کہ بابا جائیں۔

الفت یہ تو نہ کہتی تھی کہ جلیس الحسن آئیں البتہ یہ ضرور کہتی تھی کہ بابا کو یا کسی اور کو جلیس الحسن کے پاس جانے کی ضرورت نہیں۔

تہنیت کی شادی کے جوڑے خواہش کی مرضی کے مطابق گھر کے قریب اسی درزی کے ہاں سلوائے گئے جو الفت کی شادی سے پہلے تک اُس کے کپڑے بھی سیتا رہا تھا۔

لیکن مہندی، شادی اور ولیمے کے لیے الفت نے اپنے جوڑے اسی درزی سے سلوانے کا ارادہ کر رکھا تھا جس کے ہاں جلیس الحسن اُس کے اور دونوں بیٹیوں کے کپڑے سلوایا کرتے تھے ___ اس میں شک نہیں تھا کہ وہ سلائی تو ضرور زیادہ لیتا تھا مگر کمال کی سلائی کرتا تھا۔ الفت اسکول جوائن کرنے کے بجائے اب تک اس کے ہاں کے سلے ہوئے جتنے بھی جوڑے پہن کر اسکول گئی تھی سب نے عمدہ فٹنگ اور دیدہ زیب ڈیزائنوں کو بہت سراہا تھا۔

بھابی کو بھی اس درزی کی سلائی بہت پسند آئی تھی اور وہ بھی تہنیت کی شادی کے لیے اپنے کپڑے وہیں سلنے کو دینا چاہتی تھیں۔

بھابی کا خیال یہ تھا کہ جس روز اُن کے صاحب بہادر کو فرصت ہو گی انہیں بھی ہمراہ لے کر چلیں گی تاکہ بوقت ضرورت کام آئے مگر افسوس کہ وہ وقت نہ نکال پائے۔

ناچار ایک روز بھابی اور الفت کو خود ہی رکشا میں جانا پڑا۔

ویسے بھی آج کل دونوں رکشا اور منی بسوں میں ہی بھاگتی دوڑتی کام نمٹا رہی تھیں۔

مذکورہ درزی الفت کو دیکھتے ہی اُس کے آگے بچھ بچھ گیا۔

"زہے نصیب بیگم صاحبہ آپ تشریف لائی ہیں..... میں تو ڈر رہا تھا کہ کہیں ایسا نہیں کہ ہمارے کسی کاریگر نے آپ کی مرضی کے مطابق کام نہ کیا ہو۔"

"نہیں ماسٹر صاحب کام اچھا ہے آپ کا تب ہی تو اپنی بھابی کو بھی آپ کی دکان دکھانے لائی ہوں۔" الفت نے چرمی تھیلے سے اُن سلے کپڑے نکال کر ماسٹر کے کاؤنٹر پر دھرتے ہوئے کہا۔

"بس بیگم صاحبہ آپ جیسے قدر دانوں کی قدر دانی ہی ہمارے لیے سب سے بڑا انعام ہوتی ہے۔"

"ماسٹر صاحب ڈیزائن پسند کرنے کے لیے وہ کورین لڑکیوں والی کیٹلاگ ضرور دکھائیے گا؟"

"جی بہتر۔"

ماسٹر نے جھک کر شو کیس میں سے تین ضخیم کیٹلاگز اور "رشی" کے دو شمارے اُن کے آگے رکھ دیے۔

بھابی اور الفت دونوں ڈیزائن پسند کرنے میں منہمک ہو گئیں اور درزی "یور موسٹ او بیڈینٹ سرونٹ" بن کر کھڑا ہو گیا۔

پھر جب وہ ڈیزائن پسند کر چکیں بھابی نے اپنا ناپ دے دیا اور وہ دونوں باہمی صلاح مشورے سے اُسے یہ بتانے لگیں کہ کون سا جوڑا کس ڈیزائن کا بنایا جائے گا تو وہ بصد تعظیم بولا "بیگم صاحبہ آپ کا ناپ صفحہ نمبر چالیس پر ہی ہے نا؟"

"ہاں۔"

"پرسوں صاحب بھی تشریف لائے تھے میں نے پوچھا صاحب کیا بیگم صاحبہ کو ہمارے کسی کاریگر کا کام ناپسند ہوا جو کافی دنوں سے نہیں آئیں تو کچھ بولے نہیں چپ رہے۔"

الفت بھی چپ ہی رہی۔

بھابی کن انکھیوں سے اُسے دیکھنے لگیں۔

"بیگم صاحبہ! بڑی بی بی کے سوٹ کا جو کپڑا صاحب دے گئے ہیں وہ ہے ساڑھے چار گز جبکہ بی بی نے جو ڈیزائن بتایا ہے اس میں پانچ گز یا ساڑھے چار میٹر کپڑا لگے گا۔ آپ اجازت دیں تو میں اپنی مرضی سے ایک نیا ڈیزائن بنا دوں شرٹ کا، گھا زیتی سے خوبصورت معلوم ہو گا۔"

"صاحب آئیں تو انہی سے پوچھ لینا۔" الفت کو درزی اور بھابی دونوں سے نظریں چرانا محال ہو گیا۔

"جو حکم۔"

الفت کے چاروں اور بھابی کے پانچوں جوڑوں کی ڈیزائننگ کا معاملہ نمٹ گیا تو الفت نے کہا "ماسٹر

صاحب شادی کے کپڑے ہیں وقت پر مل دیجیے گا۔"

"آپ فکر نہ کیجیے انشا اللہ وقت سے پہلے ہی دے دوں گا۔ کوشش کروں گا کہ بچیوں کے کپڑوں کے ساتھ یہ کپڑے بھی تیار ہو جائیں تاکہ صاحب کو ایک ساتھ ہی لے دوں۔"

"نہیں...نہیں ماسٹر صاحب یہ ہم لوگ خود لے کر جائیں گے۔" وہ گھبرا کر بولی پھر اُس نے جواز پیش کرنے کی کوشش کی۔

"تاکہ اگر کوئی کسر ہو تو ہاتھ کے ہاتھ صحیح کروالیں۔ بھابی کے بھی تو کپڑے ہیں نا۔"

"جی بہت بہتر...... جیسے آپ کی مرضی۔"

"مگر وقت پر تیار کر دیجیے گا۔"

"آپ فکر نہ کیجیے۔" درزی سینے پر ہاتھ دھرتے ہوئے نیاز مندانہ انداز میں سر جھکا کر بولا۔

درزی کو کپڑے دینے کے بعد جب وہ دونوں دکان سے باہر نکل آئیں تو بھابی نے کہا۔ "ظہلہ تمہارے آگے اتنا کھیا، پچھا جار ہا تھا کہ مجھے تو تم پر رشک آنے لگا۔"

"اچھا!" وہ ہنس دی۔

"الفی جان! کیا تمہیں پتا ہے وہ کیوں اتنی تعظیم دے رہا تھا تمہیں؟" بھابی نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"کیوں؟" وہ لٹ ہاتھ پر آتے ہوئے بولی۔

"کیونکہ تم جلیس الحسن کی بیگم ہو۔"

وہ کچھ نہیں بولی۔

لیکن اس رات جب وہ بستر پر لیٹی تو اُس نے سوچا۔

"کیا بھابی جان اس وقت یہ کہنا چاہ رہی تھیں کہ اگر وہ جلیس الحسن کی بیوی نہ ہوتی تو درزی اُسے اتنی تعظیم نہ دیتا؟"

اُس نے اپنے دل سے تائید چاہی۔

اور اُس کے سینے میں دبکا دل دھڑکنے لگا۔

لیکن اگلے روز جب اُس نے ہفتہ واری تعطیل تہنیت کے جہیز کی تیاری کے چھوٹے موٹے بہت سے کاموں کی نذر کرتے ہوئے پھروں سے توثیق چاہی تو دل نے کہا۔

"اونہہ! جس کو پیسے کی مار دو وہی تعظیم دینے لگتا ہے۔"

یہ کم بخت دل ہی تو دوغلی چال چل رہا تھا۔

شب کی تیرگیوں میں کچھ

دن کے اجیاروں میں کچھ!

![■■■■■■■■]

پھر ایک دن جب وہ اسکول لائبریری کے ایک گوشے میں چھٹی جماعت نہم کے ماہانہ ٹیسٹ کی کاپیوں کی پڑتال میں مصروف تھی، رعنا جمیل اُس کے شانے پر ہاتھ دھر کر اُسے چونکاتی اُس کے قریب آ بیٹھیں۔

"ہاں بھئی اتنے دن ہو گئے تمہیں اسکول جوائن کیے تم سے تفصیلی بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔" انھوں نے کہا۔

الفت نے قلم اپنے سامنے رکھی کھلی کاپی کے بیچ دھر کاپی بند کی اور اُسے اپنے سامنے دھرے کاپیوں کے ڈھیر پر رکھنے کے بعد اُن کی جانب متوجہ ہو گئی۔

"کیسی رہیں؟" انھوں نے پوچھا۔

اُن کے اس فقرے میں "رہیں" کا استعمال خاصا معنی خیز تھا۔

وہ یہ بھی تو کہہ سکتی تھیں کہ "کیسی ہو؟"

"ٹھیک ہوں۔" الفت نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"کیا سچ کہہ رہی ہو؟"

"جی۔"

"تمہارا چہرہ تمہارے بیان کی گواہی دینے سے قاصر نظر آرہا ہے۔"

"اچھا!" اُس نے اپنی مسکراہٹ کو اور گہرا کرنے کی کوشش کی۔

رعنا نے اِدھر اُدھر دیکھا، اُس کی آنکھوں میں جھانکا پھر سرگوشی میں بولیں "کچھ گڑبڑ ہو گئی ہے کیا؟"

"کیسی گڑبڑ؟"

"میاں سے!" انھوں نے استفہامیہ لہجے میں کہا۔

"نہ...... نہیں...... تو......" وہ سٹپٹا کر بولی۔

انھوں نے میز پر دھرے اُس کے ہاتھ پر دھیرے سے اپنا ہاتھ رکھ دیا اور آہستہ سے بولیں "الفت! تم نے ایک روز بتایا تھا بھی حال دل مجھ سے کہہ ڈالا تھا۔ اب پھر مجھ پر اعتماد کر سکتی ہو...... تمہارے اور میرے درمیان دوستی کا رشتہ ہے۔"

الفت نے چونک کر اُن کی جانب دیکھا اور بے اختیار اُس کی آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے۔

"تم مجھ پر اعتبار کر سکتی ہو۔" وہ آہستہ آہستہ اُس کے ہاتھ کی پشت اپنے ہاتھ سے تھپتھپاتے ہوئے بولیں۔

ضبط کی ہزار کوشش کے باوجود الفت کے لبوں سے ایک سرد آہ نکل گئی۔

"مس انجم کے توسط سے اسٹاف ممبرز کو پتا چلا ہے کہ تمہارے ہسبینڈ اور تمہارے درمیان کچھ ناچاقی ہو گئی ہے۔"

وہ ایک بار پھر چونکی اور اُس نے استعجابیہ نگاہوں سے رعنا جمیل کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "مس انجم کے توسط سے؟"

"ہاں سنا ہے تمہاری چھوٹی بہن کی نند اور مس انجم کی بہن ایک ہی کالج میں پڑھتی ہیں۔ تمہاری بہن کی نند نے تمہاری تمہارے میاں سے ناچاقی کی خبر مس انجم کی بہن کو سنائی اور مس انجم نے اپنی بہن سے سُن کر اسٹاف ممبرز میں مشتہر کر ڈالی۔"

الفت کو رعنا جمیل کے اس انکشاف نے خاصا چونکا دیا۔ اس کا دھیان بلا تامل روشنی کی طرف گیا۔ خالہ بی بی کے ہاں بس وہی ایک زیرِ تعلیم تھی بڑی دو بہنوں کی تو شادیاں ہو چکی تھیں۔ بھائی پڑھ لکھ کر کب کا برسرِ روزگار ہو چکا تھا۔

رعنا اُسے سوچ میں گم دیکھ کر بولیں "کیا تمہاری بہن کی ہونے والی کوئی نند واقعی مس انجم کی بہن کے کالج میں پڑھتی ہے؟"

"یہ تو مجھے معلوم نہیں البتہ ایک نند اُس کی ہے ضرور کالج میں۔"

"اچھا یہ بتاؤ کیا یہ خبر سچ ہے؟" رعنا نے اُسے گہری نگاہوں سے دیکھا۔

"کون سی خبر؟" وہ انجان بن گئی۔

"میاں سے تمہاری ناچاقی؟"

وہ تذبذب میں پڑ گئی۔

رعنا اپنی کرسی اُس کے اور نزدیک کھسکاتے ہوئے بولیں "میں اوروں کے ساتھ سر جوڑ کر باتیں بنانے کے لیے یہ بات نہیں پوچھ رہی ہوں بلکہ جاننا چاہتی ہوں کہ ایسا کیوں ہوا؟"

الفت کے ہونٹوں پر لرزش سی طاری ہو گئی۔

"کس باعث ہوئی تمہارے اور اُن کے درمیان ناچاقی؟"

وہ اپنے بائیں ہاتھ کی انگلیوں کو مجتمع کر کے ناخنوں کو گھورنے لگی۔

"بچے؟ کیا بچے باعثِ نزاع بنے؟"

الفت کے پاس اثبات میں سر ہلانے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔

مگر اُس نے بہت دھیرے سے سر ہلایا۔

"قصہ کیا تھا؟"

الفت کے لبوں کو ہلکی سی جنبش ہوئی پھر اُس نے دھیرے سے کہا "بچے...... نالائق...... اور بدتمیز تھے...... میرے ساتھ بدتمیزی کرتے تھے۔"

"تم نے میاں سے شکایت کی ہو گی؟"

اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"اور انھوں نے بچوں کی حمایت کی ہو گی، انھیں شہ دی ہو گی؟"

اُس نے خاصی حیرانی سے انھیں دیکھا۔

وہ تو دردِ دل خانہ رازوں کی بھیدی معلوم ہوتی تھیں۔

"ہے نا؟" انھوں نے توثیق چاہی۔

"جی..... مگر آپ کو کیسے معلوم؟"

وہ دھیرے سے مسکرائیں پھر بولیں "بھئی اب اتنے تجربہ کار ہو چکے ہیں ہم اس میدان میں کہ بھانپ لیتے ہیں مضمون لفافہ دیکھ کر..... ڈیر! ہم خود بھی تو اسی میدان کے سوار ہیں۔" الفت خاموش رہی۔ انھوں نے پوچھا

"اچھا ایک بات بتاؤ ایمانداری سے..... تمہارے میاں کیسے ہیں تمہارے ساتھ؟"

"ہیں نہیں..... تھے!"

"اچھا چلو تھے ہی سہی۔"

"ٹھیک ٹھاک!"

"محض ٹھیک ٹھاک یا اچھے؟"

"اگر بچوں کی بیچ نہ ہوتی تو بہت اچھے۔"

"تمہاری ضرورتوں کا خیال رکھتے تھے؟"

"بہت زیادہ۔"

"گڈ!" رعنا جمیل نے کہا پھر پوچھا۔

"محبت کرتے تھے تم سے؟"

"ظاہر تو یہی کرتے تھے۔"

"تمہیں شبہ ہوگا کہ وہ تم سے زیادہ بچوں سے محبت کرتے ہیں؟"

"شبہ نہیں یقین تھا مجھے۔"

"کوئی ایسی خامی یا بُرائی جو تمہارے لیے ناقابل برداشت رہی ہو؟"

"نہیں۔"

رعنا جمیل نے ایک گہری سانس کھینچی پھر بولیں۔ "الفت! باغبانی سے کچھ شغف ہے تمہیں؟"

"جی تھوڑا بہت۔" اُس نے اُن کے سوال پر حیرانی سے انھیں دیکھا۔

"کبھی ایک سیزن کے آخری دنوں میں پھولوں سے بھری کیاری میں اگلے سیزن کے بیج پھوٹتے دیکھے ہیں؟"

الفت نے حیران ہو کر انھیں دیکھا۔

بات کیا ہو رہی تھی اور وہ موضوع کیا لے بیٹھی تھیں۔

رعنا اُس کی حیرانی پر ہولے سے مسکراتے ہوئے بولیں "کبھی اس تجربے سے گزر کے دیکھو تو تمہیں یوں محسوس ہوگا جیسے نئی رُت جاتی رتوں کی کوکھ سے ہی جنم لیتی ہے۔ جاتی رُت کے پھولوں سے کیاری میں پھوٹنے والی اگلی رُت کا ننھا سا پودا شروع شروع میں تو جاتی رُت کے پھولوں کے بیچ ہی گم رہتا ہے اور بڑا حقیر اور بے وقعت سا نظر آتا ہے لیکن دھیرے دھیرے یہی ننھا سا پودا اگلی رتوں کا امین بن جاتا ہے اور کیاری کو بھر دیتا ہے۔" انھوں نے چند لمحے توقف کیا پھر بولیں۔ "ڈیر! محبتوں کا بھی یہی حساب ہے۔ پُرانی محبتوں کے بیچ نئی محبت کو تناور ہونے کے لیے کچھ وقت درکار ہوتا ہے..... کچھ انتظار کرنا پڑتا ہے۔ تمہیں بھی انتظار کرنا چاہیے تھا۔"

"اور اگر نئی کونپل کو کیاری میں لگے پُرانے پودے پنپنے کا موقع نہ دیں۔ اُس کا راستہ روک لیں تو؟"

"نئی کونپل اپنا راستہ اُن سے ٹکرا کر نہیں..... اپنے بازوؤں کو پھیلا کر راستہ بنانے اور اپنا چہرہ اٹھا کر اوپر دیکھنے کی کوشش کرے تو کیسے نہیں ملے گا اُسے پنپنے کا راستہ۔ البتہ استقامت اور عزم شرط ہے۔"

الفت لاجواب سی نظر آنے لگی۔

"یہ بتاؤ معاملہ بگڑا کہاں تک ہے؟"

"بس میں امی کے یہاں آگئی۔"

"تمہارے میاں نے سمجھوتے کی کوشش کی؟"

اُس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"اور شاید تم اور تمہارے گھر والے اس آن میں بیٹھے ہوں گے کہ مفاہمت میں پہل کیوں کریں؟"

"مفاہمت کرنی ہی نہیں ہے۔"

"کیا یہ تمہارے گھر والوں کا فیصلہ ہے؟"

"اُن سے زیادہ میرا۔"

"ایسی حماقت کرنا بھی مت۔"

"حماقت! آپ ایک بروقت اور درست اقدام کو حماقت کا نام دے رہی ہیں!"

"ہاں کیونکہ میں ذاتی طور پر اس تجربے سے گزر چکی ہوں..... تب میں نے بھی یہی سمجھا تھا کہ میرا فیصلہ بہت دانشمندانہ ہے۔ مگر بہت جلد مجھ پر حقیقت کھل گئی کہ میں غلط فیصلہ کر رہی ہوں۔" انھوں نے توقف کیا پھر بولیں۔ "اگر سچ پوچھے پر تم نے مجھے یہ بتایا ہوتا کہ تمہارے شوہر تمہارا خیال نہیں رکھتے تھے تمہاری ضرورتوں کو نظر انداز کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ تم سے محبت نہیں کرتے تھے یا یہ کہ ظالم و جابر تھے یا کوئی ایسا عیب تھا جو تمہیں ناگوار گزرتا تھا تمہارے لیے ناقابل برداشت تھا تو میں تم سے کہتی اچھی طرح سوچ سمجھ لو گزارا کرنے کی کوشش کرو اور اگر تم یہ سمجھتی ہو کہ گزارا کسی قیمت پر ممکن نہیں تو ٹھیک ہے علیحدگی اختیار کر لو۔ مگر تم یہ کہتی ہو کہ وہ تمہاری ضرورتوں کا خیال رکھتے تھے تم سے محبت بھی کرتے تھے۔ ان میں کوئی بُرائی دیکھی اور اگر بچوں کی بیچ نہ ہوتی تو وہ بہت اچھے تھے اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ تمہیں میاں سے نہیں اُن کے بچوں سے شکایت ہے..... ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو کہ جس شخص سے تمہیں کوئی شکایت نہیں اُس کو فقط اس لیے چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لینا کہ وہ چار نالائق اور بدتمیز بچوں کا باپ ہے کہاں کا انصاف ہے بلکہ سچ پوچھو تو ایسا شخص تو زیادہ تعاون اور محبت کا حقدار ہے۔ تمہاری تھوڑی سی ریاضت تھوڑا سا صبر و تحمل اُسے ہمیشہ کے لیے تمہارا اسیر کر سکتے ہیں۔ ایک زخم خوردہ مرد کو عورت کی محبت اور اپنائیت اس کا غلام بنا سکتے ہیں۔"

"آپ کے اور میرے حالات مختلف ہیں اس لیے ایک زخم خوردہ مرد کے بارے میں اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر میرا خیال بھی آپ سے مختلف ہے۔"

"بائی دی وے کیا کہتا ہے آپ کا تجربہ؟"

"میرا تجربہ یہ کہتا ہے کہ ایک مرجانے والی عورت کے شوہر کو تو شاید دوسری عورت کی محبت اور اپنائیت اس کا غلام بنا سکتے ہوں مگر چھوڑ کر چلی جانے والی زندہ عورت کے شوہر کا دل پہلی اور دوسری عورت کے درمیان منقسم رہتا ہے۔ وہ پہلی کو بھلا نہیں سکتا۔ اُسے بار بار بہانے بہانے سے یاد کرتا ہے۔ بہانے بہانے سے اس کا نام اپنی زبان پر لاتا رہتا ہے وہ دوسری عورت میں بھی پہلی کو تلاش کرتا ہے۔ دوسری عورت اُس کا اعتبار کر ہی نہیں سکتی۔"

رعنا جمیل سے یہ کہتے ہوئے الفت کے تصور میں جلیس الحسن کی الماری میں رکھا وہ لاکٹ ٹکوسے لہرا رہا تھا جس میں عاصمہ کی تصویر لگی تھی۔

تاہم الفت نے رعنا سے اُس کا تذکرہ کرنے سے گریز کیا۔

"ہو سکتا ہے تم ٹھیک کہتی ہو۔" رعنا بولیں۔

تب ہی گھنٹی بج گئی۔

اور الفت اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"پیریڈ ہے تمہارا؟"

"جی۔"

"ہماری بات ابھی ختم نہیں ہوئی ہے جاری ہے پھر بیٹھیں گے اور بات کریں گے۔" رعنا اٹھتے ہوئے بولیں۔

"جی بہتر۔"

"اس کے بعد کوئی پیریڈ فری ہے تمہارا؟"

"جی ہاں چھٹا۔"

رعنا نے اپنے بیگ کی چھوٹی جیب سے اپنا ٹائم ٹیبل نکال کر دیکھا اور خوش ہوتے ہوئے کہا "اتفاق ہے چھٹا پیریڈ میرا بھی خالی ہے۔ کہاں ملو گی؟" وہ مسکرائیں اور بولیں۔ "یہ سوال تم سے اس لیے کرنا پڑ رہا ہے کہ اسٹاف روم میں اب تم شاذ ہی نظر آتی ہو۔"

"جی ہاں..... کیونکہ لوگوں کی چبھتی ہوئی نگاہوں کا سامنا کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔" الفت نے بیگ شانے پر لٹکایا کاپیوں کا بنڈل جو کاؤنٹر اُٹھایا اور لائبریری کے خارجی دروازے کی سمت پیش قدمی کی۔

رعنا بھی ساتھ ساتھ ہو لیں۔

راہداری سے گزرتے ہوئے کئی لیکچررز سے ٹکراؤ ہوا اور الفت کو ایک ناکردہ احساس جرم نے اُن سے نظریں

چھپانے پر مجبور رکھا۔

رعنا جمیل کی زبانی یہ معلوم ہونے کے بعد کہ مس انجم کے توسط سے اُس کی ان تمام غلط بیانیوں کا پردہ چاک ہو چکا تھا جن سے وہ اپنی ساتھیوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتی رہی تھی اُسے ایک عجیب سی خجالت محسوس ہو رہی تھی۔ رعنا اپنی کلاس کی طرف جانے لگیں تو الفت نے اُن سے کہا "ویسے مجھے ان دنوں آپ کی ایک بات یاد بار یاد آتی ہے۔"

"نہ ہے نصیب! کون سی بات بھئی؟" وہ ٹھٹھک کر تھم گئیں۔

"آپ نے کہا تھا ہماری مشکلات کو دنیا والے اور مشکل بنا دیتے ہیں۔"

"ہاں یہ تو ہے...... مگر میں کہتی ہوں کہ انہیں ایسا موقع دیا ہی کیوں جائے!"

اُلفت نے آگے پیش قدمی کرنے کا ارادہ کیا مگر رعنا کی آواز نے اُسے رک جانے پر مجبور کر دیا۔

"بھئی یہ تو بتاتی جاؤ کہاں بیٹھی ملو گی چھٹے پیریڈ میں؟"

"وہیں لائبریری میں یا پھر آپ کی نرگس لیب میں۔"

"لیب زیادہ بہتر ہے چھٹے پیریڈ میں کوئی پریکٹیکل بھی نہیں ہے وہیں آ جانا۔"

"بہتر۔"

چھٹے پیریڈ میں جب الفت نرگس لیب میں پہنچی تو رعنا کو گرم چائے کے ساتھ اپنا منتظر پایا۔ انہوں نے کچھ وہ ادھر اُدھر کی باتیں کیں پھر اسی موضوع پر آ گئیں جس پر پچھلی نشست برخاست ہوئی تھی۔

"الفت! بتاتے ہیں کیا۔ شادی کے کچھ ہی دنوں بعد میرے بھی اختلافات ہو گئے تھے میاں جی سے۔ میں کہتی تھی کہ اپنے بچوں کو ان کی نانی اور ماموں کے حوالے کر کے وہ بچوں سے اپنی بھی جان چھڑا لیں اور میری بھی۔ بچوں کی نانی اور ماموں تو بہت خواہشمند تھے کہ ایسا ہو جائے کیونکہ انہیں بچوں سے بہت پیار تھا۔ اور یہ بالکل فطری بات تھی۔ ہمارے میاں بچوں کو ہفتے عشرے میں دو ایک روز ان کے پاس رہنے کی اجازت دیے ہوتے تھے مگر انہیں مستقل طور پر ان کے حوالے کر دینے کے حق میں نہ تھے۔ بس اسی بات پر میری اور ان کی ٹھن گئی...... جناب میں اپنے میکے آ گئی اور میں نے شرط رکھی کہ میں میاں کے گھر اُسی وقت واپس جاؤں گی جب میاں صاحب بچوں کو ان کی نانی کے حوالے کر دیں گے۔ ادھر تو وہ تھے ہی اپنی بات پر اڑے ہوئے۔ تقریباً دو مہینے میں گھر بیٹھی رہی۔ گو خود کفیل تھی۔ اپنا کما کھا رہی تھی مگر ان دو مہینوں میں دونوں بھابیوں اور بھاوجوں نے ایسے رنگ بدلے کہ میرے تو چودہ طبق روشن ہو گئے۔ بڑی بھاوج نے دبی زبان سے یہاں آ کے کہہ دیا کہ اگر میاں سے علیحدہ رہنا ہے تو کرائے پر علیحدہ گھر لے کر رہیں ہمارے گھر میں ویسے ہی تنگی ہے۔ چھوٹے بھائی بھاوج نے کہا اگر میاں کا گھر نہیں بسانا تو ہم سے قطع تعلق سمجھو اور انہوں نے مجھ سے بات چیت بند کر کے بہ کر خاوت کو یا اعلان جنگ کر دیا۔ ادھر بہنوئی بہن کو طعنے دے دے کر کھانے لگے کہ لو بسا نہ لیا تمہاری بہن نے گھر وہ تو آزاد رہنا چاہتی ہے۔ عزیز رشتے داروں نے منہ جوڑ جوڑ کر باتیں بنانا شروع کر دیں جس محفل میں جاتی مجھے عجیب نگاہوں سے دیکھا جاتا۔ ادھر مسز رفیع میری اور میرے میاں کے اختلاف کو اسٹاف میں مشتہر کرنے کے درپے ہو گئیں مگر میں نے اُن سے دو ٹوک بات کی کہ دیکھیں اگر میں آپ کی سسرالی عزیز ہوں تو آپ کا بھی مجھ سے ایسا ہی تعلق ہے۔ کچھ کمزوریاں آپ کی بھی میرے ہاتھ آ چکی ہیں۔ اگر آپ نے اسٹاف میں یہ بات پھیلائی اور مجھے تختۂ مشق بنانے کی کوشش کی تو اچھا نہ ہوگا۔ کمزوریاں اُن کی واقعی ہاتھ لگ چکی تھیں میرے...... کیا؟ یہ مت پوچھنا۔ بہرحال اُن کا تو منہ میں نے یوں بند کر دیا مگر اپنے خاندان والوں کے منہ بند نہ کر سکی۔ اپنوں نے جس طرح کا رویہ اختیار کیا وہ میرے چودہ طبق روشن کر دینے کو کافی تھا۔ ادھر دل کا یہ حال کہ جہاں دو میاں بیوی کو ہنستے بولتے ساتھ چلتے، بازاروں میں خرید و فروخت کرتے دیکھتی مجھے میاں کا خیال ستانے لگتا۔ غرض پوچھو مت ان دنوں کیسی...... پاگل ہو چلی تھی میں...... بی حوا کی طرح جنت کی قدر آ رہی تھی اور اپنی غلطی پر بُری طرح پچھتا رہی تھی۔ میرا جی چاہتا تھا گھڑی کی چوتھائی میں اپنی جنت میں واپس چلی جاؤں۔ خدا کا کرنا ایک روز یونہی اپنا جی بہلانے کو بلا مقصد یوں ہی بازار میں گھوم رہی تھی کہ میاں ٹکرا گئے۔ سامنے ہی کولڈ ڈرنک اور چاٹ کی دکان تھی۔ دونوں وہاں جا بیٹھے۔ گلے شکوے ہوئے۔ میاں کا موقف سرِ مو نہ بدلا تھا، بچوں کو وہ اپنے ساتھ ہی رکھنا چاہتے تھے کہنے لگے ان بچوں کی تمہیں ابھی قدر نہیں لیکن جب اُن کا کوئی چھوٹا بہن بھائی آ جائے گا تو دیکھنا کس قدر کام آئیں گے تمہارے۔ خیر جناب یوں ہی بازار سے میں اپنے گھر آ گئی اور میاں سے میکے والوں کو پیغام بھجوا دیا کہ میں اپنی جنت میں واپس پہنچ گئی ہوں۔ سچ کہتی ہوں اپنا گھر اپنی جنت ہوتی ہے۔"

الفت خاصے اشتیاق سے رعنا جمیل کی داستانِ حیات کا یہ باب سنتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ کسی نے سچ کہا ہے۔

ہر شخص ایک چلتی پھرتی کہانی ہے!

"دیکھو اسٹاف میں مسز رفیع کو جو تھوڑی بہت سُن گن ہے سو ہے میں نے تم سے پہلے کسی ساتھی کو نہیں بتایا۔ ہماری پریشانیوں پر ہنسنے والے لوگ زیادہ ہوتے ہیں ہمدردی اور خلوص کا اظہار کرنے والے خال خال۔ تمہیں پتا نہیں تمہارے بارے میں اسٹاف ممبرز سر جوڑ جوڑ کر کیسی کیسی باتیں بناتی ہیں۔ مجھے تو خیر افسوس ہوتا ہے۔ اور اسی لیے میرا مشورہ تو تمہارے لیے یہی ہے کہ اگر اپنی جان پر تھوڑی سی سختی برداشت کر کے بھی گزارا ہو سکتا ہے تو کرو...... ڈیئر! اپنا گھر ہی جنت ہوتی ہے...... اپنی جنت میں تو جب سے دیکھا آیا ہے مجھے اپنی جنت کی خوبصورتی ہی دوبالا لگنے لگی ہے۔ میاں کا کہنا بھی سچ ہوا کہ دونوں بچے بھائی پر اپنی جان چھڑکتے ہیں کہ مجھے تو گود میں لینے کا موقع ہی کم ملتا ہے۔ صبح سے دوپہر تک میں یہاں ہوتی ہوں وہ پڑوسن کے ہاں رہتا ہے۔ وہ میرے بچے کے معاملے میں تعاون کرتی ہیں میں اُن کے بچوں کو پڑھاتی ہوں۔ دوپہر کو جب میں گھر پہنچتی ہوں تو دونوں بھائی بہن اسکول سے آ کر چھوٹے والے کو پڑوسن کے ہاں سے لا چکے ہوتے ہیں۔ رات تک سنبھالے سنبھالے پھرتے ہیں۔ مجھے تو دیتے ہی نہیں۔"

تصور کی کرشمہ سازیاں الفت کو نبیل، اعجاز، فرزانہ اور زرینہ کو بھی ایک ننھے منے سے بچے کو اپنی گود میں لینے پر لڑتے جھگڑتے دکھانے لگیں۔

اس رات جب الفت نے بستر پر لیٹنے کے بعد رعنا جمیل کی داستان والا بٹن دبایا تو وہ ایک عجیب تجربے سے دوچار ہوئی۔

اپنوں کی باتوں پر ملول نظر آنے والا چہرہ رعنا کا نہیں اُس کا اپنا تھا!

اپنوں کی بے اتفاقی اور بے رُخی کا صدمہ سہتا دل رعنا کا نہیں اُس کا اپنا تھا!

گلیوں، چوباروں اور پُرہجوم بازاروں میں ہنستے مسکراتے، بولتے چالتے "خوش باش جوڑوں کو دیکھ کر دکھی ہو جانے والی عورت رعنا جمیل نہیں وہ خود تھی۔

اور

یہ فقط واہمہ نہ تھا

حقیقت تھی کہ وہ بھی رعنا جمیل کی طرح ان دنوں یہ کٹھنائیاں جھیل رہی تھی۔

پھر

اُسے یوں لگا جیسے وہ بوہری بازار میں کھڑی گھائل ہرنی کی طرح چہار اطراف تاک رہی ہو۔

جلیس الحسن کو جانے کس اور سے آنا تھا!!

تہنیت کی شادی امی اور بابا کے بچوں میں سب سے آخری تھی اس لیے مدعوئین کی فہرست بناتے ہوئے اس امر کا پورا خیال رکھنے کی کوشش کی گئی تھی کہ اپنے پرایوں میں کوئی ایسا نہ ہو جو مدعو کیے جانے سے رہ جائے اور بعد میں گلے شکوے سننے کو ملیں۔

فہرست کی تیاری کا کام الفت کے سپرد ہوا تھا۔

بابا نے کہا "بیٹی! پہلے تو خاندان کے تمام گھرانوں کی فہرست تیار کر لو۔ پھر خاندانی دوستوں، آس پڑوس اور ملنے جلنے والوں کا اندراج فہرست میں کر لو۔ اس کے بعد جملہ اہلِ خانہ سے فرداً فرداً اُن کے ذاتی دوستوں کا پوچھ کر لکھو کہ کس کس کو مدعو کرنا چاہتے ہیں۔"

"سمدھیانوں کو بھول گئے؟" امی نے لقمہ دیا۔
"تمہیں جو یاد تھا۔" بابا مسکرائے۔
الفت بھی مسکرائے بنا نہ رہ سکی۔
رجسٹر اور قلم سنبھال کر بیٹھی۔ اور فہرست کی تیاری کا جس قدر کام اسی وقت نمٹایا جا سکتا تھا امی اور بابا کے نزدیک بیٹھ کر نمٹا ڈالا۔

دو سو تیرہ گھرانوں کی فہرست بنی۔
امی نے کہا "مہمانوں کی اوسط تعداد فی گھرانہ پانچ افراد بھی رکھیے تو ہزار سے زیادہ نہیں ہوں گے۔"
"جبکہ ابھی بچوں کے دوست احباب کی جانب تو توجہ کی ہی نہیں ہے۔" بابا بولے۔
"بابا کچھ کم کر دیں اس فہرست میں سے۔" الفت نے کہا۔
"نہیں۔" امی بولیں۔ "آخری بچی کی شادی ہے کوئی رہنا نہیں چاہیے۔"
"ارے فکر کیوں کرتی ہو چند برس گزر جائیں گے پھر بچوں کے بچوں کی شادیاں شروع ہو جائیں گی۔"
"میاں صاحب! پھر تو جیسے کا سوگ۔ بڑی بیبی گا۔" امی جذباتی ہو گئیں اور بولیں۔ "خیر سے تہنیت بھی گھربار کی ہو جائے گی۔"
"میں یہی دعا کیا کرتا تھا اپنے رب سے کہ مجھے میرے فرائض سے جو کہ تو نے مجھ پر عائد کیے ہیں بحسن وخوبی عہدہ برآ فرما۔ بہت شکر ہے اس رب العزت کا کہ تہنیت کی شادی کے ساتھ ہی ہم دونوں اپنے بچوں کی ذمے داریوں سے فراغت پا لیں گے۔"
"محسوس کر رہی تھیں آیا دل چھوٹا مت کرنا تمہاری تہنیت کو تو میں پھولوں پر رکھوں گی۔"
"ان شاء اللہ وہ سکھی رہے گی۔ سہیل اچھا لڑکا ہے۔"
"اللہ رکھے عظمت اور فضیلت بھی خوش ہیں اپنے اپنے گھروں میں..... بہو بھی خدا نے بہتوں سے بھلی دی ہے ہمیں....."
بس ایک الفت کی طرف سے دل کو دھڑکا ہے۔" آخری جملے پر امی کی آواز قدرے بوجھل ہو گئی۔
"نیک بخت! خدا نے چاہا تو یہ صدمہ بھی نہیں سہنے گا۔ اٹھائیس برس سرکاری کرسی پر ہزاروں لوگوں سے نمٹا ہوں..... ذمے داری ایسی تھی کہ نوع بنوع افراد سے واسطہ پڑا کرتا تھا۔ ملازمت نے جہاں عزت، فراغت اور چند اچھے اور ہمدرد دوست دیے وہاں مردم شناسی بھی سکھائی۔ میرا تجربہ تو یہی گواہی دیتا ہے کہ جلیس الحسن دوسروں کو تکلیف پہنچا کر خوش ہونے والوں میں سے نہیں بلکہ اگر سچ پوچھو تو جلیس مجھے عظمت اور فضیلت کے شوہروں سے زیادہ سمجھدار اور نفیس مزاج محسوس ہوتے ہیں مجھے تو اگر تم نے اور الفت بیٹی نے سختی سے منع نہ کر رکھا ہوتا تو میں اول روز ہی ان سے بات کرنے پہنچ جاتا اور میرا دل کہتا ہے کہ وہ سعادت مندی دکھاتے۔"
"کبھی میرا تو خیال تھا کہ وہ خود آئیں گے بلکہ ضرور آئیں گے۔" امی بولیں۔
"خیال تمہارا بھی برا نہیں تھا لیکن خود میرا چلا جانا بھی برا نہیں تھا۔ ارے بھئی اچھے بچوں کے مسائل ہم بڑے نہیں سلجھائیں گے تو کیا امریکا سے چچا سام آئیں گے ان کے مسائل سلجھانے کو؟"
امی نے ایک ٹھنڈی سانس کھینچی جو ان کے باطنی دکھ کی غماز تھی۔

ان کے دکھ کی ذمے دار ہونے کا احساس ان کے نزدیک بیٹھی الفت کے دل کو اپنی مٹھی میں دبوچنے لگا۔
"بہرحال اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے جلیس میاں اب بھی ہمارے ہیں۔ میں تو انھیں تاریخ ٹھہرائی کے موقع پر بھی بلانا چاہتا تھا مگر تم اور تہنیت اور الفت بیٹی کی بھی مرضی نہ پائی میں نے۔ بہرحال اب میں تمہارے منع کرنے سے بھی نہیں رکوں گا۔"
"بابا! اب بقیہ فہرست؟" الفت نے ایک دم سے موضوع بدل دیا۔
"اب یہ ہے بیٹی کہ اپنے بھتیجا، بھابی، بہنوں اور خود تہنیت سے بھی پوچھ لینا کہ وہ کس کس کو مدعو کرنا چاہتے ہیں ان کا اندراج بھی کر لینا۔ تم اپنے احباب کو بلانا چاہو ان کا بھی۔ اور ہاں....." بابا نے معنی خیز خوشگوار مسکراہٹ کے ساتھ کہا "اپنی امی سے بھی پوچھ لینا کہ وہ اپنی کن کن سہیلیوں کو مدعو کرنا چاہتی ہیں مگر برائے خدا وہ جو ان کی سہیلی ہیں نا للتن کی اماں ان کو شامل نہ کرنا اس فہرست میں کہ وہ تو جا بے جا بیکے کی پچکاریاں مار کر بام و در تجریدی آرٹ کے نمونوں سے سجا جاتی ہیں۔"
"انھیں تو میں سب سے پہلے دعوت نامہ بھجواؤں گی۔" امی تنک کر بولیں۔
"بیٹی، دعوت ناموں پر نام تو تم ہی لکھو گی نا؟"
"جیسے آپ حکم کریں گے۔"
"بس تو للتن کی اماں کے کارڈ پر ج۔ س۔ م۔ ف۔ قلم زد کر کے تم جلی حروف میں اس کی جگہ ا۔ ل۔ م۔ ب لکھ دینا۔"

"یہ کیا ہے کا مخفف ہے بابا؟" الفت کے دل پر چند لمحوں پہلے چھائی یاسیت نے ایک خوشگوار مسکراہٹ کے حق میں پتہ سمیٹ لیے تھے۔
"اگالدان لانا مت بھولیے۔"
الفت بے اختیار کھلکھلا کر ہنس دی۔
"اچھا!" امی چڑ گئیں۔ "اور وہ جو آپ کے دوست آتے ہیں مرزا عبدالرحمٰن اسٹرق جن کے لیے بطور خاص حقہ منگوا کے رکھا گیا ہے اور جن کے آتے ہی دہائی مچتی ہے کہ ذرا چلم تو بھر دینا۔ ان کے کارڈ اور لفافے پر تو میں بڑا بڑا لکھواؤں گی..... مرزا عبدالرحمٰن چلمی سے"
بابا نے اتنا زوردار قہقہہ لگایا کہ تہنیت لپکی چلی آئی۔
"خیریت تو ہے بابا؟"
"بیٹی ذرا تمہاری امی کو چھیڑ رہا تھا۔"
"چھیڑ چھاڑ کی عادت اس عمر میں بھی گئی تھوڑی ہے۔" امی نے تیکھی نظروں سے بابا کو دیکھا۔
"نیک بخت خوش رہ کر گزاری اسی لیے تو زندگی سکون سے گزر گئی اور ہم دونوں آج تک ایک دوسرے کے رفیق و دمساز بنے بیٹھے ہیں ورنہ خدا جانے تم کہاں ہوتیں میں کہاں ہوتا؟"
"ایں! کہاں ہوتے آپ؟ آج کھلے ہیں ایک عمر کے بعد!" امی بولیں۔
"دیکھا بچیو اپنی ماں کو؟ عورت ہونے کا ثبوت دے رہی ہیں۔" بابا نے الفت اور تہنیت کی جانب دیکھتے ہوئے کہا پھر روئے سخن امی کی طرف کر کے بولے۔ "سبحان اللہ! میں جہاں بھی ہوتا جب سر اٹھا کر دیکھتا آپ ہی کو سر پہ کھڑا پاتا۔"
"اچھا اب آپ یہ بتائیں کہ دعوت نامے کب چھپنے کو دے رہے ہیں؟"
"بس ذرا فہرست مکمل ہو جائے تاکہ اندازہ ہو جائے کہ کتنے دعوت نامے چھپوانے ہوں گے۔"
"اے ہے! کب فہرست مکمل ہوگی؟ کب دعوت نامے تقسیم ہوں گے؟ دن ہی کتنے رہ گئے ہیں اب؟ کیا لوگوں کو عین وقت پہ بلاوہ دینے کا ارادہ ہے؟" امی باقاعدہ پریشان نظر آنے لگیں۔
تہنیت شرما کر کمرے سے نکل گئی۔
"تم اطمینان رکھو اور اپنے بلڈ پریشر کو بڑھنے مت دو۔" بابا نے امی کو اطمینان دلانے کی کوشش کی۔ پھر الفت کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولے۔ "بیٹی، عظمت اور فضیلت آج کل میں چکر نہ لگائیں تو تم خود انھیں فون کر کے پوچھ لینا کہ وہ کس کس کو بلانا چاہتی ہیں۔ اپنے بھائی بھاوج سے تو تم آج ہی پوچھ سکتی ہو۔ ہاں تہنیت سے بھی اور اپنی امی سے بھی۔"
امی نے بابا کو گھورا تو وہ مسکرا دیے۔
"اور بابا آپ سے بھی تو پوچھوں گی کہ آپ کس کس کو بلانا چاہتے ہیں؟" الفت نے رجسٹر سنبھالتے اور اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے جانے کا قصد کیا۔
"بھئی ہمارے عمومی مہمان تو اسی فہرست میں شامل ہو چکے جو تم بنا چکی ہو۔ رہے عبدالرحمٰن چلمی تو انھیں کارڈ تمہاری امی بھجوائیں گی۔ البتہ ایک خصوصی مہمان ہیں ہمارے ان کا نام تم ابھی نوٹ کرتے جاؤ۔"
الفت نے کھڑے کھڑے رجسٹر کھولا قلم سنبھالا اور بولی۔ "جی بتائیے۔"
"میاں جلیس الحسن مع اہل خانہ!"
الفت نے چونک کر بابا کی طرف دیکھا۔
امی بھی ان کی طرف دیکھنے لگیں۔
"لکھو بیٹی۔" بابا نے بصد شفقت کہا۔
اس نے دزدیدہ نگاہوں سے امی کو دیکھا۔
"جب یہ چاہتے ہیں تو لکھ لو بیٹی۔"
اور الفت یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ کیا عظمت آپا اور فضیلت نے امی کو ان کے حق میں لچک پیدا کرنے پر مجبور کر دیا تھا؟
یا
خود اس کی طرح وہ بھی ہارنے لگی تھیں۔

بہت خاموشی سے اُس نے فہرست میں جلیس الحسن کا نام بھی شامل کر لیا۔

***

دعوت ناموں کی تقسیم کا مرحلہ آیا تو اس میں بھی جس سے جتنا بن پڑا اتنا اُس نے حصہ لیا۔

جلیس الحسن کو دعوت نامہ پہنچانے کا مرحلہ آیا تو بابا نے کہا "انہیں میں خود پہنچا آؤں گا کارڈ۔"

مگر الفت کو بابا کے جانے میں سبکی محسوس ہوئی

اُس کے خیال میں بابا کی ایک ارفع حیثیت تھی، مقام تھا۔ ان کی اس حیثیت اور مقام کا تقاضا تھا کہ وہ سر نگوں نہ کرتے۔

ان کا یوں گر پڑ کر جلیس الحسن کے ہاں جانا مناسب نہ تھا۔

سو اُس نے فقط امی کی موجودگی میں بابا سے کہا "بابا! آپ کارڈ ضرور بھجوا دیں وہاں مگر خود نہ جائیں۔"

"بیٹی کارڈ کوئی نہ کوئی تو دے کر جائے گا ہی۔"

"کسی سے بھی بھجوا دیں مگر آپ نہ جائیں۔"

"بیٹے جانے میں کیا حرج ہے؟"

"کیوں نہیں... یہ تاثر دیا جائے کہ ہم ہار گئے ہیں!"

"میں سب سمجھتا ہوں بیٹی... سوال ہار جیت کا نہیں بلکہ مسئلہ تمہاری انا کا ہے۔"

"آپ یہی سمجھ لیں۔"

"بحث کا ہے کی..... الفت آپ سے زیادہ بہتر سمجھ سکتی ہے اس معاملے کو۔" امی نے الفت کی توقع کے عین مطابق اس کی حمایت کرتے ہوئے کہا۔ "اگر وہ چاہتی ہے کہ آپ نہ جائیں بلکہ کوئی اور کارڈ لے کر جائے تو ٹھیک ہے کسی اور سے بھجوا دیں۔"

"مثلاً کس سے؟" بابا نے سوالیہ نگاہوں سے امی کی طرف دیکھا۔

اور امی الفت کی طرف دیکھنے لگیں۔

"کسی سے بھی بھجوا دیں۔" وہ دھیرے سے بولیں۔

"بھائی چلے جائیں تمہارے؟" امی نے اجازت طلب لہجے میں پوچھا۔

"بابا کے علاوہ کوئی بھی چلا جائے۔" وہ مشروط انداز میں بولی۔

"تو ٹھیک ہے تمہارے امی کو بھیجے دیتے ہیں۔"

"میں تو ایسی خبر لوں گی جلیس اور اُن کے بچوں کی کہ یاد رکھیں گے۔" امی تڑخ کر بولیں۔

"نہیں خاتون آپ تو رہنے ہی دیں۔" بابا نے ہاتھ جوڑ دیے۔ "میں تو مذاقاً آپ کو بھیجنے کی بات کر رہا تھا۔"

"ارے جب وہ کہہ رہی ہے کہ بھیا سے بھجوا دیں تو کسی سے بھجوا دیں نا۔"

"بیٹی! تمہارے بھائی گئے یا میں بات تو ایک ہی ہے۔"

"ایک نہیں ہے بابا..... بہت فرق ہے۔"

"اچھی بات ہے تو پھر تمہارے بھیا سے بھجوائے دیتے ہیں انھیں دعوت نامہ۔" بالآخر بابا نے ہتھیار ڈال دیے۔

"دلہن بھی ساتھ چلی جائیں گی۔" امی نے کہا۔

"کیوں بیٹی بھائی چلی جائیں؟ اُن کے لیے تو اجازت ہے؟"

"جی!"

"یعنی بات کی وضاحت ہو رہی ہے؟" بابا نے مسکرا کر کہا۔

"وضاحتاً او رکیا خیال تھا بابا!"

"وضاحت کر دو گی ابھی اس بات کی؟" بابا نے گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولے۔

"آپ وہاں خوش فہمی میں مبتلا نہ ہوں کہ ہم جھک گئے ہیں!"

بابا نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔

"اچھا! تو کیا تم سمجھتی ہو کہ فقط رسم دنیا نبھانے کو بلاوا دیا جا رہا ہے انھیں؟"

"اور نہیں تو کیا۔" وہ دھیرے سے بولی۔ "اگر عظمت آپا اور فضیلت کے شوہروں اور سسرالیوں کا خیال نہ ہوتا تو میں کبھی ہرگز نہ بلاتے انھیں۔"

حالانکہ وہ غلط کہہ رہی تھی۔

بجا کہ عظمت آپا اور فضیلت کے شوہروں کے اطمینان اور سسرالیوں کا خیال بھی دامن گیر تھا۔

مگر یہ بھی سچ تھا کہ

رعنا جمیل کی باتوں نے اُس کے دل میں اپنی گم گشتہ جنت میں لوٹ جانے کے خیال کو انتہائی تحریک دے رکھی تھی۔

اب یہ اور بات تھی کہ

وہ سر جھکا کر نہیں سر بلند کر کے واپس لوٹنے کی خواہاں تھی۔

اور اپنی انا کو گھائل نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔

جب وہ امی اور بابا کے پاس سے جا چکی تو امی نے بابا سے بڑی رازداری سے کہا "لگتا ہے الفت کی اپنے گھر جانے کی نیت ہو رہی ہے۔"

"ہاں..... مگر کچھ الجھی ہوئی ہے۔ جانا تو چاہتی ہے مگر جلیس کو اپنے جھک جانے کا تاثر دیے بغیر۔" بابا بولے۔

امی نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ "پہلے تو میں نہیں چاہتی تھی مگر اب چاہتی ہوں کہ الفت اپنے گھر چلی جائے۔ اپنا پرایا جو ہے فوراً میکے کا ہی زخم ہرا نکلی دھرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ادھر عظمت اور فضیلت پریشان ہیں۔"

"اگر تم نے اس وقت مجھے جلیس الحسن کے پاس جانے دیا ہوتا تو مشکلات اتنی نہ بڑھتیں۔"

"اے تب مجھے کیا پتا تھا کہ دنیا والے یوں طعنے بند کر دیں گے۔"

"بیٹیوں کے معاملات میں اُن کے میکے والوں بالخصوص والدین کو بہت احتیاط اور سمجھداری سے کام لینا چاہیے......

ارے بھئی میاں بیوی میں اونچ نیچ، گرمی سردی ہوتی ہی رہتی ہے۔ ہمارے ہاں اکثر والدین یہ غلطی کرتے ہیں کہ بیٹی سسرال سے روٹھ کر میکے آئی تو اُس سے زیادہ خود خفا ہو جاتے ہیں اُس کے میاں اور سسرالیوں سے اور اُن کی یہ جذباتیت اکثر بیٹی کا گھر بگاڑ دیتی ہے۔"

امی گہری سوچ میں غلطاں ہو گئیں۔

"کیا سوچ رہی ہو بیوی؟"

"سوچ رہی ہوں فرض کیجیے الفت اپنے گھر چلی گئی......"

"فرض کیوں کیجیے۔ ارے بھئی اُس کو لامحالہ اپنے گھر جانا ہے۔" بابا نے اُن کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "بیٹیاں اپنے گھروں میں ہی اچھی لگتی ہیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر جلیس خدا جانے کیا سلوک کریں گے اُس کے ساتھ!"

"انشاء اللہ اچھا ہی کریں گے۔"

"اور اگر نہ کیا تو؟"

"تو ہم مر تو نہیں گئے۔ والدین کا اگر یہ فرض ہے کہ وہ بیٹیوں کے گھر بسائے رکھنے کی کوشش کریں تو یہ بھی ہے کہ اگر خدانخواستہ وہ دُکھ میں ہیں یا شوہر اُن پر ظلم و زیادتی کر رہا ہے تو اُس کا گریبان پکڑ لینے میں تامل نہ کریں اور بیٹی کو ہر ممکن سہارا دیں..... دیکھیے تم دل چھوٹا مت کرو انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اور آئندہ بھی ٹھیک ہی رہے گا۔"

"آپ کے منہ میں گھی شکر۔"

بابا مسکرا دیے۔

***

چنانچہ جلیس الحسن کو تہنیت کی شادی کا دعوت نامہ پہنچانے کی ذمے داری بھیا اور بھابی کو تفویض کی گئی۔

جلیس الحسن کی مصروفیت کے پیش نظر بابا نے بھیا کو مشورہ دیا کہ وہ ہفتہ وار تعطیل کی صبح نو دس بجے کے آس پاس وہاں پہنچ جائیں تاکہ اُن کا ملنا یقینی بھی ہو اور وہ قدرے فراغت میں بھی ہیں۔

بابا کے مشورے کے بموجب جمعہ کی صبح پونے دس بجے کے آس پاس جب بھیا اور بھابی "حسن لاج" پہنچے تو جلیس الحسن بچوں کے ساتھ سبزہ زار پر بیٹھے دھوپ تاپ رہے تھے۔

گھر آنے والے مہمانوں کا انھوں نے یوں تپاک سے استقبال کیا جیسے اُن سے کوئی رنجش ہی نہ تھی اور سچ تو یہ تھا سوائے الفت کے اُن کی اور کسی سے رنجش تو تھی بھی نہیں۔

اور الفت سے بھی رنجش کیا بس اختلاف تھا سو تھا۔

وہ انھیں اپنی شریکِ سفر اور دمساز کے طور پر اکثر یاد آتی تھی۔ جلوت اور تنہائی میں اس یاد کا رنگ اور گہرا

پڑ جاتا تھا۔

مگر اس کے وجود کو انھوں نے اپنی کمزوری نہ بننے دیا تھا۔

وہ ان مردوں میں سے نہیں تھے جو عورت کو اپنی کمزوری بنا لیتے ہیں۔

یہ بھی نہیں کہ الفت کے لیے انھوں نے اپنے گھر کے دروازے بند کر دیے ہوں۔

مگر یہ طے کیے بیٹھے تھے کہ الفت کی واپسی اگر ہو گی تو اُن کی اپنی شرائط پر نہ کہ الفت یا اُس کے متعلقین کی شرائط پر۔

الفت کے میکے جانے کے بعد اُدھر سے جو سن گن نہ تھی اس خاموشی کے باعث انھیں یقین تھا کہ الفت خود نہ سہی اُس کے متعلقین میں سے کوئی نہ کوئی رجوع ضرور کرے گا۔

چنانچہ بھیا اور بھابی کو دیکھ کر انھیں پہلا گمان یہی گزرا کہ وہ سمجھوتے اور مصالحت کی بات کرنے کے لیے اُن کے پاس آئے تھے۔

بچے جو اُن کے ساتھ ہی سبزہ زار پر موجود تھے اپنی سوتیلی ماں کے دو قریبی متعلقین کو دیکھ کر کچھ پریشان اور ناخوش سے نظر آنے لگے۔

ناخوش اس لیے کہ سوتیلی ماں اور اُس کے حمایتی متعلقین انھیں بُرے لگتے تھے۔

پریشان اس لیے کہ اُن کی فہم و سمجھ نے اُن کے کان میں سرگوشی کی کہ کہیں اُن کا آنا اُن کی سوتیلی ماں کے دوبارہ گھر آنے کا پیش خیمہ تو نہ تھا۔

وہ اُس کی واپسی کو کسی صورت بھی برداشت کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔

اُس کے جانے کے بعد وہ باپ کو ہر ممکن طریقے سے خوش اور مطمئن رکھنے کی مشترکہ کوششیں ہی اس لیے کر رہے تھے کہ سوتیلی ماں کی واپسی کے راستے پر پہرے بٹھا لیے جائیں۔

وہ چاہتے تھے کہ اُن کا باپ اپنی کتابِ زندگی سے اس عورت کا نام ہمیشہ کے لیے مٹا دے۔

ایسی صورت میں انھیں اپنی سوتیلی ماں کے بھائی اور بھاوج کا آنا بھلا کیونکر گوارا ہوتا!

رسمی علیک سلیک کے دوران جلیس الحسن نے دزدیدہ نگاہوں سے چاروں بچوں کے تاثرات بھانپنے کی کوشش کی۔

گو بھیا اور بھابی نے بہت اپنائیت اور محبت سے ان چاروں کا حال چال پوچھا مگر جلیس الحسن نے دیکھا کہ اُن کی اپنائیت اور محبت کے جواب میں ان چاروں ہی نے انتہائی سرد مہری اور روکھائی کا مظاہرہ کیا۔

چنانچہ بچوں کو وہیں دھوپ تاپتے چھوڑ کر جلیس الحسن مہمانوں کو اپنے انتہائی آراستہ و پیراستہ ڈرائنگ روم میں لے آئے۔

الفت بہت ہی بے وقوف تھی: بھابی نے بیش قیمت فرنیچر اور آرائشی اشیاء سے سجے وسیع و عریض ڈرائنگ روم کو بہ نظرِ رشک دیکھتے ہوئے سوچا۔

"آپ لوگ چائے پینا پسند کریں گے یا کافی؟" جلیس الحسن نے پوچھا۔

"کچھ نہیں جلیس بھائی ابھی ناشتا کر کے ہی نکلے ہیں ہم لوگ۔"

"ایک کپ اور سہی۔"

"سچ! کچھ نہیں..... ویسے بھی ہم لوگ آپ کا زیادہ وقت نہیں لیں گے کیونکہ تھوڑی سی عجلت میں ہم خود بھی ہیں۔"

"خیریت؟"

بھیا نے بھابی کی جانب توجہ کی۔

بھابی نے اپنے بیگ میں سے جلیس الحسن کے نام کا دعوت نامہ نکال کر میاں کی جانب بڑھا دیا — بھیا نے مخملیں لفافہ دعوت نامہ اُن سے لے کر جلیس الحسن کو پیش کرتے ہوئے بولے "یہ تہنیت کی شادی کا دعوت نامہ ہے۔"

"شکریہ۔"

انھوں نے دعوت نامہ لے کر لفافے پر درج تحریر پر ایک نظر ڈالی۔

"جناب جلیس الحسن صاحب مع عیال۔"

وہ دھیرے سے مسکرائے۔

"آپ کو اعتراض ہے؟" بھابی نے کہا۔

"مع عیال..... ؟" وہ معنی خیز لہجے میں بولے۔

"جی بالکل۔" بھابی نے جواب دیا۔

"آپ یہ جانتے ہوئے بھی کہ بچے ہی میرے اور آپ کی....." وہ کہتے کہتے رک گئے پھر بولے "معاف کیجیے گا رشتوں کے سلسلے میں میری معلومات خاصی ناقص ہیں۔ الفت کیا ہوئیں آپ کی؟"

"نند۔" بھابی نے مسکرا کر بتایا۔

"ہاں نند کے درمیان باعثِ نزاع قرار پائے ان بچوں کو الفت کی ہمشیرہ کی شادی میں اتنے کھلے دل سے اجازت دے رہی ہیں آپ!"

"جلیس بھائی اب خاک ڈالیے اس جھگڑے پر۔"

"آپ کی نند کیا کہتی ہیں؟ کیا وہ ابھی تک میرے بچوں سے نفرت کرنے کے موقف پر قائم ہیں؟"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔"

"مطلب یہ کہ وہ علی الاعلان کہہ کر گئی تھیں کہ انھیں میرے بچوں سے نفرت ہے اور وہ اُن پر تھوکتی ہیں۔"

"کیا! الفت نے ایسا کہا؟"

"یہی نہیں اور بھی بہت کچھ۔"

"حیرت ہے! حالانکہ الفت تو ہمارے اِن چاروں بہنوں میں سب سے زیادہ سمجھدار خیال کی جاتی ہے۔" بھابی بولیں۔

"جلیس صاحب!" بھیا نے بات ختم کرنے والے انداز میں ہاتھ اُٹھاتے ہوئے کہا "یہ ساری باتیں آپ بہ سہولت الفت کی موجودگی میں بابا اور امی وغیرہ کے سامنے پیش کیجیے گا۔ فی الحال ہمیں تو آپ اجازت دیجیے کیونکہ کئی اور جگہوں پر بھی جانا ہے۔"

"جی بہتر۔"

"مگر دیکھیے آپ کی شرکت لازم ہے۔" بھیا نے جتایا۔

"بالکل۔" بھابی نے تائید کی اور توضیح بھی "مایوں، مہندی، شادی، ولیمہ سب میں۔"

"کوشش کروں گا۔"

"ایں! یہ تو آپ ٹالنے والی بات کر رہے ہیں۔" بھیا نے بڑی اپنائیت سے اُن کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "بھائی! آپ فیملی ممبر ہیں آپ کی شرکت بہت ضروری ہے۔"

"او کے۔ آئی ول ٹرائی مائی بیسٹ۔"

"آپ نہ آئے تو بابا کو بہت مایوسی ہو گی۔"

"انھیں میرا سلام پہنچا دیجیے گا۔"

"خود آ کے کیجیے گا سلام۔"

گو الفت کے حوالے سے جلیس الحسن رشتے میں بھیا اور بھابی کے چھوٹے ہوتے تھے مگر خدا جانے یہ اُن کی قبل از وقت کھچڑی ہو جانے والی قلموں کا لحاظ تھا یا اُن کی امارت اور فراغت کا رعب کہ بھیا اور بھابی بلکہ عظمت آپا اور اُن کے میاں بھی اُن سے آپ جناب اور جلیس بھائی، جلیس صاحب کہہ کر مخاطب ہوتے تھے۔

"مجھے افسوس ہے کہ آپ لوگوں نے چائے کافی کچھ نہیں پی۔" جلیس الحسن انھیں اٹھنے کا قصد کرتے دیکھ کر بولے۔

"پھر سہی..... کوئی غیر گھر تو ہے نہیں اپنا ہے۔" بھابی نے کہا مگر جی ہی جی میں بولیں: "کاش الفت نے اپنا سمجھا ہوتا!"

پھر وہ دونوں اٹھ کھڑے ہوئے اور انھوں نے شادی میں اُن کی شرکت پر اصرار کرتے ہوئے اُن سے اجازت چاہی۔

جلیس الحسن انھیں رخصت کرنے باہر تک گئے۔

اور

اُن کا مہمانوں کے ساتھ یہ پُرتپاک رویہ دیکھ کر سبزہ زار پر بیٹھے چاروں بچے ناپسندیدگی اور نفرت کے اظہار کے لیے ناک منہ چڑھانے لگے۔

"پھر آ گئے یہ گندے لوگ!" زرین دونوں ہاتھ سینے پر باندھتے ہوئے بڑبڑائی۔

"نجی باجی! کیوں آئے ہیں یہ لوگ؟" فراز نے پوچھا۔

"مجھے کیا معلوم!"

"نگی ابھی تو کچھ گڑبڑ لگتی ہے۔" اعجاز کن انکھیوں سے انھیں اُن کی گاڑی کی طرف پیش قدمی کرتے دیکھ کر آہستہ سے بولا۔

"ہاں لگتی تو ہے۔" نگین نے تائید کی۔ وہ خاصی متفکر نظر آنے لگی تھی۔

"یار نگی! وہ بلا کہیں سچ مچ دوبارہ آہی نہ جائے۔" اعجاز اپنی کرسی نگین کے قریب کرتے ہوئے منمنایا۔

"وہ آئے تو ہی اُسے بُری طرح بھگا دینا ہے۔ اس دفعہ ہم میں سے کوئی بھی لحاظ نہیں کرے گا۔" نگین نے دانت پیستے ہوئے کہا پھر وہ مٹھیاں بھینچ کر کرسی کے ہتھوں کو ہیجانی کیفیت میں ٹھونکتے ہوئے بولی "کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ ہمارے گھر میں آکر ہمیں اور ہمارے بہن بھائیوں کو تنگ کرے۔"

اعجاز نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

اور وہ استفہامیہ نظروں سے اُسے دیکھتی رہ گئی۔

"مسٹر! خواہ مخواہ ہاتھ مت توڑو پہلے یہ دیکھ تو لو کہ قصہ کیا ہے۔ بابا ان خبیثوں کو رخصت کر کے آئیں تو پھر معلوم ہو کہ قصہ کیا ہے؟"

"اور اگر بابا جی نے کہا بچوں جی آپ کی وہ بدصورت حاجی واپس آرہی ہیں تو؟" فراز نے چونچ کھولی۔

نگین اور اعجاز مسکرا دیے۔

"تو تم اُن کا کارٹون بنانا اور ہم سب پروٹسٹ کریں گے۔" اعجاز نے کہا۔

"کیسے پروٹسٹ کریں گے آپ؟" فراز نے پوچھا۔

"یار! وقت آنے دو پھر بتائیں گے۔"

جلیس الحسن مہمانوں کو رخصت کر کے واپس آئے تو نگین نے محتاط لہجے میں پوچھا۔

"پاپا کیوں آئے تھے یہ لوگ؟"

"بیٹے جی! ان کی سب سے چھوٹی بہن کی شادی ہے اُس کا بلاوا دینے آئے تھے۔"

"انویٹیشن پاپا؟" زرین نے اپنی بانہیں اُن کے گلے میں حمائل کرتے ہوئے پوچھا۔

"جی بیٹا!" وہ اُس کا بازو تھپتھپاتے ہوئے بولے۔

"آپ جائیں گے پاپا؟" نگین نے پوچھا۔

"ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا بیٹا۔"

ان چاروں کی نگاہیں ایک دوسرے کی جانب اٹھیں اور باہم نگاہوں میں سرگوشی کرتی گزر گئیں کہ کچھ نہ کچھ گڑبڑ ہونے جا رہی ہے!

جلیس الحسن اُن کی نگاہوں سے ٹپکتی ناگواری بخوبی دیکھ سکتے تھے۔

مروجہ رسمیں اور رسمیں پورے زور و شور سے شروع ہو گئیں۔

قطع نظر اس بحث کے کہ یہ رسمیں اور رسمیں غلط ہیں یا صحیح، جا ہیں یا بے جا بہر حال اُن کا ایک مخصوص حسن ہے۔ سو یہ حسن تہنیت کی شادی کے موقع پر نبھاہی جانے والی رسموں میں بھی جھلکے پڑ رہا تھا۔

شادی سے ہفتہ بھر پہلے مائیوں کی رسم ہوئی۔

مائیوں کی رسم کے موقع پر زرد جوڑے میں ملبوس جھکی جھکی آنکھوں والی تہنیت کا جب سب دستور سات سہاگنیں منہ میٹھا کرانے لگیں تو الفت بھی ایک چھنڈی ہاتھ میں لے کر تہنیت کا منہ میٹھا کرانے والی سہاگنوں کے ساتھ عظمت آپا کے پیچھے کھڑی اپنی باری کی منتظر تھی کہ چچی جان نے اُس کے قریب آکر اُس کا بازو دبوچتے ہوئے اپنا منہ اُس کے قریب کرتے ہوئے کہا "الفت تم منہ میٹھا مت کرانا تہنیت کا۔"

"کیوں؟" اُس نے حیرانی سے پوچھا۔

"اونہوں!" انھوں نے سر محفل اُس کی بلند آہنگ "کیوں" کا بُرا مناتے ہوئے اپنے ہونٹوں پر انگلی دھر کر اُسے چپ رہنے کا اشارہ کیا اور اُس کا ہاتھ پکڑ کر اُسے ایک جانب کھینچ لے گئیں۔

"او ہو! چچی جان ایسی کیا بات ہے؟ وہ ادھر سب تہنیت کا منہ میٹھا کرا چکیں گی اور میں رہ جاؤں گی۔"

"اے بچی میں اپنی طرف سے تھوڑی منع کر رہی ہوں۔ تمہاری ماں نے مجھ سے کہا کہ الفت کو منع کر دو ذرا جا کر کہ وہ تہنیت کا منہ میٹھا نہ کرائے۔"

"مگر کیوں؟"

"بھئی تمہاری خالہ بی بی کو اعتراض تھا انھوں نے تمہاری ماں کے کان میں اپنا اعتراض پھونکا اور تمہاری ماں نے مجھے دوڑایا کہ چھوٹی دلہن ذرا الفت کو تم روکنا تو ہی جا کر۔"

"لیکن کیوں چچی جان؟" وہ زچ ہو کر بولی۔

"بیٹی! جو لڑکیاں اپنے گھروں میں سکھی نہ رہیں اُن سے منہ میٹھا نہیں کرایا جاتا بلکہ سچ پوچھو تو اُن کی تو پرچھائیں سے بھی دور رکھا جاتا ہے دلہن کو۔"

الفت پر ایسا سناٹا طاری ہوا کہ چھنڈی اُس کی مٹھی میں بھینچ کر چورا چورا ہو گئی۔

"بچی! یہ ملامت اتنا مجھے تو تمہاری ماں نے دوڑایا تھا تمہاری طرف اور وہ بے چاری بھی مجبور تھیں کہ تمہاری خالہ نے اعتراض کیا تھا اور وہ ٹھہریں اب تہنیت کی ساس!"

"آپ ٹھیک کہتی ہیں چچی جان۔"

اپنی آواز اسے کسی اندھے کنوئیں سے آتی محسوس ہوئی!

پھر جب تک تہنیت سہاگنوں سے گھری بیٹھی رہی اور منہ میٹھا ہوتی رہی الفت نے حتی الامکان پس منظر میں رہنے کی کوشش کی۔

وہ چپ چاپ آنسو پیتی رہی۔

نہ اُس نے امی سے کوئی شکوہ کیا

نہ خالہ بی بی سے۔

نہ اس وقت

نہ بعد میں۔

شکوہ اگر تھا تو جلیس الحسن سے کہ انھیں تو مائیوں کا بلاوا بھی دیا گیا تھا پھر وہ کیوں نہیں آئے تھے۔

وہ تو مہندی میں بھی نہیں گئے۔

الفت اپنے ہاں مہندی کی رسم میں بھی دُور دُور رہی۔

اور دولہا کی مہندی لے کر جانے والوں کے ساتھ نہیں گئی۔ تہنیت کے اکیلے پن کے بہانے سے گھر پر ہی رہی۔ کیونکہ امی اور ابا تو گھر پر تھے مگر تہنیت کے پاس کسی کا ہونا بھی ضروری تھا۔ اور وہ جو اُس نے رد شن سے مس انجم کی بہن کو درون خانہ راز بتا دینے کی بابت یا زپرس کا ارادہ کر رکھا تھا وہ ارادہ سر بہ سر تھوڑا کر خدا جانے کہاں پڑا رہا۔

پھر شادی کا دن آپہنچا

اور وہ شادی میں بھی نہیں آئے۔

عظمت آپا اور فضیلت کے شوہروں اور سسرالیوں پر بھی بالآخر بھید کھل ہی گیا۔

وہ سب سے اور بالخصوص دونوں بہوتیوں اور اُن کے گھر والوں سے نظریں چراتی، الگ تھلگ بھرتی رہی۔

جب دولہا اور دلہن کے ساتھ متعلقین کی تصویریں کھنچیں اور مووی بننی شروع ہوئی تو وہ شادی ہال کے عقبی حصے میں ایک نیم تاریک گوشے میں دبک کر کھڑی ہو گئی۔

ایک گروپ کے بعد دوسرا گروپ جگہ لیتا گیا۔

فضیلت کی فیملی کے ساتھ دولہا دلہن کا گروپ بننے کا موقع آیا تو فضیلت کے میاں غائب پائے گئے۔

یہاں سے وہاں تک ایک پکار سی مچ گئی۔

"ارے! حامد میاں کو بلاؤ کہاں گئے!"

"حامد میاں؟"

"حامد میاں!"

ہر ایک حامد میاں کو تلاش کرتا پھر رہا تھا۔

کون تھا جس کو دولہا دلہن کے ساتھ بٹھا کر یادگاری گروپ نہ بنایا گیا۔

بس ایک الفت ہی تھی جو کسی کو یاد نہ آئی!

یا

شاید قصداً یاد نہ کیا گیا!!

خدایا! کس قدر تنہا اور دل گرفتہ محسوس کر رہی تھی وہ خود کو ہال کے اس نیم تاریک گوشے میں دبکا ئے ہوئے۔

رخصتی پونے بارہ بجے عمل میں آئی۔

شادی ہال سے واپس ہوتے ہوتے سوا ایک بج گیا۔

راستے میں امی نے بابا سے کہا "عظمت اور فضیلت دونوں اپنے گھروں کو پریشان گئی ہیں۔"

"کیوں خیریت؟"

"جلیس کے تقریب میں شریک نہ ہونے پر ان کے سسرالیوں میں خاصی چہ میگوئیاں ہوئیں۔"

"اچھا!"

"ہاں بلکہ فضیلت تو چلتے ہوئے میرے کان میں یہ کہہ گئی ہے کہ حامد بھری محفل میں اس سے یہ کہتے سے باز نہ رہے کہ تم نے اور تمہارے گھر والوں نے تو بہت چھپانے کی کوشش کی مگر آج ثابت ہو گیا کہ تمہاری اپیا اور ان کے شوہر نامدار میں خاصی شدید قسم کی گڑبڑ ہے۔"

"ہاں ایسی باتیں چھپی کہاں رہتی ہیں بھلا" بابا نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا "مگر مجھے حیرت ہے کہ جلیس میاں آخر آئے کیوں نہیں؟ کیا اتنی شدید ناراضگی ہے کہ انھوں نے ہماری خوشی میں شریک ہونا بھی گوارا نہ کیا۔ میں تو یہ باور کیے بیٹھا تھا کہ مائیوں اور مہندی میں نہ آئے تو کوئی بات نہیں، شادی اور ولیمے میں ضرور آئیں گے۔"

"جب شادی میں نہ آئے تو ولیمے میں کیا آئیں گے!" امی نے خاصی دل شکستگی سے کہا۔

"تم ٹھیک کہتی ہو۔"

الفت مٹی کی مورت بنی چپ چاپ سن رہی تھی۔

اس رات جب وہ اس کمرے میں آئی جو تہنیت کے دم سے سجا رہا کرتا تھا تو بے اختیار جی بھر آیا۔

اگلے پچھلے سارے ہی بند ایک ساتھ ٹوٹ گئے۔

"بہنوں کا ساتھ بھی کتنا مختصر ہوتا ہے...!" اُس نے آنسوؤں کے بہاؤ میں انتہائی دل گرفتگی سے سوچا "کل تہنیت یہاں تھی آج نہیں ہے۔"

تہنیت کا خالی بستر دیکھ کر اُس کا دل کچے پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ کمرے میں اس کا اسباب اس کی بُری طرح یاد دلا رہا تھا۔

کرسی کی پشت پر اُس کا دوپٹا پڑے دیکھ کر اُسے لحظہ بھر کو تو یوں لگا جیسے تہنیت یہیں کہیں گھر کے کسی کونے کھدرے میں تھی اور ابھی کوئی دم میں اپنی دلکش مسکراہٹ کے پھول بکھیرتی اس کے سامنے آ کھڑی ہوگی اور مسکرا کر کہے گی "کیا بات ہے بندی پرور، ایسی چپ چاپ کیوں بیٹھی ہیں؟ ساری فکروں کو گولی ماریں اور فٹافٹ بتائیں چائے چلے گی اس وقت؟"

کتنا خیال رکھتا تھا اُس نے اُس کا۔

اس گھر میں اپنے آخری لمحوں تک اُس کی ہمدرد و غمگسار رہی تھی۔

جس روز مائیوں بٹھایا گیا اُس روز تمام مہمانوں کے جانے اور ساری مصروفیات سے فراغت پانے کے بعد جب وہ اس کمرے میں لوٹی تو تہنیت نے پوچھا تھا "اپیا! آپ وہاں کیوں نہیں تھیں؟"

"کہاں؟"

"جہاں مجھے لے جا کر بٹھایا گیا تھا۔"

"تھی تو سہی۔" اُس نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"کوئی نہیں۔"

"ہاں بھئی۔"

"میرا سر جھکا ہوا اور آنکھیں بند تھیں تو کیا، کان تو کھلے ہوئے تھے۔ شاکرہ بھابی وغیرہ وقتاً فوقتاً ایک ایک کو اس کے نام سے پکار پکار کر بلا رہی تھیں۔ آپ کا نام تو نہیں سنا میں نے۔"

"بھئی میں نے شاکرہ بھابی کو اپنا نام پکارنے کی زحمت دیے بنا ہی مہندی کا ذرا سا اور اتنا تمہارے منہ میں دے دیا تھا۔"

"پتا ہے کیا اپیا" تہنیت نے اُسے گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا تھا "اپنی بہنوں کو تو میں اُن کی خوشبو سے پہچان

سکتی ہوں۔"

"سوری تہنی۔" اُس نے اپنے مصلحت آمیز جھوٹ کے پکڑے جانے پر خجل ہوتے ہوئے پھر ایک جھوٹ سے کام لینے کی کوشش کی "دراصل اتنے بہت سے کام تھے جان کہ مجھے تمہاری طرف آنے کی فرصت ہی نہیں ملی۔"

"جلیس بھائی نہیں آئے نا؟"

"نہیں۔"

پھر مہندی والے دن بھی اُس نے یہی سوال دہرایا تھا۔

اور آج بھی

نکاح سے ذرا دیر پہلے جب وہ اُس کے پاس جا کر بیٹھی تھی تو اُس نے چپکے سے یہی سوال کیا تھا۔ بعد نکاح تو تصویروں اور مووی بنانے کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا اور وہ الگ تھلگ ہو گئی تھی۔

لباس تبدیل کرنے کے بعد وہ جلتی آنکھوں کو ٹھنڈا کرنے کی غرض سے غسل خانے میں جا گھسی۔

کھونٹی پر ٹنگے تہنیت کے زرد جوڑے کو دیکھتے ہی دل کا سارا دکھ حلق میں امڈ آیا۔ وہ آگے بڑھی اور ریشمی جوڑے پر یوں سج سج ہاتھ پھیرنے لگی جیسے وہ تہنیت کے مائیوں کا جوڑا نہ ہو اس کا وجود ہو۔

آنکھوں پر پانی کے چھپاکے مارتے ہوئے اُس کے دل سے تہنیت کے لیے دعاؤں کی برکھا برسنے لگی۔

"خدا کرے تہنیت سکھی رہے۔"

"ڈھیروں خوشیاں ملیں"

"کوئی دکھ نہ پائے۔"

منہ دھو کر دوبارہ کمرے میں آئی تو اُسے خفقان سا ہونے لگا۔

تنہائی کے جان لیوا احساس سے دم گھٹنے سا لگا۔

اُس نے بتی بجھائی کینڈل پاور بلب روشن کیا اور برآمدے کے رُخ کھلنے والے کھڑکی پر پڑے پردے سمیٹ کر دونوں پٹ وا کر دیے۔

برآمدے میں مدقوق روشنی بکھری پڑی تھی۔

اور ملحقہ کمرے سے بھیا اور بھابی کی دھیمی دھیمی آوازیں سناٹے میں ملکورے لیتی اس تک پہنچنے لگیں۔

"جس نیم دلی سے انھوں نے دعوت قبول کی تھی اُس کے پیش نظر مجھے اندازہ تھا وہ نہیں آئیں گے۔" بھیا کہہ رہے تھے۔

"الفت نے بھی تو انتہا کر دی کہ اُن سے کہا کہ مجھے آپ کے بچوں سے نفرت ہے اور میں اُن پر تھوکتی بھی نہیں۔"

"ہاں بالکل..... بھئی مجھ سے تو اگر کوئی کہہ دے کہ مجھے تمہارے بچوں سے نفرت ہے تو میں اُس کی صورت تک دیکھنے کا روادار نہ رہوں۔"

"الفت کو ایسی بات نہیں کہنی چاہیے تھی۔"

"اب اُسے اپنی غلطی کا احساس کون دلائے۔"

"ایک بات کہوں۔"

"ہاں کہو۔"

"الفت نے مارے باندھے ہاں کر تو لی تھی... مگر اوّل دن سے اس کا نباہ کا ارادہ نہیں تھا۔"

"ہو سکتا ہے۔"

"ہو سکتا ہی نہیں بلکہ یہ بالکل یقینی بات کہہ رہی ہوں میں آپ سے۔"

"بہرحال اب تو جیسے بھی ہو مصالحت کی کوشش کی جانی چاہیے۔"

"مجھے تو جلیس الحسن کے تیور مصالحت کرنے والے نہیں لگتے۔"

"اگر ایسا ہے تو بہت بُرا ہے۔"

"سوچا تھا تہنیت اپنے گھر چلی جائے گی تو اُس کا کمرا ارشد اور امجد کے لیے سیٹ کر دوں گی۔ بے چارے بچوں کو ڈرائنگ روم میں سونا پڑتا ہے۔ مگر الفت بی بی گویا واپس آ بیٹھیں اور مجھے تو اب واپس جاتی لگتیں نہیں۔ کنوارپن کا لیبل اترنا تھا سو اتر گیا۔ اب میکے میں راج کریں گی۔ سچ کہتی ہوں ذرا جو ملال دیکھا ہو میں نے الفت کے چہرے پر اس بات کا کہ میاں کو چھوڑے میکے میں بیٹھی ہوں۔"

اس سے آگے سننے کی الفت میں نہ سکت تھی نہ تاب۔

کپکپاتے ہاتھوں سے اُس نے کھڑکی کے پردے برابر کیے اور اوندھے منہ بستر پر ڈھیر ہو گئی۔

انسانی چہروں پر ایسے بھی نقاب چڑھے ہو سکتے ہیں، اُس کے گمان میں بھی نہ تھا۔

دن کے اجالوں میں شستہ، اجلی، مشفق، مہربان، ہمدرد اور میٹھا نظر آنے والی بھابی جان کی رات کے سناٹوں اور تاریکی میں دکھائی دینے والی پرچھائیں کس قدر مہیب، کریہہ اور دل شکن تھی۔

اُسے پہلی بار شدت سے اس حقیقت کا ادراک ہوا کہ

دل دکھانے والے ان بے رحم دنوں سے بدرجہا بہتر تو وہ دن تھے جو اُس نے "حسن لاج" میں گزارے تھے۔

وہاں دوسری نوعیت کے دکھ ضرور تھے مگر بے زمین، بے آسمان ہونے کا احساس تو خنجر کی طرح دل میں اُترتا محسوس نہ ہوتا تھا۔

رضا جمیل نے غلط نہ کہا تھا۔

اپنا گھر اپنی جنت ہوتی ہے!

اپنی گم گشتہ جنت کا خیال اُس کے دل کو تڑپا رہا تھا۔

بی حوا کو بھی اگر پتا ہوتا کہ وہ جنت سے نکل کر ایسی خوار ہوں گی تو وہ دانۂ گندم کو کھانا تو در کنار اُس کے تصور سے بھی ہاتھ کھینچ لیتیں۔

الفت کو جلیس الحسن بے طرح یاد آ رہے تھے۔

شاید بی حوا بھی بابا آدم کے لیے یونہی تڑپی ہوں گی۔

یونہی بکی ہوں گی۔

مگر جنت بدر کیے جانے کی ساری ذمے داری بابا آدم کے سر ڈال کر خود اُس کی طرح ایک طرف نہ بیٹھ رہی ہوں گی بلکہ اگر بابا آدم نے اُن کی تلاش کی تھی تو وہ بھی اُن کی جستجو میں دیوانہ وار ادھر سے اُدھر بھٹکتی پھری ہوں گی۔

اگر اپنے اپنے حصے کے دکھ بھوگنے کے بعد آدم اور حوا مل سکتے تھے تو وہ بھی جلیس الحسن سے ملنے کی اُمید باندھ سکتی تھی۔

اسی اُمید کا دامن تھامے تھامے وہ نیند کی مشفق اور مہربان آغوش میں سو گئی۔

رات کا بقیہ حصہ خواب دیکھتے گزرا۔

اونچے اونچے سر بفلک پہاڑوں سے گھرے لق و دق چٹیل میدان میں وہ دیوانہ وار ادھر سے اُدھر بھٹکتی چلاتی پھرتی رہی۔

جلیس!

جلیس!

تم کہاں ہو میرے ہمنفس؟

شاید بی بی حوا نے بھی بابا آدم کو یونہی پکارا ہوگا۔

****

اگلی صبح وہ منہ اندھیرے اُٹھ بیٹھی۔

فجر کی نماز کے بعد حسبِ معمول نماز ادا کی۔

سورۂ توبہ کی تلاوت کی۔

سورۂ رحمٰن پڑھی۔

اور خود کو پُرسکون محسوس کرنے لگی۔

یہ آزمودہ نسخہ تھا کہ

جب کبھی وہ کسی باعث پریشان ہوتی نماز کے بعد سر جھکا کر بیٹھ جاتی اور دل کھول کر رو لیتی۔

عجب تقویت ملتی تھی دل کو اس عمل سے۔

جیسے اپنے مربی و محسن، اپنے ہمدرد و غمگسار، اپنے عزیز ترین دوست سے سب کچھ کہہ ڈالا ہو۔

کلامِ الٰہی کا سحر جدا تھا۔

جوں جوں تلاوت کرتی جاتی دل کا دکھ رفع ہوتا چلا جاتا۔

بابا اور امی کے لیے چائے بنا کر لے گئی اور اُن کے سرہانے دھرے ٹیلیفون سیٹ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی "بابا! ایک فون کرنا ہے۔"

"خیریت! اتنی صبح کسے فون کرنے کی ضرورت درپیش آگئی؟"

"بس کسی کو کرنا ہے۔"

بابا اور امی نے معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

"فون ذرا اپنے کمرے میں اُٹھا لے جاؤں بابا؟"

"آں ہاں ضرور۔"

ٹیلیفون کا تار تو خیر سے اتنا لمبا رکھا گیا تھا کہ حسبِ ضرورت گھر کے ہر کمرے تک لے جایا جا سکتا تھا۔

وہ ٹیلیفون سیٹ اُٹھائے اپنے کمرے میں چلی آئی۔

گھر پر سناٹے کا عالم تھا۔ بابا، امی اور وہ بس یہی تین نفوس ابھی جاگے تھے۔ بھیا، بھابی، بچے، تائی اماں اور رشتے کی ایک خالہ جو خاندان بھر میں خطوبی کی عرفیت سے مشہور تھیں اور گزشتہ رات شادی ہال سے سیدھی چلی آئی تھیں کہ کل ولیمہ بھی ہے کون نگوڑ مارے کو رنگی سے یہاں آنا پھرے گا، سب ابھی تک سو رہے تھے۔

بھیا نے دفتر سے تین دن کی چھٹی لے رکھی تھی۔

اور وہ خود بھی تین دن کی چھٹی پر تھی۔

"یہ صبح ہی صبح کہاں فون کرنے کی ضرورت پیش آگئی الفت کو؟" امی نے بابا سے پوچھا اور اُن کے جواب کا انتظار کیے بغیر بولیں "اتنی صبح تو اسکول بھی نہ کھلا ہوگا۔"

زمانہ شناس بابا دھیرے سے مسکرا دیے۔

"لگتا ہے آج جلیس میاں سے پوچھا جائے گا کہ کل کیوں نہ آئے؟"

"اچھا! اب سمجھی!"

"یہ کوئی نئی بات نہیں، تم ہمیشہ دیر سے سمجھتی ہو۔"

بابا کا قیاس غلط نہ تھا۔

الفت جانتی تھی، جلیس الحسن ابھی بستر ہی پر ہوں گے اور ٹیلیفون سیٹ حسبِ معمول اُن کے سرہانے دھرا ہوگا اور ابھی "حسن لاج" پر سناٹا چھایا ہوا ہوگا۔

ریسیور چوتھی مرتبہ گھنٹی بجنے پر اٹھا لیا گیا۔

"ہیلو!" جلیس الحسن کی خوابناک آواز سنائی دی۔

الفت کا سانس اوپر کا اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔

کتنے دنوں بعد!

اُن کی آواز کان میں پڑی تھی۔

"ہیلو!" اُنھوں نے دوسری جانب سناٹا پا کر دوبارہ کہا اور اس بار اُن کے لہجے سے قدرے حیرانی عیاں تھی۔

الفت کا جی بھر آیا۔

"میں بول رہی ہوں۔" اُس نے بھیگی ہوئی آواز میں کہا۔

ٹیلیفون سیٹ بولنے والے کی آواز کے ساتھ اس کی تصویر بھی دکھا سکتا تو وہ دیکھتی کہ جلیس الحسن نیند سے بوجھل آنکھیں بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے مسلتے یک بیک سیدھے ہو بیٹھے تھے اور جلیس الحسن دیکھتے کہ اُس کی آنکھیں آنسوؤں کے سمندر میں یوں تیر رہی تھیں جیسے زندہ مچھلیوں کے کلپھڑوں کو چاک کر کے تالاب میں چھوڑ دیا گیا ہو۔

"کیسے خیال آگیا آج؟"

"آپ ..... نے ..... بھیا اور بھابی کے سامنے ..... سارا دوش مجھ پر ڈال دیا؟" اُس نے شاکی لہجے میں کہا پھر بولی "حالانکہ غلطی آپ کی بھی تھی۔"

جلیس الحسن زیرِ لب مسکرا دیے۔

اُس کا یہ کہنا کہ غلطی آپ کی بھی تھی اس کا محتاط اعترافِ خطا تھا۔

گویا وہ تسلیم کر رہی تھی کہ غلطی اس کی بھی تھی۔

"میری تمہارے بھائی اور بھابی سے زیادہ بات ہی نہیں ہوئی۔"
"آپ نے یہ تو کہا کہ......"
"کہ کیا؟"
"کہ الفت یہ کہہ کر گئی ہے کہ مجھے آپ کے بچوں سے نفرت ہے اور میں اُن پر......" اُس نے ایک بار پھر بات ادھوری چھوڑ دی۔
"تھوکتی ہوں۔" انھوں نے اُس کا جملہ مکمل کر دیا۔
"جی۔"
"ہاں یہ کہا ہے میں نے اُن سے۔" جلیس الحسن نے اعتراف کیا پھر بولے۔" اور میں نے غلط تو نہیں کہا...... کیا تم نے یہ بات نہیں کہی تھی؟"
"مگر آپ کو اُن لوگوں سے شکایت کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"
"کیونکہ وہ تمہارے قریب ترین متعلقین ہیں۔ انھیں پتا ہونا چاہیے کہ اصل قصہ کیا ہے؟"
"اور میں کس سے فریاد کروں؟ کس سے شکایت کروں ان زیادتیوں کی جو میرے ساتھ آپ کے گھر میں روا رکھی گئیں۔"
"مثلاً؟"
"اب کون کون سی زیادتی گنواؤں؟ اور گنوانے کا فائدہ بھی کیا؟ آپ نے پہلے کون سی میری سُنی جو اب سُن لیں گے۔! آپ کا حساب تو وہ ہے کہ ہم ہی قاتل ہم ہی مسیحا...... کوئی غیر جانبدار آدمی ہو تو اُسے بتایا بھی جائے...... آپ تو پھر یہی ایک بات کہہ دیں گے کہ ساری غلطی تمہاری ہے۔"
"چلو کسی غیر جانبدار شخص کی خدمات حاصل کر کے فیصلہ کروائے لیتے ہیں کہ غلطی کس کی ہے۔"
"نہیں میں کوئی پنچایت یا جرگہ نہیں بٹھوانا چاہتی۔"
"تو پھر فون کس لیے کیا ہے؟"
اُن کے اس سوال پر اُس کا ایسا جی اُمڈا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔
کچھ بھی سہی جلیس الحسن سے اُس کا ایک ایسا رشتہ! ایسا تعلق تھا جس کی نزاکتوں اور لطافتوں سے اس رشتے کی زنجیر اور تعلق کی ڈور میں بندھے مرد و زن ہی آشنا ہوتے ہیں۔
الفت کے ساتھ انھوں نے چار ماہ گزارے تھے۔
اُس کے دم سے اگر بہت سی تلخ یادیں وابستہ تھیں تو کچھ خوشگوار یادیں بھی منسوب تھیں۔
فون پر اُس کے رونے کی آواز سُن کر وہ مضطرب ہو گئے۔
"کیا ہوا؟"
"رو کیوں رہی ہو؟"
انھوں نے تڑپ کر یہ دو سوال کیے۔
پھر بڑی ملائمت سے بولے۔"کچھ بتاؤ تو؟"
مگر وہ بتاتی کیسے!
آنکھوں سے سیلِ رواں جاری تھا۔
حلق دُکھ رہا تھا۔
دل دکھ کی بھاری صلیب تلے دبا تھا۔
"پلیز! رو مت۔" وہ لجاجت سے بولے۔
مگر اُس کی آنکھوں سے بہتے آنسو کہتے تھے کہ آج نہ تھمیں گے۔
"مجھے بتاؤ تو آخر بات کیا ہے؟"
"گھر میں کچھ گڑبڑ ہو گئی ہے کیا؟"
وہ کیسے بتاتی انھیں کہ اُس کا تو جیون ہی تلپٹ ہو کے رہ گیا تھا۔
"دیکھو اگر تم نے رونا بند نہ کیا اور مجھے یہ نہ بتایا کہ رو کیوں رہی تھیں تو میں فون بند کر دوں گا۔" انھوں نے دھمکی آزمانے کی کوشش کی۔

سسکیوں اور ہچکیوں کے درمیان وقفے بتدریج بڑھنے لگے۔
جلیس الحسن اُس کی سسکیاں تھم جانے کا انتظار کرتے ہوئے کبھی کھنکھار کر، کبھی گہرا سانس کھینچتے ہوئے اور کبھی جمائی لے کر اُسے رابطہ برقرار رہ جانے کا یقین دلاتے رہے۔
جب وہ پُرسکون ہو گئی تب انھوں نے پھر کہا" ہاں بھئی اب بتاؤ یہ رونا دھونا کس سبب سے تھا؟"
وہ بدستور خاموش رہی۔
"یار! تم عورتوں کے پاس ہتھیار بہت کارآمد اور آزمودہ ہیں...... ماں اولاد کو دودھ نہ بخشنے کی قسم دے کر ڈرا دیتی ہے بہن بھائی کو اپنی قسم دے کر اُس سے ہر کام نکلوا لیتی ہے۔ بیوی اپنے شوہر کو رو کر سہا دیتی ہے۔"
چند پل کو دونوں طرف سناٹا سا چھا گیا پھر انھوں نے بڑے پریم سے کہا" الفت!"
"جی!" وہ منمنائی۔
"روئیں کیوں اتنا؟"
"آپ نے دکھ جو دیا۔"
"میں نے تمہیں یا تم نے مجھے؟"
"آپ نے مجھے۔"
"نہیں تم نے مجھے۔"
دل کا بوجھ بہت ہلکا ہو چکا تھا اور اب وہ خود کو بہت پُرسکون محسوس کر رہی تھی۔
"کل آپ تہنیت کی شادی میں کیوں نہیں آئے؟"
"کس نسبت سے آتا؟"
"کیا میری نسبت کافی نہیں تھی؟"
"تم تو راستے میں کانٹے بچھا گئی تھیں۔"
"آپ انھیں چُن کر راستہ صاف کرتے ہوئے آسکتے تھے۔"
"سوری! مجھے اپنی انگلیاں فگار کرنے کا شوق نہیں۔"
الفت کو اُن کی اس بات سے دھچکا سا پہنچا۔
گویا وہ اب تک وہیں ڈٹے کھڑے تھے۔
مگر الفت بھی فیصلہ کر چکی تھی کہ:۔
اگر دکھ بھگتنا ہی ہے تو بے مقصد کیوں؟
اور اگر
اونچے نیچے سر بفلک پہاڑوں سے گھرے لق و دق چٹیل میدان میں دوڑنے پھرنے کی سزا مل ہی گئی ہے تو بے ثمر کیوں رہا جائے؟
کیوں نہ آدم کی بازیابی کو نصب العین ٹھہرا لیا جائے!
سو اُس نے کہا:
"آج ولیمے میں آئیں گے؟"
"راستے میں کانٹے بچھے ہیں!"
"میں نے چُن لیے ہیں...... آپ آکر تو دیکھیے راستہ صاف ملے گا!"
جلیس الحسن سوچ میں پڑ گئے
الفت سے شادی کا فیصلہ تو انھوں نے تنہا کر لیا تھا۔ وہ اور بات تھی کہ سارے معاملات طے ہو جانے کے بعد انھوں نے بچوں کو بھی اعتماد میں لے لیا تھا۔
مگر اب الفت کو گھر واپس لے آنے کا فیصلہ وہ تنہا کرنے پر قادر نہ تھے۔
پہلے انھیں بچوں سے اعتماد کا ووٹ حاصل کرنا تھا۔
الفت کے بھائی اور بھاوج کے آنے پر بچوں کی تشویش پچھلے جمعہ کی صبح سے کل شام تک برقرار رہی تھی۔
دعوت نامہ انھیں پُرزہ پُرزہ ہوا بر آمدے کے سنگی ستون کی آڑ میں دھرے جدید وضع کے خوبصورت کوڑے دان میں

نظر آیا تھا اور وہ یقیناً چاروں بچوں میں سے کسی ایک کی حرکت تھی یا ملی بھگت تھی کیونکہ صفائی ستھرائی پر مامور ماجراں کی عادت سے تو وہ بخوبی واقف تھے کہ وہ کاغذ کا معمولی سے معمولی پرزہ بھی گھر والوں کو دکھا کر اطمینان کر لینے کے بعد ہی کوڑے دان میں ڈالتی تھی کہ وہ کام کا تو نہ تھا۔

کل شام جب وہ دفتر سے گھر واپس لوٹے تو بچوں کے چہروں پر گزشتہ کئی دن سے نظر آتی تشویش کا رنگ گہرا ہو چکا تھا شام ڈھلے جب وہ تیار ہو کر ٹی وی لاؤنج میں پہنچے تو وہ چاروں پہلے انھیں پھر خاصی تشویش کے ساتھ ایک دوسرے کو دیکھنے لگے تھے۔

"بابا! آپ کہیں جا رہے ہیں کیا؟" نگین نے خاصی تشویش کے ساتھ پوچھا تھا۔

حالانکہ اگر بالفرض وہ کہیں جا بھی رہے تھے تو یہ کوئی غیر معمولی یا تشویش کی بات نہیں تھی۔

"جی بیٹے۔"

"کہاں؟"

"آپ بوجھیے کہاں؟" انھوں نے بچوں کو آزمانے کی کوشش کی۔

"پتا نہیں بابا!" نگین دھیمے اور اداس لہجے میں بولی۔

پھر انھوں نے ایک ایک سے پوچھا اور ان میں سے ہر ایک نے نگین کی طرح دھیمے سُروں میں کہا تھا "پتا نہیں"

اور جب انھوں نے کہا "آج ہم سب چائنیز چل رہے ہیں۔"

تو وہ سب اُچھل پڑے تھے۔

اُن کی خوشی دیدنی تھی۔

چائنیز وہ پہلی مرتبہ نہیں جا رہے تھے۔ ان گنت مرتبہ گئے تھے۔ مگر جیسی خوشی کا اظہار انھوں نے کل کیا تھا پہلے کبھی نہ کیا تھا۔

جلیس الحسن بچے نہ تھے کہ اُن کی اس غیر معمولی مسرت کا سیاق و سباق نہ سمجھ سکتے۔

کل وہ چاروں اُن کے ساتھ باہر جا کر اتنے خوش ہوتے تھے کہ اتنا خوش تو انھوں نے انھیں کبھی اُن کی ماں کے زمانے میں بھی کسی موقع پر نہ دیکھا تھا

اس قسم کی صورتِ حال میں الفت کو گھر واپس لانے کے لیے پہلے بچوں کو اعتماد میں لینا ضروری تھا۔

"آئیں گے نا آپ؟" الفت نے پھر پوچھا۔

"کوشش کروں گا۔"

"کوشش کروں گا نہیں، آپ کو وعدہ کرنا ہوگا۔" وہ بے حد لجاجت سے بولی۔

"شاید ایک دو روز کے لیے لاہور جانا پڑ جائے۔" انھوں نے ٹالنے کی کوشش کی۔

"پلیز! آج نہیں کل چلے جائیے گا۔" وہ گڑگڑا کر رو دی۔ "ورنہ میں کل کی طرح آج بھی بہت تنہا محسوس کروں گی خود کو..... کل سب تھے سوائے آپ کے اور..... میں خود کو بہت اکیلی اکیلی محسوس کرتی رہی..... بولیں آئیں گے نا؟"

"ایک بات پوچھوں تم سے؟"

"جی۔"

"اتنا اصرار کیوں ہے؟"

وہ روہانسی ہو گئی۔

"کیونکہ..... شاید..... شاید میں تھک گئی ہوں۔"

جلیس الحسن کچھ دیر کو سوچ میں پڑ گئے۔

"او کے..... آؤں گا۔ مگر یہ تو بتاؤ ولیمہ ہو کہاں رہا ہے میرا مطلب ہے، مجھے پہنچنا کہاں ہوگا؟"

"پہلے تو یہیں آئیے گا امی کے ہاں، یہاں سے اکٹھے ہو کر جائیں گے وہاں..... میں آپ کی منتظر رہوں گی۔"

"اینی تھنگ یو نیڈ فار دی ایکیژن؟"

اُس کے دل پر گھٹا سی برسنے لگی۔

وہ اُس سے پوچھ رہے تھے کہ کیا اُسے اس خصوصی موقع پر کسی چیز کی ضرورت تھی۔

گزری کل کے تصور نے اُس کے دل کو تڑپا کے رکھ دیا۔

عظمت آپا اور فضیلت اپنے اپنے گھروں سے گلاب اور موتیا سے گندھے گجرے بالوں میں آراستہ کر کے آئی تھیں۔

بھابی کے لیے سبیا بطورِ خاص گجرا بنوا کر لائے تھے۔

کسی کو اُس کا خیال نہ آیا تھا کہ وہ بھی تو سہاگن تھی!

کتنے یاد آئے تھے کل جلیس الحسن اُسے کہ شام کو جب وہ اُسے لے کر گھومنے پھرنے نکلتے تھے تو اُس کے لیے بڑی محبت اور چاہت سے گجرے خریدا کرتے تھے۔

اب جو اُنھوں نے پوچھا۔

"اینی تھنگ یو نیڈ فار دی ایکیژن؟"

تو اُسے گزری شام یاد آ گئی۔

جو بہت رنگین، بہت دلکش، بہت خوبصورت ہونے کے باوجود اُسے بہت اُداس محسوس ہوتی رہی تھی۔

"مجھے صرف آپ کی ضرورت ہے۔" اُس کی آواز شدّتِ جذبات سے بوجھل ہو رہی تھی۔

"میں آؤں گا۔" انھوں نے کہا۔

اوہ!

جلیس الحسن سے بات کرنے کے بعد وہ کس قدر مطمئن اور پُرسکون محسوس کر رہی تھی خود کو!

جیسے سیاہ گھٹا ہیں دل کو ڈرا دینے کے بعد کہیں اور نکل گئی ہوں۔

بے آب و گیاہ رہگزار میں یک بہ یک رنگ برنگ پھولوں کے تختے کے تختے کھل اُٹھے ہوں

مہیب اندھیارے میں کسی راہ گم کردہ کو قطبی تارا نظر آ گیا ہو۔

بی حوّا کو بابا آدم کا سُراغ مل گیا ہو۔

چہرے پر اطمینان و سکون کی خوشی لیے وہ ٹیلیفون سیٹ واپس رکھنے بابا اور امی کے کمرے میں گئی تو بابا نے پوچھا

"صبح سویرے کس کو فون کرنے کی ضرورت پیش آ گئی تھی بیٹی؟"

"آپ کے داماد کو بابا!"

"خیریت؟"

وہ ایک گہری سانس کھینچتی بابا کے قریب بیٹھ گئی۔

"بابا! جنگ میں کسی ایک فریق کو تو ہار ماننی ہی پڑتی ہے۔"

"تو تم نے ہار مان لی؟"

"یہی سمجھیے۔"

"مجھے خوشی ہوئی بیٹا۔"

اُس نے چونک کر بابا کی طرف دیکھا

"میری ہار پر بابا؟" اُس نے دھیمے سُروں میں کہا۔

"تمہارے درست اور دانشمندانہ فیصلے پر۔"

"درست اور دانشمندانہ؟" وہ بے یقینی سے بولی

بابا مسکرائے، کھنکھار کر گلا صاف کیا پھر دھیمے لہجے میں بولے۔ "بیٹا! عورت کے بارے میں عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مرد کے مقابلے میں بہت کمزور، بے بس اور نہتی ہوتی ہے مگر میری ناقص رائے ہے عورت کے پاس صبر اور خاموشی ایسے ہتھیار ہیں جن کو استعمال میں لا کر وہ اپنے گھر کی بے تاج ملکہ بن سکتی ہے۔" بابا نے توقف کیا پھر بولے "بیٹی! مجھے اندازہ ہے کہ تمہاری راہ دشوار ہے۔ بہت پر پیچ راستہ ہے۔ ایک بڑی آزمائش کا تم سامنا کر چکی ہو۔ آئندہ بھی آزمائش کے بہتیرے موقعے آئیں گے۔ ہم ہوں نہ ہوں تم ثابت قدم رہنے کی کوشش کرنا۔"

"کیسی باتیں کر رہے ہیں بابا! خدا آپ کو ہمیشہ ہمارے سروں پر سلامت رکھے۔"

"بیٹے! ہم تو اب چراغِ سحری ہیں..... ویسے ہم تو خدا چاہے تو قیامت کے بورے سمٹوا لے ہم تو۔" بابا نے کہا "ہاں تو میں کہہ رہا تھا بہت سے نشیب و فراز آئیں گے تمہارے راستے میں، ہر موقعے پر ثابت قدمی کا مظاہرہ کرنا..... بیٹی! شادی تو ٹو و آر ڈوائی کا دوسرا نام ہوتی ہے یعنی کر گزرو یا پھر جان ہی سے گزر جاؤ..... مجھے اس وقت عظیم رومی شہنشاہ مارکس

آرسٹیٹس کا ایک قول یاد آرہا ہے، اُس نے کہا تھا خود غرضی کو الگ رکھو اور جو کچھ تمہاری قسمت میں ہے اس پر راضی اور شاکر رہو۔"
الفت کے لیے یہ سمجھنا محال نہ تھا کہ بابا مختاط الفاظ میں اُس سے کیا کہنا چاہ رہے تھے۔ یقیناً یہی کہ:۔
اُسے جلیس الحسن کے بچوں کو اپنا حریف نہیں سمجھنا چاہیے اور نہ ہی ان سے خائف ہونے کی ضرورت ہے۔
اُسے حالات سے سمجھوتا کرتے ہوئے اپنے مقدر پر شاکر ہو جانا چاہیے۔

"جانتی ہو بیٹی مارکس نے یہ بات کیوں کہی تھی؟"

"کیوں بابا؟"

"کیونکہ مارکس آریلیس زندگی کی اس اہم حقیقت سے آشنا تھا کہ خوشی صرف اُن لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو خود غرضی کو اپنی ذات سے علیحدہ رکھتے ہوئے اپنے اوپر حکومت کر سکتے ہیں۔" بابا نے گہری نگاہوں سے اُس کی جانب دیکھا اور بولے "تم سمجھ رہی ہو نا میری بات؟"

"جی بابا۔" اُس نے دھیرے سے کہا۔

تو یہ تھی اُس کے اَن گنت سنہرے خوابوں کی تعبیر جو وہ جلیس الحسن سے اپنی شادی ہونے سے پہلے دیکھا کرتی تھی! اور اب اُسے صبر اور خاموشی کے ساتھ بے چوں و چرا قبول کر لینے ہی میں عافیت تھی ورنہ بابا کے بھڑکنے کو ٹھیس پہنچنے اور دنیا کو باتیں بنانے اور ہنسنے کا مزید موقع ملنے اور اُس پر عرصۂ حیات تنگ ہو جانے کا احتمال تھا۔

حالات جیسے بھی تھے اُن سے سمجھوتا کر کے انجانی منزلوں سے صبر و رضا کے ساتھ گزرنے ہی میں عافیت تھی۔

اتنے دن سے وہ جلیس الحسن کے خلاف جن شکایتوں اور حکایتوں کا بوجھ دل پر لیے پھر رہی تھی وہ اُس کے دامنِ دل سے پھسل کر بابا کے قدموں میں ڈھیر ہو گئیں۔

بابا اور امی چائے پی چکے تھے۔ ٹرے اٹھا کر وہ اُن کے کمرے سے باہر نکل آئی۔

اُس روز جلیس الحسن نے ڈنر کا کھانا خلافِ معمول گھر پر بچوں کے ساتھ کھایا اور کھانے کے آخری مراحل میں انھوں نے نگین اور اعجاز کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "آپ دونوں سے ایک مشورہ لینا ہے مجھے۔"

وہ دونوں ہی نہیں فراز اور زرین بھی چونک کر استفہامیہ نظروں سے اُن کی جانب دیکھنے لگے۔

وہ دھیرے سے کھنکھارے پھر انھوں نے کہا "مجھے معلوم ہے آپ کی دوسری ماں نے آپ کے ساتھ کوئی اچھا برتاؤ نہیں کیا اور اسی وجہ سے آپ لوگ انھیں پسند بھی نہیں کرتے...... میرا مطلب ہے کہ کچھ زیادہ پسند نہیں کرتے لیکن... کبھی کبھی مصلحتاً ہمیں اُن لوگوں کے ساتھ بھی گزارا کرنا پڑتا ہے جو ہمیں اچھے نہیں لگتے...... میرا اور اُن کا اختلاف اسی بات پر ہوا کہ وہ آپ لوگوں کے ساتھ مناسب رویہ اختیار نہیں کر سکی تھیں......" انھوں نے اپنے مکالمے کا اہم ترین حصہ زبان سے نکالنے سے پہلے بچوں کے تاثرات بھانپنے کو توقف کیا اور اُن کے چہروں پر دبی دبی سی ناگواری دیکھتے ہوئے بھی مجبوراً بولے۔
"اب اگر وہ آپ لوگوں کے ساتھ مناسب رویہ اختیار کرنے اور آپ کا ہر ممکن خیال رکھنے کی شرط قبول کرتے ہوئے گھر واپس آنا چاہیں تو آپ کی کیا رائے ہے؟"

مخاطبین میں سے کوئی کچھ نہیں بولا۔

جلیس الحسن نے اُن کی خاموشی کو اپنے موقف کی حفاظت کے لیے بہترین وقت سمجھتے ہوئے مزید کہا۔ "نگی اور اعجاز بیٹے جی آپ دونوں کو یاد ہو گا کہ میں نے آپ کی دوسری ماں کے پہلی مرتبہ اس گھر میں آنے سے پہلے آپ لوگوں سے وعدہ کیا تھا کہ آپ چاروں کی خوشی اور طمانیت میری زندگی کی پہلی ترجیح رہے گی۔ میں ساری دنیا کو چھوڑ سکتا ہوں مگر آپ چاروں کو نہیں۔ آپ سے میرا وعدہ اب بھی برقرار ہے...... میرے اس وعدے کا مکمل یقین کرتے ہوئے آپ مجھے کیا مشورہ دیں گے؟"

"بابا! ہم چاروں میں سے کوئی بھی تو نہیں......" نگین کہتے کہتے رک گئی۔

"پسند نہیں کرتا۔" جلیس الحسن نے اُس کا ادھورا جملہ مکمل کیا پھر بولے "میں جانتا ہوں یہ بات، بلکہ بہت اچھی طرح جانتا ہوں لیکن بیٹا مسئلہ وہی ہے جو کہ پہلے تھا یعنی گھر میں ایک عورت کی ضرورت ہے۔"

"بابا! کوئی بات نہیں نگی باجی تھوڑے دنوں میں اور بڑی ہو کر عورت بن جائیں گی۔" زرین نے کہا۔
اور اُس کی اس بات پر جلیس الحسن ہی نہیں بلکہ نگی اور اعجاز بھی مسکرا دیے۔

"بیٹا! اس گھر کے لیے ایک ماں یا ایک عورت چاہیے۔"

"وہ آئی تو تھیں پاپا لیکن...... انھوں نے کیا کیا؟" اعجاز تلخی سے بولا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو یار۔" وہ قدرے بے تکلف فضا ہموار کرنے کی کوشش میں بولے "مگر میں سمجھتا ہوں کہ ایک اور موقع دے دینے میں کوئی ہرج نہیں۔"

"پاپا! ان کے جانے کے بعد سب کچھ اتنا اچھا اور ٹھیک ٹھاک تو چل رہا ہے پھر ایسا موقع دینے کی اور کیا ضرورت؟" نگین نے ناگواری سے کہا۔

"تم بھی ٹھیک کہتی ہو۔ واقعی اُن کے جانے کے بعد سے سب کچھ بہت اچھا اور ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے مگر بیٹے میں کھل کر بات کروں تو بات یہ ہے کہ آج نہیں تو کل جب آپ لوگوں کی شادی بیاہ کے مراحل آئیں گے تو ایک ماں یا ایک عورت کی ضرورت لازماً ہو گی۔"

"پاپا! نگین نے تیکھی نگاہوں سے انھیں دیکھتے ہوئے کہا "کیا جن کی مائیں نہیں ہوتیں اُن کی شادی نہیں ہوتی؟"

"اور کون سی وہ ہماری سگی ماں ہیں۔" اعجاز نے گرہ لگائی۔

جلیس الحسن سمجھ گئے کہ بے خوف ماحول کے پروردہ، شہر کے بہترین انگریزی تعلیمی اداروں میں زیرِ تعلیم بچوں سے نمٹنا چنداں کارِ آسان نہیں۔

چنانچہ انھوں نے قصے کو طول دینے کے بجائے مختصر کرتے ہوئے کہا "مجھے آپ لوگوں کی ہر بات سے سو فی صد اتفاق ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ انھیں ایک چانس اور دینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔" وہ رُک کر پھر بولے "جب پاپا آپ کی ہر بات سے اتفاق کرتے ہیں تو بیٹے جی پاپا کی ایک بات سے آپ لوگوں کو بھی اتفاق کر لینا چاہیے...... اور یہ میرا وعدہ ہے کہ اگر اب کی بار اس عورت نے گڑبڑ کی تو پھر اس گھر کے دروازے اس پر ہمیشہ کے لیے بند ہو جائیں گے۔"

نگین اور اعجاز نے ایک دوسرے کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھا پھر اعجاز نے کہا "پرومس؟"

"بالکل پکی بات۔"

"پھر کبھی نہیں آئیں گی وہ یہاں؟" اعجاز کا انداز مشروط تھا۔

"کبھی نہیں۔"

"آل رائٹ ڈن۔" اعجاز نے شانے اُچکاتے ہوئے کہا "دے کر دیکھ لیں ایک اور موقع۔"

"تھینک یو...... تھینک یو مائی سن۔" اور انھوں نے نگین کی جانب دیکھتے ہوئے کہا "تم تو ہمیشہ بھائی کا ساتھ دیتی ہو۔" پھر وہ فراز اور زرین کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولے "اور ان دونوں کا ووٹ تو تم دونوں ہی کے ساتھ ہو گا۔"

ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ اہم ترین مسئلہ کہ جسے وہ بڑی آسانی کے ساتھ حل ہو جائے گا اور وہ اُلفت کی گھر واپسی کے سلسلے میں بچوں کی جانب سے اعتماد کا ووٹ حاصل کرنے میں اتنی جلدی کامیاب ہو جائیں گے...!

ولیمے کی شام وہ سراپا انتظار بن گئی۔
اگرچہ جلیس الحسن نے اُس سے آنے کا وعدہ تو کیا تھا۔
مگر دل کو دھڑکا سا لگا تھا کہ
خدا جانے وہ وعدہ نبھائیں گے بھی یا نہیں!
آئیں گے یا دغا دے جائیں گے!
اُن کے اس وعدے کی بابت اُس نے کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا۔
امی اور بابا کو بھی نہیں جنھیں اُس نے اپنی شکست خوردگی کی خبرِ افشا سنادی تھی۔
اس ضمن میں رازداری برتنے کا سبب یہ تھا کہ

وہ اُن کے نہ آنے کی صورت میں دوسروں کے سامنے خفت اور پشیمانی سے بچنا چاہتی تھی۔

اور اُن کے آنے کی صورت میں دوسروں کا ردِعمل دیکھنا چاہتی تھی۔

اُسے میکے بیٹھے جو تھا بیس برس ہونے کو آیا تھا اور اس دوران اُس نے لوگوں کو اتنے رنگ بدلتے اور روپ دھارتے دیکھا تھا کہ خود اپنی ذات بھی اُسے بے بھرم محسوس ہونے لگی تھی۔

اوروں کا تو شکوہ کیا سگے بھائی بہنوں کے رُخ بدل گئے تھے!

عظمت آپا جن کے لیے مناسب بر کے انتظار میں خود اُس کے کئی سنہری سال سنولا گئے تھے اور وہ کبھی اس سلسلے میں حرفِ شکایت زبان پر نہ لائی تھی جن کی ایک آواز پر وہ "یور موسٹ او بیڈئینٹ میڈ" بن جایا کرتی تھی جن سے اسے اتنی محبت تھی کہ شاید اگر کبھی انھوں نے جان بھی مانگی ہوتی تو اس نے دریغ نہ کیا ہوتا۔

جن کی شادی کے بعد بھی وہ دامے، درمے، سخنے اُن کے کام آنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہا کرتی تھی۔ اُن کے بچوں کی پیدائش، اُن کے دکھ سکھ، اُن کی علالتیں، خریداریاں، سالگرہیں، عقیقے، اسکول میں داخلے کی تیاری، داخلہ ٹیسٹ، ماہانہ ٹیسٹ، ششماہی اور سالانہ امتحانات، یونیفارموں کی سلائی۔ غرض کون سا موقع تھا جب اُس نے آپا کی مدد اور معاونت سے انکار کیا ہو۔

مئی جون کی تپتی دوپہریں بھی اگر وہ آکھڑی ہوتیں کہ اُنہیں شاپنگ کے لیے بازار چلنا ہے تو وہ گرمی، دھوپ اور اپنی تھکن بھول کر ایک دم اُن کے ساتھ جانے کو اُٹھ کھڑی ہوتی تھی اور گھنٹوں اُن کے ساتھ گھومتی پھرتی تھی۔

جب اُن کے بڑے لڑکے عدنان کو یرقان ہوا اور وہ تقریباً ڈیڑھ ماہ اسپتال میں داخل رہا تو اُن کی ساس نندیں، جٹھانی اور دیورانیاں تو کوٹھے کوٹھے منہ دکھانے اسپتال آیا کرتی تھیں۔ وہی تھی جو اس موقع پہ آپا کے اس طرح کام آئی تھی کہ عظمت آپا کی جگہ کوئی احسان ماننے والی بندی ہوتی تو ساری زندگی اس کا یہ احسان نہ بھولتی۔

اس موقع پہ دن رات ایک کر دیا کرتی تھی بجھتی کے بعد گھر جانے کے بجائے اسپتال چلی جاتی اور صبح وہیں سے اسکول جایا کرتی تھی۔ ایک دو نہیں مسلسل گیارہ راتیں اُس نے پلک جھپکائے بنا عدنان کے سرہانے بیٹھ کر گزاری تھیں۔ عظمت آپا کو وہیں سے گھر بھیجتی تھی کہ آپ دولھا بھائی اور دوسرے بچوں کا خیال رکھیے۔ عدنان کی دیکھ بھال کو میں ہوں اس کے پاس۔

شروع شروع تو ڈاکٹر اور نرسیں، دوسرے مریض اور اُن کے ورثا یہی سمجھا کرتے تھے کہ عدنان کی ماں وہی تھی۔

پھر جب سب کو پتا چلا کہ وہ ماں نہیں خالہ تھی تو سب کہتے تھے "بھئی شاباش ہے خالہ ہو تو ایسی جاں نثار اور بے غرض!"

عدنان کا یرقان کے شدید حملے سے بچ جانا اگر ایک معجزہ تھا تو شاباش الفت کو بھی تھی کہ اُس نے بھانجے کی دیکھ بھال میں نہ دن کو دن سمجھا تھا نہ رات کو رات۔

اور ایک عدنان کی بیماری ہی کا کیا ذکر بہت سے موقعے ایسے آئے تھے جب وہ انتہائی بے غرضی سے عظمت آپا کے کام آئی تھی۔

مگر جب اُس کا موقع آیا تو ماسوا شروع کے چند دنوں کے عظمت آپا نے اس کی غمگساری کی ویسی کوشش نہیں کی جیسی کہ اُن کا حق بنتا تھا بلکہ بعد میں تو وہ کچھ بیزاری کا اظہار کرنے لگی تھیں۔

تہنیت کی شادی کے موقع پر بالخصوص اُن کا رویہ بہت اہانت آمیز ہو گیا تھا۔

فضیلت کے ساتھ حسنِ سلوک میں اُس نے کون سی کسر چھوڑی تھی۔ اُس کی شادی میں جس جوش و خروش سے حصہ لیا، جس محنت اور خلوص کے ساتھ اُس کے جہیز کی تیاری میں مدد و معاونت رہی اُسے دیکھ کر اپنے پرائے سب ہی انگشت بدنداں رہ گئے تھے۔

"کمال ہے بھئی بہن ہو تو ایسی کہ ذرا اس بات کا ملال نہیں دکھائی دیتا الفت کے چہرے پہ کہ مجھ سے چھوٹی بہن پہلے اپنے گھر بار کی ہو رہی ہے۔"

سب ہی نے اُس کی اس خوبی کا اعتراف کیا تھا اور سراہا تھا۔

اپنے حصے کا بیشتر جہیز اُس نے فضیلت کو دے ڈالا تھا۔

ایمان کی بات تھی امی نے تو کہا تھا۔ "اے الفت بیٹی! یہ تو تمہارے لیے رکھا ہے۔"

مگر اُس نے بڑی بے غرضی سے کہہ دیا تھا۔ "امی! اس وقت فضیلت کا پہلا حق ہے کیونکہ وہ اپنے گھر جا رہی ہے۔" ذرا خود غرضی جو دکھائی ہو اُس نے۔

یا ملال ظاہر ہونے دیا ہو۔

شادی میں ایسے بڑھ چڑھ کر خوشی کا اظہار کیا کہ خاندان کی وہ ساری بڑی بوڑھیاں جو اپنے تجرباتِ زندگی کی بنا پر دعوے کیے بیٹھی تھیں کہ چھوٹی بہن کی پہلی شادی ہو جانے کا الفت پر بڑا نفسیاتی اثر پڑے گا دانتوں میں انگلیاں دبا کر بیٹھ گئیں۔

پھر فضیلت کے ہاں پہلے بچے کی پیدائش پر جس چاہت سے اُس نے چھوچھک تیار کروانے میں حصہ لیا، اُسے دیکھ کر تو بعض بڑی بوڑھیاں بے ہوش ہوتے ہوتے بچیں۔

"اے ہے! ذرا افسوس دکھائی نہیں دیتا الفت کے چہرے پر اس بات کا کہ میری چھوٹی بہن تو ماں بننے والی ہے اور میں ابھی ماں باپ کے گھر ہی بیٹھی ہوں۔"

الفت کے کانوں تک جب ایسی باتیں پہنچتیں تو وہ ہنس دیتی۔

"تو بھلا یہ بھی کوئی ملال کی بات ہے...... اپنی اپنی قسمت ہے بھئی۔"

جب فضیلت کے میاں نیا مکان خریدنے لگے اور ۳۵ ہزار روپوں کی کمی پڑی تو بابا اور بھیا دونوں یہ رقم دینے کو تیار تھے مگر اُن سے پہلے اُس نے ۳۵ ہزار کا چیک لکھ کر فضیلت کے حوالے کر دیا تھا۔ اگرچہ اُس نے لاکھ کہا کہ بابا سے لے لیں گے، بھیا سے لے لیں گے مگر اُس نے بڑی محبت سے فضیلت کو سمجھایا۔

"دیکھو! بابا کو سرٹیفکیٹ کیش کرانا پڑیں گے جبکہ بھیا اور بھابی اپنی بچت پرائز بانڈز کی صورت میں رکھتے ہیں انھیں بانڈز بھنانے پڑیں گے جبکہ میرے پاس رقم بینک میں پڑی ہے۔ تم یہ چیک بینک بھجوا دو گی اور یہ کیش ہو جائے گا نہ دیر ہو گی نہ کوئی دقت...... میں تمہاری بہن ہوں کوئی غیر تو نہیں جو تم تکلف برت رہی ہو۔ بہنیں ہی بہنوں کے کام آتی ہیں۔ آج تمہیں ضرورت ہے تو کل مجھے ہو گی تم سے ہی لوں گی کسی غیر سے تھوڑی مانگنے جاؤں گی۔"

اگرچہ پرانا مکان فروخت ہوتے ہی فضیلت نے سب سے پہلے الفت ہی کے پیسے واپس کیے تھے مگر وقت پہ پوری محبت اور بے غرضی سے تو الفت ہی سب سے آگے تھی کام آنے والوں میں۔

اور بھی

اور بھی بہت سے موقعے تھے جب اُس نے عظمت آپا کی طرح فضیلت کے سلسلے میں بھی محبت اور خلوص کا ثبوت دے کر اپنا کر اُس کی بہن ہونے کا حق ادا کیا تھا۔

لیکن جب اُس کی باری آئی۔

جب اُس پہ افتاد پڑی۔

تو فضیلت نے چھوٹی ہونے کے باوجود بھی اُسے کبھی بالواسطہ اور کبھی بلاواسطہ باتیں سنا دینے سے گریز نہیں کیا۔

عظمت آپا اور فضیلت دونوں کو بس اپنی اپنی پڑی تھی۔

الفت کے میکے آبیٹھنے کی خبر کو اپنے شوہروں اور سسرالیوں سے چھپاتے رکھنے کی کوشش میں وہ یوں ہلکان ہوئی جاتی تھیں جیسے خدانخواستہ وہ کوئی بڑا کام کر آئی تھی۔ یا اس دنیا کی پہلی لڑکی تھی جو میاں کے گھر سے خفا ہو کر میکے آبیٹھی تھی۔

عظمت آپا اور فضیلت سے قطع نظر بھیا، بھابی اور اُن کے بچوں کے لیے بھی جو تھے تو اس کے بھتیجے ہی وہ کب پیچھے رہی تھی!

بھاوج کو ہمیشہ بہنوں کی طرح چاہا۔ جو چیز اپنے لیے پسند کی اُن کے لیے بھی ضرور لائی۔ اپنے ہاتھوں سے پکا کر کھلایا۔ اپنی گرہ سے خرچ کر کے انھیں پہنایا اور خوش ہوئی۔

بھتیجیوں کی کون سی فرمائش تھی جو رد کی ہو۔ رات گیارہ بجے بھی اگر انھوں نے کہہ دیا کہ پھپھو جی! فلاں چیز چاہیے تو اُن کی فرمائش پوری کرنے کو پا بہ رکاب ہو جایا کرتی تھی۔

رہے بھیا تو وہ اُن کے لیے تو ہر لمحہ اپنی آخری سانس تک بھی دینے کو تیار رہا کرتی تھی۔ وہ گھر سے نکلتے تو دعاؤں کے پہرے کے پہرے اُن کے پیچھے روانہ کر دیتی اور جب بخیریت گھر لوٹ آتے تو شکرانوں کے پُل باندھ دیتی۔

اپنی جمع پونجی کو تو خیر اس نے بھائی بھتیجیوں سے زیادہ بڑھ کر اہمیت دینے کی کبھی موہوم سی بھی کوئی کوشش نہیں کی۔ اُس نے تو کبھی خود غرضی دکھانے کی کوشش نہیں کی۔

لیکن جب اُس پر آزمائش کا وقت آیا تو بھابی نے جو دن کے اجالوں میں بہت مہربان، مشفق اور ہمدرد نظر آیا کرتی تھیں، رات کی تیرگی میں بڑے تحکمانہ پن سے کہہ دیا:

"وہ الفت نے ہمارے باندھے ہاں تو کرلی تھی مگر اوّل دن سے اُس کا نباہ کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔"

اور یہ کہ:

"سوچا تھا تہنیت اپنے گھر چلی جائے گی تو اُس کا کمرہ ارشد اور ماجد کے لیے سیٹ کردوں گی، بے چارے بچوں کو ڈرائنگ روم میں سونا پڑتا ہے۔ مگر الفت گئی گوائی واپس آگئیں اور مجھے تو اب واپس جاتی لگتی نہیں۔ کنوارین کا لیبل اُترتا تھا سو اُتر گیا اب یہیں راج کریں گی۔ سچ کہتی ہوں ذرا جو ملال دیکھا ہو میں نے الفت کے چہرے پر اس بات کا کہ میاں کو چھوڑ کے میکے میں بیٹھی ہوں۔"

یہ تو بہت قریبی لوگوں کے بدلے ہوئے رنگ تھے۔

ورنہ گھاؤ تو اور بھی بہت سے کھائے تھے دل نے گزشتہ چند ماہ کے دوران۔

وہ تن تنہا تھی۔

اور تیر ہر سمت سے برسائے گئے تھے۔

بالآخر وہ اوندھے منہ گر پڑی تھی۔

اور تب اُس نے بہت ایمانداری سے سوچا تھا کہ اتنی یا شاید اس سے بھی کم اذیت برداشت کر کے تو وہ اس میدان کی فاتح قرار پا سکتی تھی جہاں سے بددل ہو کر وہ میدان چھوڑ بھاگی تھی۔

اذیت کے انہی لمحوں میں اُس نے ہیں دیوار لیٹے شکست خوردہ تیمور کی طرح اپنے مورچے پر لوٹ جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

شام ڈھلتے ہی وہ سراپا انتظار بن گئی تھی۔

جوں جوں تہنیت کے رخصتی میں جانے والے مہمان گھر میں جمع ہوتے گئے اُس کے دل پر بیتابی سی طاری ہوتی چلی گئی۔

"خدا جانے وہ آئیں گے بھی یا نہیں؟" وہ سہم کر بار بار سوچتی۔

"اگر نہ آئے تو!" بار بار یہ خدشہ اُس کے ذہن میں سر اُٹھاتا۔

ہر آہٹ پر، ہر گاڑی کے ہارن پر اُس کے کان کھڑے ہو جاتے۔

"کہیں وہی نہ ہوں!" دل سرگوشی کرتا۔

وہ انتظار کرتی رہی۔

کرتی رہی

یہاں تک کہ انتظار ماند پڑنے لگا۔ "اور چلو بھئی بہت دیر ہو گئی!" کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔

کارنشین کاروں میں اور بے کار چلتے بجھتے قمقموں سے آراستہ کوسٹرز میں بیٹھنے لگے۔

عظمت آپا اپنی گاڑی میں اپنے دولہا کے ساتھ اگلی نشست پر بیٹھیں۔ ان کی ساس اور بچے پچھلی نشست پر تھے۔

فضیلت اپنی فوکسی میں اپنے میاں کے ساتھ اگلی نشست پر براجمان تھی جبکہ پچھلی نشست پر اُس کی نند اور بچے تھے۔ بھیا کے ساتھ اگلی نشست پر بابا بیٹھے تھے، پچھلی نشست پر بھابی، امّی اور دونوں بچے۔

الفت سے کسی نے نہ پوچھا کہ وہ کونسی گاڑی میں بیٹھنے جا رہی ہے۔

ساری خواتین ہار گجروں سے لدی پھندی تھیں۔ اُس کے حصّے میں بھی ایک گجرا آیا تھا مگر اس طور کہ بھابی نے کہا "لو الفت یہ ایک گجرا بچا ہے تم اپنے جوڑے میں لپیٹ لو۔"

اُس نے بھابی سے گجرا لے تو لیا تھا مگر اپنے بالوں میں آراستہ کرنے کے بجائے امّی کی ہزار نہ نہ اور تمرد کے باوجود اُن کے بالوں میں آراستہ کر دیا تھا کہ اُس کے خیال میں امّی کے بالوں میں اُسے زیادہ سجنا تھا آخر کو وہ بھی سہاگن تھیں اور بابا کے ساتھ اُن کی ازدواجی زندگی قابل رشک تھی۔

وہ بھیا کی گاڑی کے پیچھے کھڑی کوسٹر میں بیٹھ چکی تھی اور کھڑکی سے سر ٹکائے اس ہجوم رنگ و بو میں بھی خود کو یکسر تنہا محسوس کرتے ہوئے انتہائی دل گرفتہ ہو رہی تھی کہ کھڑکی کے شیشے پر دستک نے اُسے چونکنے پر مجبور کر دیا۔

اُس نے دیکھا اور دیکھتی ہی رہ گئی۔

ذرا دیر کو تو اُسے حقیقت پر بھی خواب کا سا گمان گزرا۔

جلیس الحسن نے دغا نہیں دی تھی۔

وعدہ نبھایا تھا۔

وہ آگئے تھے۔

اور اب کنڈیشنڈ کوسٹر کی بند کھڑکی کے اُس پار بہت نزدیک کھڑے تھے۔

اُس نے بے اختیار کھڑکی کھول دی۔

"میں تمہیں تلاش کر رہا ہوں اور تم یہاں بیٹھی ہو۔" انھوں نے کہا۔

اُس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔

اپنا زرتار دوپٹہ سنبھالتی وہ اٹھی اور بے حد عجلت میں کوسٹر کے دروازے کی طرف لپکی۔

"واقعی آپا! کھڑکی کا دروازہ تو بند کرتی جائیے۔" نہ جانے کس نے کہا مگر اس وقت اسے کسی اور کی بات پر توجہ دینے کی فرصت نہ تھی۔

اور ذرا سی دیر میں یہاں سے وہاں تک ایک شور سا مچ گیا۔

"الفی کے دولہا آگئے۔"

"جلیس الحسن آگئے۔"

"جلیس صاحب آگئے!"

"جلیس میاں آگئے۔"

"جلیس بھائی آگئے!"

گاڑیوں میں بیٹھے بٹھائے لوگ گاڑیوں سے نکل آئے۔

امّی، بابا، تائی اماں، چچا جان، چچی جان، بڑی پھوپی جان، چھوٹی پھپو، چھوٹے پھوپا، بھیا، بھابی، عظمت آپا، اُن کے دولہا، فضیلت، اُس کے میاں اور نہ جانے کون کون!

ان سب نے جلیس الحسن کے اور اُس کے گرد گھیرا سا ڈال دیا تھا۔

اور اُسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ دو دالیہ ہوتے ہوتے بچ گئی ہو۔

بالکل آخری لمحوں میں!

وہ خود کو معتبر محسوس کر رہی تھی۔

اور معتبر بھی!

اُسے یوں لگ رہا تھا جیسے اُسے اپنی شناخت کے لیے ایک معتبر حوالہ مل گیا ہو۔

جلتی بجھتی روشنیوں کے سحر انگیز اجالوں میں وہ ایک ایک کو دیکھ رہی تھی۔

امّی اور بابا مطمئن اور مسرور ہی نہیں بلکہ خود اس کی طرح مغرور لگ رہے تھے۔

باقی ہر نگاہ میں جدا کیفیت تھی۔

کہیں اشتباہ تھا

کہیں رشک

کوئی نگاہ بے یقینی میں ڈوبی دکھائی دیتی تھی۔

کوئی حیران تھی

ہر نگاہ میں ایک سوال تھا!

"جلیس الحسن اچانک کیونکر آگئے؟"

اس سوال کا جواب فقط الفت ہی دے سکتی تھی۔

وہی جانتی تھی کہ جلیس الحسن کو وہاں بلا کر اُن کے حوالے سے خود کو معتبر، مغرور، سربلند اور سرخرو قرار دینے کی خاطر اُسے اپنی انا کو سولی پر لٹکانا پڑا تھا۔ اُس نے اس عورت کو جو ہر عورت کی طرح اپنے لیے خوشیوں کے ہنڈولے چاہتی تھی ہمیشہ کے لیے مار ڈالا تھا۔

"آپ کے آنے سے بڑی خوشی ہوئی جلیس میاں۔" بابا نے رسمی علیک سلیک کے بعد کہا۔ "آپ کی شرکت سے تقریب کی رونق دوبالا محسوس ہوگی۔ اچھا آپ سے تفصیلی باتیں تو تقریب کے دوران رہیں گی۔ دیر ہو رہی ہے آپ بسم اللہ کیجیے گاڑی میں بیٹھیے۔"

"جی بہتر۔" وہ بولے پھر انھوں نے الفت سے کہا "چلیں جناب۔"

وہ ان کی معیت میں اُن کی لشکارتے ارتی کار کی طرف چل دی۔

اس کے لیے کار کا دروازہ انھوں نے خود وا کیا۔ پھر گاڑی کے اگلے دائیں دروازے سے اُس کے برابر میں آ بیٹھنے کے بعد بولے: "یہاں سے روانگی کتنی دیر بعد ہے؟"

"بس بیٹھ رہے ہیں وہ لوگ گاڑیوں میں۔"

"اپنے ساتھ بٹھانا ہے کیا کسی کو؟"

"نہیں۔" اُس نے بلا تامل کہا۔

مگر اس لیے نہیں کہ وہ کسی کے لیے اپنے دل میں گنجائش نہ پا رہی تھی بلکہ اس لیے کہ وہ ان سے ملاپ کے ان لمحوں میں کسی اور کو اُن کے اور اپنے مابین حائل نہ ہونے دینا چاہتی تھی۔

وہ زیرِ لب مسکراتے اس کی طرف مڑ کر ترچھے ہو بیٹھے۔

"کیسی ہو؟" انھوں نے اپنی نگاہیں اُس کے چہرے پر گاڑ دیں۔

خدا جانے کیوں اُس کا جی بھر آیا۔

لبوں کے گوشے پھڑکنے لگے۔

اور وہ ایک دم ہی بے حد جذباتی ہو گئی۔

وہ اس کی کیفیت تاڑ گئے۔

اُس کے ذرا سا اور نزدیک ہوتے ہوئے انھوں نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اُسے یوں لگا جیسے یک بیک وہ کسی پناہ گاہ میں آ گئی ہو۔

"بولو کیسی ہو؟" انھوں نے پھر پوچھا۔

"آپ کی بلا سے کوئی مرے یا جیے۔"

"خیر جی تو تم رہی ہو اور میرے اطمینان کے لیے یہ بات بہت کافی ہے۔"

"اتنی دیر سے کیوں آئے آپ؟"

"تاکہ تم اعتراف کر سکو کہ میں تمہارے لیے اہم ہوں۔"

"وہ تو ہر مرد اپنی عورت کے لیے ہوا کرتا ہے۔"

"واقعی!" وہ چونک کر بولے۔

اور یہی وہ اعتراف تھا جو عاصمہ نے اُن کے ساتھ اپنی اٹھارہ سالہ رفاقت میں ایک بار بھی اس قدر کھلے دل سے نہ کیا تھا۔

"ہاں!" اُس نے دھیرے سے کہا۔

مرد عورت سے اور چاہتا ہی کیا ہے سوائے اس کے کہ وہ اس کی بڑائی اس کی اہمیت کو تسلیم کر لے۔

"ارے یہ وہی سوٹ ہے نا جو تم نے ماسٹر سے سلوایا ہے؟"

"آپ کو کیسے معلوم؟"

"بچیوں کے کپڑے لینے گیا تھا تو مجھے ہینگر میں لٹکے تمہارے چاروں جوڑے دکھا کر کہنے لگا: بیگم صاحبہ سے کہیے گا کپڑے بالکل تیار ہیں اگر وہ کمی بیشی ناپ کے ہاتھ پوری کروانے کی غرض سے مجھے یہ ہدایت نہ کر گئی ہوتیں تو میں ابھی اسی وقت آپ کے ساتھ کر دیتا۔" وہ ٹھہر کے پھر بولے: "کیوں منع کر آئی تھیں جی تم اُسے؟"

"تاکہ اُسے کچھ پتا نہ چلے!"

"یہ سوچا تھا لمحہ بھر کو بھی کہ ایسی باتیں کتنے دن چھپائی جا سکتی ہیں!"

وہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کے رہ گئی۔

یہ بات وہ اس سے کہہ رہے تھے!

اُس سے!

جو پل صراط کا سفر طے کر آئی تھی۔

"گھر کیسا ہے؟" اُس نے دھیرے سے پوچھا۔

"تمہاری بلا سے بنے یا بگڑے۔" انھوں نے بالکل اسی کے لہجے میں کہا۔

"پلیز! اب کبھی ..... کبھی مت کہیے گا ایسی بات۔"

"کیوں؟"

"کیوں کہ کوئی بھی عورت اپنا گھر بگاڑنا نہیں چاہتی۔"

"گڈ!" وہ اُسے توصیفی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولے۔

"بس اب چل دیے ہیں لوگ۔" وہ ونڈ اسکرین کے اس پار آگے کھڑی گاڑیوں کو دھیرے دھیرے حرکت میں آتے دیکھ کر بولی۔

جلیس الحسن سیدھے ہو بیٹھے اور انھوں نے اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔

کوسٹر میں بیٹھی شوخ و شنگ لڑکیوں نے جھانجھریں بجا بجا اور گیت گانا شروع کر دیے تھے۔

کچھ دیر بعد جب یہ پُر مسرت قافلہ شہر کی روشن سڑکوں سے گزرنے لگا تو انھوں نے گردن بائیں رُخ گھما کر ذرا کی ذرا اس کی طرف دیکھا اور بولے: "تم نے اپنے گھر کا حال تو پوچھ لیا گھر والوں کا نہیں پوچھا۔"

چند لمحوں کو تو وہ سکتے میں رہ گئی۔

اُس کے دل میں ایک جارحانہ لہر اٹھی۔

اور اُسے یوں لگا جیسے یہ تند لہر ریت کے ان تمام پکے بندوں کو بہا کر لے جائے گی جو اس نے پچھلی نصف شب سے آج شام تک باندھے تھے۔

لیکن پھر اُس نے اپنی اس کیفیت پر قابو پاتے ہوئے بڑے تحمل سے پوچھا: "کیسے ہیں سب؟"

"سب کون؟"

"ہمارے بچے!"

اب گویا اُن کی باری تھی۔

چند لمحوں کو تو اُن پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔

اُن کے گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ ایک ہی جست میں وہ تمام کٹھن منازل عبور کر جائے گی جنھیں وہ مرحلے وار طے کروانا چاہ رہے تھے۔

اُس نے تو انھیں اپنی وہ کڑی شرائط سنانے کی مہلت ہی نہ دی جو تمام کی تمام بچوں ہی سے متعلق تھیں۔ "ہمارے بچے" کہہ کر اس نے اگلے پچھلے تمام جھگڑوں پر خاک ڈال دی تھی۔

کچھ دیر کو وہ دونوں ہی چپ ہو رہے۔

پھر انھوں نے کہا: "کیا میں یقین کر سکتا ہوں اُلفت کہ تم میرے بچوں کو قبول کرنے اور ماں کی ان بننے میں کسی قسم کا تامل نہیں دکھاؤ گی؟"

لمحہ بھر میں اس پر قیامت سی گزر گئی!

نہ جانے کتنے پل صراط طے کر گئی وہ!!

پھر اُس نے دھیمی آواز میں کہا: "وہ اب میرے بچے ہیں۔"

"وہ نالائق اور بدتمیز بچے!" جلیس الحسن نے طنزاً کہا۔

"اگر تعلقات کی استواری مطلوب ہے تو براہِ کرم طنز فرمانے کی کوشش نہ کیجیے۔" وہ قدرے تلخی سے بولی۔

"آل رائٹ۔" وہ زیرِ لب مسکرائے پھر بولے: "مگر ایک بات ضرور پوچھوں گا تم سے۔"

"جی پوچھیے۔"

"یہ انقلابِ عظیم کیوں اور کیسے؟"

اُس نے ایک گہری سانس کھینچی پھر ونڈ اسکرین کے اس پار عروس البلاد کی پُر ہجوم سڑکوں پر رنگ برنگی روشنیوں سے نظریں چار کرتے ہوئے بولی: "آپ نے یقیناً یہ بات سُنی ہوگی کہ زمانہ بہت بڑا معلّم ہے۔" اس نے پل بھر کو خاموشی اختیار کرنے کے بعد کہا: "ویسے بابا نے مجھے آج صبح بدرجہا خوبصورت بات سُنائی۔"

"ذرا ہمیں بھی تو سناؤ۔"

"بابا نے رومی شہنشاہ مارکس آریلیئس کا ایک قول مجھے سُنایا کہ وہ کہتا تھا: خوشی صرف ان لوگوں کو حاصل ہوا کرتی ہے جو اپنے اوپر حکومت کرنا جانتے ہیں۔"

"بہت خوب!"

پیٹرول پمپ سے ناظم آباد کی طرف جانے والا سگنل بند ہوا تو قافلے میں شامل گاڑیاں ایک دوسرے کے آگے پیچھے، دائیں بائیں اور دوسری گاڑیوں کے آگے پیچھے رک گئیں البتہ بھیا کی گاڑی اور اُن کے پیچھے پیچھے ایک لگژری کوچ سگنل بند ہونے سے پہلے ہی آگے نکل گئی تھیں۔

گلاب اور موتیا کے گندھے گجرے اور کلائی بند بیچنے والے نو عمر لڑکے سگنل بند ہوتے ہی ٹریفک کے رکتے ہی سگنل کی تینوں سمتوں میں رکی گاڑیوں کی جانب لپکے اور گاڑیوں میں بیٹھی بیگمات کے لیے اُن کے صاحبان کی توجہ تازہ بہ تازہ گجروں اور کلائی بندوں کی جانب مبذول کرانے کی کوشش کرنے لگے۔

جلیس الحسن نے اپنے سابقہ معمول کے مطابق اُس کے لیے گجرے اور کلائی بند خرید لیے۔

الفت کو اُن کے خریدے ہوئے گجرے اور کلائی بند پہنتے ہوئے یوں لگا جیسے تہنیت کے ولیمے میں جانے والے اس قافلے میں شامل اگلی پچھلی تمام گاڑیوں میں بیٹھی ناریوں کے گجرے اُس کے گجروں اور کلائی بندوں کے سامنے ہیچ ہو گئے ہوں ——

اتنی مسرور

ایسی مغرور

اور ایسی دلربا سہاگن تو اُس نے خود کو اس سے پہلے کبھی محسوس نہ کیا تھا۔

اُن کی گاڑی کے پیچھے لگژری کوچ میں بیٹھی لڑکیاں خوب زور زور سے جھانجھریں بجاتے ہوئے جھوم جھوم کر گا رہی تھیں۔

الفت اتنی خوش تھی کہ اُسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ تہنیت کے نہیں خود اپنے ہی ولیمے میں شرکت کرنے جا رہی ہو۔

وہ دعویٰ کر سکتی تھی کہ اس رواں دواں قافلے میں اس سے زیادہ مسرور عورت اور کوئی نہ تھی!

اور وہاں تقریب میں پہنچنے کے بعد بھی اُس نے اپنے دعوے کو عملاً سچ کر دکھایا۔

آخری لمحوں تک جلیس الحسن نے اُسے ان بیش قیمت تحائف کی بات کچھ پتا نہ چلنے دیا جو وہ تہنیت اور اُس کے دولہا کے لیے لائے تھے۔

دھڑا دھڑ کیمرے چمک رہے تھے۔

مووی بنائی جا رہی تھی۔

جب دولہا اور دلہن کے ساتھ عزیز و اقارب کے گروپ بننے لگے تو کسی نے صدا لگائی: "ارے بھئی پہلے الفت جہاں اور اُن کے دولہا کے ساتھ گروپ بنا لو کیونکہ انھیں جلدی جانا ہے!"

وہ آئے تو دولہا دلہن کے لیے بیش قیمت تحائف بھی لائے جو انھوں نے الفت سے خدا جانے کہاں چھپا کر رکھے تھے اب تک۔

تہنیت کے لیے خوبصورت طلائی زیورات کے سیٹ اور اُس کے دولہا کے لیے ریمنڈ وائل کلائی گھڑی بطور سلامی دے کر جلیس الحسن نے الفت کا سر بھری محفل اونچا کر دیا۔

کیمروں کی روشنیوں سے نگاہیں چار کرنے کے بعد جب وہ تہنیت کو پیار اور اُس کے دولہا کو ڈھیروں دعائیں دینے کے بعد کیمروں کے سامنے سے ہٹی تو کیمروں کے بجائے انسانی آنکھوں کو کھٹا کھٹ اپنی اور جلیس الحسن کی تصویریں کھینچتے پایا۔

"کیا کسی سے کہا آپ نے کہ آپ کو جلدی جانا ہے؟" اُس نے اوروں سے علیحدگی میں اُن سے پوچھا۔

"ہاں! بابا سے۔"

"کیوں جلدی کیوں جانا ہے اور کہاں جانا ہے؟" اُس نے ایک ساتھ دو سوال کیے۔

"گھر کیونکہ بچوں کو زیادہ رات تک نوکروں کے رحم و کرم پر چھوڑے رکھنے کا میں قائل نہیں۔"

لمحہ بھر کو پھر ایک قیامت سی گزر گئی۔

لیکن پھر اُس نے بڑے تحمل سے کہا: "ٹھیک ہے کھانا شروع ہی ہونے والا ہے کھانے کے بعد چلتے ہیں۔"

اُسے دل کو ان قیامتوں کا عادی بنانا تھا کہ اسی میں عافیت تھی۔

اور اسی میں نجات بھی!

"چلتے ہیں!" انھوں نے استفہامیہ انداز میں اُس کا یہ فقرہ دُہرایا۔

"جی ہاں۔"

"تو تم گھر چل رہی ہو؟"

اعترافِ شکست کے یہ آخری لمحے بہت جاں گسل تھے۔

مگر وہ ان سے بھی گزر رہی تھی۔

کھانے کے بعد جب وہ ان کے ہمراہ بابا اور امی سے اجازت لینے اُن کے پاس پہنچی تو بابا یہ سُن کر کہ وہ اپنے گھر جا رہی ہے مسکرا دیے۔

امی بھی خوش اور مطمئن نظر آ رہی تھیں۔

وہ چلتے چلتے جو روانسی ہونے لگی تو بابا نے اس کے سر پر ہاتھ دھرتے ہوئے اتنی آہستگی سے کہ فقط وہی سن پاتی، سرگوشی کی۔

"بیٹا! سمندر کی طرح وسیع القلبی کا مظاہرہ کرنا جو موتیوں ہی کو نہیں کنکروں کو بھی پیار سے اپنے دامن میں سمیٹے رہتا ہے۔"

سوا بارہ بجے کے لگ بھگ جب جلیس الحسن کی گاڑی "احسن لاج" کے صدر دروازے سے آنکھیں چار کرتی اُس کے باہر آ رکی اور جلیس الحسن نے چوکیدار کو اپنی آمد سے مطلع کرنے کے لیے ہارن بجانا شروع کیا تو وقت گزاری کی خاطر وی سی آر پر فلم دیکھتے اعجاز اور نگین کے کان کھڑے ہو گئے۔

فراز اور تزئین بھی ساڑھے گیارہ بجے تک تو اُن کے ساتھ ہی بیٹھے سٹرڈے نائٹ اسپیشل دیکھتے ہوئے باپ کا انتظار کرتے رہے تھے پھر فراز کو اس کے کمرے میں بھیجنے کے بعد نگین تزئین کو ہمراہ لیے اپنے کمرے میں چلی آئی تھی اور اسے زبردستی سلا دیا تھا حالانکہ وہ پاپا کی واپسی تک جاگتے رہنا چاہتی تھی۔ ان کی سوتیلی ماں کے جانے کے بعد پہلا موقع تھا کہ پاپا انھیں گھر پر چھوڑ کر خود اتنی دیر تک گھر سے باہر رہے تھے ورنہ عموماً وہ شام کو دفتر سے واپس آنے کے بعد گھر ہی پر رہتے تھے۔ تنہا کہیں جاتے بھی تو حد سے حد ساڑھے نو بجے تک لوٹ آیا کرتے تھے اور جاتے ہوئے اُن سے مل کر انھیں خدا حافظ کہہ کر ضرور جایا کرتے تھے جبکہ آج تو انھیں گھر سے نکلنے کی خبر ہی نہ ہوئی تھی۔

وہ چاروں تو اوپری ٹی وی لاؤنج میں بیٹھے پی ٹی وی پر موسیقی کا پروگرام دیکھ رہے تھے۔ اس پروگرام کے ختم ہونے کے بعد جب نگین نیچے اُتری تو ملازم نے بتایا کہ صاحب تیار ہو کر کہیں باہر گئے ہیں۔

"کہاں؟" نگین کے ذہن میں فوراً سوال اُبھرا۔

اور یہ خدشہ کلبلایا کہ کہیں وہ ان چاروں بہن بھائیوں کی دشمن جاں کی ہمشیرہ کے ولیمے میں تو نہیں گئے تھے۔

دعوت نامے کا پوسٹ مارٹم تو اُس نے اور اعجاز ہی نے کیا تھا اور وہ شادی اور ولیمے کی تاریخوں کو بھلا کیونکر ذہن سے محو ہونے دے سکتے تھے۔

اس نے اوپر جا کر اعجاز سے اپنے اس خدشے کا تذکرہ کیا تو وہ بولا: "پاپا کو اگر وہاں جانا ہوتا تو شادی میں ضرور گئے ہوتے۔"

"کچھ پتا نہیں، ہو سکتا ہے آج چلے گئے ہوں۔"

"ہاں یہ ہو تو سکتا ہے۔"

اور اُن کا یہ خدشہ درست ثابت ہو گیا تھا۔

جب وہ گاڑی کا ہارن بجنے کی آواز سُن کر لاؤنج سے نکلنے کے بعد ٹیرس میں آئے تو انھوں نے دیکھا پاپا کی گاڑی پورچ میں رک چکی تھی اور اُن کی سوتیلی ماں گاڑی سے باہر نکل رہی تھی۔

"شٹ!" اعجاز نے اپنے جبڑے پوری شدت سے باہم بھینچتے ہوئے کہا۔

"اس سے پہلے کہ وہ ہمیں دیکھیں ہمیں یہاں سے ہٹ جانا چاہیے۔" نگین نے بھائی کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔

"[illegible]" اعجاز نے بہن کے ہمراہ پلٹتے ہوئے کہا۔

"گھبراؤ مت بہنا..... پچھلی بار تو ہمیں سمجھایا گیا تھا مگر اب ہم سب مل کر انھیں ایسا تنگ کریں گے کہ یاد رکھیں گی۔"

"پیرڈس؟"
"پیرڈس!"
"پاپا سے تو ہم وعدہ لے ہی چکے ہیں کہ اگر اب کی بار اس نے گڑبڑ کی تو اس گھر کے دروازے اس پر ہمیشہ کے لیے بند ہو جائیں گے۔"
"بہت جلد جانی..... بہت جلد ایسا ہوگا۔ ہم سب مل کر انھیں ایسا نچائیں گے کہ یہ خود گھر چھوڑ کر بھاگیں گی!" نگین نے بڑے وثوق سے کہا۔
"آئی ہیٹ ہر۔" اعجاز نے کہا۔
"اب مجھے تم سے بھی زیادہ نفرت محسوس ہونے لگی ہے اس عورت سے..... پاپا کو ہمارے کتنا دور کر دیا تھا اس نے ہم سے۔"
"اب سب ٹھیک ہو جائیں گے۔"
"ہم نہیں ہونے دیں گے..... خیر اب اس وقت زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ شاید پاپا سونے سے پہلے اوپر آئیں۔ جاؤ تم اپنے کمرے میں جاؤ۔ میں بھی وی سی آر آف کر کے اپنے کمرے میں جاتی ہوں۔"
"او کے..... گڈ نائٹ۔"
"گڈ نائٹ۔"

کچھ دیر بعد اُن کی توقع کے عین مطابق جلیس الحسن نے اوپر کا چکر لگایا۔ اگرچہ اعجاز اور نگین دونوں ہی جاگ رہے تھے مگر اُن کے کمروں کے بند دروازوں اور کھڑکیوں سے چھن کر باہر آتے موہوم اندھیرے اور گہرے سناٹے نے انھیں اُن کے خوابیدہ ہونے کا تاثر دیا۔
"خدا جانے صبح الفت کو گھر میں دیکھ کر ان چاروں کا کیا ردِعمل ہوگا!" یہ سوچتے ہوئے انھوں نے نیچے کا رُخ کیا۔
اور
عین اسی لمحے زیریں منزل پر اُن کی خواب گاہ میں اپنے دونوں بازو پھیلائے بستری کی طرح گھومتی الفت یک بیک شاہانہ طرز کی مسہری پر چت جا پڑی۔
"ہوم سوئیٹ ہوم!" اُس نے ایک پر اطمینان سانس کھینچتے ہوئے چھت پر نگاہیں ٹکا دیں۔
"کتنا ترسی ہوں میں ان در و دیوار کو!" اس خیال کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں کے کنارے نم ہو گئے۔ پھر اُس نے خود کلامی کے انداز میں زیر لب کہا "کتنی خوش ہوں میں یہاں واپس آکر!" اور آنکھیں یوں موند لیں جیسے اطراف میں پھیلے منظر کو ہمیشہ کے لیے آنکھوں میں سمیٹ لینا چاہتی ہو۔
لیکن بھاری قدموں کی آہٹ نے اُسے آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیا۔
وہ اُٹھ بیٹھی۔
"بچے تو سو چکے!" وہ اس کی جانب پیشقدمی کرتے ہوئے بولے۔
الفت کے دل میں ایک شوریدہ سر لہر اٹھی۔
"پھر بھی!" اُس نے دانت بھینچتے ہوئے۔
دل آمادۂ بغاوت ہونے لگا۔
مگر اُسے پاپا کی بات یاد آئی:
"خوشی انھی لوگوں کو ملتی ہے جو اپنے اوپر حکومت کرنا جانتے ہیں۔"
تو گویا
اب اُسے اپنے جذبات پر حکومت کرنا تھی۔
جلیس الحسن اُس کے روبرو آٹھہرے۔
لبلباتی شلوار قمیص اور واسکٹ میں ملبوس اس وجیہہ اور پُروقار مرد کو دیکھتے ہوئے الفت نے جی ہی جی میں سوچا:
"کیسی بے وقوف تھی وہ عورت جو اس مرد کو چھوڑ گئی!"
"اس طرح کیوں دیکھ رہی ہو؟" وہ مسکرا کر بولے۔

اس نے محجوب ہو کر نگاہیں جھکا لیں۔
وہ اُس کے نزدیک بیٹھ گئے۔
اور اُسے اپنے بازوؤں کے حصار میں لیتے ہوئے بولے "کیا تم مجھے مس کرتی تھیں؟"
"بہت!" اُس نے اعتراف میں تامل سے کام نہیں لیا۔
پھر اُس نے اپنی جھکی ہوئی نگاہیں اٹھائیں۔
"کیا آپ نے مس کیا مجھے؟"
"ہر رات جاناں۔"
اُن کی قربت کا احساس اُسے ایک عجیب سی سرشاری دینے لگا۔
اُس کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوئی جا رہی تھیں۔
اور اُسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ آج ہی بیاہ کر اس گھر میں آئی ہو۔
"دو باتیں سنو گی میری؟" وہ آہستہ سے بولے۔
"جی!"
"میرے بچے آج بھی مجھے اتنے ہی عزیز ہیں جتنے کل تھے۔ میں آج بھی تم سے وہی درخواست کروں گا جو کل کی تھی۔" انھوں نے دو پل کو توقف کیا پھر بولے "اُن سے غلطیاں کل بھی سرزد ہوئی تھیں، آج بھی ہوں گی اور آئندہ بھی۔ انھیں تمہاری محبت اور توجہ کی ضرورت ہے۔ اُن کی لغزشوں اور کوتاہیوں پر ایک ماں کی حیثیت سے ان کی اصلاح کرنے کی کوشش کرو گی تو تمہارے رویے میں تلخی نہیں آئے گی اور تم خود کو سب کے دل پر حکومت کرتا پاؤ گی جہاں تم کل مجھے چھوڑ گئی تھیں۔"
ذرا دیر کو تو اُسے ملال نے آگھیرا۔
عجیب تھے وہ بھی!
ایک پل مائل بہ کرم
اور اگلے پل مائل بہ جفا۔
کیا بگڑ جاتا اُن کا اگر وہ قرب اور وصال کے ان جذباتی لمحوں میں پھر اسی موضوع پر گفتگو نہ کرتے۔
مگر وہ پچھلے راستوں پر اتنے دکھ اور اذیتیں بھگت آئی تھی کہ یہ دکھ پچھلے راستوں پر بھگتے گئے دکھوں اور اذیتوں کے مقابلے میں کہیں کم لگ رہا تھا۔
"کیا میں ان لمحوں کا اعتبار کر سکتا ہوں الفت؟" وہ ویسے ہی دھیمے سُروں میں بولے۔
"جی!" اُس نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔
"تم نے اسکول جوائن کر لیا تھا؟" اُن کے لہجے میں استفہامیہ کیفیت تھی۔
اس نے چونک کر ان کی طرف دیکھا اور بولی "آپ کو کس نے بتایا؟"
"ایک روز ایم اے جناح روڈ سے گزرتے ہوئے تمہیں ڈائریکٹوریٹ آف ایجوکیشن کی عمارت سے نکلتے دیکھا تھا۔"
"اور آپ رُکے بھی نہیں!" وہ شاکی لہجے میں بولی۔
"یقین جو نہیں تھا!"
"یقین!" اُس نے تذبذب کے عالم میں کہا "کس بات کا؟"
"کہ تم عام انا پرست عورتوں سے مختلف ثابت ہوگی اور اپنے گھر کو ٹوٹنے سے بچا لے جاؤ گی!"
شدتِ جذبات سے الفت کے لبوں پر ہلکی سی تھرتھراہٹ طاری ہو گئی۔
انھیں کیسے بتاتی کہ وہ کتنا مشکل راستہ طے کر کے دوبارہ ان کی طرف لوٹی تھی۔
اس کی جذباتی کیفیت کا اندازہ کرنا اُن کے لیے چنداں دشوار نہ تھا۔
اُسے سنبھالا دینے کو وہ اُس کے اور نزدیک ہو گئے۔

اوپر نگین اور اعجاز اپنے اپنے کمرے میں جاگ رہے تھے۔ نیند اُن کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔
الفت کا دوبارہ گھر لوٹ آنا انھیں بُری طرح کھل رہا تھا۔
"مجھ سے اگر بدتمیزی کرنے کی کوشش کی تو اچھا نہ ہوگا!" اعجاز نے سوچا۔

"پاپا نہ لاتے ہوتے انھیں تو اچھا تھا۔" نگین سوچ رہی تھی۔
اعجاز مضطرب ہو کر بستر پر اُٹھ بیٹھا اور اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ "ایک تو مم کو پتا نہیں کیا پڑی تھی امریکا جانے کی۔ ہم سب یہاں بھی تو بہت خوش تھے۔"
"سب کچھ ٹھیک ٹھاک تو چل رہا تھا خواہ مخواہ پاپا لے آئے انھیں۔ ہم ان کے بغیر کتنے خوش تھے۔" نگین آزردہ ہو کر سوچ رہی تھی۔
اعجاز بستر سے اٹھا اس نے اپنے پیروں میں سلیپر ڈالے اور آہستہ سے کمرے کا دروازہ کھول کر دبے پاؤں کمرے سے باہر نکل آیا۔
اپنے کمرے کے دروازے پر ہلکی سی دستک سنتے ہی نگین کے کان کھڑے ہو گئے اور وہ اُٹھ بیٹھی۔ دستک دوبارہ سنائی دی۔
وہ ننگے پاؤں چلتی دروازے تک پہنچی اور اس نے دروازے سے کان لگا کر پوچھا "کون ہے؟"
"میں ہوں۔"
یہ آواز تو وہ لاکھوں کروڑوں صداؤں کے ہجوم میں پہچان سکتی تھی۔
اس نے جھٹ دروازہ کھول دیا اور اعجاز اندر آ گیا۔
"کیا بات ہے جاجی؟" اُس نے اعجاز کو خاصی تشویش سے دیکھتے ہوئے کہا۔
"نیند نہیں آ رہی؟"
"ہاں مجھے بھی نیند نہیں آ رہی۔"
اعجاز آگے بڑھا اور کھڑکی کے نزدیک بڑے دیوان پر بیٹھ گیا۔
نگین نے سائیڈ بورڈ پر دھری خشک میوے کی پلیٹ اٹھائی اور اعجاز کے قریب آ بیٹھی۔
"لو کھاؤ۔" اُس نے پلیٹ اعجاز کے سامنے چھوٹی میز پر رکھ دی۔
"تو تھینک یو۔"
"نیند کیوں نہیں آ رہی تمہیں؟" نگین نے پوچھا۔
"پتا نہیں بس مجھے اچھا نہیں لگ رہا ہے اس عورت کا گھر آنا۔"
"فکر مت کرو۔ واپس آنے کا خوب اچھی طرح مزہ چکھائیں گے انھیں۔"
"ایک تو پاپا نہ جانے کیوں لے آئے؟"
"پاپا تو ہم لوگوں سے پوچھنے کے بعد ہی لائے ہیں۔"
"ہمارے پاس ہاں کرنے کے سوا کوئی دوسرا راستہ ہی نہیں تھا۔" اعجاز نے ناگواری سے کہا۔
"بہر حال اب تو وہ آ چکی ہیں۔"
"صبح ہم لوگ ناشتے پر نیچے نہیں جائیں گے۔"
"کیوں؟"
"تاکہ پاپا کو پتہ چلے کہ ہم خوش نہیں ہیں اُس کے واپس آنے سے اور پروٹسٹ کر رہے ہیں۔"
"کیا فرق پڑے گا ہمارے نیچے نہ جانے سے؟ میں تم سے شرط لگا سکتی ہوں کہ ہمارے نیچے نہ جانے پر دو ہی باتیں ہوں گی یا تو پاپا اوپر آ جائیں گے اور ہمیں سمجھا بجھا کر نیچے لے جائیں گے یا پھر ناشتہ اوپر بھجوا دیں گے۔"
"تو پھر..... کیا کیا جائے؟" اعجاز مٹھیاں بھینچ کر بولا۔
"میری سمجھ میں تو بس ایک ہی بات آئی ہے۔"
"وہ کیا؟" اعجاز ہمہ تن متوجہ ہو گیا۔
"بھائی ترکیبوں پر ترکیبیں سوچتے جاؤ انھیں پریشان کرنے کی یہاں تک کہ وہ پریشان ہو کر گھر چھوڑ جائیں۔ پھر پاپا نے وعدہ تو کر ہی رکھا ہے ہم سے کہ وہ ان محترمہ پر گھر کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند کر دیں گے۔"
"تو اس کا مطلب ہے صبح ناشتے کے لیے نیچے جانا ہوگا؟"
"بالکل جانا ہے..... اب ہم پہلے کی طرح دب کر نہیں اوپر ہی نہیں رہیں گے بلکہ پورے گھر میں گھومیں پھریں گے گھر ہمارے پاپا کا ہے۔"

"ہاں گھر تو ہمارے پاپا کا ہے۔" اعجاز نے کہا پھر منہ بنا کر بولا "تمہیں یاد ہے کھانے کی میز پر کتنا سڑا ہوا منہ بنائے بیٹھی تھیں وہ!"
"مجھے سب یاد ہے۔"
"اوہ! آئی ہیٹ دیٹ وومین۔" اعجاز نے منہ بنا کر الفت سے اپنی نفرت کا ایک بار پھر واشگاف الفاظ میں اعلان کیا۔
"صبح اسکول بھی جانا ہے۔ جاؤ اب جا کر سو جاؤ۔"
"یار نیند آ ہی نہیں رہی۔"
"کوشش کرو گے تو آ جائے گی۔"
"میری تو سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اب کیا ہوگا!"
"کہا نا میں نے تم سے کہ ہم اتنا عاجز کر دیں گے کہ یہ بھاگ جائیں گی۔"
"خدا کرے ایسا ہی ہو۔"
"لیکن ایک بات سنو تم میری۔"
"بولو۔"
"تم غصہ بہت نہیں کرو گے..... یہ جو تمہارا غصہ ہے نا کبھی کبھی کام بگاڑ دیتا ہے۔ پتا ہے دوسروں کو عاجز کرنے کے لیے آدمی کو اپنے غصے پر قابو رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے جو لوگ غصہ بہت کرتے ہیں وہ دوسروں کو کم جلاتے ہیں خود کو زیادہ۔" نگین نے پیار سے بھائی کا بازو پکڑتے ہوئے کہا "سمجھے نا تم میری بات۔"
"کچھ کچھ۔" وہ مسکرا کر بولا۔
"اچھا اب جاؤ۔"
"او کے..... گڈ نائٹ۔"
"گڈ نائٹ۔"
اگلی صبح جب زرین جاگی تو نگین نے اس پر جھک کر اس کا ماتھا چومتے ہوئے کہا "اٹھو چھوٹی۔"
"باجی! پاپا آ گئے تھے رات کو؟"
"بہت دیر سے۔"
"کیوں؟"
"تمہاری ماں کو لینے گئے تھے۔"
"ہاں۔" زرین کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا "کیا آ گئیں؟"
"ہاں۔"
"اوں۔" زرین نے منہ بسورا۔
"لیکن تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہم سب مل کر انھیں تنگ کریں گے ناک میں دم کر دیں گے۔" نگین ہنس دی۔
"میں نے تمہیں اُن کے گھر آنے کی خبر اس لیے سنائی ہے تاکہ جب تم نیچے جاؤ تو انھیں دیکھ کر پریشان نہ ہو جاؤ۔"
فراز کو یہ خبر اعجاز نے سنائی۔
نیچے جانے سے پہلے نگین نے میر کارواں کے فرائض انجام دیتے ہوئے چھوٹے بہن بھائیوں کو چند ضروری ہدایات جاری کیں۔
حسب معمول جب وہ ڈائننگ لاؤنج میں داخل ہوئے تو اُن کی گردنیں تنی ہوئی تھیں اور وہ چاروں زبردستی مسکرانے کی کوشش میں اپنی شکلیں بگاڑے لے رہے تھے۔
"گڈ مارننگ پاپا۔" اُن میں سے ہر ایک نے کہا۔
اور ناشتے کی میز پر الفت کی موجودگی کو کاملاً نظر انداز کرنے کی کوشش کرتے اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے۔
"گڈ مارننگ بچو!" جلیس الحسن نے گہری نگاہوں سے اُن کے چہروں کے تاثرات اور حرکات و سکنات کا بغور جائزہ لیتے ہوئے کہا۔
الفت نے دزدیدہ نگاہوں سے اُن کے خودسرانہ انداز دیکھے۔

ان کی گزشتہ بدسلوکیوں کا خیال ان کے خلاف دل میں نفرت کی ایک سرد لہر کو جنم دینے کا باعث بنا۔ انسانی فطرت کے عین مطابق وہ اپنی ساری خطائیں اور کوتاہیاں بھول گئی۔

اُسے تو بس یہی خیال آیا کہ

یہی وہ نالائق اور بدتہذیب بچے تھے جن کی وجہ سے اُسے چار ماہ کے لگ بھگ ایک کڑی آزمائش سے گزرنا پڑا تھا۔

اُس کی سانسیں بوجھل ہونے لگیں۔

اور اُسے یوں لگا جیسے نفرت کی وہ سرد لہر اُس کے سینے کی تمام پرتیں چیرتی ناشتے کی میز پر ہی بہہ نکلے گی۔

صدیوں کا سفر اُس کے دل نے لمحوں میں طے کیا۔

بالآخر وہ جلیس کے بچوں کے خلاف اپنے دل میں اٹھنے والی لہر کو جوں توں دبانے میں کامیاب ہو ہی گئی۔

"گڈ مارننگ بچو!" اُس نے ایک نئے راستے پر پہلا قدم رکھتے ہوئے کہا۔

وہ چاروں چونکے۔

انھوں نے باپ کی طرف دیکھا۔

پھر ایک دوسرے کو دیکھا۔

اور یوں انجان بن گئے جیسے ہوائیں کوئی سرگوشی کرتی گزر گئی تھیں۔

جلیس الحسن نے چاہا کہ انھیں تنبیہ کریں۔

لیکن پھر انھوں نے کسی سمجھدار ہمدانی کے مشورے کے بغیر ہی اُلفت اور بچوں کو اپنے معاملات بغیر کسی مداخلت کے باہم نمٹا دینے کا فیصلہ کر لیا۔

اُن کا یہ فیصلہ صحیح تھا یا غلط وہ اس بحث میں الجھنا نہ چاہتے تھے۔

وہ تو اپنے تئیں فقط اتنا جانتے تھے کہ:

اپنے اوپر بچوں کے اعتماد کو متزلزل نہ ہونے دینے اور انھیں اپنے خلاف کسی بدگمانی میں مبتلا ہونے سے بچانے کا بہترین اور محفوظ ترین راستہ اُن کے پاس یہی تھا کہ وہ خود کو اُلفت اور بچوں کے باہمی قضیے سے فی الحال قطعاً علیحدہ رکھیں اور پھر...... یہ بھی تو ممکن تھا کہ...... اُلفت کا یہ روپ عارضی ہو!

ناشتے کے دوران وہ چاروں ایک دوسرے سے اور جلیس الحسن سے تو باتیں کرتے رہے مگر اُلفت کو انھوں نے قطعی نظر انداز کیے رکھا۔

اُس نے زرنہ بن کو توس پر مکھن اور جام لگا کر دیا تو اُس نے ایک طرف رکھتے ہوئے نگین سے کہا "نگی باجی ذرا بٹر اور جیم تو لگا دیں مجھے توسٹ پر۔"

"بیٹے! آپ کو ماما نے تو لگا کر دیا ہے۔" جلیس الحسن نہ چاہتے ہوئے بھی مداخلت کرنے پر مجبور ہو گئے۔

"تھینک یو پاپا...... نگی باجی زیادہ اچھا لگاتی ہیں۔"

اعجاز اور نگین ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا دیے۔

پھر نگین زیرِ لب مسکراتے ہوئے زرنہ بن کے لیے دوسرے توس پر مکھن اور جام لگانے لگی۔

اور احساسِ توہین سے اُلفت کے کانوں کی لوئیں تک جلنے لگیں۔

اس کا جی چاہا چلا کر زرنہ بن سے کہے "کیوں میں نے توس پر بٹر اور جام کے بجائے زہر لگا دیا ہے کیا؟"

یا پھر

ناشتا ادھورا ہی چھوڑ کر اُٹھ جائے۔

مگر وہ بابا کی نصیحت کا پلو تھامے صبر و استقلال کے ساتھ بیٹھی رہی۔

بابا نے کہا تھا:

"عورت کے پاس صبر اور خاموشی ایسے ہتھیار ہیں جن کو استعمال میں لا کر وہ اپنے گھر کی سلطنت کی بے تاج ملکہ بن سکتی ہے۔"

وہ ہارنے کے لیے نہیں، فتح حاصل کرنے کے لیے آئی تھی۔

اسکول کے لیے روانہ ہوتے وقت بھی ان چاروں نے جلیس الحسن کو باری باری خدا حافظ کہا اور ناشتے

کی میز پر اُلفت کو جس بُری طرح نظر انداز کرنے کی کوشش کی تھی وہی بے رخی اسکول جاتے وقت بھی برتنے کی کوشش کی۔

مگر اُن کی اس بے اتفاقی کے باوجود اُلفت نے انھیں برآمدے کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر خدا حافظ کہا۔

گو "گڈ مارننگ" کی طرح جواب اُسے "خدا حافظ" کا بھی نہیں ملا۔

لیکن پھر بھی وہ کوٹھی کے صدر دروازے سے گاڑی کے نکل جانے تک اپنا ہاتھ ہلاتی رہی۔

جب وہ پلٹی تو اُس کی آنکھیں یک بیک بھیگ گئیں۔

جلیس الحسن نے اپنا بازو اُس کے شانوں پر دراز کرتے ہوئے کہا "تھینک یو ویری مچ اُلفت!"

پھر وہ ایک گہری سانس کھینچنے کے بعد بوجھل آواز میں بولے "مجھے اُمید ہے کہ تم میری مجبوریوں اور دقتوں کو سمجھنے کی کوشش کرو گی!"

مزاحمت کی ایک شوریدہ سر لہر نے اس پر سنا یا ہذیانی کیفیت طاری کر دی۔

اُس کے جی میں تو آیا اُن کا گریبان پکڑ کر اُن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے پوچھے کہ "یہ کیسی مجبوری ہے اور کیسی دقت ہے کہ آپ اپنے بچوں کو میرے ساتھ اہانت آمیز رویہ اختیار کرنے پر ٹوک بھی نہ پائے"

مگر وہ آنسو پینے کے سوا اور کچھ نہ کہہ سکی۔

جلیس الحسن کے دفتر جانے کے بعد وہ گھر کی خیر خبر لینے نکلی تو ہاجراں کچن کی صفائی میں مصروف تھی۔ ہاجراں سے اُلفت کی صبح سویرے اس وقت ملاقات ہو چکی تھی جب وہ جلیس الحسن کے ساتھ چہل قدمی کے لیے سبزہ زار کی طرف جا رہی تھی۔

اس وقت تو وہ فقط سلام ہی داغ سکی تھی۔ گھر کے ملازموں پر جلیس الحسن کا رعب داب کچھ ایسا تھا کہ وہ اُن کی موجودگی میں اپنی زبان زیادہ نہ کھولتے تھے۔

اب جو ہاجراں نے اُلفت کو تنہا اور فراغت میں پایا تو اپنا کام روک کر کھڑی ہو گئی اور اپنے مخصوص لہجے میں خوشامدانہ انداز میں بولی "بسم اللہ بیگم صیب بسم اللہ...... سچ بولتی ہوں جی میرے کوں تو بہوتی خوشی ہوئی ہے آپ کو دیکھ کر۔"

"اچھا" اُلفت مسکرا دی۔ "تم کیسی ہو؟"

"شکر ہے مولا کا!" ہاجراں دونوں ہاتھ باندھ کر بولی۔

"بچے وچے ٹھیک ٹھاک ہیں؟"

"بالکل۔"

"کام ٹھیک چل رہا ہے۔"

"بیگم صیب جی! بس دیکھ لو آپ۔ ہم تو خادم لوگ ہیں جی۔"

"میاں تو تمہارا سودا سلف لینے چلا گیا ہے شاید۔"

"ہاں جی۔"

اُلفت نے کچن کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد کچن سے باہر نکلنے کے لیے دروازے کا رُخ کیا تو ہاجراں بولی "بیگم صیب جی! سچی بولتی ہوں میرے کوں تو آپ کے جانے کا بہوتی افسوس ہوا تھا جی۔"

"اب تو آگئی ہوں۔"

"شکر ہے مولا کا!" ہاجراں منہ چھت کی طرف اور ہاتھ دعا کی صورت اُٹھا کر بولی پھر اُس نے منہ بنا کر شکایتی انداز میں کہا "لیکن بچے۔" اُس نے دونوں کانوں کو ہاتھ لگائے اور دائیں ہاتھ کی انگشتِ شہادت سے اپنی ناک کے بانسے پر تین مرتبہ لکیریں کھینچنے کے بعد چٹاچٹ اپنے رخسار پیٹتے ہوئے بولی "اللہ میری توبہ! اتنے خوش تھے اتنے خوش کہ میں آپ کو بول نہیں سکتی۔"

اُس کا یہ انکشاف اُلفت کے لیے کوئی اچنبھے والی بات نہ تھی۔

"اور بیگم صیب! روزانہ انھوں نے صیب جی کے ساتھ باہر گھومن پھرن واسطے جانا، خوب فلمیں دیکھیں۔ ہلا گلا کرنا...... اللہ میری توبہ!" اُس نے پھر کانوں کو ہاتھ لگائے۔ "بہوتی بدتمیز بچے نے!"

"ہاجراں!" اُلفت نے قدرے ناگواری سے ہاجراں کو دیکھتے ہوئے تنبیہی تیوروں کے ساتھ کہا "آئندہ تم بچوں کو بُرا نہیں کہو گی۔"

ماجراں ہکا بکا ہو کر اُس کی صورت دیکھنے لگی۔
یہ وہ کہہ رہی تھی!
وہ!
جو ماجراں سے بچوں کی سُن گن لیا کرتی تھی۔
جلیس الحسن اور اُن کی پہلی بیوی کے بارے میں استفسار کرتی رہا کرتی تھی۔
اور اُس کے عوض کبھی اُسے اپنی اُترن سے اور کبھی مٹھی گرم کر کے نوازتی رہتی تھی۔
"سمجھیں۔" اُس نے کڑے تیوروں سے کہا۔
"جی بیگم صاحب۔" ماجراں کان پکڑنے کے بجائے کان کھجانے لگی۔
اور جب اُلفت کچن سے باہر نکل گئی تو ماجراں نے کشمکش کے عالم میں اپنے سر کو جھٹکتے ہوئے کہا۔ "عجیب لوگوں کا بھی کچھ معلوم نہیں۔"
زیریں منزل کا ایک تفصیلی چکر لگانے کے بعد اُس نے بالائی منزل کا رُخ کیا۔
بچوں کی عدم موجودگی میں اوپر جاتے ہوئے اُس کے دل پر پہلے کی طرح پھر خفت طاری ہونے لگی۔ لیکن اُس نے دل کو پھٹکارا۔
"بیوقوف! اپنے گھر میں بھی کوئی ڈرتا ہے۔"
اُس کے قدم اعتماد کے ساتھ اُٹھنے لگے۔
اوپر پہنچنے کے بعد اُس نے اعجاز کے کمرے میں جھانکا۔
خدایا!
کس قدر بکھرا پڑا تھا اُس کا کمرہ۔
یہاں تکیہ
وہاں چادر۔
اِدھر کتابیں
اُدھر کپڑے
کشن قالین پر
چپل مسہری پر
سارا کمرہ یوں تتر بتر پڑا تھا جیسے مکین کمرہ رات بھر چیزوں کو اُلٹنے پلٹنے اور پٹخنے میں مصروف رہا ہو۔
خیر رات بھر تو نہیں۔
صبح اسکول جانے سے پہلے اُلفت کو ناشتے کی میز پر دیکھ کر اعجاز پر ہیجانی کیفیت البتہ طاری ہوئی تھی اور سارا کمرہ اُلٹ پلٹ گیا تھا۔
اُلفت کا شوقِ تجسس اُسے کشاں کشاں اعجاز کی مسہری کے سرہانے تک لے گیا۔ مسہری پر بچھی چادر کو پلٹا تو عاصمہ کی فریم شدہ تصویر ہنوز وہاں رکھے دیکھی۔
اُس نے عاصمہ کی ہنستی مسکراتی تصویر کو شدید نفرت سے گھورتے ہوئے جی ہی جی میں کہا۔ "اے عورت! تو گئی تھی تو اپنے ان بچوں کو بھی اپنے ساتھ لے گئی ہوتی جو میرے لیے سوہانِ روح بنے رہے ہیں بنے ہوئے ہیں۔"
پھر اُس نے تصویر کو اُس کی جگہ واپس رکھا۔ مسہری پر بچھی چادر سے اُسے حسبِ سابق ڈھانپا اور مسہری پر پڑی چپل کو ناگواری سے نیچے پھینکتی کمرے سے باہر نکل آئی۔
اعجاز کے کمرے سے نکلنے کے بعد اُس نے نگین اور زرّین کے مشترکہ کمرے کا رُخ کیا۔
اعجاز کے کمرے کی نسبت اُن کا کمرہ بہت صاف ستھرا تھا اور ہر چیز قرینے سے اپنی جگہ پر رکھی تھی۔
مسہری کے سرہانے سنہرے فریم میں جڑی آبی رنگوں میں بنی ایک تصویر دھری تھی۔ فریم کے قریب ہی گلاب کا ایک پھول رکھا ہوا تھا۔
گو یہ تصویر مصوّر کی نو آموزی کی زبانِ حال سے گواہی دے رہی تھی تاہم اُسے دیکھ کر یہ اندازہ کرنا دشوار نہ تھا کہ مصوّر نے جلیس الحسن کی تصویر بنانے کی کوشش کی تھی اور جلیس الحسن کے چاہنے والوں نے اُسے سنہرے فریم میں آراستہ

کر کے اُسے اُن سے اپنی محبت کا ثبوت دینے کی کوشش کی تھی۔
تصویر کے انتہائی دائیں گوشے میں حسبِ روایت مصوّر کا نام خاصے فنکارانہ انداز میں رقم تھا۔ اگر نہ بھی ہوتا تو اُلفت بہر حال جانتی تھی کہ اس گھر میں بس ایک ہی مصوّر تھا۔
اور وہ تھا
جلیس الحسن کا چھوٹا بیٹا فراز!
فراز کا کمرہ بھی اُلفت کو ٹھیک ٹھاک ہی لگا۔
تھوڑی بہت صفائی درکار تھی تو ماجراں کچن کی صفائی سے نمٹنے کے بعد حسبِ معمول اوپر آنے والی تھی۔
فراز کے کمرے کے در و دیوار پہلے بھی تصویروں سے مزین رہتے تھے اور اب بھی تھے۔
البتہ تصاویر کی تعداد میں پہلے کی نسبت اضافہ ہو چکا تھا۔ بعض پُرانی تصاویر کی جگہ نئی تصاویر نے لے لی تھی۔
جلیس الحسن کی کئی تصویریں کمرے کے در و دیوار پر آراستہ تھیں۔
کمرے میں موجود رائٹنگ ٹیبل البتہ قدرے انتشار کا شکار نظر آتی تھی۔
میز پر رنگین پنسلیں، مارکرز، آبی رنگ، چھوٹے بڑے برش اور سادہ ڈرائنگ شیٹیں موجود تھیں۔
میز پر کئی مکمل اور ادھوری تصویریں موجود تھیں۔
میز کی دراز میں بھی بہت سی مکمل اور نامکمل تصویریں رکھی ملیں۔
اُلفت کرسی پر بیٹھ کر وہ تصویریں دیکھنے لگی۔
زیادہ تر تو کارٹون ہی تھے۔
ان میں سے بیشتر ڈونلڈ ڈک، وڈی وڈ پیکر اور مکی ماؤس کے کارٹون تھے۔
چند لینڈ اسکیپ تھے۔
اور متعدد پورٹریٹ۔
قائدِ اعظم، علامہ اقبال، سر سید احمد خان، شاہ فیصل شہید، ملکہ ایلزبتھ، ہیلن کیلر اور فلورنس نائٹ اینگل کی شبیہیں۔
اعجاز، نگین اور زرّین کی قلمی اور آبی شبیہیں بھی تھیں اور ان کے کارٹون بھی جن کی ہنستی مسکراتی لکیریں مصوّر سے ان کی گہری چاہت کی غماز تھیں۔
میز کی نچلی دراز سے کچھ چند تصویریں برآمد ہوئیں۔
بڑے سائز کے لفافے میں سے جلیس الحسن اور عاصمہ کی ایک قلمی تصویر برآمد ہوئی جو زبانِ حال سے مصوّر کے اس انہماک کی گواہی دے رہی تھی جس کی بنا پر یہ تصویر مصوّر کی بقیہ تمام تخلیقات کے مقابلے میں بہترین نظر آتی تھی۔
اسی دراز سے اُلفت کو چند تخلیقات، "اسٹیپ مدر" یعنی سوتیلی ماں کی سرخی کے ساتھ ملیں۔
کسی میں سوتیلی ماں کو لنگڑی دکھایا گیا تھا۔
کسی میں بھینگی۔
کہیں وہ جادوگرنی کے روپ میں دکھائی گئی تھی۔
کہیں فقیرنی کے روپ میں۔
کسی میں اس کے دانت بڑے بڑے اور نکیلے تھے۔
کسی میں ناک طوطے کی چونچ کی طرح نکیلی اور لمبی۔
ایک تصویر میں دیو ہیکل سوتیلی ماں ایک بچی کو اپنے لمبے اور نوکیلے مہیب دانتوں کے درمیان دبائے کھڑی تھی۔ ایک لڑکی کو اپنی دائیں مٹھی میں اور ایک لڑکے کو بائیں ہاتھ میں دبوچ رکھا تھا۔ اس کے کنے اور ہتھیلیوں سے خون بہہ رہا تھا اور ایک چھوٹا سا لڑکا اس کے سامنے کھڑا اسے گھور رہا تھا۔
دیو ہیکل سوتیلی ماں کے منہ اور مٹھیوں میں دبے ہوئے بچوں کے منہ سے "مدد! مدد!" کے الفاظ نکلتے دکھائے گئے تھے جبکہ اس کو گھورتے ہوئے چھوٹے سے لڑکے کو یہ کہتے دکھایا گیا تھا۔
"ظالم جادوگرنی! میں اپنے بڑے بھائی اور بہنوں کو تجھ سے چھڑانے اور تیرا خاتمہ کرنے آیا ہوں۔"

اس جھونپڑے سے لڑکے کے قدموں تلے نفرت زدہ انداز میں فرازؔ نے اپنا نام بطور مصور لکھا تھا۔

"سوتیلی ماں" کے عنوان سے موسوم یہ تصویر بہ مصور کی اس گہری نفرت کی غماز تھیں جو وہ سوتیلی ماں کے خلاف اپنے دل میں رکھتا تھا۔

الفت بخوبی سمجھ سکتی تھی کہ فرازؔ نے یہ تصویر جب اپنی سوتیلی ماں کے خلاف نفرت کے اظہار کے لیے بنائی تھیں اور فراز کی سوتیلی ماں وہ خود تھی تو تھی۔

اس نے چپ چاپ تمام تصویروں کو ان کی جگہ پر دھرتے ہوئے دل ہی دل میں سوچا "کبھی تو ہوں میں جلیس الحسن کی پہلی بیوی کے بچوں سے مفاہمت اور محبت کے راستے پر مگر شاید میرا خون جگر بھی ان کے دلوں سے اس نفرت کو نہ دھو سکے گا جو کہ وہ منفی جذبات اپنے دلوں میں رکھتے ہیں۔"

دوپہر کو الفت نے دوپہر کا کھانا حسب سابق بچوں کی گھر واپسی سے قبل ہی یا اپنے کمرے میں کھانے کی روایت برقرار رکھنے کی کوشش نہیں کی۔

بلکہ جب وہ چاروں اپنے اسکول اور کالج سے لوٹنے، کپڑے بدلنے اور منہ ہاتھ دھونے کے بعد کھانے کے لیے ڈائننگ لاؤنج میں آئے تو وہ بھی ڈائننگ لاؤنج میں چلی آئی۔

"سلام علیکم!" اس نے اپنے اوپر مکمل جبر کی کیفیت طاری کرتے ہوئے بظاہر بڑی رسانیت اور ملائمت سے کہا۔

سلام کا اسے ان چاروں میں سے کسی نے جواب نہیں دیا۔

بلکہ جب اس نے دزدیدہ نظروں سے ان کے چہروں کے تاثرات کا جائزہ لینے کی کوشش کی تو بالخصوص تمکین اور اعجاز کے چہروں پر ناگواری دیکھی۔

چاروں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

پھر یکبارگی اعجاز اپنی جگہ سے اٹھا اور کرسی دھکیلنے کے بعد تیزی سے ڈائننگ لاؤنج سے واک آؤٹ کر گیا۔

پھر زینے کے رُخ سے اس کی غصے میں ڈوبی آواز نیچے پہنچی۔

اس نے خانساماں کو حکم دیا۔

"غلام محمد! میرے لیے کھانا اوپر بھجوا دو!"

پھر یکے بعد دیگرے وہ تینوں بھی میز پر سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

تمکین نے لاؤنج کے باہر راہداری میں صدا لگائی! "غلام محمد! ہم سب کے لیے اوپر کھانا لے آؤ!"

کھانے کی میز پر الفت تنہا رہ گئی۔

آنسو اس کی آنکھوں میں اُمڈ آنے کو تھے کہ خانساماں غلام محمد لپکا ہوا ڈائننگ لاؤنج میں آیا اور اس نے الفت کے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "کیا ہوا جی بیگم صاحب؟"

"غلام محمد! بچوں کو کھانا اوپر پہنچا دو۔" اس نے آنسو پیتے ہوئے بظاہر انتہائی تحمل سے جواب دیا۔

اور خود کھانا کھائے بنا میز سے اٹھ گئی۔

شدتِ رنج اور احساسِ توہین سے اس کا رُواں رُواں لرز رہا تھا۔

سہ پہر کو بابا نے فون کیا اور حال چال دریافت کیا۔

بابا کے بعد امی سے بات ہوئی۔

"بیٹی! میں تو صبح سے بے چین تھی تم سے بات کرنے کو مگر یہ کمبخت فون خراب ہوا پڑا تھا۔" امی نے کہا پھر فون پر بڑی رازداری سے بولیں "سب ٹھیک تو رہا؟"

"جی امی!"

"جلیس میاں نے زیادہ تین پانچ تو نہیں کی تمہارے ساتھ؟"

"نہیں امی!" اس نے کہا اور ان کو مزید اطمینان دلانے کے لیے ہنس دی۔

"تھوڑی بہت طعن و تشنیع تو ضرور کی ہوگی یہ تو سارے مردوں کی عادت ہوتی ہے!"

"اچھا! بیٹی کو اس کے میاں کے خلاف ورغلا رہی ہو!" فون پر بابا کی آواز سنائی دی۔

"نہیں امی! کوئی طعن و تشنیع نہیں!"

"یہ تو ضرور کہا ہوگا کہ بس رہ لیں اماں باوا کے گھر۔۔۔ آخر کو تھک ہار کر آنا ہی پڑا!"

"بالکل نہیں امی!"

"بیٹی کیا کہہ رہی ہے ہماری؟" فون پر پھر بابا کی آواز سنائی دی۔

"کہہ رہی ہے کچھ نہیں کہا جلیس الحسن نے!" امی نے بابا کو بتایا پھر بولیں "مجھے تو حیرت ہو رہی ہے اور یقین نہیں آ رہا!"

"یقین کر ڈالیے کیونکہ آپ کا داماد آپ کے تصور میں خاکسار پڑ گیا ہے!"

"اجی ہاں بڑے آئے خاکسار کہیں کے!"

وہ فون پر بھی امی اور بابا کی یہ نوک جھونک سن کر مسکرا دی۔

"اور جلیس کے بچے؟ ان کے کیا تیور رہے؟"

اس کا جی بھر آیا۔

امی سے بڑھ کر اس کا ہمدرد اور غمگسار کون ہو سکتا تھا!

جی میں آیا صبح سے دوپہر تک کا جملہ احوال انھیں سنا کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر ڈالے۔

لیکن پھر خیال آیا کہ اس سے فائدہ کیا ہوگا؟

یہ تو طے تھا کہ حالات جیسے بھی تھے اب اسے ان کا مقابلہ کرنا تھا۔ جیسے تیسے گزارہ بہرحال کرنا تھا۔

امی کو بتا دینے کا ایک نقصان البتہ ہو سکتا تھا۔ اور وہ یہ کہ وہ بھائی اور بہنوں سے ذکر ضرور کرتیں پھر نہ جانے کتنی باتیں بنتیں اور کیا کیا قیاس آرائیاں ہوتیں۔

چنانچہ بچوں کے رویے کی بابت امی کے استفسار پر اس نے کہا "سب بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں وہ بھی خوشی ہیں امی!"

"چلو خدا کا شکر ہے کہ تم بھی خیریت سے اپنے گھر پہنچ گئیں!"

"ہو سکتا ہے شام کو چکر لگاؤں آپ کے پاس!"

"جم جم آؤ بیٹی۔۔۔۔۔ اور یہ تو خبر ہے نا تمہیں کہ کل چوتھی ہے؟"

"تہنیت نے فون نہیں کیا؟"

"دوپہر کو آئے تھے دونوں میں کھڑے کھڑے۔ فون ٹھیک نہ تھا ورنہ تم سے ضرور بات کرتی۔ شاید سسرال سے کرے تمہیں فون!"

"میں خود کر لوں گی!"

"اچھا لو اب اپنے بابا سے پھر بات کر لو!"

"جی اچھا!"

"ہاں بیٹے!" بابا کی شفیق آواز سنائی دی۔

"ہو سکا تو شام کو آؤں گی آپ کے پاس بابا!"

"اچھی بات!"

"ویسے تو سب ٹھیک ہے نا؟"

"بالکل ٹھیک بابا!"

"اچھا تو پھر انشاء اللہ العزیز باقی باتیں زبانی ہوں گی!"

"اچھی بات ہے بابا!"

شام کو جب جلیس الحسن دفتر سے لوٹے تو وہ پہلے کی طرح کمرے میں بیٹھ کر ان کی راہ تکنے کے بجائے سبزہ زار پر بیٹھی ایک رسالے کی ورق گردانی کرتے ہوئے ان کا انتظار کر رہی تھی جلیس الحسن ایک خوشگوار حیرت سے دوچار ہوئے اور خود بھی وہیں آ بیٹھے۔

"آئی ایم سوری الفت! آج اتنی مصروفیت رہی کہ میں تمہیں فون تک نہ کر سکا!"

"کوئی بات نہیں!"

"اور سناؤ دن کیسا گزرا؟"

"ٹھیک!" اس نے گھائل لہجے میں کہا۔

اسے اپنی آنکھوں میں جلن اور حلق میں گھٹن سی محسوس ہونے لگی۔

دل میں یک بیک ڈھیروں درد سا اُمڈ آیا۔
جی چاہا اُنھیں سب کچھ بتا دے۔
ان سے کہہ دے کہ:
"آپ کے بچّے مجھ سے شدید نفرت کرتے ہیں اُنھیں میرے ساتھ ایک میز پر کھانا کھانا تک تو گوارا نہیں۔ میں چاہوں بھی تو وہ مجھے اپنی ماں تسلیم نہیں کریں گے۔"
مگر پھر اس نے سوچا کہ یہ تو وہی پرانا راگ چھیڑ دینے والی بات ہوگی۔
شکایتوں نے پہلے کیا دیا تھا؟
جو اب دے دیں گی!
لہٰذا بہتر یہی ہے کہ اب کی بار شکایتوں حکایتوں کے بجائے صبر و ضبط کو آزمایا جائے اور اپنے جذبات کو اپنے تابع رکھا جائے۔
اسے بابا کی بات یاد آئی جو انھوں نے کل صبح اس سے کہی تھی کہ:
"شادی ٹوڈو اور ڈائی کا دوسرا نام ہوتی ہے یعنی کر گزرو یا پھر جان ہی سے گزر جاؤ۔"
"ڈو اور ڈائی۔" اس نے دل ہی دل میں اپنے آپ سے کہا۔
اور
اپنے شانوں پر نئی آزمائش کی صلیب اٹھا کر کھڑی ہوگئی۔

اُلفت نے امّی اور بابا سے وعدہ کیا تھا کہ شام کو اُن کے پاس آئے گی۔ گو کل شب ہی گھر آنے کے بعد آج اُس کا میکے جانا ضروری تو نہ تھا مگر وہ امّی اور بابا کے اطمینان کی خاطر اُن کے پاس جانا چاہتی تھی کیونکہ ٹیلیفون پر امّی کے لہجے سے بالخصوص خاصی تشویش ظاہر ہو رہی تھی۔
شام کو دفتر سے واپس آنے کچھ دیر سستا لینے اور کچھ وقت بچّوں کے پاس گزار چکنے کے بعد جب جلیس الحسن اُس کے پاس آ بیٹھے تو اُس نے دبی زبان سے کہا "ذرا دیر کو امّی کے ہاں لے چلیں گے مجھے؟"
"ہاں ہاں کیوں نہیں۔"
"بچّے تو ہمارے ساتھ چلنے پر آمادہ نہ ہوں گے شاید؟" اُس نے استفہامیہ لہجے میں کہا۔
جلیس الحسن نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔
اُن کی نگاہوں میں بے یقینی تھی۔
یہ وہ کہہ رہی تھی!
وہ!
جسے بچّوں کا نام تک لینا گوارا نہ تھا۔
"انھیں رہنے دو۔" وہ الفت سے بولے۔ "تم تیار ہو جاؤ۔"
"میں تو تیار ہوں۔"
"تو چلو!" وہ ایک دم اُٹھ کھڑے ہوئے۔
"چلیے۔" وہ ان کے ساتھ ہولی۔
راستے میں پھول گجروں والے ایک لڑکے سے انھوں نے اُس کے لیے حسبِ عادت گجرے اور کلائی بند خریدے۔

میکے پہنچی تو امّی، بابا، بھیّا، بھابی سب ہی نے خوشی کا اظہار کیا۔
وہ اُن کی خوشی کی انفرادی نوعیت سے بخوبی آگاہ تھی۔
امّی اور بابا تو اس لیے خوش تھے کہ وہ دوبارہ اپنے گھر چلی گئی تھی۔
بھابی یقیناً اس لیے خوش تھیں کہ کمرہ خالی ہوگیا تھا جسے وہ اپنی مرضی کے مطابق دونوں بچّوں کے لیے آراستہ کر سکتی تھیں۔
بھیّا بے چارے تو تھے ہی بھابی کے ہم آواز اور ہم خیال۔
بھابی نے آن کی آن میں لوازمات خورد و نوش اُن کے سامنے چُن دیے۔
امّی نے اُسے سرگوشی میں بتایا۔ "کل رات عظمت اور فضیلت دونوں بہت خوش تھیں تمہارے اپنے گھر چلے جانے سے!"
"تہنیت کی سنائیے کیا کہہ رہی تھی؟"
"وہ بھی بہت خوش تھی۔ سہیل تو تمہارے یہاں لے جانے کو تیار تھے۔"
"ہائے نہیں امّی۔ تہنیت کو آپ منع کیجیے گا کہ ایسے نہ آئے میں اُس کی دعوت کروں گی۔ پہلے میں اُسے ویسے بلاؤں اپنے ہاں جیسا کہ اُس کا حق بنتا ہے پھر بے شک وہ سہیل کے ساتھ روز آئے میرے پاس۔"
"کل جب چوتھی میں آؤ گی تم تو یہ بات خود کہہ دینا اُس سے۔"
"اچھی بات ہے۔"
بابا اور بھیّا کافی دیر تک جلیس الحسن سے باتیں کرتے رہے۔
بھابی جب اُس کے پاس آکر بیٹھیں تو انھوں نے بڑی رازداری سے کہا۔ "اُفّی! جان! تمہارا جو سامان یہاں رکھا ہے وہ؟"
سامان تھا ہی کیا۔
فقط ایک سوٹ کیس اور ایک بیگ ہی تو لائی تھی وہ اپنے ہمراہ۔
وہ بھابی کا مطلب سمجھ گئی۔
انھیں کمرہ بالکل خالی چاہیے تھا۔
تہنیت تو اپنے سارے پُرانے کپڑے، جوتے اور ذاتی استعمال کی دیگر چھوٹی موٹی چیزیں اپنی سہیلیوں اور اپنی چھوٹی عمزاد بہنوں میں تقسیم کر گئی تھی۔
یا شاید پھر یہ بات تھی کہ
بھابی کو یہ خدشہ تھا کہ کہیں وہ دوبارہ واپس نہ آجائے۔
"آپ فکر نہ کیجیے بھابی میں اپنا اسباب آج ہی لے جاؤں گی۔" اُس نے بھابی کو اطمینان دلایا۔
"سمیٹ دوں؟"
"نہیں، آپ تکلیف کیوں کریں میں خود سمیٹے لیتی ہوں۔"
"جان! تکلیف کیسی۔ چھوٹی بہنوں کا کام کر کے تو خوشی ہوا کرتی ہے۔"
وہ بھابی کا منہ دیکھتی رہ گئی۔
ضبط کی لاکھ کوشش کے باوجود وہ ایک ٹھنڈی سانس کو اپنے سینے کے نہاں خانے میں گھونٹ لینے میں کامیاب نہ ہو سکی۔
اُس نے اُٹھ کر اپنا اسباب سمیٹا اور برآمدے میں رکھ دیا۔ کہ جب جانے لگے گی تو گاڑی میں رکھوا لے گی۔
ساڑھے آٹھ بجے کے لگ بھگ وہ جلیس الحسن کے کہے بنا گھر جانے کو اُٹھ کھڑی ہوئی اور اُن کی توجہ اس جانب مبذول کراتے ہوئے بولی۔ "بس اب بابا اور بھیّا سے اجازت لیں۔"
"بیٹی! کھانا کھا کے جانا۔" امّی نے کہا۔
"ہاں میاں! آپ کی ساس ٹھیک کہہ رہی ہیں بس اب کھانا کھا کے جائیے گا۔" بابا نے جلیس الحسن سے کہا۔
لیکن جلیس الحسن کے کچھ کہنے سے قبل ہی الفت نے کہا۔ "نہیں بابا! اب ہمیں اجازت دیجیے کھانا ہم لوگ گھر پر بچّوں کے ساتھ کھائیں گے۔"

جلیس الحسن نے بے ساختہ چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"اچھا اگر یہ بات ہے تو پھر ہم اصرار نہیں کریں گے۔" بابا نے کہا۔

"شکریہ۔" جلیس الحسن نے بابا کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"میاں! ہم تو آپ لوگوں کی خوشی میں خوش ہیں۔"

"شکریہ بابا۔" الفت بولی۔

بابا آگے بڑھے اور انھوں نے الفت کے سر پر ہاتھ دھرتے ہوئے جلیس الحسن کی جانب دیکھا اور بولے:

"جلیس میاں! یہ اس گھر کی سب سے پیاری بیٹی ہوا کرتی تھی۔"

"تھی، گویا اب نہیں ہوں۔" الفت مسکرا کر بولی۔

"بیٹا!" بابا نے دھیرے سے اُس کے سر کو بوسہ دیتے ہوئے کہا۔ "اب تم اس گھر کی کم ہو، اپنے خدائے مجازی کے گھر کی زیادہ۔"

"اچھا بابا اب اجازت؟"

"جاؤ فی امان اللہ۔" بابا اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔

وہ مُڑی اور اپنے سر پر امی کا دستِ شفقت رکھوانے کو اُن کے نزدیک جھک گئی۔

"سکھی رہو، آباد رہو۔" امی نے دعا دی۔

"امی جی۔" اُس نے امی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔ "آپ اطمینان رکھیے، میں بہت خوش ہوں اپنے گھر میں۔"

"خدا تمہیں اور بہت سی خوشیاں دے۔" امی نے کہا۔

وہ سب انھیں رخصت کرنے برآمدے تک آئے۔

الفت نے برآمدے میں رکھا بیگ خود اٹھاتے ہوئے سوٹ کیس کی طرف اشارہ کیا اور جلیس الحسن سے بولی: "یہ سوٹ کیس گھر لے جانا ہے۔"

جلیس الحسن سوٹ کیس اٹھانے کو جھکے مگر ان سے پہلے بھیّا نے سوٹ کیس اٹھا لیا۔

"پلیز آپ رہنے دیجیے۔" جلیس الحسن بولے۔

مگر بھیّا نے اُن کے مزید اصرار پر بھی انھیں سوٹ کیس نہ اٹھانے دیا اور بولے: "جلیس صاحب! بہنوں کے رخصت ہوتے وقت بھائی اُن کا سامان ڈھونے میں زیادہ خوشی محسوس کیا کرتے ہیں۔"

"مگر جناب رخصتی تو کل رات عمل میں آ چکی۔" جلیس الحسن بھی موڈ میں آ گئے۔

"غالباً آپ کو یاد ہو گا کہ پہلی رخصتی پر بھی ہمارے ہاں سے جہیز دو روز بعد ہی گیا تھا آپ کے ہاں۔"

بھیّا کی اس بات پر بھی سب ہی بے ساختہ ہنس دیے۔

وہ گھر پہنچے تو کھانا تیار تھا۔

رات کے کھانے پر چاروں بچے نیچے تو آ گئے اور انھوں نے کھانا بھی نیچے ہی کھایا مگر الفت کو انھوں نے بعینہٖ ویسے ہی نظرانداز کرنے کی کوشش کی جیسے کہ صبح ناشتے پر کیا تھا۔

کھانے کے دوران وہ باپ سے باتیں بھی کرتے رہے۔

کھانے کے بعد اوپر جاتے ہوئے انھوں نے جلیس الحسن کو یکے بعد دیگرے "گڈ نائٹ پاپا" بھی کہا۔

مگر الفت کی طرف انھوں نے دیکھنا تک گوارا نہ کیا۔

"گڈ نائٹ۔" الفت نے اُن کی سرد مہری اور بے رخی پر صبر و ضبط کے کڑوے گھونٹ پیتے ہوئے کہا۔

تہنیت کی شادی کے سلسلے میں الفت نے اسکول سے پانچ دن کی رخصت لی تھی۔ دسویں جماعت کے امتحانات اب زیادہ دُور نہ تھے اس لیے وہ طالبات کا زیادہ حرج نہ ہونے دینا چاہتی تھی۔

تہنیت کی چوتھی کے اگلے روز جب ڈرائیور حسبِ معمول چاروں بچوں کو اُن کے اسکول اور کالج چھوڑنے جا چکا تو الفت نے دبی زبان سے جلیس الحسن سے کہا: "کیا آپ مجھے میرے اسکول تک پہنچا دیں گے؟"

"کیوں؟" جلیس الحسن کا رنگ متغیر نظر آنے لگا۔

"کیونکہ اب تک تو تہنیت کی شادی کے سلسلے میں لی ہوئی رخصت چل رہی تھی، آج مجھے جوائن کرنا ہے۔"

"مگر..... گھر کو تمہاری زیادہ ضرورت ہے۔" وہ دُکھائی سے بولے۔

"جانتی ہوں۔"

"پھر بھی؟" اُن کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ "اور میں بتا دوں تمہیں کہ جب تم اپنے گھر جا رہی تھیں اس وقت مجھے سب سے زیادہ صدمہ اسی بات کا ہوا تھا کہ تم نے اپنی ملازمت برقرار رکھی اور مجھے تاریکی میں رکھا۔"

الفت کو اُن کے لہجے کی درشتی سے دُکھ پہنچا اور دسویں جماعت کے امتحانات تک ملازمت جاری رکھنے کا ارادہ اُس نے فوری طور پر منسوخ کرتے ہوئے بڑے تحمل سے کہا: "سرکاری ملازمت کے کچھ قواعد و ضوابط ہوا کرتے ہیں۔ ملازمت سے مستعفی ہونے ہوئے بھی مجھے چند قواعد و ضوابط کا پابند رہنا ہو گا۔ محکمے کو اپنے ملازمت چھوڑنے کی پیشگی اطلاع دینی ہو گی ورنہ میرے نام شوکاز نوٹس جاری ہو گا اور خواہ مخواہ الجھن بڑھے گی۔"

جلیس الحسن کے چہرے پر فکر و اندیشوں کی جگہ طمانیت نے لے لی۔

"گڈ! تو تم ریزائن کرنے جا رہی ہو؟"

"جی۔"

"نوٹس کتنے دن کا دینا ہو گا؟"

"یقین سے تو میں فی الوقت کچھ نہیں کہہ سکتی لیکن جہاں تک میری معلومات میں، غالباً پندرہ دن کا۔"

"گویا پندرہ دن تک تم اسکول جانے کی پابند ہو گی؟"

"میں تو یہی سمجھتی ہوں، بہرحال اصل صورتِ حال اسکول جانے پر معلوم ہو گی۔ ویسے آپ اطمینان رکھیں، اتفاق رخصت کے سالانہ کوٹے میں سے ابھی میں نے صرف پانچ ہی دن کی چھٹی لی ہے۔ یہی تہنیت کی شادی کے سلسلے میں۔ اگر ہیڈ مسٹریس مہربان ہو جائیں تو شاید مجھے کافی سہولت مل جائے گی۔ ورنہ اتنی اجازت تو آپ مجھے دیں گے کہ میں اپنی ملازمت سے حسبِ قاعدہ مستعفی ہو سکوں۔"

"او۔ کے۔" جلیس الحسن نے کہا۔

"ویسے تو میں ڈرائیور کی واپسی کا انتظار کر کے اُس کے ساتھ بھی جا سکتی ہوں مگر پہلے ہی دیر ہو چکی ہے۔ مزید دیر ہو جائے گی اس لیے آپ کو تکلیف دینا چاہتی ہوں۔"

جلیس الحسن اُس کے روبرو بہت نزدیک آ کھڑے ہوئے اور اس کے دونوں شانوں پر ہاتھ دھرتے ہوئے بولے: "کیا بات ہے الفت؟"

"آں..... کیا..... کیا ہوا؟" اُس نے کچھ گھبرا کر اُن کی طرف دیکھا۔

انھوں نے اُس کے شانوں پر سے اپنے ہاتھ ہٹاتے اور اُس کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولے: "تم اتنی کیوں بدل گئی ہو؟"

"بدل گئی ہوں؟" اُس نے سوالیہ لہجے میں اُن کے الفاظ دُہرائے۔

"ہاں..... بہت بدلی ہوئی لگتی ہو تم مجھے۔"

"کس اعتبار سے؟"

"کئی اعتبار سے۔"

الفت نے خاموشی پر اکتفا کیا اور اُن سے نظریں چرانے کی کوشش کرنے لگی۔

"تین دن ہو گئے ہیں تمہیں گھر لوٹے ہوئے اور ان تین دنوں میں کئی مرتبہ یہ بات محسوس کی ہے کہ تم میرے ساتھ بھی نارمل..... میرا مطلب ہے محتاط رویہ اپنائے ہوئے ہو۔" وہ پل بھر کو خاموشی اختیار کرنے کے بعد بولے: "تمہیں..... نہیں جاناں..... میرے ساتھ تمہارا یہ رویہ ہرگز نہیں چلے گا..... دیکھو تمہیں اپنے سے میں بہت قریب دیکھنا چاہتا ہوں..... اتنے نزدیک کہ کوئی بُعد محسوس نہ کر سکوں۔" انھوں نے دوبارہ توقف کیا پھر بولے: "ڈرائیور کی واپسی کا انتظار تم کیوں کرو، میں جو ہوں تمہارا موسٹ اوبیڈینٹ شوفر۔"

الفت کی آنکھوں کے کناروں پر نمی سی اُتر آئی۔

کیونکر بتاتی وہ اُن کو کہ:

سمندر کی شوریدہ سر لہروں کے سامنے بیٹھی عورت موجوں کی شوریدہ سری اور ریت کی بے اعتباری کا خوف دل میں لیے کس احتیاط سے گھروندا بنایا کرتی ہے۔

. . . .

گو اسکول لگے کافی دیر ہو چکی تھی مگر صدر دروازے پر تعینات حد درجہ بدمزاج چوکیدار ــ جس کے بارے میں "بے کار اساتذات کارنشینوں" کو رشک و حسد سے دیکھتے ہوئے انتہائی شاکی رہا کرتی تھیں ــ ساڑھے سات سے پونے آٹھ بج جاتیں تو چوکیدار گیٹ کھولنے پر انھیں ہیڈ مسٹریس سے زیادہ باتیں سُنا دیا کرتا ہے ــ جلیس الحسن کی گاڑی کا ہارن سنتے ہی صدر دروازہ وا کر دیا اور الفت کو اشکارے مارتی گاڑی کی اگلی نشست پر براجمان دیکھ کر سلام بجا لایا۔

جلیس الحسن کی گاڑی اسکول کے احاطے میں داخل ہوئی تو مس راحیلہ، مسز نیاز اور مسز صدیقی جو کیمسٹری لیب کے باہر برآمدے میں کھڑی خوش گپیوں میں مصروف تھیں بغور کار اور کار نشینوں کو دیکھنے لگیں۔ الفت کو گاڑی میں بیٹھے دیکھ کر ان کی نگاہوں میں رشک و حیرت کی کیفیت اُمڈ آئی۔

جلیس الحسن نے گاڑی برآمدے کی سیڑھیوں کے قریب روکی اور جب وہ گاڑی سے اترنے کے لیے دروازہ کھولنے لگی تو انھوں نے پوچھا "واپسی کا کیا پروگرام ہے؟"

"میں رکشا سے چلی جاؤں گی۔"

"چھٹی کتنے بجے ہوتی ہے؟"

"ساڑھے بارہ بجے۔"

"میں ڈرائیور کو ہدایت کر دوں گا کہ وہ تمھیں لینے آ جائے۔"

"نہیں اس سے دیر ہو جائے گی۔"

"کیوں؟"

"اُسے بچّوں کو بھی تو لینے جانا ہوگا۔ وہ کب مجھے چھوڑے گا اور کب انھیں لینے جائے گا۔ آپ میری واپسی کی فکر نہ کریں۔ میں خود چلی جاؤں گی۔"

جلیس الحسن نے اپنی نگاہوں میں کسی گہری سوچ کی کیفیت لیے اُسے دیکھا پھر بولے "ٹھیک جیسے تمھاری مرضی۔"

"خدا حافظ" الفت نے گاڑی سے اترتے ہوئے کہا۔

"خدا حافظ۔"

اُس نے برآمدے کا رُخ کیا اور جلیس الحسن نے واپس جانے کو گاڑی موڑ لی۔

جونہی وہ برآمدے کی سیڑھیوں سے برآمدے میں آئی، مسز نیاز نے بہ آوازِ بلند کہا "بھئی اُلفت تم کو بہن کی شادی مبارک۔"

"اگرچہ بلایا تو نہیں تم نے ہمیں اپنی بہن کی شادی میں مگر پھر بھی بہت مبارک" مسز صدیقی نے اپنے مخصوص طنزیہ تیور آزماتے ہوئے کہا۔

الفت نے تہنیت کی شادی میں اپنے اسکول کی ساتھیوں میں سے کسی کو مدعو نہیں کیا تھا۔

احتیاطاً، او مصلحتاً۔

حالانکہ رعنا جمیل کو بلانے کو بہت تھا اس کا دل۔

مگر اُس نے مصلحتاً انھیں بھی مدعو نہ کیا تھا۔

وہ جانتی تھی کہ کسی ایک کو بھی مدعو کیے جانے کی خبر دوسروں کو ہو گئی تو گلے شکوے جو ہوں گے وہ الگ، باتیں ہزاروں بنیں گی۔

اور اگر سب کو مدعو کرتی تو خدشہ تھا کہ وہ سرِ محفل اس کے اور جلیس الحسن کے تعلقات کو موضوعِ گفتگو بنائیں گی۔ شادی میں جلیس الحسن نہ آتے تو مس انجم کی بہن کے توسط سے ملنے والی خبر پر گویا مہرِ تصدیق ثبت ہو جائے گی، پھر جتنی باتیں نہ بنائی جاتیں کم ہوں گی۔

مس راحیلہ جو الفت کی شادی سے پہلے اُس کی اچھی بھلی دوست ہوا کرتی تھیں "مبارکاں! مبارکاں!" کا نعرہ لگاتی اُس کی طرف بڑھیں۔

پھر مسز صدیقی، مسز نیاز اور مس راحیلہ تینوں نے اُس کا باجماعت محاصرہ کر لیا۔

"اُلفت! ہم نے تو سُنا تھا کہ......" مسز نیاز کہتے کہتے رک گئیں اور معنی خیز نگاہوں سے مسز صدیقی اور مس راحیلہ کو دیکھنے لگیں۔

"مسز نیاز" الفت نے انتہائی سکون و تحمل کے ساتھ کہا "آپ نے جو سُنا تھا وہ درست تھا مگر آپ نے جو دیکھا ہے!"

مسز نیاز خفیف سی ہو گئیں اور بغلیں جھانکنے لگیں۔

انھیں اسی خفت میں غلطاں مسز صدیقی اور مس راحیلہ کے ساتھ کھڑے چھوڑ کر اس نے ہیڈ مسٹریس مسز ربانی کے دفتر کا رُخ کیا۔

تحریری استعفا اُس کے بیگ میں موجود تھا۔ اب اس سلسلے میں مسز ربانی سے گفت و شنید کرنی تھی۔

مسز ربانی کو اس نے اپنا استعفا پیش کیا تو وہ خاصے حیرت اور دکھ سے کچھ بول اُٹھیں "آپ ریزائن کیوں کر رہی ہیں؟"

"میڈم! میرے گھر کو میری زیادہ ضرورت ہے۔"

"ٹھیک ہے عورت کی ضرورت کس گھر کو نہیں ہوتی مگر جب تک آپ چھٹی سے کام چلا سکتی ہوں چلا لیتے۔"

"نہیں میڈم! میرا خیال ہے یہ اُس جائز امیدوار ملازمت کی حق تلفی ہوگی جو میرے استعفا دینے کے بعد خالی اسامی پر ملازم رکھی جا سکے گی۔"

"چودہ سال کی ملازمت ہے آپ کی۔"

"بجا مگر اب جبکہ مجھے ملازمت کی نہ تو ضرورت رہی ہے اور نہ میں اپنے پیشہ ورانہ فرائض اپنی گھریلو ذمے داریوں کے سبب اس قدر انہماک اور تن دہی کے ساتھ انجام دینے کی اہل باقی ہوں خود کو جیسا کہ حق بنتا ہے تو بہتر یہی ہے کہ میں اپنی میراث سمجھ کر دبائے رکھنے کے بجائے کسی حق دار کے حق میں دستبردار ہو جاؤں۔"

"گویا آپ فیصلہ کر چکی ہیں ملازمت چھوڑنے کا؟"

"جی ہاں۔"

"دیکھیے بعد کو مسز ثمینہ فاروق کی طرح مت آئیے گا میرے پاس کہ مجھ سے غلطی ہوئی عجلت میں فیصلہ کر لیا تھا اب ریزگنیشن واپس لینا چاہتی ہوں۔ وہ تو خوش قسمت تھیں کہ محکمے کے افسران ان دنوں ایک کانفرنس کے انعقاد میں مصروف تھے اور ان کی درخواست ایڈیا تھارٹیز کے پاس پہنچ نہیں پائی تھی پھر بھی نچلی سطح سے بھی اُن کے استعفے کو واپس لینے میں انھیں اور اُن کے میاں کو جو بھاگ دوڑ کرنا پڑی سو پڑی مجھے خاصی تکلیف ہوئی۔ ان لوگوں سے کہنا سننا پڑا جن سے کہیں عام حالات میں تو بات کرنا بھی پسند نہیں کرتی۔ آپ کو اندازہ نہیں افسران تو پھر بھی سُن لیتے ہیں شائستگی سے پیش آتے ہیں مگر کلریکل اسٹاف! معاذ اللہ موقع پاتے ہی چھوٹے میاں سبحان اللہ بن بیٹھتے ہیں..... آپ اچھی طرح سوچ سمجھ لیں۔"

الفت دھیرے سے مسکرا دی "میڈم! میں نے سوچ سمجھ کر ہی فیصلہ کیا ہے۔"

"ایک بات پوچھوں آپ سے؟"

"جی فرمایئے۔"

"میں نے کچھ اُڑتے اُڑتے سُنا تھا کہ......" مسز ربانی نے توقف کیا پھر محتاط لہجے میں بولیں "آپ کے اور آپ کے ہسبینڈ کے تعلقات خدانخواستہ کشیدہ ہیں؟"

اُلفت نے گھائل نگاہوں سے اُن کی طرف دیکھا۔

"آپ کو تو اچھی طرح پتا ہے کہ" مسز ربانی اس کی نگاہوں کی تاب نہ لا سکیں اور انھوں نے نظریں نیچی کرتے ہوئے کہا "میں اسٹاف سے زیادہ فری نہیں ہوں پھر بھی خبریں اِدھر اُدھر سے پہنچ ہی جاتی ہیں۔"

"جی میڈم" اُلفت نے دھیرے سے کہا "ایک وقتی بحران آیا تھا جو گزر گیا۔"

"گزر گیا؟"

"جی۔"

"گڈ!" مسز ربانی بولیں پھر اُنھوں نے اپنے معمول کے لہجے کے برخلاف بڑی رسانیت سے کہا "کشیدگی ہر میاں بیوی میں ہوتی رہتی ہے مگر وہ جو کہا ہے نا کسی نے کیا کہ.... بڑا مزہ ہے اس ملاپ میں جو ہو لڑائی ہو کر..... یا اس سے ملتی جلتی ہی کوئی بات تو بھئی وہ والی بات بھول جا ہیے......" پھر وہ دھیرے سے مسکرا کر بولیں "ہمارے صاحب تو کہا کرتے ہیں جو میاں بیوی لڑتے جھگڑتے نہیں اُن کی بخشش نہیں ہوگی کہ تم نے منافقت کی زندگی بسر کی۔"

اُلفت مسکرائے بنا نہ رہ سکی۔

"ایک دفعہ پھر سوچ لیں بلکہ اس ریزگنیشن کو ابھی دو چار روز اپنے پاس ہی رکھیں" مسز ربانی نے اصل موضوع کی

طرف لوٹتے ہوئے کہا

"میڈم! ملازمت سے استعفیٰ دینا میری ازدواجی زندگی کا اولین اور بنیادی تقاضا بن گیا ہے۔"

"آئی سی" مسز ربانی نے اُسے گہری نگاہوں سے دیکھا۔ "شاید آپ کے ہسبینڈ آپ کا ملازمت کرنا پسند نہیں کرتے۔"

"جی یہی سمجھیے۔"

"تب تو آپ کو زیادہ محتاط ہو کر فیصلہ کرنا چاہیے..... خدانخواستہ کل کلاں کو آپ کی اپنے ہسبینڈ سے کسی اور بات پر..... ایڈجسٹمنٹ نہ ہو سکی تو آپ کے پاس اپنے مستقبل کے لیے کوئی راستہ تو محفوظ ہونا چاہیے۔ ایک ملازمت پیشہ عورت کے لیے اس کی ملازمت بڑا تحفظ ہوا کرتی ہے اور دیکھیے ملازمت چھوڑ دینا بہت آسان ہے، حاصل کرنا بہت مشکل۔"

"آپ کے مخلصانہ مشوروں کا بہت شکریہ میڈم مگر مجھے استعفیٰ دینا ہے۔"

"اوکے..... مجھے آپ کا ریزگنیشن آگے بڑھا دینے میں کوئی اعتراض نہیں۔ ایک خالی اسامی کے لیے ہزاروں اُمیدوار منتظر بیٹھے ہیں۔"

"جی..... تو میں سرکاری خزانے سے جونک بن کر کیوں چپکی رہوں۔ دوسروں کے لیے جگہ کیوں نہ خالی کر دوں!"

مسز ربانی نے تیکھی نگاہوں سے اُسے دیکھا پھر اُس کے استعفیٰ کی درخواست پر ضروری ریمارکس لکھتے ہوئے گھنٹی بجا کر چپراسی کو بلایا اور اُس کے توسط سے آفس سپرنٹنڈنٹ کو اپنے دفتر میں طلب کرنے کے بعد ہدایت کی۔

"وکیل فاروقی صاحب یہ مس الفت کا ریزگنیشن فارورڈ کرنا ہے۔"

وکیل صاحب چونکے۔

"اچھا تو مس الفت ریزائن کر رہی ہیں!"

"مس الفت نہیں وکیل صاحب مسز الفت جلیس۔" الفت نے خوشگوار مسکراہٹ کے ساتھ تصحیح کی۔

"جی ہاں" مسز ربانی بھی اپنی غلطی کی بالواسطہ تصحیح پر جھینپ سی گئیں۔

"میڈم! یہ تو ہم لوگوں کی دیرینہ روایت ہے کہ جو ٹیچرز ہیں اس اسکول میں جو یہاں آنے کے بعد مسز بنیں مگر ہمارے، آپ کے اور ساتھی ساتھیوں کے لیے وہ بدستور مس ہی ہیں۔" وکیل صاحب مسکرا کر بولے۔

"میڈم! آج چلی جائے گی میری یہ درخواست یہاں سے؟" الفت نے پوچھا۔

"کیوں بھئی اب ایسی بھی کیا جلدی! کیا بہت بیزار ہو گئی ہیں آپ ہم سے؟"

"نو میڈم! یہ بات نہیں۔" وہ وکیل فاروقی صاحب کی موجودگی کے خیال سے زیادہ خفیف ہو گئی۔

"میڈم! میں آج ہی بھجوا دیتا ہوں۔" وکیل صاحب نے مسز ربانی کے منصب اور اہمیت کا لحاظ رکھتے ہوئے یہ بات کہی تو مسز ربانی سے مگر درحقیقت الفت کو اطمینان دلانے کے لیے۔

"رائٹ" مسز ربانی نے کہا۔

وکیل فاروقی کے جانے کے بعد الفت نے مسز ربانی سے معذرت طلب انداز میں کہا۔ "میڈم مجھے پوری شدت سے اس امر کا احساس ہے کہ میٹرک کے امتحان میں اب زیادہ دن نہیں اور میرا اس موقع پر جانا غلط ہے۔ مگر مجھے اُمید ہے کہ آپ اسے میری انتہائی مجبوری سمجھیں گی۔ ملازمت سے استعفیٰ دینا میری ذاتی مجبوری ہے لیکن اگر میرے ہسبینڈ معترض نہ ہوئے تو میرا وعدہ ہے کہ متبادل ٹیچر کا بندوبست ہونے تک میں میٹرک کی طالبات کو پڑھانے کے لیے آتی رہوں گی بشرطیکہ آپ بھی اس کی اجازت دیں۔"

مسز ربانی کچھ دیر ٹکٹکی باندھے حیرانی سے اُسے دیکھتی رہیں پھر بولیں۔ "پیشہ ورانہ ذمے داریوں کے سلسلے میں آپ کا یہ احساسِ فرض قابلِ تعریف ہے۔ کیا آپ اپنے ریزگنیشن کو میٹرک کے امتحانات تک التوا میں نہیں ڈال سکتیں؟"

"میڈم! کبھی کبھی جب ہمیں دو میں سے ایک راستے کا انتخاب کرنا ہو تو منتخب راہ پر پہلا قدم ہمیں اپنے دل پر رکھنا پڑتا ہے۔ کیونکہ اسی میں ہماری نجات ہوتی ہے۔ میں سمجھتی ہوں اس وقت میری پہلی ترجیح میرا گھر ہے۔"

مسز ربانی نے ایک گہری سانس لی پھر بولیں۔ "میں آپ کی مشکل کا کسی حد تک اندازہ کر سکتی ہوں۔ شاید آپ اور آپ کے ہسبینڈ کے درمیان کشیدگی کا اصل سبب آپ کی ملازمت رہی ہے۔"

الفت نے مسز ربانی کے اس قیاس کی تصدیق و تردید میں اُلجھنا مناسب نہیں سمجھا۔

"مس الفت! اگرچہ میں اسٹاف کے ذاتی معاملات میں دخل اندازی پسند نہیں کرتی مگر آپ سے یہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکتی کہ آپ آج کل ہیں کہاں؟ میرا مطلب ہے اپنے میکے میں یا.....؟"

"اپنے گھر۔"

"گڈ!" مسز ربانی نے قدرے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ "خوش ہیں؟"

"جی۔ اور اس خوشی کو برقرار رکھنے کے لیے ہی ایک ایسے موقع پر ریزائن کر رہی ہوں جب میٹرک کی طالبات کو بالخصوص میری ضرورت ہے اور میں خود کو شرمندہ محسوس کر رہی ہوں۔"

"آپ فکر نہ کریں، ہم کچھ نہ کچھ کر لیں گے۔ آپ انگلش گرامر لے رہی تھیں نا؟"

"جی۔"

"ٹھیک ہے میں لے لوں گی۔"

"مگر آپ کے پاس تو پہلے ہی نائنتھ کلاس کا پیریڈ ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔ ایک پیریڈ اور لے لوں گی۔"

"اوّل تو میں کوشش کروں گی کہ میرے ہسبینڈ راضی ہو جائیں کہ میں میٹرک کے امتحانات تک اعزازی طور پر میٹرک کو پڑھا سکوں ویسے بھی میٹرک میں میرا پیریڈ عموماً انٹرول کے بعد ہی ہوتا ہے ایک پیریڈ کے لیے آ جایا کروں گی۔"

"نہیں نہیں مس الفت آپ اس فکر کو ذہن سے بالکل نکال دیجیے اب تو..... میں یہ پیریڈ خود لوں گی۔ عورت ہونے کی حیثیت سے میں آپ کے مسئلے کا بخوبی اندازہ کر سکتی ہوں۔"

"آپ کو مشکل ہو گی کیونکہ آپ کو اور بھی بہت سے امور انجام دینے پڑتے ہیں۔"

"آپ فکر نہ کریں..... آپ کا ازدواجی اطمینان میری مشکل سے زیادہ اہم ہے۔"

"تھینک یو..... تھینک یو ویری مچ۔" الفت نے مشکور لہجے میں کہا۔

مسز ربانی جنہیں الفت نے ہمیشہ ایک سخت گیر معلّمہ کے روپ میں دیکھا تھا اپنے اس نئے روپ میں اُسے قدرے ناقابلِ یقین مگر بہت بھلی، مہربان اور مشفق لگ رہی تھیں۔

اگر یہ بات سچ ہے کہ:
عورت ہی عورت کی سب سے بڑی دشمن ہے
تو یہ بھی غلط نہیں کہ:
عورت ہی عورت کا درد محسوس کر سکتی ہے!
وقت کے ہاتھوں کتنے عجیب و غریب تجربات ہو رہے تھے اُسے!

شاید
سب سے بڑا تجربہ
اور سب سے اہم بات جو اُسے وقت نے سکھا دی تھی وہ یہی تھی کہ ع ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ کے مصداق انسانوں کے چہرے اور اُن کے ظاہری رویے بھی کھلا دھوکا دیتے رہتے ہیں!
بظاہر درشت اور تلخ نظر آنے والے لوگ بباطن انتہائی مشفق اور ہمدرد ثابت ہو سکتے ہیں اور بظاہر دوست نظر آنے والے لوگ اپنے مشفق اور دلکش چہروں کے نقاب کے اندر سے بھی زہر برسا سکتے ہیں۔
کسی نے سچ کہا ہے۔
وقت بہت بڑا معلّم ہے۔

• • • • • •

اسی دن وقفے تک الفت کے استعفیٰ پیش کر دینے کی خبر سارے تدریسی اور غیر تدریسی اسٹاف میں مشتہر ہو چکی تھی۔

رعنا جمیل پہلے اور دوسرے پیریڈ میں اپنی کلاسوں میں مصروف تھیں اس لیے اُن سے بات نہ ہو سکی، تیسرے پیریڈ میں جب وہ ہشتم الف میں پڑھا رہی تھی، رعنا جمیل کمرۂ جماعت کے دروازے پر آ کھڑی ہوئیں اور انہوں نے الفت کو اپنی جانب متوجہ کرتے ہوئے طالبات کے لحاظ سے خاصے "مکلفانہ طرزِ تخاطب" سے کہا۔ "الفت! میں آپ کو دو منٹ کے لیے ڈسٹرب کرنا چاہتی ہوں۔"

"جی۔" الفت کمرۂ جماعت سے باہر نکل آئی۔

طالبات کی پُراشتیاق نگاہوں اور پُرتجسس سماعت سے ذرا دُور وہ دونوں برآمدے کی سیڑھیوں کے

قریب منگی ستونوں کی آڑ میں کھڑی ہو گئیں۔

"تمنا بچے تم ریزائن کر رہی ہو؟"

"جی ..... میں تو درخواست پیش کر چکی ہوں اب محکمے کی منظوری کے مراحل باقی ہیں۔" الفت نے اپنی جماعت کی طالبات پر نظر رکھتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟"

"کیونکہ آپ کے مخلصانہ مشوروں کی روشنی میں میں اپنے گھر واپس چلی گئی ہوں۔"

"اچھا! یہ تو تم نے بہت اچھا کیا۔"

"اب اسی اچھائی کو برقرار رکھنے اس کو استحکام دینے اور اپنے میاں کی خوشنودی کی خاطر میں نے استعفٰی دیا ہے۔"

"تو کیا ..... ؟"

"مسز جمیل! اگلا پیریڈ فری ہے آپ کا؟"

"نہیں۔"

"تو پھر میں انٹرول میں بات کروں گی آپ سے کیونکہ لڑکیوں نے موقع پا کر شور مچانا شروع کر دیا ہے اس پاس کی کلاسیں ڈسٹرب ہو رہی ہوں گی۔"

"اچھی بات ہے۔"

"آپ کی فزکس لیب میں، وہاں اسٹاف روم میں نہیں۔"

"اب بھلا تمہیں کسی سے اتنا خوف زدہ ہونے کی کیا ضرورت! تم اپنے گھر چلی گئی ہو۔"

"بس میں اوروں کی موجودگی میں اپنی واقعات پر بات نہیں کرنا چاہتی۔" الفت نے اپنی توجہ اپنی جماعت کی طالبات پر مرکوز رکھتے ہوئے قدرے عجلت میں کہا۔ "انٹرول میں بات ہو گی آپ سے۔"

"ٹھیک ہے۔"

اُلفت نے تیزروی سے اپنے کمرۂ جماعت کا رُخ کیا۔

انٹرول میں جب وہ مسز رعنا جمیل سے کیے ہوئے وعدے کے مطابق فزکس لیب میں اُن کے پاس پہنچی تو انھیں سموسوں اور چائے کے ساتھ اپنا منتظر پایا۔

"ہاں بھئی جلدی بتاؤ کیوں دیا تم نے ریزائن؟" وہ بے تابی سے بولیں۔

"کیونکہ اُن کی مرضی نہیں تھی۔"

"تم رخصت بھی تو لے سکتی تھیں۔"

"پہلے لی تو تھی۔" اُلفت نے کہا پھر تجربہ گاہ کی اَدھ کھلی کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے بوجھل آواز میں بولی "جب حالات خراب ہوئے اور میں نے انھیں جتایا کہ وہ مجھے بے آسرا نہ سمجھیں میری ملازمت برقرار ہے اور میں اپنے پیروں پر کھڑی ہوں تو وہ سخت خفا ہوئے کہ تم نے مجھے دھوکا دیا۔ میرے اعتماد کو دھچکا پہنچایا۔ مجھے تاریکی میں رکھا وغیرہ وغیرہ۔"

"گویا تم نے انھیں جو دھمکی دی وہ انھوں نے الٹا تم ہی پر آزما ڈالی؟"

"میں نے دھمکی تو نہ دی تھی۔"

"چلو! انھوں نے اسے دھمکی ہی جانا ہوگا..... اچھا خیر..... تو پھر؟"

"تو پھر یہ کہ اب اُن کی خوشنودی کی خاطر استعفٰی دیا ہے میں نے۔"

"یہ بتاؤ کہ تم نے کیونکر؟"

رعنا کے اس سوال نے الفت کا چہرہ دھواں دھواں کر دیا۔

اُس نے ایک ٹھنڈی سانس کھینچنے کے بعد کہا۔ "بس کچھ نہ پوچھیے یہ سمجھیے کہ اپنے دل کو کچلتی ہوئی گئی ہوں دل کہتا تھا جھکنا مت ورنہ ہمیشہ کے لیے اپنی نظروں میں گر جاؤ گی ..... مگر میں نے دل کے کہنے پر عمل کرنے کے بجائے جھکنے کا فیصلہ کر لیا۔"

رعنا گہری سوچ میں پڑ گئیں۔

اُن کا چہرہ گویا کہہ رہا تھا کہ وہ الفت کے باطنی اضطراب اور درد سے بخوبی آشنا تھیں۔

پھر انھوں نے اُلفت کے شانے کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "اچھا کیا..... بہت اچھا کیا تم نے ..... "

اُلفت کا اضطراب بڑھ گیا۔ اُس کے لبوں پر لرزش سی طاری ہو گئی۔ اُس نے اپنے دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ کی انگلیاں چٹخاتے ہوئے کہا۔ "لیکن مسز جمیل! مجھے یوں لگتا ہے جیسے ....." اُس کی آواز لحظہ بہ لحظہ رُندھتے رُندھتے گھٹ کے رہ گئی۔

"بولو۔" رعنا نے بڑے پیار سے کہا۔

وہ کچھ دیر سر جھکائے چپ بیٹھی رنج و ملال کی انتہائی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی پھر اُس نے کہا۔ "مجھے لگتا ہے میں اندر سے پارہ پارہ ہو گئی ہوں شکست خوردگی کا احساس مجھے مارے ڈالتا ہے۔"

رعنا دھیرے سے ہنس دیں۔

"پگلی! شکست اور فتح کا سوال تو مقابلے یا جنگ میں ہوا کرتا ہے۔ میاں بیوی کوئی جنگ تھوڑی لڑ رہے ہوتے ہیں۔ جو فتح یا شکست کا سوال ہو۔ پرانی مثل ہے کہ میاں اور بیوی تو گاڑی کے دو پہیے ہوتے ہیں۔ گاڑی کے ٹھیک ٹھاک چلنے کا انحصار ان دو پہیوں کے باہمی توازن پر ہے۔ کبھی ایک دوسرے کے گھاؤ کو سہارا دیتا ہے کبھی دوسرا پہیہ کے زمین سے اُٹھاؤ کو متوازن کرنے کو دب جاتا ہے ..... تم تو میں یہ سمجھو کہ کسی موڑ پر گاڑی کا ایک پہیہ زمین سے قدرے اُٹھ گیا تھا دوسرا جو نسبتاً شریف تھا توازن قائم رکھنے کو دب گیا تاکہ گاڑی کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔"

"پہیے بھی شریف اور بدمعاش ہوتے ہیں کیا؟" اُس نے موہوم سی سوگوار رنگت میں اسی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"ارے تم نہیں جانتیں کیا ..... ؟ بھئی! بعض پہیے تو خطرناک حد تک بدمعاش ہوتے ہیں۔" انھوں نے کامل سنجیدگی سے کہا۔

الفت کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

"سچ کہتی ہوں۔" رعنا جمیل نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید کہا۔ "دوسرا پہیہ لاکھ چاہے مگر وہ بدمعاش والا پہیہ توازن میں آنے ہی نہیں دیتا۔ نتیجتاً گاڑی حادثے کا شکار ہو جاتی ہے ..... تم تو بہت خوش قسمت ہو کہ تمہاری زندگی کی گاڑی کا دوسرا پہیہ بھی تمہاری طرح مفاہمت پسند ہے اور گاڑی حادثے سے بچ گئی ہے۔"

الفت نے رعنا کی جانب دیکھا اور تشکر آمیز لہجے میں بولی۔ "کیسے شکریہ ادا کروں آپ کا؟"

"کس بات کا شکریہ بھئی؟"

"ہر بُرے وقت میں ہمیشہ دل سے ملال کو یوں دھو دیتی ہیں جیسے صابن میلے کپڑوں کی کثافت کو دھو ڈالتا ہے۔"

"تم میرے لیے چھوٹی بہنوں سے کم نہیں اور بڑی بہنیں کس کام کی اگر وہ چھوٹی بہنوں کے اتنا سا بھی کام نہ آ سکیں۔"

"شکریہ!" الفت کی آواز میں سیلن تھی اور اُس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

"بُری بات ..... بہنوں کے ساتھ یہ ظلم نہیں کیا کرتے۔" پھر وہ سموسوں کی پلیٹ اُس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولیں۔ "بھئی یہ تو لو کوس رہے ہوں گے یہ ہماری بدذوقی پر ہمیں۔"

الفت نے نیم دلی سے ایک سموسہ اُٹھا لیا۔

"اچھا ہاں وہ استعفے والی بات تو درمیان میں رہ گئی ..... کیا میاں تمہارے اتنی رعایت دینے پر بھی آمادہ نہ تھے کہ تم لمبی رخصت لے لو یا بھئی یہ ممکن ہے کہ کل کو محض وقت گزاری کی خاطر ملازمت ہی تمہاری ضرورت بن جائے۔"

"میں نے اس سلسلے میں اُن سے کوئی بات ہی نہیں کی۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ اول تو میں کسی جائز حق دار کو اُس کے حق سے محروم نہیں رکھنا چاہتی۔ میری جگہ ملازمت پر آنے والی امیدوار عوضی پر کیوں آئے خالی اسامی پر کیوں نہیں؟ اور دوسری بات یہ کہ ....."

رعنا اُس کی بات کاٹتے ہوئے بولیں۔ "ایک بات کہوں بشرطیکہ تم میرے بارے میں اپنی رائے کو بہت زیادہ نہ بگاڑ لینے کا وعدہ کرو؟"

"کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ؟"

"میرے خیال میں اس دنیا کی سفاکیوں سے مقابلہ کرنے کے لیے آدمی کو پچاس فی صد تو ہی سمجھیں فی صد خود غرض ضرور ہونا چاہیے۔"

الفت اُن کا منہ دیکھتی رہ گئی۔

"ہاں!" انھوں نے سر جھٹکا ..... یہ الفت بخشتے میری بڑی خالہ کا قول ہوا کرتا تھا جنھوں نے اٹھارہ برس کی نوجوانی

میں ہوگی کے بعد چھ ماہ کے بیٹے کی خاطر ہر خوشی تیاگ دی تھی۔ لوگوں نے انھوں نے لاکھ سمجھایا، بہتیرا کہ دوسری شادی کر ڈالو مگر انھوں نے کسی کی نہیں سنی اور انھوں نے کہا "میرا سہاگ تو اب بہت کر بیٹھے سے بنے بیٹے کو پڑھا لکھا کر انجینئر بنایا! اُس کا گھر بسایا اور آخر میں وہ صاحب اس بُری طرح بیوی کے غلام ہو چکے کہ ماں کو چھوڑ چھاڑ بیگم کے ساتھ جرمنی جا بسے خالہ بے چاری اُن کے صدمے میں ایسی پلنگ سے لگیں کہ پھر اٹھیں ہی نہیں۔"

الفت کو یہ مختصر مگر دلدوز داستان سُن کر رنج ہوا۔

"ایک بات تو بتائیے۔"

"ہاں پوچھو۔"

"ہم میں سے ہر عورت اپنے دل پر ایک نہ ایک گھاؤ لیے کیوں پھر رہی ہے؟"

رعنا جمیل نے ایک سرد آہ کھینچی۔ پھر بولیں۔ "شاید اس لیے کہ ہم صبر کر سکتی ہیں۔"

چلتے کے چند گھونٹ دونوں نے خاموشی کے حصار میں پیے پھر رعنا کو یک بہ یک یاد آیا۔ "ہاں وہ دوسری بات تو درمیان ہی میں رہ گئی۔"

"کون سی دوسری بات؟" الفت نے سوالیہ نظروں سے اُن کی طرف دیکھا۔

"جس کی بنا پر تم نے اپنے میاں سے اپنی ملازمت سے رخصت کے لیتے کی بات نہیں کی۔"

لیبارٹری کی آدھ کھلی کھڑکی سے در آنے والا ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا الفت کے بالوں کی اگلی لٹیں منتشر کرتا ہوا گزر گیا۔

الفت نے دونوں ہاتھوں سے بال سمیٹتے ہوئے ایک گہری سانس لی اور گمبھیر آواز میں بولی۔ "میں اب کی بار ساری کشتیاں جلا کر مقدر آزمانا چاہتی ہوں۔"

"کیوں؟"

"تاکہ پلٹ کر دیکھنے کی گنجائش باقی نہ رہے۔"

اُس کے چہرے پر لرزاں آزردگی کے سائے خود رعنا جمیل کے چہرے پر بھی عکس بن کر ڈولنے لگے۔

"میری دعائیں تمہارے ساتھ رہیں گی۔"

"مجھے دعاؤں کی ضرورت بھی ہے۔" الفت نے کہا۔

دوپہر کو جب چھٹی کی گھنٹی بجنے کے بعد وہ اپنی کلاس سے نکل کر برآمدے میں آئی تو اُس نے دیکھا، اسٹاف روم کے دروازے پر مسز نیاز، مسز راحیلہ اور مس انجم خاصے انہماک سے برآمدے سے پرے، احاطے میں ایک مخصوص سمت نگاہیں لگائے کھڑی تھیں اور آپس میں باتیں کر رہی تھیں۔

اُلفت نے گردن موڑ کر اُن کی نگاہوں کے تعاقب میں اپنی نگاہیں دوڑائیں تو دیکھتی ہی رہ گئی۔

احاطے میں ایستادہ بلند و بالا نیم تلے جلیس الحسن کی کار کھڑی تھی اور وہ گاڑی سے باہر سراپا انتظار بنے کھڑے تھے۔

جونہی مسز نیاز کی نظر الفت پر پڑی وہ برآمدے سے گزرتی طالبات کا لحاظ کیے بغیر با آوازِ بلند چلا اٹھیں۔

"الفت! بی بی! وہ دیکھو تمہارے میاں سوا بارہ بجے سے تمہارے انتظار میں ہیں۔"

برآمدے سے گزرتی طالبات چونک کر اُس کی سمت دیکھنے لگیں، جدھر مسز نیاز نے ہاتھ کا اشارہ کیا تھا۔

پھر اُن میں کھسر پھسر ہونے لگی۔

کبھی وہ گردن موڑ کر الفت کو دیکھتیں کبھی احاطے میں کھڑی گاڑی کی جانب تکنے لگتیں۔

الفت مجوب سی ہو کر لمبے لمبے ڈگ بھرتی اسٹاف روم تک پہنچی۔ اپنی اونی شال جو دن قدرے گرم ہو جانے کے سبب لپیٹ کر اسٹاف روم میں رکھ دی تھی میز پر سے اُٹھانے کو تھی کہ ملحقہ باتھ روم سے مسز الٰہی بخش برآمد ہوئیں اور انھوں نے کہا۔ "الفت! تمہاری شادی میں تو ہم آ نہیں سکے آج مسز نیاز نے بتائے میاں دکھائے بھئی بہت ہینڈسم ہیں۔"

"ہم نے تو آپ سے پہلے ہی کہا تھا کہ الفت کے میاں اُلفت سے زیادہ اچھے ہیں۔" اسٹاف روم میں ایستادہ چوبی الماری کے عقب سے مسز بھیم جی کی آواز آئی۔

اُلفت نے چونک کر توجہ کی۔

مسز بھیم جی الماری کی آڑ میں کھڑی اپنی ساڑی کی فال درست کر رہی تھیں۔

پھر اسٹاف روم میں قہقہوں کا ریلا سا در آیا۔

"ارے! الفت کے ہسبینڈ کو دیکھا؟" جیتنی زبانوں پر یہی سوال تھا۔

مسز سعدیقی نے اُلفت کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ "ارے بھئی الفت دوڑو، باہر نیم تلے تمہارے میاں تمہارے انتظار میں کھڑے ہیں۔"

اپنے گھروں کو جانے کے لیے چادریں اوڑھتی، کوٹ پہنتی، دوپٹوں کو سروں پر سلیقے سے جماتی اور ساڑیوں کی فال درست کرتی ساتھیوں کی رشک آمیز نگاہوں کے ہجوم سے گزرتی وہ باہر لپک لی۔

لیکٹی رنگ کا تھری پیس سوٹ اور خالص چمڑے کے جوتے پہنے، آنکھوں پر بادامی شیشوں کا چشمہ چڑھائے سراپا خوشبو میں بسے وہ اُس کے منتظر تھے۔

طالبات کی پُرتجسس و پُراشتیاق نگاہوں اور دھیمی دھیمی سرگوشیوں سے گزرتی جب وہ اُن تک پہنچی تو انھوں نے مسکرا کر کہا۔

"ہیلو مائی لو!"

اُس کے لیے قدم اُٹھانا مشکل ہو گئے۔

اُن کی مسکراہٹ گہری پڑ گئی۔

وہ یونٹ کے گرد نیم دائرے میں آگے بڑھے اور اُس کے لیے دروازہ وا کر دیا۔

پھر اُس کی طرف کا دروازہ بند کرنے کے بعد وہ دوسرے دروازے سے اُس کے برابر آ بیٹھے۔

گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے اُنھوں نے پوچھا۔ "ہاں جی کیسا رہا دن؟"

"بہت اچھا۔"

"آں ہاں اور...... وہ ریزگنیشن کا کیا رہا؟"

"دے دیا۔"

"پھر اب؟"

"بس اب ڈپارٹمنٹ سے استعفے کی منظوری آنے تک آپ کو مجھے اسکول آنے جانے کی اجازت دینی ہوگی۔"

"اور وہ جو تم کہہ رہی تھیں کہ کیجول لیو کا کوٹا ابھی کافی باقی ہے؟" انھوں نے گاڑی اسکول کے [illegible] دروازے کے رخ موڑتے ہوتے پوچھا۔

"ہاں وہ تو ہے مگر میٹرک کے امتحانات نزدیک ہیں مجھے ہیڈ مسٹریس سے کیجول لیو کی بات کرنے اچھا نہیں لگا لیس منھ موڑے سے دنوں کی بات ہی تو ہے۔"

"اچھا!" وہ نیم دلی سے بولے۔

الفت نے اپنے گرد ایک طائرانہ نظر دوڑائی۔

[illegible] ہاں تھی تھیں اُن کی پُراشتیاق نگاہیں اُس پر اُس کے میاں پر اور اُن کی [illegible]

گاڑی پر لگی تھیں۔

رعنا جمیل [illegible] مسز بھیم جی اور مس راحیلہ کے ساتھ چند قدم [illegible] الفت نے گاڑی اُن کے نزدیک [illegible]

روکا اور کہا۔ "آئیے آپ کو بس اسٹاپ تک ڈراپ کر دیں۔"

رعنا مسکرا دیں پھر جھک کر بولیں "شکریہ! تم تو اب چند دن کی مہمان ہو ہم اپنی عادت خراب کیوں کریں؟"

"نہیں تو" الفت نے اصرار کیا۔

"نہیں [illegible]...... بہت شکریہ...... ہم لوگ چلتے ہوئے راستے میں [illegible] کر لیں [illegible]"

رعنا نے کہا۔

"اچھی بات۔" الفت نے ہتھیار ڈال دیے۔

چہلیں کرتی طالبات کے بیچ سے راستہ بناتے ہوئے جلیس الحسن بہت سُست رفتاری سے [illegible] سے گاڑی نکال رہے تھے۔ کہ الفت نے سائیڈ مرر میں رعنا جمیل کا عکس دیکھا۔ وہ اپنے دائیں ہاتھ کی پہلی اور درمیانی انگلی سے "وی" بنائے مسکرا رہی تھیں۔

تمام شد

وہ اس "دکشری" کی بات کر رہی تھیں جو اُس نے شعلے اگلتی زبانوں کو اُن کے بھسم ہو جانے پر مجبور کر کے حاصل کی تھی۔

اس روز دوپہر کا کھانا جلیس الحسن نے گھر پر ہی کھایا۔ اور بچے بھی انھیں گھر میں موجود دیکھ کر نیچے اُتر آئے۔

• • • • • •

شام کو بھیا اور بھابی تہنیت اور سہیل کے اعزاز میں اپنی طرف سے دی جانے والی ضیافت میں شرکت کا بلاوا دینے آئے۔

جلیس الحسن دفتر سے آچکے تھے۔ اور اپنے برادرِ نسبتی یعنی بھیا کو دیکھ کر وہ ویسے ہی خوش ہوئے جیسے کہ عموماً شادی شدہ مرد اپنے سالا بیگم کو دیکھ کر خوش ہوا کرتے ہیں۔

"پرسوں شام تہنیت کی دعوت میں آپ سب کا بلاوا ہے۔" بھابی نے جلیس الحسن سے کہا "پھر بولیں "بچوں کو ضرور ہمراہ لائیے گا۔"

"مروّجہ فیشن کے مطابق ہلکی پھلکی موسیقی کا پروگرام بھی ہے۔ ایک صاحب تو وہی ہوں گے جنھوں نے فضیلت کے ہاں آپ کی دعوت میں غزلیں سُنائی تھیں۔ ایک دو اور شوقیہ فنکار رہوں گے۔" بھیا بولے۔

"الفی بچوں کو ضرور ساتھ لانا' خوش ہو جائیں گے۔" بھابی جان نے الفت کو بطورِ خاص مخاطب کر کے کہا۔

"جی اچھا۔"

"آج کل میں عظمت بھی آنے والی ہیں تمہارے ہاں۔" بھابی نے بتایا۔

"اور اُن کی وجہ نزول بھی وہی ہوگی جو کہ ہمارے بے وقت نازل ہونے کا سبب بنی ہے۔" بھیا نے کہا۔

"کیسی باتیں کرتے ہیں آپ' یہ آپ ہی کا گھر ہے' جب چاہیں بصد شوق تشریف لائیں۔" جلیس الحسن بولے۔

"اچھا اب اجازت۔" بھیا نے اُٹھنے کو پر تولے۔

"ارے اتنی جلدی..... آئے دو منٹ ہوتے نہیں کہ جانے کو اُٹھ کھڑے ہوئے آپ۔" جلیس الحسن نے بھیا کا بازو تھامتے ہوئے کہا۔

"دراصل کئی جگہوں پر جانا ہے اور وقت کم ہے۔"

"ہاں اب اجازت دیجیے۔"

"کچھ دیر تو بیٹھیے۔" جلیس الحسن نے اصرار کیا۔

"انشاءاللہ پھر آئیں گے اور بیٹھیں گے۔"

"بچوں کو ضرور لائیے گا۔" اب کی بار بھابی کی نظریں جلیس الحسن پر تھیں۔

"جی بہتر۔" انھوں نے رسمی انداز میں کہا۔

بھیا اور بھابی کو رخصت کر چکنے کے بعد جلیس الحسن اس سے بولے "بھئی الفت ہمیں بھی تو تہنیت کی دعوت کرنی چاہیے۔"

الفت نے انھیں مشکور نگاہوں سے دیکھا۔

جو بات وہ اُن سے کہنے کا ارادہ کر رہی تھی' وہ انھوں نے از خود کہہ کر اُس کی مشکل آسان کر دی تھی۔

"جی کرنا تو چاہیے۔"

"کب؟ کہاں؟" انھوں نے ایک ساتھ دو سوال کر دیے۔

"جب آپ چاہیں اور جہاں چاہیں۔"

"کب کا جہاں تک تعلق ہے تو میں کہوں گا کہ تہنیت کی دعوت تم اپنی پہلی فرصت میں اپنے نام کرا لو۔ رہا سوال یہ کہ دعوت کہاں کی جائے تو کسی بھی فائیو اسٹار ہوٹل میں بکنگ کروا لیں گے۔"

"گھر میں انتظام نہ کر لیا جائے؟"

"ہاں گھر پر بھی کیا جا سکتا ہے مگر......" وہ کہتے کہتے رک گئے۔

"مگر کیا؟"

وہ کچھ متذبذب نظر آنے لگے۔

الفت کے لیے نہ اُن کا "تذبذب" تاڑ لینا مشکل تھا نہ اس کا سبب۔

فی الوقت اُس نے اس موضوع کو التوا میں ڈالنا ہی مناسب جانا اور رات کے کھانے کی تیاری کا جائزہ لینے کے لیے کچن کا رُخ کیا۔

اور کوٹھی کی بالائی منزل پہ

فرزانہ اور زریں ٹی وی لاؤنج میں بیٹھے اپنا ٹی وی پروگرام پورے انہماک اور دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔

جبکہ تمکین اور اعجاز ٹیرس کے جنگلے کے سہارے کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی انھوں نے اپنی سوتیلی ماں کے بھائی اور بھاوج کو اپنے گھر آتے اور کچھ دیر بعد واپس جاتے دیکھا تھا اور اس وقت غم و غصّے کی کیفیت سے دوچار تھے۔

"میرا تو جی چاہتا ہے شوٹ کر دوں۔" اعجاز نے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر دائیں کی مٹھی سے پوری شدت سے ضرب لگاتے ہوئے کہا۔

"بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔"

"تم تو جیسے بڑی عقلمند ہو نا..... اوئے سلی گرل۔" اعجاز نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔

"شرم آنی چاہیے تمہیں' میں تمہاری بڑی بہن ہوں اور تم مجھے سلی گرل کہہ رہے ہو۔"

"صرف ایک سال بڑی۔"

"ہوں تو بڑی۔"

"بڑی بھی اور بڑی بے وقوف بھی۔"

"یہ آخر تمہیں مجھ پر اتنا غصّہ کیوں آ رہا ہے؟" تمکین نے اُس کا بازو پکڑتے ہوئے پوچھا۔

"کیا تم نے نہیں کہا تھا آنے تو دو اُن کو' ایسا تنگ کریں گے کہ دو دن میں میدان چھوڑ بھاگیں گی۔"

"ہاں کہا تھا۔"

"تو پھر؟"

"تو پھر کا کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ اُن کے تو مہمان آنے لگے ہیں دوبارہ سے۔ ابھی دیکھا تھا تم نے اُن کے موٹو بھائی صاحب کو۔ کیسے توند نکال نکال کر چل رہے تھے۔ بندوق ہوتی میرے پاس تو یہاں سے ایسا نشانہ لیتا کہ مٹکا پھوڑ دیتا۔"

"یو سلی بوائے' ایک تو تم غصّے میں بے وقوفی کی باتیں بہت کرنے لگتے ہو۔" تمکین نے اُسے پچکارا۔

"بابا کچھ کرو۔" اعجاز آہنی جنگلے کے چوبی فریم پر یکے بعد دیگرے دو تین مکے جماتے ہوئے بولا۔

"کوئی ترکیب کرو بیگم کی کوئی جھگڑا فساد کرو۔ پاپا وعدہ کر چکے ہیں کہ اب کی بار اگر اُس نے جھگڑا کیا تو گھر کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند ہو جائیں گے اُس پر۔"

"وہ کوئی موقع تو دیں۔ میں نے تو سوچا تھا اگر انھوں نے گڑبڑ کی تو ہم سب مل کر مزہ چکھا دیں گے۔ مگر وہ تو چپ ہیں۔"

"تو تم خود کوئی ترکیب سوچو۔"

"تم زیادہ پریشان مت ہو۔" تمکین نے اُسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

اگلی صبح جب جلیس الحسن اُس کے کہے بنا ہی اسکول چھوڑ آنے کو مستعد پائے گئے تو الفت کو شبِ عروسی کا کہا ہوا ایک جملہ یاد آ گیا:

"آپ ان بچوں کے معاملے میں مجھ سے تعاون کیجیے میں ہر معاملے میں آپ سے تعاون کروں گا۔"

تو کیا یہ ایفائے عہد کی ایک کڑی تھی!

اُسے تاسف ہوا کہ استعفا پیش کرنے سے قبل اگر اُس نے انھیں یہ بتاتے ہوئے کہ میٹرک کے امتحانات میں بمشکل دو ڈھائی باقی تھے اور وہ اسکول میں میٹرک کی طالبات کو انگریزی قواعد پڑھانے پر مامور تھی جس میں سرکاری اسکولوں کے طلبا و طالبات عموماً کمزور ہی ہوتے ہیں اُن سے میٹرک کی طالبات کے امتحانات کی تیاری کے لیے گھر بیٹھ جانے تک اسکول کی ملازمت جاری رکھنے کی مہلت طلب کی ہوتی تو شاید وہ اُسے مایوس نہ کرتے۔

مگر خیر اب تو جو ہونا تھا ہو چکا تھا۔

استعفا وہ پیش کر چکی تھی۔ غالباً وکیل فاروقی صاحب نے کل ہی اُسے ضروری کارروائی کے بعد محکمے کو ارسال بھی کر دیا ہوگا۔

اور الفت نے کل رات سوچا تھا کہ اب جتنے دن اسکول میں گزارنے ہیں، وہ اپنے فری پیریڈ میں میٹرک کی دوسری ٹیچرز کے پیریڈز لے کر جلد از جلد میٹرک کی طالبات کا مقررہ نصاب ختم کروانے کی کوشش کرے گی۔ تاکہ اُس کے ملازمت چھوڑنے کے بعد لڑکیوں کو نصاب ختم نہ ہونے کی پریشانی میں مبتلا نہ ہونا پڑے۔ پھر بعد میں نصاب کا اعادہ وہ خود بھی کر سکتی تھیں اور مسز بانی نے بھی اُسے اطمینان دلایا تھا کہ اُس کا پیریڈ وہ لے لیا کریں گی۔

بہرحال جو اُس کے اختیار میں تھا وہ کر جانا چاہتی تھی۔

گزشتہ روز کی طرح اس روز بھی چھٹی کے وقت جلابین الحسن اُسے لینے کے لیے موجود تھے۔ تاہم کل کی طرح وہ دوپہر کے کھانے کے لیے گھر پر نہیں رکے بلکہ اپنی کسی اشد مصروفیت کے باعث اُسے گھر پر چھوڑ کر فوراً ہی واپس چلے گئے۔

بچے جو کل گھر میں باپ کی موجودگی کے پیشِ نظر دوپہر کے کھانے کے لیے نیچے ڈائننگ لاؤنج میں آ گئے تھے، آج اوپر ہی رہے اور الفت نے ملازم کو اُن کا کھانا اوپر پہنچا دینے کی ہدایت کی۔

اُس نے نیچے تنہا ہی کھانا کھایا۔

کھانے کے بعد جب اوپر سے برتن نیچے آ چکے اور کچن سے برتنوں کی دُھلائی اور اُن کے باہم ٹکرانے کی مترنم صدائیں آنے لگیں تو الفت نے دبے پاؤں بالائی منزل کا رُخ کیا۔

پہلے اُس نے اعجاز کے اس کمرے میں ہونے کا یقین کیا پھر نگین کے کمرے کے نیم وا دروازے پر دستک دی۔

"کون؟" نگین نے پوچھا۔

اور جواب میں الفت نے کمرے میں جھانکا۔

نگین جو بستر پر نیم دراز تھی اُسے دیکھتے ہی سیدھی ہو بیٹھی، اور اس کی نگاہوں میں حیرت، نفرت اور خوف کی ملی جلی کیفیات ہلکورے لینے لگیں۔

زرین نے جو بستر پر لیٹی کہانی کی ایک کتاب اپنی آنکھوں کے بے حد نزدیک کیے پڑھ رہی تھی، کتاب کی آڑ سے دیکھا اور اُس پر نظر پڑتے ہی قدرے خوفزدہ سی اُٹھ بیٹھی اور نگین کی آڑ میں چھپنے کی کوشش کرنے لگی۔

الفت کو اُن دونوں سے ایک روح فرسا رقابت کا احساس ہوا۔

لیکن اُس نے اپنی کیفیت پر بہت جلد قابو پاتے ہوئے بڑی رسانیت سے کہا۔ "نگین بیٹے! میں اندر آ سکتی ہوں؟"

"کیا بات ہے؟" نگین نے تیوری پر بل ڈال کر پوچھا۔

"کچھ بات کرنی ہے مجھے آپ سے۔" وہ اندر داخل ہو گئی۔

"کیا بات؟"

"بیٹا! پہلے مجھے اندر آنے کی اجازت تو دو۔" اُس نے نفرت اور رقابت کو مصلحت کی مار دیتے ہوئے کہا

"اندر تو آپ آ چکی ہیں؟"

"ہاں اندر تو آ چکی ہوں۔ اپنے قریب آنے کی اجازت دو۔" الفت نے اُس کی اجازت کے بنا ہی قدم بڑھا دیے۔

"اگر آپ یہ سمجھتی ہیں کہ آپ ہم سے چاپلوسی اور خوشامد سے کام لے سکتی ہیں تو یہ آپ کی بھول ہے۔"

الفت مسہری کے کنارے پر جا بیٹھی۔

"بیٹا! مائیں بچوں کی منت تو کر سکتی ہیں مگر اُن سے چاپلوسی سے کام نہیں لیتیں۔"

"آپ ہماری ماں تو نہیں ہیں۔" نگین نے بڑی بے رحمی سے کہا۔

اور الفت کو رعنا جمیل کی بات یاد آ گئی۔

"دوسرے کے بچے کبھی اپنے بچے نہیں بن سکتے۔"

اُس کے لبوں سے ایک گھٹی گھٹی سی سرد آہ نکلی۔

اُس نے کمال تحمل نگاہوں سے نگین کو دیکھا پھر بولی۔ "ٹھیک ہے تمہاری ماں نہیں ہوں مگر تمہاری بڑی تو ہوں۔"

"بابا کے سوا ہمارا کوئی بڑا نہیں ہے۔" وہ انتہائی بے رخی سے بولی۔

"اوکے.... بڑا بھی مت سمجھو.... گھر کی نوکرانی ہی سمجھ لو.... آخر تم اجراں سے بھی تو بات کرتی ہی ہو۔"

"میں نے کہا نا آپ کی چاپلوسی اور خوشامد ہم برداشت نہیں کریں گی۔"

اُلفت نے سر جھکا لیا۔

کچھ دیر یونہی بیٹھی رہی۔

پھر اُس نے رنجیدگی سے کہا۔ "تم لوگ مجھ سے اتنے خفا کیوں ہو؟"

نگین کچھ نہیں بولی۔

"بولو بیٹے.... کیوں اتنے خفا ہو مجھ سے؟"

نگین نے بدستور چپ سادھے رکھی۔

"کیا میں اتنی بُری ہوں کہ تم لوگ بیٹھ کر ساتھ ایک میز پر کھانا کھانا تک گوارا نہیں کرتے؟"

الفت کی مصلحت کوشی اُس کا اپنا دل چیرے لے رہی تھی۔

اتنی بُری طرح تو اُس نے زندگی میں کبھی کسی کے سامنے اپنا سر نگوں نہیں کیا تھا۔

"آپ کے اس طرح مجھ سے دُور دُور رہنے سے گھر کے نوکروں کو باتیں بنانے کا موقع ملتا ہے۔"

"تو ہم کیا کریں؟"

"آپ یہ کریں بیٹے کہ چھوٹے بہن بھائیوں کو سمجھائیں کہ وہ بے شک مجھ سے بات نہ کریں، مجھے اچھا نہ سمجھیں مگر میرے ساتھ بیٹھ کر کھانا تو کھا لیا کریں۔"

"کھانا ہم اوپر کھائیں یا نیچے اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"پڑتا ہے.... پڑتا ہے۔"

"ہمارے آرام کا وقت ہے آپ ہمیں آرام کرنے دیں۔" نگین نے منہ بنا کر کہا۔

"ٹھیک ہے تم آرام کرو...... بس ایک بات بتا دو مجھے۔" الفت نے توقف کیا پھر بولی۔ "کل آپ دعوت میں میرے اور اپنے بابا کے ساتھ چلنا پسند کرو گی؟"

"جی نہیں۔" نگین نے بلا تامل انکار کیا۔

"تھوڑی دیر کے لیے۔"

"ایک منٹ کے لیے بھی نہیں۔" نگین نے فیصلہ کن انداز میں کہا پھر بولی۔ "میں نے کہا نا آپ زیادہ چاپلوسی سے کام لینے کی کوشش نہ کریں۔"

نگین جیسی سیکڑوں بلکہ ہزاروں لڑکیوں کو الفت اپنی چودہ سالہ ملازمت کے دوران پڑھا چکی تھی۔ اُس کی ہم سن اپنی شاگرد لڑکیوں کو اُس نے ہمیشہ اپنے آگے سرِ تسلیم خم کیے پایا تھا۔ وہ عزت و تکریم کی عادی تھی!

نگین کو منہ در منہ مقابلہ کرتے اور بدتمیزی سے جواب دیتے دیکھ کر اُس کا خون کھولے جا رہا تھا۔ احساسِ شکست سے اُس کا رُواں رُواں تپ رہا تھا۔ وہ ایسی بدتہذیبی کی عادی کب تھی!

مگر مصلحت کوشی نے اُسے نگین کی اس بدخلقی کو چپ چاپ برداشت کر لینے پر مجبور کر رکھا تھا۔ اُس نے الجھ کر تو دیکھ لیا تھا اور بالآخر گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو گئی تھی۔

اب وہ صبر و رضا سے کام لے کر دوسروں کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دینے کا تجربہ کرنا چاہتی تھی اور خود ہتھیار نہ ڈالنا چاہتی تھی۔

اسی لیے نگین کے ناروا طرزِ عمل کے باوجود وہ حوصلہ نہیں ہاری۔

"بیٹا! تمہاری شرکت سے میرے خاندان والوں میں میری عزت بڑھ جائے گی۔" اُس نے بڑے تحمل سے کہا۔

نگین نے سر کو بائیں رُخ پر تھوڑا سا جھٹکا دیتے ہوئے زہر آگیں نگاہوں سے اُسے دیکھا اور اپنے اور اُس کی عمر اور رشتے کا لحاظ بالائے طاق رکھتے ہوئے بولی۔ "برائے مہربانی آپ میرے کمرے سے چلی جائیے ورنہ مجھے اپنے بھائی کو بلانا پڑے گا۔"

لمحہ بھر کو الفت کا سینہ پتھر کا سا ہو گیا۔ اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ جبڑے بھنچ گئے۔ چہرہ دُھواں دُھواں ہو گیا۔

اُس کا جی چاہا چلا کر کہے۔ "بدبخت لڑکی بلا لے..... بلا لے اپنے بھائی کو۔ دیکھتی ہوں کہ وہ تیرا احمق نیرا میرا کیا بگاڑ سکتا ہے۔ میں جتنی نرمی سے کام لے رہی ہوں تو اُسی قدر ماش کے آٹے کی طرح اکڑی ہی جا رہی ہے۔"

لیکن اُس نے ہیجان پر ضبط کے پہرے بٹھاتے ہوئے کہا۔ "اچھا بیٹا چلی جاتی ہوں۔"

من من بھر کے قدموں سے وہ نیچے اُتری اپنے کمرے میں پہنچ کر دروازے کو بند کیا اور بستر پر اوندھی پڑکر رونے لگی۔

نصیب کی سختی نے اُسے کیسی آزمائش سے دوچار کر دیا تھا!

اور نگین نے اپنے کمرے سے اُس کے جاتے ہی اعجاز کے کمرے کا رُخ کیا۔ زرّین بھی اُس کے ساتھ تھی۔

نگین اعجاز کو سارا واقعہ سُنا چکی تو وہ بولا "اب یہ عورت ہمارے ساتھ کوئی زبردست گیم کھیلنے جا رہی ہے۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" نگین نے تائید کی اور بولی "یقین کرو بھائی میں نے اتنی انسلٹ کی ہے اُس کی اور چاہا کہ چھوٹے موٹے لڑائی جھگڑے سے آغاز ہو جائے مگر وہ پھر بھی ڈھٹائی سے بیٹھی رہی۔"

"میں کہتا ہوں نا تم سے شی از اے رذیل بچ۔"

"بھائی! نگی باجی نے اتنا ڈانٹا۔ مگر وہ پھر بھی غصے میں نہیں آئیں۔" زرّین نے بھائی کو بتایا۔

"بہرحال آج پاپا سے میری شکایت ضرور کی جائے گی۔"

"کرنے۔ ضرور کرنے...... کیا تم ڈر رہی ہو؟"

"نہیں ڈر تو نہیں رہی۔"

"پھر؟"

"دیکھنا یہ ہے کہ پاپا کیا کہتے ہیں؟"

"پاپا بھی بس ایسے ہی ہیں۔" اعجاز سر جھٹک کر بولا۔

"کیا مطلب؟"

"کل خوب ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے اُس سے۔"

"تم نے دیکھا؟"

"ہاں کل شام میں نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے دیکھا تھا دونوں لان پر بیٹھے تھے۔"

"آج شام مجھے ڈانٹ پڑنے جا رہی ہے!"

"نگی باجی آپ بھی پاپا سے اُن کی جھوٹی جھوٹی شکایتیں کر دیجیے گا۔" زرّین بولی۔

"گڈ آئیڈیا!" اعجاز نے چٹکی بجائی پھر زرّین کو توصیفی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا "چھوٹی! یو آر ونڈرفل۔ بے بی ہو تم تو...... اتنے چھوٹے سے دماغ میں اتنی بڑی بات!"

زرّین نیازمندانہ انداز میں مسکرانے لگی۔

"بالکل ٹھیک ہے نگی جب پاپا تم سے کچھ کہیں تو تم کہہ دینا کہ تم کو بُرا کہا تمہیں گالیاں دیں اور......" اعجاز نے نگین سے کہا۔

"ہاں اور کیا؟"

"اور جو مرضی آئے کہہ دینا۔"

شام تک نگین یہی سوچتی رہی کہ اُسے پاپا سے کیا کہنا ہوگا۔

لیکن اُس کی یہ ساری تگ و دو دھری رہ گئی۔

جلیس الحسن نے حسبِ معمول کچھ وقت اُن کے ساتھ اوپر گزارا۔ اُن سب سے باتیں بھی کیں۔ اعجاز کو جتایا کہ میٹرک کے سالانہ امتحانات میں اُس کا اوّل آنا ضروری ہے۔

مگر نگین سے انھوں نے اُس کی توقع کے برخلاف کوئی بازپرس نہیں کی بلکہ قطعاً تذکرہ تک نہیں کیا۔

وہ تذکرہ تو تب کرتے جبکہ الفت نے اُن سے تذکرہ کیا ہوتا۔

اگرچہ اُسے نگین کے رویّے سے بہت دکھ پہنچا تھا مگر اُس نے جلیس الحسن سے کچھ نہیں کہا تھا۔

شکایتوں حکایتوں میں اُلجھ کر وہ زندگی کا رہا سہا حُسن بھی غارت کر دینے کے حق میں نہ تھی۔

بچوں کا رویّہ بے شک تکلیف دہ تھا۔

مگر جلیس الحسن کا طرزِ عمل انتہائی مفاہمانہ تھا۔

تہنیت کی تیسری دعوت الفت کے ہاں ٹھہری۔

الفت نے چھوٹے پیمانے پر دعوت کرنا چاہی مگر جلیس الحسن نے اس تقریب کو ایٹ "گرینڈ بیشن" بنانے کا اہتمام کر ڈالا۔

"گھر میں بہت عرصے بعد کوئی تقریب ہو رہی ہے تو شاندار ہونی چاہیے۔" انھوں نے کہا۔

الفت کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔

جس طور جلیس الحسن اس تقریب کے انعقاد میں دلچسپی لے رہے تھے اُس سے یہ بات عیاں تھی کہ یہ تقریب تہنیت اور سہیل کے اعزاز میں رکھی جانے والی ایک یادگار تقریب قرار پائے گی۔

الفت تو اپنے میکے اور تہنیت کی سسرال سے فقط تیس پینتیس افراد کو بلانے کا تخمینہ لگائے بیٹھی تھی۔ مگر جلیس الحسن نے اُس کے میکے سے تقریباً ڈیڑھ سو افراد کو مدعو کر ڈالا۔ چند احباب انھوں نے اپنے بھی مدعو کیے۔ الفت نے اپنے حلقۂ احباب سے صرف رعنا جمیل اور اُن کے اہلِ خانہ ہی کو دعوت دی۔

اتنی بڑی دعوت کا میزبان بننا الفت کے لیے پہلا تجربہ تھا مگر جلیس الحسن اس سلسلے میں خاصے تجربے کار تھے۔ عاصمہ بیگم کے زمانے میں ایک دو نہیں بیسیوں تقاریب کا اہتمام کیا تھا انھوں نے۔ چھوٹی موٹی دعوتیں تو آئے دن ہوتی رہتی تھیں۔ دوسرے تیسرے دن کھانے کی میز پر مہمان ہوا کرتے تھے۔ حلقۂ احباب جلیس الحسن کا بھی وسیع تھا عاصمہ کا بھی۔

مگر عاصمہ بیگم کے جانے کے بعد جلیس الحسن ماسوا چند احباب کے اپنے بیشتر دوستوں سے کٹ سے گئے تھے۔

الفت سے شادی کے بعد انھوں نے اپنا ولیمہ بھی ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں کیا تھا۔ یوں عاصمہ کے جانے کے بعد تہنیت کی دعوت "حسن لاج" میں پہلی تقریب تھی۔

اپنے سابقہ تجربے کے سبب جلیس الحسن کو تو کوئی خاص فکر نہ تھی بلکہ اپنے گھر میں بڑے دنوں بعد ایک بڑی تقریب کے انعقاد کی تیاری اُن کے لیے باعثِ مسرت تھی تاہم الفت خوش ہونے کے ساتھ قدرے ہراساں اور متفکر بھی تھی۔

خوشی تو اُسے اس بات کی تھی کہ جلیس الحسن اُس کی بہن اور بہنوئی کے اعزاز میں اتنی بڑی تقریب منعقد کر کے اس بات کا ثبوت دینے جا رہے تھے کہ وہ اپنے اور اُس کے گھر والوں کے سماجی مراتب میں ایک درجے کا فرق ہونے کے باوجود اُس کے میکے والوں کو اور اُس کی خوشی کو اہمیت دیتے تھے۔

خوشی اُسے اس بات کی بھی تھی کہ یہ تقریب اُسے اُس کے بھائی بہنوں سے قطعِ نظر دیگر عزیزوں میں بھی سرباند کر دے گی۔

اس بہانے وہ سُرخرو ہو سکے گی۔

ہراساں وہ اس خیال سے تھی کہ اس بڑی تقریب کا حقِ میزبانی کیونکر ادا کر سکے گی؟ کہیں کوئی سُبکی نہ ہو جائے۔

گو تیار شدہ کھانوں کی فراہمی اور خدمتِ میزبانی کے سلسلے میں جملہ ذمے داری جلیس الحسن نے ایک آزمودہ انتظامیہ کے سپرد کر دی تھی۔

مگر پھر بھی پہلی مرتبہ ایک ایسی تقریب کا میزبان بننا جس کے مدعوئین میں اُڑتی چڑیا کے پر گن لینے والی بعض خواتین بھی شامل تھیں کم از کم الفت کے لیے تو ایک فکر طلب مرحلہ ہی تھا۔

سب سے زیادہ پریشانی اس خیال سے ہو رہی تھی کہ اگر جلیس الحسن کے بچے شریکِ تقریب نہ ہوئے یا شریک ہو کر بھی کچھ اُکھڑے اُکھڑے سے رہے تو وہ کیسی خفت کا شکار ہوگی؟

کیا خبر شریکِ تقریب ہی نہ ہوں یا اس سے بچوں کے بارے میں کیسا استفسار کر ڈالے۔ کیا جانے کون کون بچوں سے اس کی بابت پوچھے۔ بچوں کو تقریب کی وجہ انعقاد سے آگاہ کرنا اور انھیں مہمانوں کے سامنے خوش خلقی اور تمیز داری کا مظاہرہ کرنے کا پابند کرنا بجائے خود ایک گمبھیر مسئلہ تھا۔

دعوت سے دو روز قبل الفت نے دبی زبان سے جلیس الحسن سے پوچھا "بچوں کو دعوت کا علم ہے؟"

"ہاں ہے۔" وہ بولے۔

"شریک ہوں گے؟"

"ہاں کیوں نہیں۔ بلکہ کل انھیں کچھ شاپنگ وغیرہ بھی کروائی ہے اس سلسلے میں۔ بہت دنوں بعد گھر میں کوئی تقریب ہو رہی ہے۔ اُن کے لیے نئے ملبوسات آ جائیں تو خوش ہو جائیں گے۔"

"خاک خوش ہوں گی وہ بدروحیں۔" الفت نے دل میں کہا مگر زبان سے بولی "جی ہاں ضرور۔"

دل اور زبان کے مابین اس اختلاف اور زبان کی منافقت پر اسے خفت بھی ہوئی۔
مگر پھر اس نے سوچا:
یہی زندگی ہے!
ہم میں سے بیشتر انسان دوہری زندگی بسر کرتے ہیں۔ ہمارے دل میں کچھ ہوتا ہے، زبان پر کچھ۔
اور
شاید کامیاب زندگی منافقانہ زندگی ہی کا دوسرا نام ہے!
پھر اس نے سر جھکا کر آہستہ سے کہا: "کیا آپ بچوں کو پیار سے ایک بات سمجھا سکتے ہیں؟"
"کیا؟"
"کہ وہ مہمانوں کے سامنے مجھ سے بیزار نظر آئیں۔ چند گھنٹوں کو خاموشی سے مجھے برداشت کر لیں ورنہ لوگوں کو باتیں بنانے کا موقع ملے گا۔"
کہنے کو وہ یہ بات بچوں سے خود بھی کہہ سکتی تھی مگر اس نے اپنے سابقہ تجربے کے پیشِ نظر ان سے براہِ راست بات کرنا مناسب نہیں جانا تھا۔
کیا عجب کہ براہِ راست بات کرنے کا وہ کچھ الٹا ہی ردِ عمل ظاہر کرتے۔
جلیس الحسن اس کی بات سن کر اس کا منہ تکتے رہ گئے۔
ان کے گمان میں بھی نہ تھا کہ چند ماہ قبل اس نے جن بچوں کو یکسر مسترد کر دیا تھا، ان کی بابت وہ اس قدر حلیم الطبعی کا مظاہرہ بھی کر سکتی ہے۔
اگرچہ وہ الفت اور بچوں کے باہمی معاملات میں کچھ عرصے تک قطعاً مداخلت نہ کرنے کا تہیہ کیے ہوئے تھے لیکن انھوں نے چند لمحے سوچنے کے بعد کہا: "تم فکر نہ کرو، میں سمجھا دوں گا۔"
جلیس الحسن بچوں سے زیادہ بحث و تمحیص میں نہیں الجھے۔ انھوں نے فقط ایک ترپ چال چلی!
"حماد بیٹے! اگر آپ فرسٹ آئے اپنے امتحان تو کالج جانے کے لیے بالکل نئی کار کی چابی میری طرف سے تحفہ ہوگی۔"
"ریئلی پاپا!" اس نے بے یقینی سے کہا۔
"او! یس" جلیس الحسن نے اپنا بازو بیٹے کے شانوں پر دراز کرتے ہوئے کہا "اور ہاں بیٹا جی! ایک بات اور پرسوں کی تقریب میں نگی اور آپ بڑے مہمانوں کا اور فراز اور زرین ننھے مہمانوں کا استقبال کریں گے۔ آپ لوگ میزبان ہوں گے۔ خیال ہے کہ مہمانوں کو شکایت کا کوئی موقع نہ ملے...... اوکے؟"
"اوکے پاپا!" اعجاز اور نگی کو بادلِ ناخواستہ کہنا پڑا۔
اور اسی بادلِ ناخواستگی کے ساتھ انھوں نے دو دن بعد مہمانوں کا استقبال کیا۔
بحیثیت مجموعی تقریب بہت پُرمسرت اور کامیاب رہی۔

پانچواں پیریڈ تھا اور الفت فہم بی میں تھی۔ اس نے طالبات کو "لے وزٹ ٹو دی زو" کے عنوان کے تحت ایک مضمون لکھنے کا کام تفویض کر رکھا تھا۔ بیشتر طالبات سر جھکائے کام میں مصروف تھیں اور چند ادھر ادھر تاکا جھانکی کرتے ہوئے دوسروں کی کارکردگی پر حسبِ استطاعت ہاتھ صاف کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔
ڈیسکوں اور کرسیوں کی دو رویہ قطاروں کے درمیان آہستہ خرامی سے کمرۂ جماعت کا چکر لگاتے ہوئے بظاہر الفت کی نظریں طالبات پر تھیں مگر اس کا ذہن کہیں اور تھا۔
ان گنت سوچوں اور فکروں میں گرفتار!
جلیس الحسن کی مفاہمانہ اور بچوں کی متنفر نگاہوں کے بیچ الجھا ہوا!
دفعتاً مسز ربانی کے چپراسی احمد نے کمرۂ جماعت میں داخل ہوتے ہوئے کہا: "مس! آپ کو سیڈم بلا رہی ہیں۔"
احمد کی بلند آہنگی نے طالبات کو اس کی طرف دیکھنے پر مجبور کر دیا۔
"خیریت؟" الفت نے پوچھا۔
"جی میرے کو کچھ خبر نہیں۔ میڈم نے کہا مس الفت کو بلاؤ، میں آپ کو بلانے آگیا۔" احمد نے خاصی بے نیازی سے کہا اور جس تیزی سے آیا تھا اسی تیزی سے واپس بھی چلا گیا۔
الفت نے میز پر سے اپنا بیگ اٹھاتے ہوئے طالبات کو اسی خاموشی سے کام کرنے کی ہدایت کی اور کمرۂ جماعت سے مسز ربانی کے دفتر کی طرف چل دی۔
جونہی وہ مسز ربانی کے دفتر کے دروازے پر پڑی چق اٹھا کر اندر داخل ہوئی مسز ربانی نے اس پر نظر پڑتے ہی کہا: "آئیے آئیے۔"
"جی میڈم!" وہ ان کے روبرو پہنچنے کے بعد بولی۔
"بیٹھیے۔"
الفت کرسی کھینچ کر ان کے روبرو بیٹھ گئی۔
"سمجھ میں نہیں آرہا مس الفت...... اور آئی ایم سوری مسز جلیس!" مسز ربانی اپنے سہو پر معذرت کرتے ہوئے بولیں "کہ میں آپ کو مبارکباد دوں یا اظہارِ افسوس کروں۔"
الفت استفہامیہ نظروں سے ان کی جانب دیکھنے لگی۔
"آپ کے استعفے کی منظوری آگئی ہے۔"
اسے یوں لگا جیسے کسی نے اس کا دل پوری قوت سے مٹھی میں دبوچ لیا ہو۔
"یہ لیجیے یہ رہا آپ کا ایکسیپٹنس لیٹر۔"
اس نے ایک نظر پروانۂ منظوری پر ڈالی اور اس کی آنکھوں کے کنارے بھیگ گئے۔
"تھینک یو میڈم!" اس نے بھیگی ہوئی آواز میں کہا۔
"میں آپ کی فیلنگز کو بخوبی سمجھ سکتی ہوں مسز جلیس!" مسز ربانی نے کہا: "اپنی پہلی فرصت میں آپ اپنے واجبات کی وصولی کے سلسلے میں ضروری کارروائی کے لیے وکیل فاروقی صاحب سے رابطہ قائم کر لیجیے گا۔"
"جی بہتر" اس نے دھیرے سے کہا پھر بولی "میڈم! اپنی چودہ سالہ ملازمت کے گیارہ برس میں نے اس اسکول میں گزارے ہیں...... یہاں میرا بہت اچھا وقت گزرا۔ آپ نے ہر معاملے میں تعاون فرمایا، میں آپ کی مشکور رہوں گی۔"

"آئی وِش یو آل دی بیسٹ اِن فیوچر" مسز ربانی بولیں۔
"تھینک یو..... تھینک یو ویری مچ" اُلفت نے بوجھل آواز میں کہا۔
"ہر جانے والے کی طرح آپ بھی حسبِ روایت ایک دن ہم لوگوں کے نام کریں گی۔ اس سلسلے میں ہم آپ سے ٹیلیفون پر رابطہ قائم کرلیں گے۔"
"بہتر...... مجھے اجازت" وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔
مسز ربانی بھی اپنی کرسی سے اُٹھ کھڑی ہوئیں۔
جونہی وہ مسز ربانی کے کمرے سے نکلی اُن کے دروازے کے باہر تعینات چپراسی احمد نے اُس کا اُترا ہوا چہرہ دیکھ کر تشویش کے ساتھ پوچھا "خیریت تو ہے مس؟"
"ہاں میرے استعفے کی منظوری آگئی ہے"
"اچھا..... تو کیا آپ چلی جائیں گی؟"
"ہاں"
اُس کا جی بھر آیا!
اپنے اطراف پر ایک طائرانہ نگاہ دوڑاتے ہوئے اُس کا دل بے تحاشا دُکھنے لگا۔
یہاں اُس نے اپنی زندگی کے سنہری سال گزارے تھے!
پانچواں پیریڈ ابھی جاری تھا۔
وہ جماعت نہم بی میں واپس چلی آئی اور بے دم سی کرسی پر بیٹھ گئی۔ طالبات خاصی تشویش کے ساتھ اُس کا سنجیدہ چہرہ دیکھنے لگیں۔
"ایک بات کہنا چاہتی ہوں آپ سے" اُس نے طالبات کی جانب دیکھتے ہوئے۔
وہ سب کی سب اس کی طرف متوجہ ہو گئیں۔
"کل سے آپ کی کلاس کوئی اور ٹیچر لیا کریں گی"
"کیوں مس؟" طالبات نے چونک کر پوچھا۔
"کیونکہ میں اسکول چھوڑ رہی ہوں"
"کیوں مس؟"
"میں نے استعفیٰ دے دیا ہے اور میں اسکول چھوڑ کر جارہی ہوں"
"مس پلیز نہ جائیں" ایک لڑکی نے کہا۔
"میں مس..... پلیز مس مت جائیں" باقی لڑکیوں نے ہم آواز ہو کر تائید کی۔
"آئی ایم سوری میں نہیں رُک سکتی۔ اُس نے دل پر جبر کر کے کہا۔
"مس آپ اتنا اچھا پڑھاتی ہیں۔ آپ مت جائیں" لڑکیاں باقاعدہ گڑگڑانے لگیں۔
"میڈم آپ کے لیے کسی اچھی ٹیچر کا بندوبست کریں گی" اُلفت نے انھیں اطمینان دلانے کی کوشش کی۔
طالبات کے روشن چہرے بجھ سے گئے تھے۔
اور کمرۂ جماعت میں سناٹا چھا گیا تھا۔
ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے اُلفت نے چاروں اور دیکھا اور پھر اُس کی نظریں چھت سے آویزاں پنکھے پر جا ٹکیں۔
کتنے یادگار دن گزارے تھے اُس نے ان کمروں کی چھتوں تلے!
طالبات اس سے محبت نہیں کرتی تھیں بلکہ پوجتی تھیں۔
ہر صبح ان کمروں میں اُسے پھولوں کی صورت اپنی عقیدتوں کے نذرانے پیش کیا کرتی تھیں۔
اُس کی راہوں میں اپنی آنکھیں بچھایا کرتی تھیں۔
ایک عجیب پُراسرار سا رشتہ تھا اُس کے اور اُس کے شاگردوں کے بیچ!
جس کی کشش انھیں اسکول سے جانے کے بعد بھی گاہے گاہے اُس کے پاس کھینچ کر لاتی رہتی تھی۔

گھنٹی بجتے ہی وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔
"اچھا بھئی بچیو خدا حافظ" اُس کی آواز بھرا رہی تھی۔
"خدا حافظ مس!"
لڑکیوں کے چہروں پر رنج و ملال کی پرچھائیاں تھیں اور آنکھوں میں آبی زردیں۔
"مس آپ ہم لوگوں کو بہت یاد آیا کریں گی" جماعت کی مانیٹر نے کہا۔
"بیٹا یاد تو مجھے بھی بہت آیا کریں گی آپ لوگ"
اُس کا چھٹا پیریڈ خالی تھا سو وہ اسٹاف روم میں جا بیٹھی۔
جلیس الحسن کے گھر واپس آنے کے بعد اُس نے دوبارہ اسٹاف روم میں بیٹھنا شروع کر دیا تھا۔
"اُلفت! سنا ہے تمہارے استعفے کی منظوری آگئی ہے؟" اسٹاف روم میں بیٹھی مسز جبیم جی نے پوچھا۔
"جی ہاں"
"اب کیا ارادے ہیں؟"
"ارادے کیا بس اب گھر بیٹھنا ہے"
"گھر بیٹھی بور نہ ہو جایا کرو گی کیونکہ یہ تو ہم دیکھ آئے ہیں تمہارے گھر جا کر کہ تمہارے پاس دل بہلانے کو تو کچھ بھی نہیں ہے" مسز زبیری بولیں۔
"ہاں یہ تو ہے"
"ملنے کے لیے تو آیا کرو گی نا ہم سے؟"
"کیوں نہیں"
کچھ دیر بعد طالبات کے پرے کے پرے اُس سے ملنے کے لیے آنے لگے۔
"مس آپ جا کیوں رہی ہیں؟" اُن میں سے ہر ایک کا سوال تھا۔
"پلیز مس نہ جائیں" ہر ایک التجا کر رہی تھی۔
ساتویں پیریڈ کی گھنٹی بجتے ہی وہ اپنا آخری پیریڈ لینے کے لیے اُٹھ کھڑی ہوئی۔
یہ اسکول میں اُس کے آخری دن کا آخری پیریڈ تھا!
جس مصروفیت میں چودہ سال تک دن کا آدھا حصہ گزرتا رہا ہو اُسے خیرباد کہہ دینا کچھ کام آسان نہ تھا۔
"باجی جی سنا ہے آپ کا استعفیٰ آگیا ہے" آیا نے راہداری میں پوچھا۔
"ہاں آیا جی میرے استعفے کی منظوری آگئی ہے"
"فیر اب آپ کی جگہ کس نے آنا ہے؟"
"دیکھیں کون آتا ہے"
"باجی جی میں تے بڑی دعاواں کرتی ہوں آپ کے واسطے..... آپ سمجھ گئے ہو نا میرا مطلب" اُس نے توقف کیا پھر بولی "بچوں سے بڑی بہاراں آتی ہیں جی گھر میں"
اُلفت محجوب ہو گئی۔
آخری پیریڈ جماعت ہفتم میں تھا۔ جماعت ہفتم کی طالبات اُس کے اسکول سے جانے کی خبر سن کر جماعت نہم کی طالبات کی طرح دلگیر نہ ہوئیں۔
انھوں نے صاف انکار کر دیا کہ وہ آج پڑھیں گی نہیں اس سے باتیں کریں گی۔
نو عمر لڑکیاں چھوٹے چھوٹے استفسارات کرتی رہیں۔
"مس آپ کہیں جارہی ہیں؟"
"اب کیا کریں گی؟"
"کبھی کبھی ملنے کے لیے تو آیا کریں گی نا؟"
"ہمیں یاد کریں گی؟"
وغیرہ وغیرہ۔

چھٹی کی گھنٹی بجنے پر جب وہ لڑکیوں کو خدا حافظ کہنے اور اُن کی خدا حافظ سننے کے بعد کمرۂ جماعت سے باہر برآمدے میں آئی تو بے اختیار اس کی نگاہیں اسکول کے احاطے میں ایستادہ نیم کے درخت کی جانب اُٹھ گئیں۔

جلیس الحسن معمول کے مطابق اُس کے منتظر تھے۔

لیکن اس روز انھیں اُس کا خلافِ معمول دیر تک انتظار کرنا پڑا۔ کیونکہ چھٹی کے بعد طالبات اور دوسری ٹیچرز دیر تک اُسے گھیرے رہیں۔

لڑکیاں کافی اُداس تھیں۔

تمام ٹیچرز بھی دل گیر تھیں اور اس وقت اُسے اتنی محبت سے الوداع کہہ رہی تھیں کہ اُس کا دل مضطرب ہوئے جا رہا تھا۔

اُس کے گمان میں بھی نہ تھا کہ لوگ اُس کے لیے اتنی محبتیں دلوں میں چھپائے بیٹھے ہوں گے۔

چھٹی کے بعد رخصت ہوتے ہوتے اُسے دس پندرہ منٹ لگ گئے۔

مسز راؤ کو خدا حافظ کہتے ہی وہ جلیس الحسن کی طرف لپکی جو اس غیر معمولی تاخیر پر کچھ پریشان ہو کر اِدھر سے اُدھر ٹہلنے لگے تھے۔ اُن کے پاس پہنچنے سے پہلے اُلفت نے وسطِ میدان میں تھم کر چہار اطراف نظر دوڑائی اور اُس کا گلا منہ کو آنے لگا۔

اپنی زندگی کے گیارہ سنہری سال اس ادارے کو دے کر وہ اپنے دامن میں اَن گنت یادیں اور بے انتہا محبت اور عقیدت اپنے دامن میں سمیٹے لیے جا رہی تھی۔

جیسے ہی وہ جلیس الحسن کے نزدیک پہنچی۔ انھوں نے خاصی تشویش کے ساتھ پوچھا "خیریت تو ہے آج اتنی دیر سے کیوں نکلیں؟"

اُلفت نے اُن کی طرف دیکھا غیر مدہم سُروں میں بولی "سب کو خدا حافظ کہنے میں دیر ہو گئی۔"

"بھئی وہ تو تم روز کہا کرتی ہو" جلیس الحسن نے اُس کے لیے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

"آج آخری دن تھا!"

"کیا مطلب؟" وہ چونک کر پلٹے۔

"آج لیٹر آگیا ہے۔ میرے ریزگنیشن کی منظوری کا۔"

"رئیلی!"

اُلفت نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"یہ تو بہت اچھی خبر ہے" انھوں نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ اور اُلفت کے گاڑی میں بیٹھ جانے کے بعد اُس کے برابر آ بیٹھے۔

اُلفت نے اپنے لب باہم بھینچ لیے۔

وہ اپنا اضمحلال جلیس الحسن پر عیاں نہ کرنا چاہتی تھی۔

کلچ دباتے ہوئے انھوں نے اُلفت کی طرف دیکھا اور تشکر نگاہوں سے اُسے دیکھتے ہوئے بولے۔

"تھینک یو ویری مچ!"

وہ کچھ نہیں بولی۔

گردن موڑ کر گاڑی کی کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے وہ آنکھوں میں اُمڈ آنے والے آنسوؤں کو اُن سے چھپانے کی کوشش کرنے لگی۔

آشنا فضاؤں سے دامن چھڑا کر جاتے ہوئے اُسے نہ جانے کب کب کی اور کس کس کی پُرانی پُرانی باتیں یاد آنے لگیں۔

سچ ہے کہ

لوگوں، چیزوں اور جگہوں کی قدر اُن کے بچھڑنے کے بعد ہوتی ہے!

اُس نے رعنا جمیل سے کہا تھا کہ وہ اس بار ساری کشتیاں جلا کر مقدر آزمانا چاہتی ہے۔

سو اُس نے کشتیاں جلا دی تھیں۔

مگر یہ منظر بڑا روح فرسا اور صبر آزما تھا!

ترکِ ملازمت کے بعد سب سے پہلا کام تو اُس نے یہ کیا کہ خانساماں کے کام میں قدرے تخفیف کر دی۔ ہانڈیاں پکانا اُس نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

میکے میں تو اُس کے ہاتھ کے ذائقے کی دھوم تھی۔

امی کہا کرتی تھیں:

"اُلفت کے ہاتھ کی بنی تو چٹنی بھی مرغ مُسلّم کا مزہ دیتی ہے۔"

بابا کہتے تھے:

"اُلفت بیٹی کے ہاتھ کی دس پوروں میں اللہ میاں نے بارہ مصالحوں کا مزہ سمو دیا ہے۔ دسترخوان کو کچھ بھی لے تو دسترخوان سجائے دینے لگتا ہے۔"

اُلفت کے ہاتھ کے سوا دکی سب ہی تعریف کرتے تھے۔

یوں اُسے اپنے اس وصف کا بخوبی احساس تھا۔

مگر شادی کے بعد جس گھر میں آئی وہاں باورچی خانہ مکمل طور پر ملازموں کے ہاتھ میں تھا اور یہ کوئی نئی بات تھی۔ عاصمہ کے زمانے سے یہی نظام چلا آ رہا تھا۔ عاصمہ بیگم اچھا کھانے پینے کی شوقین ضرور تھیں ——— مگر انھیں باورچی خانے سے چنداں رغبت نہ تھی۔

جبکہ اُلفت نے تو گویا ہوش ہی باورچی خانے میں سنبھالا تھا۔ عظمت آپا جب ہنڈکلیاں پکایا کرتی تھیں تو وہ بھی اُن کے سنگ سنگ لگ جایا کرتی تھی۔ کھیل ہی کھیل میں بہت سے کام سیکھ ڈالے۔ آتے دن گڑیا گڈے کی شادی نے امورِ خانہ داری کی ترتیب کی داغ بیل ڈالی۔ رفتہ رفتہ سارے کاموں میں مہارت آتی چلی گئی۔

خدا کا کرنا اُلفت کے ہاتھ میں عظمت آپا بلکہ امی سے بڑھ کر سواد آگیا تھا۔ جب تک ماں باپ کے گھر رہی شام کا اور بصورتِ چھٹی صبح کا کھانا پکانا بھی اسی کے سپرد ہوا کرتا تھا۔ اور تو اور بھیا کہہ دیا کرتے تھے بھابی سے کہ:

"چپاتی چاول بے شک تم پکا لیا کرو مگر سالن اُلفت ہی کے ہاتھ کا مزہ دیتا ہے!"

شادی کے بعد کچھ تو اس لیے کہ ملازموں کی خدمات میسر تھیں اور کچھ اس لیے بھی کہ حالات کی پیچیدگی نے اُسے اُبھار رکھا تھا اُلفت باورچی خانے کی جانب راغب ہی نہ ہوئی۔

اصل میں اس کا ذہن اتنا اُلجھا رہتا تھا کہ امورِ خانہ داری پر توجہ دینے کو دل ہی نہ چاہتا تھا۔

اوّل چار ماہ تو گویا سرائے میں مہمان کی صورت گزارے تھے اُس نے۔

چار ماہ کی ناراضگی کے بعد میکے سے دوبارہ اپنے گھر آئی تو اسکول جانا لگا رہا۔

ترکِ ملازمت کے بعد گھر بیٹھیں تو اُس نے پہلا مورچہ باورچی خانے ہی میں سنبھالا۔ خانساماں کی چھٹی نہ کی بلکہ اُسے معاونِ کار کے طور پر ساتھ لگا لیا۔ سبزی ترکاری کی چھلائی، کٹائی، دُھلائی، مصالحہ پیسنا، آٹا گوندھنا، چپاتیاں پکانا، دال چاول چننا اور بھی دوسرے بہت سے چھوٹے بڑے کام تھے جو کرنا ہوتے تھے اور ان کاموں میں... خانساماں کی معاونت اُلفت کے کام کو آسان بنا دیتی تھی۔

شروع شروع وہ دال چاول چننے پر بڑا جز بز ہوا۔ اُلفت کو مشورہ دیا کہ بس نتھار لیں سارے کنکر پتھر صاف ہو جائیں گے۔

مگر اُلفت اس گھر سے آئی تھی جہاں کھانا پکانے میں فقط ذائقہ ہی نہیں صفائی ستھرائی کو بھی اہمیت دی جاتی تھی۔

ٹھیک ہے بقول خانساماں کے نتھارنے سے دال چاول کے کنکر پتھر تو نیچے بیٹھ جاتے ہیں مگر سُرسریوں اور سفید کیڑوں کا کیا بنتا!

اُلفت کو تو اتنی گھن آیا کرتی تھی اُن سے کہ خدا کی پناہ!

وہ تو یہ سمجھا کرتی تھی کہ خانساماں اپنے خالی وقت میں باجراں سے دال چاول چنوا لیا کرتا ہوگا لیکن جب اُس نے فقط نتھار لینے پر قناعت کرنا چاہی تو اُسے اس خیال سے ہی اُبکائی آنے لگی کہ کمبخت اتنے دنوں تک بغیر چنے

دال چاول کھلاتا رہا تھا۔

چنانچہ الفت نے سب سے پہلے تو اُسے صفائی ستھرائی کا عادی بنانے کی کوشش کی کہ قیام کا کھانا تو بہرحال وہی پکاتا تھا۔

کھانا پکانے سے قطع نظر الفت نے جلیس الحسن کو پابند کیا کہ وہ دوپہر کا کھانا ہوٹل سے منگوا کر وقت بے وقت کھانے کے بجائے گھر پر کھایا کریں۔

اس پابندی کے دو بڑے فائدے ہوئے۔

اول الفت کو روزانہ کی اس فکر سے نجات مل گئی کہ خدا جانے جلیس الحسن نے دفتر میں دوپہر کا کھانا کھایا بھی ہوگا یا نہیں۔

دوم چاروں بچے دوپہر کے کھانے پر باپ کی موجودگی کا لحاظ کرتے ہوئے بڑی شرافت اور تمیز کے ساتھ بیٹھ ہی کھانا کھانے لگے۔

ان دو بڑے فائدوں سے قطع نظر ایک بڑی تسکین الفت کو یہ میسر آئی کہ ہر روز جلیس الحسن کی زبان سے اُسے اپنی تعریفیں سننے کو ملنے لگیں۔

کبھی وہ کھانے کے دوران ہی تعریفیں کرنے لگتے۔

"واہ بھئی کیا لذیذ کھانا پکایا ہے۔"

اور بچوں کی تائید بھی حاصل کرنے کی کوشش کرتے۔

اور کبھی وہ کھانے کے بعد بچوں کی عدم موجودگی میں سراہتے۔

تخلیے میں وہ قدرے رومانی طرزِ تعریف اختیار کرتے۔

"بھئی واہ! کیا لذت ہے تمہارے ہاتھوں میں کہ چومنے کو جی چاہتا ہے۔"

اور سچ مچ ہاتھ چوم بھی لیتے۔

ایک روز کہنے لگے:

"جب سے تم نے کھانا پکانا شروع کیا ہے میں بہت کھانے لگا ہوں۔ وزن بڑھتا ہوا محسوس ہو رہا ہے۔ توند بھی کچھ نکلتی ہوئی لگتی ہے۔"

"جی نہیں آپ بالکل فٹ ہیں۔ پہلے کی طرح۔"

"ایک بجتے ہی گھڑی دیکھنے لگتا ہوں کہ بس اب اُٹھ لینے ہی میں خیر ہے ورنہ بیگم خفا ہوں گی۔"

"اور میں ایک بجتے ہی آپ کی راہ دیکھنے لگتی ہوں۔"

"ویسے یہ کریڈٹ تمہی کو جاتا ہے کہ تم نے دوپہر کا کھانا بھی گھر پر کھانے کا پابند کر دیا ورنہ اس امر کا پابند تو مجھے عاصمہ بھی نہ کر سکی تھی۔"

الفت دم بخود رہ گئی۔

آج کتنے دنوں بعد پھر عاصمہ کا نام آیا تھا اُن کی زبان پر!

اُسے اپنی نادانی پر تاسف ہوا۔

گھر آنے کے بعد اُس نے پہلی فرصت میں پہلا کام یہی کیا تھا کہ جلیس الحسن کی الماری میں رکھے اُن کے کاغذات کو تالا لگا دیا تھا... سکتے تفصیل دیا کر طلائی دل کو وا کر کے دیکھا تھا اور عاصمہ کی تصویر کو دل سے غائب پا کر مطمئن ہو گئی تھی۔

اپنی دانست میں اُس نے اپنے دل کو یہی باور کرانے کی کوشش کی تھی کہ جلیس الحسن نے اپنے دل سے عاصمہ کو نکال دیا تھا۔

مگر نہیں

یہ اُس کی بھول تھی۔

اُس کا نام دنوں بعد سہی پھر اُن کی زبان پر آگیا تھا۔

اُس کے دل میں نتھے سے آتش فشاں کی طرح کھد بد ہونے لگی۔

مگر پھر اُس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اس دلِ خانہ خراب کی کسی پرت کو کسی بھی مقام پر کمزور ثابت نہیں ہونے دے گی!

فروری میں الفت کی ساتھیوں نے اُس کے اعزاز میں باقاعدہ "فیئرویل پارٹی" کا اہتمام کیا۔

اوائل مارچ میں فرزانہ اور زرنین کے امتحانات شروع ہوئے۔

اواخر مارچ میں اعجاز کے۔

نگین کے امتحانات جون میں متوقع تھے۔

گھر پر ٹیوٹر تو پڑھانے آتے ہی تھے۔

اعجاز نے امتحانات کی تیاری میں دن رات ایک کر دیا۔

نگین اکثر ہنس کر کہتی۔ "اچھا تو پاپا سے گاڑی کی چابی لینے کی تیاری ہو رہی ہے؟"

"تم کیوں جلتی ہو؟" وہ چڑ کر کہتا۔

"واہ میں کیوں جلتی بھلا... میں تو تمہارے ساتھ کالج جایا کروں گی... بھئی تم لوگوں کی وجہ سے مجھے خواہ مخواہ اتنے سویرے کالج جانا پڑتا ہے۔ تمہاری گاڑی ہو گی تو ہم دونوں کالج والے بندے ساتھ چلا کریں گے۔ فرزانہ اور چھوٹی کو ڈرائیور لے جایا کرے گا۔" ایک روز نگین نے کہا۔

"کوئی نہیں... کوئی نہیں میں تمہیں نہیں لے جایا کروں گا۔"

"کیوں؟"

"میرے دوست کم ہوا کریں گے میرے ساتھ جانے والے۔"

"ہاں قوال بھلا اپنی پارٹی کے بغیر کہاں نکلتے ہیں۔"

"کیا! کیا کہا تم نے مجھے قوال؟" اعجاز نے بھڑک کر کہا۔

"اوہ! آئی ایم سوری۔ میرا مطلب تھا مسکین پارٹی۔"

"نگی! میں تمہارا سر توڑ دوں گا۔"

"شرم کرو میں تمہاری بڑی بہن ہوں۔"

"صرف ایک سال بڑی۔"

دونوں میں اسی طرح نوک جھونک ہوتی رہتی تھی۔ اور اعجاز نگین کے ایک سال بڑا ہونے کا لحاظ کر کے اکثر بالائے طاق دھر دیا کرتا تھا۔

اعجاز کے امتحانات ختم ہوتے ہی جلیس الحسن نے سمندر کنارے ایک پکنک کا اعلان کر ڈالا۔

ماضی میں وہ چاروں سمندر کنارے تفریح کے تصور ہی سے خوش ہو جایا کرتے تھے۔

ساحلِ سمندر اُن کی ماں کا پسندیدہ تفریحی مقام ہوا کرتا تھا۔

چھٹی والے دن اُن کا گزارا عموماً ساحلِ سمندر کا رُخ کیا کرتا تھا۔

مم اور پاپا پہلو بہ پہلو بیٹھے چپکے چپکے سرگوشیاں کیے جاتے اور ان چاروں کی شرارتوں سے محظوظ ہوتے جاتے۔ پائنچے اوپر چڑھائے سمندر کی شوریدہ سر لہروں کے مقابل جا کھڑے ہوتے یا پھر پانیوں میں پانی ڈالے ساحل پر کبھی نم اور نرم ریت پر اپنے نقوش پا ثبت کرتے چلے جاتے۔

اور وہ چاروں ساحل پر چہلیں کرتے اور قہقہے بکھیرتے پھرتے۔

کتنے اچھے دن ہوا کرتے تھے وہ!

جب اُن کی ماں اُن کے ساتھ تھی۔

سمندر کنارے جانا انہیں ماں کے جانے کے بعد بھی اچھا لگا کرتا تھا کیونکہ وہاں جا کر ماضی کی بہت سی یادیں زندہ ہو جایا کرتی تھیں۔

مگر اس دفعہ انہیں سمندر کے کنارے تفریح کے خیال سے زیادہ خوشی نہیں ہوئی۔

بلکہ سچ تو یہ تھا کہ کچھ کوفت ہی کا احساس ہوا۔

کیونکہ اس بار اُن کی سوتیلی ماں بھی اُن کے ہمراہ جانے والی تھی۔

جانے سے انکار نہ کر سکتے تھے کہ پاپا پکنک پر لے جا رہے تھے۔ اُن کے ساتھ پہلے کبھی کہیں جانے سے اگر انکار کیا ہوتا تو اب بھی ہمت پاتے۔

جانے کو تو وہ سب ایک ہی گاڑی میں جا سکتے تھے مگر جلیس الحسن نے لوازماتِ پکنک کی کثرت اور ایک خدمت گار کی ضرورت کو بہانہ بناتے ہوئے دونوں گاڑیاں لے جانے کا فیصلہ کیا تاکہ بچے علیحدہ گاڑی میں جا سکیں اور وہ الفت کے ہمراہ۔

کیونکہ بچوں سے اُن کی بجنت مستورہ نگراُن کے دل میں الفت کے لیے بھی نرم گوشے تھے جس کا بدلا ہوا روپ انھیں ان دنوں اکثر سوچ میں ڈال دیا کرتا تھا۔

شادی کے بعد پہلی بار وہ اُسے لمبی تفریح پر لے کر نکل رہے تھے۔ راستے میں اس سے ہنستے بولتے ہوئے جانا چاہتے تھے۔ بچوں کی موجودگی الفت سے اُن کی بے تکلفی میں یقیناً حارج ہوتی۔

پکنک کے لیے مقررہ دن جب جملہ لوازماتِ پکنک دونوں گاڑیوں میں لادے جا چکے اور پکنک پر جانے والے نفوس کے گاڑیوں میں بیٹھنے کی باری آئی تو نگین کی نظر کا اشارہ پاتے ہی زرین جلیس الحسن کی گاڑی کی اگلی نشست پر اس طور پھیل کر بیٹھ گئی کہ الفت کے بیٹھنے کو جگہ ہی نہ رہی۔

جلیس الحسن نے دُزدیدہ نگاہوں سے الفت کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے اعجاز سے کہا۔

"جاجی میاں! میرا خیال ہے آپ تو دوسری گاڑی میں ہلا گلا کرتے ہوئے جانا پسند کریں گے؟"

"پاپا میں بھی۔" فراز نے کہا۔

"اور نگی بیٹے آپ؟"

"پاپا! میں بھی انہی لوگوں کے ساتھ بیٹھ جاؤں؟" نگین نے اجازت طلب انداز میں کہا۔

"جیسے آپ کی مرضی بیٹے۔"

"تھینک یو پاپا!"

ان تینوں کے دوسری گاڑی میں بیٹھ جانے کے بعد جلیس الحسن اُلفت کی جانب آئے جو زرین کے اگلی نشست پر براجمان ہو جانے پر اندر ہی اندر پیچ و تاب کھاتے ہوئے اپنی باطنی کیفیت کو جلیس الحسن پر ظاہر نہ ہونے دینے کے لیے خود اپنے آپ سے ایک سرد جنگ لڑ رہی تھی۔

"چلیے جناب! اب آپ بھی بیٹھ جائیے۔"

جلیس الحسن کا خیال تھا وہ حسبِ سابق زرین کے آگے بیٹھ جانے کا بُرا مناتے ہوئے عقبی نشست پر بیٹھنے کو ترجیح دے گی۔

لیکن انھیں اس وقت ایک خوشگوار استعجاب نے آلیا۔ جب الفت نے گاڑی کے اگلے دروازے کی چوکھٹ تھام کر جھکتے ہوئے زرین سے کہا۔ "بیٹا! تھوڑی سی جگہ مجھے بھی دو گی؟"

زرین نے منہ بناتے ہوئے اُس کی طرف دیکھا۔

"بیٹا! ممّا کے لیے جگہ بناؤ۔" جلیس الحسن نے مداخلت کی۔

زرین جبراً و قہراً سمٹ گئی۔

مگر الفت کے بیٹھنے کو جگہ نہ نکل سکی۔

"بیٹا! تھوڑا سا اور سرکو۔" جلیس الحسن جھک کر بولے۔

"جگہ نہیں ہے پاپا!" زرین منمنائی۔

"کوشش تو کرو۔ آخر آپ مما کے لیے بھی تو جگہ نکالا ہی کرتی تھیں۔"

"وہ مما جو تھیں! مجھے تو یہ دشمن لگتی ہیں اپنا۔" الفت نے دانت بھینچتے ہوئے تن ہی تن میں سوچا۔

"پاپا! تب میں چھوٹی بھی تو تھی۔"

زرین کی حاضر جوابی نے جلیس الحسن کو لاجواب کر دیا۔

"کم آن بیٹے! ان کے لیے میں کوئی سی تنبیہ عود کر آئی۔

"رہنے دیجیے میں پیچھے بیٹھ جاتی ہوں۔" الفت نے بظاہر بڑے تحمل سے کہا۔

الفت نے گاڑی کا عقبی دروازہ کھولا اور پیچھے بیٹھ گئی۔

جلیس الحسن زرین کی ڈھٹائی پر خجل ہوتے ہوئے گاڑی میں بیٹھ گئے۔

"گڈ!" دوسری گاڑی کی اگلی نشست پر براجمان اعجاز نے اپنی آنکھوں پر چڑھے چشمے کے رنگین شیشوں کے پیچھے

سے یہ سارا منظر اپنی گاڑی کے سائیڈ مرر میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"چھوٹی از وِنڈرفل!" نگین نے گاڑی میں ڈرائیور اور ملازم لڑکے کی موجودگی کا لحاظ کرتے ہوئے زرین کی کارکردگی پر انگریزی میں تبصرہ کیا پھر اعجاز سے تائید چاہی "از نٹ شی جاجی؟"

"او یس!" اعجاز نے پُرزور تائید کی۔

اس صورتِ حال پر ان دونوں کے مابین بقیہ گفتگو بھی ملازمین کی موجودگی کا لحاظ رکھتے ہوئے انگریزی ہی میں ہوئی جس کی اردو صورت کچھ یوں تھی:

"بدصورت عورت! اس کا خیال ہے کہ وہ مما کی جگہ لینے جا رہی ہے۔" اعجاز نے حقارت سے کہا۔

"آج کل تو بہت شریف بن کر دکھایا جا رہا ہے پاپا کو۔"

"ہاں بھئی! بہت ہی زیادہ۔"

"بڑی چالاک عورت ہے! پاپا کو مٹھی میں لینے کی کوشش کر رہی ہے۔"

"تم دیکھتے جاؤ بہت جلدی اصلیت کھل جائے گی۔"

پھر دونوں گاڑیاں آگے پیچھے عازمِ سفر ہوئیں۔

راستے بھر الفت عقبی نشست پر بیٹھی زرین کو جی ہی جی میں بُرا بھلا کہتی رہی مگر اُس نے انتہائی ضبط و برداشت سے کام لیتے ہوئے اپنی باطنی کیفیت کو چہرے سے ہویدا نہ ہونے دیا۔

جلیس الحسن بار بار اپنے سامنے آویزاں آئینے میں اُس کا عکس دیکھتے اور ہر بار اُس کا بظاہر مطمئن اور مدہم سی مسکراہٹ میں چھپا چہرہ حیران کرنے لگتا۔

کیا یہ وہی عورت تھی جو زرین کے گاڑی کی اگلی نشست پر بیٹھتے ہی کڑک مرغی کی طرح پھول جایا کرتی تھی! راستے بھر وہ زرین اور الفت دونوں سے باتیں کرتے رہے۔ الفت بڑی خوش دلی اور رسانیت سے شریکِ گفتگو رہی۔ بارہا اُس نے زرین سے ہمکلام ہونے کی کوشش کی۔ جلیس الحسن کے لیے یہ اندازہ کرنا چنداں محال نہ تھا کہ وہ زرین سے بے تکلف ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ ایک آدھ مرتبہ تو اُس نے کسی بات پر عقبی نشست سے ہاتھ آگے بڑھا کر زرین کا سر تھپتھپانے اور شانہ چھونے کی کوشش بھی کی۔

مگر الفت کے برعکس زرین کا رویہ انھیں قدرے جارحانہ محسوس ہوا۔ جتنی دفعہ بھی الفت نے اس سے ہمکلام ہونے کی کوشش کی وہ اَن سُنی کر گئی اور جب الفت نے اس کا سر تھپتھپانے کی کوشش کی تو اس نے بڑی عجلت سے اپنا سر پرے کر لیا۔ اور جب اُس نے اُس کا کندھا چھونے کی کوشش کی تو وہ کسمسا کے آگے سرک گئی۔

تاہم زرین کے اس جارحانہ رویے کے باوجود جلیس الحسن کو الفت کی پیشانی پر ایک شکن دیکھنے کو نہیں ملی۔

اُس روز وہ سب دن چڑھے سے شام ڈھلے تک سمندر کنارے سیر و تفریح میں مشغول رہے۔ خدمت گار لڑکا لپک لپک کر انھیں ممکنہ سہولتیں بہم پہنچانے کی کوشش کرتا رہا۔

بچوں نے سمندر کے کنارے چہل قدمی بھی کی، پکنک بھی۔

ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے، پانچوں اوپر چڑھ جاتے وہ سمندر کی شوریدہ سر لہروں کے سامنے تا دیر ڈٹے انھیں اپنے قدموں میں لوٹنے پر مجبور کرتے رہے۔

فراز اور زرین نے ساحل پر سیپیاں اور گھونگے چُنے۔

سمندر کی گیلی ریت پر گھروندے بنائے اور انھیں سیپیوں اور گھونگھوں سے آراستہ کیا۔

نگین اور اعجاز ان دنوں کو یاد کرتے رہے جب اُن کی ماں اُن کے ساتھ ہوا کرتی تھی۔ اور وہ ہر دوسرے تیسرے ہفتے یہاں آیا کرتے تھے۔

ان چاروں نے لوڈو کی بازی بھی جمائی۔

جلیس الحسن نے اُلفت کے ہمراہ اُن کے کھیل میں دلچسپی لینے کی کوشش کی تو الفت کو انھوں نے یکسر نظر انداز کر دینے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی حالانکہ اپنے طور پر الفت نے اُن سے بے تکلف ہونے اور دوستانہ مراسم استوار کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔

سرِ شام جب جلیس الحسن اُلفت کے ساتھ چہل قدمی کرتے دُور تک نکل گئے تو نگین نے بصد حسرت انھیں دیکھتے

ہوئے اعجاز سے کہا۔

"تمہیں یاد ہے جاجی! ایک مرتبہ مما اور پاپا کتنی دور نکل گئے تھے؟"

"ہاں مجھے یاد ہے۔ فراز تو رونے لگا تھا یہ سمجھ کر کہ شاید مما اور پاپا ہمیں چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔"

"اور اس کی دیکھا دیکھی چھوٹی بھی منہ بسورنے لگی تھی۔"

"پھر ہم دونوں فراز اور چھوٹی کے ہمراہ مما اور پاپا کے پیچھے پیچھے دوڑتے چلے گئے تھے۔"

"کتنے اچھے تھے وہ دن!" نگین نے حسرت سے کہا۔

"ہاں بہت اچھے۔"

"کاش! مما نہ گئی ہوتیں۔"

"کاش!" اعجاز نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ "تاکہ یہ بدصورت عورت ہمارے گھر نہ آئی ہوتی۔"

"ذرا دیکھو تو کس قدر اترا اترا کر چل رہی ہیں پاپا کے ساتھ۔"

"میں اس کی طرف دیکھنا بھی نہیں چاہتا..... آئی ہیٹ ہر۔"

"مجھے تو اب ڈر سا لگنے لگا ہے۔"

"کیوں؟ ڈر کیسا؟"

"خدا جانے ان سے ہمارا پیچھا کبھی چھوٹے گا کہ نہیں۔"

"کیوں نہیں، ضرور چھوٹے گا۔"

"پاپا کو تو نا بو میں کر لیا ہے انھوں نے۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ پاپا ایک ہیں، ہم چار ہیں اور ہم چاروں میں سے تو ایک بھی اس عورت کو لفٹ کرانے نہیں جا رہا۔"

"ہاں یہ تو ہے۔"

"تو پھر فکر کرنے یا ڈرنے کی کیا ضرورت!"

"جاجی! ایک بات پوچھوں؟" نگین نے اپنی انگلی سے نم ریت پر آڑی ترچھی لکیریں بناتے ہوئے کہا۔

"ہاں، پوچھو۔"

"سچ سچ بتاؤ گے؟"

"اگر سچ بتانے کی بات ہوئی تو۔"

"تمہیں مما یاد آتی ہیں؟" نگین کی آواز بوجھل تھی۔

اعجاز کی آنکھوں میں سرخی سی اُمڈ آئی۔ ماں کے جانے کے بعد نگین نے پہلی بار اس سے اس موضوع پر بات کی تھی۔

"بولو، یاد آتی ہیں مما تمہیں؟"

"تمہیں یاد آتی ہیں؟" اعجاز نے اُلٹا سوال داغ دیا۔

آن کی آن نگین کی آنکھوں میں سمندر کی لہروں کا عکس نظر آنے لگا۔

"تمہیں یاد آتی ہیں مما؟" اعجاز نے پھر اپنا سوال دہرایا۔

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔" نگین نے بھیگی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "تو پھر مجھ سے کیوں پوچھا تم نے؟"

"یہ جاننے کے لیے بھائی کہ مما صرف مجھی کو یاد آتی ہیں یا تم کو بھی۔"

"تمہیں یاد ہے ایک بار پاپا نے کہا تھا ہمیں مما کو بھلانے کی کوشش کرنی چاہیے؟"

"ہاں، یاد ہے مجھے۔"

"اس وقت میں نے یہ سمجھا تھا کہ پاپا ٹھیک کہتے ہیں لیکن ......"

"لیکن کیا؟"

"اب لگتا ہے، میں مما کو کبھی نہیں بھلا سکوں گا۔"

"مجھے بھی یہی لگتا ہے۔"

"نگی! چھوٹی یاد کرتی ہے مما کو؟"

"بہت۔"

"فراز کا کچھ معلوم ہے؟"

"وہ منہ سے تو نہیں بولتا مگر چھپکے چھپکے مما کی تصویریں بنایا کرتا ہے۔ اور پھر اس ڈر سے کہ کوئی دیکھ نہ لے پھاڑ دیتا ہے۔"

"تادیر وہ دونوں دل گرفتہ اور ملول بیٹھے رہے۔

لمبی چہل قدمی کے بعد جب جلیس الحسن اُلفت کے ہمراہ واپس لوٹتے دکھائی دیے تو اعجاز نے کہا — "اِس کی وجہ سے تو مما اور یاد آتی ہیں!"

جلیس الحسن نے چہل قدمی سے واپس لوٹتے ہی واپسی کے لیے تیاری کی ہدایت کی۔

سمندر کے پانیوں میں ڈوبتے سورج کا چہرہ نگین اور اعجاز کو اپنی طرح دل شکستہ محسوس ہو رہا تھا۔

اس روز فراز اور زرتین کے سالانہ امتحانات کے نتائج کا اعلان کیا جانے والا تھا۔

عاصمہ بیگم جب تک ساتھ تھیں بچوں کی پروگریس کا احوال لینے کے لیے دوسرے تیسرے ہفتے اُن کے ٹیچرز سے ملنا اپنا فرض سمجھتی تھیں۔ اسکول میں ہونے والی ہر اس تقریب میں جس میں بچوں کے والدین اور سرپرستوں کو مدعو کیا گیا ہو وہ پورے جوش و خروش سے شریک ہوا کرتی تھیں۔

یوں بچوں کی تعلیم میں دلچسپی لینا، اُن کی پروگریس پر نظر رکھنا اور اُن کے اساتذہ سے رابطہ رکھنا گویا عاصمہ بیگم کی ذمے داری میں ہوتی تھی۔

جلیس الحسن کسی اور موقع پر عاصمہ کے ساتھ بچوں کے اسکول جاتے یا نہ جاتے اُن کے سالانہ امتحانات کے نتائج سننے کے لیے اُن کے اسکول جانا اپنی سالانہ ذمے داری سمجھتے تھے۔

گزشتہ برس عاصمہ بیگم نہ تھیں تو انھوں نے یہ ذمے داری تنہا ہی نبھائی تھی۔

اس مرتبہ بھی انھیں اس روایت کو بہرصورت برقرار رکھنا تھا۔

نگین تو صبح ہی اُن کے ہمراہ چلی گئی تھی اور جاتے ہوئے فراز اور زرتین کے علاوہ نگین نے بھی جلیس الحسن کو یہ بات جتائی تھی کہ نتیجے کا اعلان دس بجے کیا جائے گا لہٰذا وہ ساڑھے نو اور پونے دس کے درمیان اسکول پہنچ جائیں۔

الفت بھی اس بات سے آگاہ تھی۔

جب جلیس الحسن بچوں کے اسکول جانے کو تیار ہونے لگے تو الفت نے از خود کہا "میں بھی چلوں آپ کے ساتھ؟"

جلیس الحسن کو ایک خوشگوار حیرت نے آ لیا!

انھیں یاد تھا کہ الفت سے شادی کے بعد ابتدائی چند ماہ کے دوران انھوں نے بچوں کی تعلیم کے معاملے میں جب کبھی اُسے کوئی ذمے داری تفویض کرنے کی کوشش کی تو اس نے ناگواری کا اظہار کیا تھا یا ٹالنے کی کوشش کی تھی۔

اور اب وہ رضاکارانہ طور پر خود اپنی خدمات پیش کر رہی تھی۔

"تمہاری مرضی ہے۔" انھوں نے اُسے آزمانے کو کہا۔

"میں تو چلنا چاہتی ہوں آپ کے ساتھ۔"

"تو بصد شوق چلو۔"

راستے میں اُس نے اُن سے پوچھا۔ "بچوں کے نتائج کے بارے میں آپ کی توقعات کیا ہیں؟"

"فراز کو ابتدائی تین اور زرتین کو شروع کے پانچ بچوں میں شامل ہونا چاہیے۔"

"اس کا مطلب ہے پڑھنے میں اچھے ہیں یہ دونوں۔"

"عاصمہ کے زمانے میں اور زیادہ اچھے ہوا کرتے تھے۔ کیونکہ ٹیوٹر کے علاوہ وہ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ خود بھی پڑھایا کرتی تھی بچوں کو۔"

پھر عاصمہ کا ذکر!

الفت کو سانسیں بوجھل معلوم ہونے لگیں۔

"تم تو خود ٹیچر رہی ہو۔" جلیس الحسن نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "تمہیں تو معلوم ہوگا کہ بچوں کی تعلیم میں جب تک والدین دلچسپی نہ لیں بات نہیں بنتی۔ عاصمہ جب تک تھی توجہ دیا کرتی تھی۔ میں نہ پہلے وقت دے پاتا تھا بچوں کی پڑھائی کو نہ اب دے پاتا ہوں۔ بس اسکول یا پھر ٹیوٹر ہی پر قناعت کرنا پڑتی ہے۔"

الفت سوچ میں پڑ گئی۔

یہ تو ٹھیک ہی تھا کہ بچوں کی پڑھائی پر جب تک والدین توجہ نہ دیں مطلوبہ نتائج حاصل نہیں ہو پاتے۔ استاد ہونے کے ناتے وہ اس حقیقت سے کماحقہٗ واقف تھی۔

"فراز اور زرین کو تو میں بھی پڑھا سکتی ہوں۔" اُس نے کہا۔

جلیس الحسن کو اپنی سماعت پے بھرم محسوس ہوئی۔

"کیا واقعی؟" انھوں نے کہا۔

"اتنی پڑھی لکھی تو خیر میں ہوں کہ دسویں جماعت تک کے طلبہ کو پڑھا سکتی ہوں۔ البتہ اس سے آگے ذرا مشکل دشوار ہے۔"

"اگر تم فراز اور زرین کی کبھی کبھی مدد کر دیا کرو اُن کی پڑھائی میں تو تمہارا شکر گزار رہوں گا۔"

"مجھے کوئی عار نہیں مگر......"

"مگر کیا؟"

"خدا جانے وہ مجھ سے پڑھنا پسند کریں گے بھی یا نہیں؟"

جلیس الحسن خاموش ہو گئے۔

یہ مسئلہ تو واقعی تھا۔

جلیس الحسن اسکول پہنچے تو بچوں کو اپنا منتظر پایا۔ مگر الفت کو دیکھ کر اُن کے منہ بن گئے۔

ٹھیک دس بجے گھنٹی بجی تو اسکول کے تمام طلبہ اسمبلی گراؤنڈ میں صفیں بنا کر کھڑے ہو گئے۔ اساتذہ طلبہ کے روبرو قطار میں کھڑے تھے۔ اور والدین اُن کی صفوں کے پیچھے موجود تھے تاکہ اوّل، دوم اور سوم آنے والے طلبہ کے والدین اور سرپرست انھیں پرنسپل سے امتیازی کامیابی حاصل کرنے پر سند اور انعام حاصل کرتے دیکھ سکیں۔

الفت جلیس الحسن کے ہمراہ کھڑی تھی اور نگین اُن سے ذرا دور اپنی سہیلیوں کے ساتھ جو اس کی طرح اپنے چھوٹے بھائی بہنوں کے نتائج سننے کے لیے آئی ہوئی تھیں۔

الفت کے لیے یہ ایک نیا تجربۂ زندگی تھا۔

جہاں وہ کل خود کھڑی ہوا کرتی تھی وہاں آج اس کی سابقہ برادری کے دوسرے اراکین کھڑے تھے۔

اور جہاں وہ دوسروں کو کھڑا دیکھا کرتی تھی وہاں آج خود کھڑی تھی۔

بساطِ حیات پر انسان مہرے ہی تو ہیں۔

الفت کے قریب کھڑی ایک خاتون نے پوچھا۔ "آپ کس کا رزلٹ سننے آئی ہیں؟"

"جی! اپنے بچوں کا۔" جلیس الحسن نے اُسے کہتے سُنا۔

نتائج کے اعلانات شروع ہوئے تو طلبہ سے زیادہ اُن کے والدین کا اضطراب دیدنی تھا۔

دیگر والدین کی طرح جلیس الحسن بھی اعلانات پر کان لگائے کھڑے تھے۔

الفت کی نگاہیں بھی سامنے ہی لگی تھیں جہاں امتیازی کامیابی حاصل کرنے والے طلبہ یکے بعد دیگرے پرنسپل سے اپنی امتیازی کامیابی کی سند اور انعام وصول کرنے آ رہے تھے جا رہے تھے۔

اوّل، دوم اور سوم آنے والے طلبہ کے نتائج کا اعلان اسمبلی میں کیا جا رہا تھا باقی طلبہ کو اُن کے رپورٹ کارڈ اُن کے کمرۂ جماعت میں لیے جانے کا اعلان پہلے ہی کیا جا چکا تھا۔

زرین کی جماعت میں اوّل اور سوم پوزیشنیں لڑکوں نے حاصل کی تھیں اور دوم ایک لڑکی رہی تھی۔

فراز کی جماعت کے نتیجے کا اعلان ہوا تو جلیس الحسن کی توقع کے مطابق وہ اپنی جماعت کے ابتدائی تین بچوں میں شامل تھا۔

فراز حسن...... سیکنڈ۔

یہ اعلان سُن کر جلیس الحسن مسکرا دیے۔

اور پُرجوش انداز میں تالیاں بجاتے ہوئے جب انھوں نے الفت کی جانب دیکھا تو اُسے بھی جوش و خروش سے تالیاں بجاتے اور مسکراتے پایا۔

نگین اُن سے ذرا دور تالیاں بجاتے ہوئے انکھیوں سے الفت کو دیکھتے ہوئے جی ہی جی میں سوچ رہی تھی۔ "کیا خوب اداکاری ہے!"

اور جلیس الحسن الفت کو قدرے بے یقینی سے دیکھ رہے تھے۔

شاید انھیں اُس کا یہ بدلا ہوا روپ کا ہے کا ہے حیرانی اور بے یقینی سے دوچار نہ کر رہا ہوتا اگر وہ اُس کا وہ پہلا روپ نہ دیکھ چکے ہوتے۔

نتائج کے اعلانات ختم ہونے کے بعد جب فراز اپنا رپورٹ کارڈ، سند اور انعام لیے جلیس الحسن کے پاس آیا تو انھوں نے اُسے پیار کیا۔

نگین بھی لپکی اور اُس نے اُسے پیار کر کے شاباش دی۔

الفت اُس کی طرف بڑھی تو اُس نے ہچکچا کر پیچھے ہٹنے کی کوشش کی مگر الفت نے بڑی سرعت سے اُس کو پیار کر لیا۔

جلیس الحسن اور خود الفت کے لیے بھی فراز کے چہرے سے یہ اندازہ لگانا محال نہ تھا کہ اُس نے الفت کے اس اقدام کو خاصی ناگواری سے دیکھا تھا۔

زرین اپنی جماعت میں ساتویں نمبر پر رہی تھی۔

اس شام جب جلیس الحسن گھر واپس لوٹے تو الفت نے فراز اور زرین کے پاس ہونے کی خوشی میں ایک چھوٹی سی ٹی پارٹی کا اہتمام کر رکھا تھا۔

دونوں کے لیے میز پر رنگین کاغذوں میں ملفوف تحائف بھی موجود تھے۔ جن پر ننھے ننھے تہنیت نامے چسپاں تھے۔ جلیس الحسن نے ان تہنیت ناموں کو کھول کر دیکھا اور انھیں پھر ایک خوشگوار حیرانی، ایک موہوم سی بے یقینی نے آ لیا۔

ایک تہنیت نامے پہ درج تھا:

فراز بیٹے کے لیے۔

بہت سی دعاؤں کے ساتھ

ممّا کی طرف سے!

اور دوسرے پر لکھا تھا

چھوٹی کے لیے

ڈھیروں پیار کے ساتھ

ممّا کی طرف سے!

جلیس الحسن نے متذبذب نگاہوں سے الفت کی جانب دیکھا اور بولے "یقین نہیں آتا۔"

"کس بات کا؟"

"یہ کہ تم وہی پُرانی والی الفت ہو!"

وہ ایک سرد آہ کو سینے میں گھونٹ کر رہ گئی۔

انھیں کیا خبر تھی کہ

وہ ان دنوں ایک گہری کھائی پر تنے ایک ایسے رستے پر چل رہی تھی جس پر ہر قدم کا اُٹھنا موت سے نبرد آزما ہونا تھا

لمحہ لمحہ دل سہما جاتا تھا!

ہر قدم ایک ڈراوا تھا!

گر جانے اور کھیل کھیل ہو جانے کا خوف۔

انھیں کیا معلوم تھا کہ

اس نئے راستے پر اُسے اپنے ہر قدم تلے خود اپنا ہی دل کراہتا محسوس ہوتا تھا۔

کاش! وہ انھیں بتاسکتی کہ
بیک وقت دو متضاد سمتوں میں مسافرت کیسا عذاب ہے۔
ہر مرتبہ وہ خود کو مقام آغاز پر کھڑا پاتی تھی!
سرد و طوفان قلب کو دبا کر سکون کا مظاہرہ کرنا پڑتا تھا۔
دل کچھ کہتا تھا
زبان سے کچھ اور کہنا پڑتا تھا۔
مصلحت اور منافقت کا طوق گردن میں لٹکا کر اپنی باطنی کیفیت کے برعکس عمل کرنا پڑتا تھا۔
وہ انھیں کیونکر بتاتی کہ
اُن کے بچوں کے لیے تو اُس کے دل میں آج بھی کوئی جگہ نہ تھی۔
مگر فقط اُن کی خوشی کی خاطر اُس نے اپنے دل کو جبر کی صلیب پر لٹکا دیا تھا۔
کیسے بتاتی وہ انھیں کہ
وہ اندر سے تو آج بھی وہی پرانی والی الفت تھی!
فراز اور زرین کے اعزاز میں منعقدہ اس چھوٹی سی تقریب میں چاروں بہن بھائی شریک تو ہوئے مگر بادلِ ناخواستہ۔
گو جلیس الحسن کو اس تقریب کے انعقاد کی خبر نہ تھی مگر وہ ہر سال کی طرح اس بار بھی دونوں بچوں کے لیے تحائف لیتے ہوئے آئے تھے۔
الفت نے فراز کو ایک خوبصورت سا پینٹنگ سیٹ دیا تھا جبکہ زرین کو اُس نے اس کی دلچسپی کا لحاظ رکھتے ہوئے باتصویر کہانیوں کے چار نظر افروز مجموعے بطور تحفہ دیے تھے۔
جلیس الحسن کی موجودگی کا لحاظ کرتے ہوئے ان دونوں نے الفت کے تحائف لے تو لیے مگر اوپر جاتے ہی انھوں نے ان تحائف کو خاصی نفرت اور حقارت سے ایک طرف ڈال دیا۔
تگین نے دونوں تحائف پر چسپاں تہنیتی ناموں کا پوسٹ مارٹم کر ڈالا۔
"ہاں! ذرا دیکھو تو جانی لکھا کیا ہے" تگین نے مضحکہ اڑانے والے انداز میں کہا....." فراز بیٹے کے لیے... بہت سی دعاؤں کے ساتھ......! اور یہ ہے جناب..... چھوٹی کے لیے..... ڈھیروں پیار کے ساتھ.....مما کی طرف سے ـ!"
"اونہہ! مما کی طرف سے!" فراز نے سر جھٹکتے ہوئے منہ بنا کر انتہائی ناگواری سے کہا۔
"بہت مکار عورت ہے!" اعجاز نے اپنی ناک کے نتھنے انتہائی حد تک پھیلاتے ہوئے تبصرہ کیا۔
"چھوٹی تمہاری تو وہ سچ مچ ماں بننے کی کوشش فرما رہی ہیں۔ بجائے زرین کے چھوٹی لکھا ہے۔ کیا خیال ہے چھوٹی تمہارا اپنی ممی کے بارے میں؟"
"ہائی فٹ!" زرین نے الفت کی بابت خاصا تحقیر آمیز رویہ اختیار کیا۔

دو دن بعد کا ذکر ہے۔
الفت کو وہی پینٹنگ سیٹ جو اُس نے فراز کو اُس کے پاس ہونے پر انعام کے طور پر دیا تھا، فراز کی رائٹنگ ٹیبل پر انتہائی شکستہ حالت میں نظر آیا۔
میز پر فراز کی نئی پرانی کئی کاوشیں پڑی تھیں۔
تقریباً دو فٹ لمبی اور ڈیڑھ فٹ چوڑی ایک ڈرائنگ شیٹ پر" بوجھئے تو" کی انگریزی سرخی کے ساتھ ایک دوسرے سے ذرا دور دور چند فلمی کارٹون بنے ہوئے تھے۔
ایک نوعمر لڑکی کا کارٹون تھا جس کا کیپشن تھا:
"مستقبل کی اکاؤنٹنٹ!"
ایک نوعمر لڑکا تھا جس کے تصور میں چہروں اور کارٹونوں کو رقصاں دکھایا گیا تھا۔
ایک نوجوان لڑکے کا کارٹون ایسا موٹر کار کے تصور میں مگن نظر آتا تھا۔

ایک نوجوان لڑکی کا کارٹون تھا جس کے منہ سے یہ الفاظ نکلتے دکھائی دے رہے تھے:
"کاش! میں جانتی ہے ایک نہیں ایک سو ایک سال بڑی ہوتی!"
ایک پختہ کار مرد کا کارٹون تھا جسے دو جمع دو چار نہیں بائیس کے پھیر میں دکھایا گیا تھا۔
ایک عورت کا کارٹون تھا جو منہ بسورتے ہوئے یہ کہتی دکھائی گئی تھی:
"افسوس مجھے کوئی پسند نہیں کرتا!"
اور اس کارٹون کے نیچے لکھا ہوا تھا
...... کے لیے
بہت نفرت کے ساتھ
فراز کی طرف سے۔
الفت سمجھ گئی کہ یہ اُس کے تحفے کا جواب تھا۔
اور اس خیال سے کہ وہ اپنی تمام تر کوشش کے باوجود جلیس الحسن کے بچوں کے دل سے اپنے خلاف نفرت کے جذبے کو بے دخل نہیں کر پا رہی تھی، اُس کی آنکھیں بھر آئیں۔
میز پر سے اس نے قلم اُٹھایا اور اس کارٹون کے نیچے درج تحریر کے ساتھ لکھ دیا۔
"بہت شکریہ بیٹے۔
تمہاری ماں!
پھر اُس نے جذباتی کیفیت میں فراز کی میز کی دراز میں رکھے وہ تمام کارٹون نکالے جو سوتیلی ماں کی سرخی سے منسوب تھے۔ اور دیوانہ وار اُن میں سے ہر ایک پر انگریزی میں "شکریہ" لکھنے کے بعد انھیں دراز میں واپس رکھ دیا۔
اور جب جلیس الحسن کے بچوں کو اُس کے اس اقدام سے آگاہی ہوئی تو نہ صرف فراز بلکہ تگین اور اعجاز بھی بھونچکا رہ گئے۔

حسنِ اتفاق کہ تگین اور زرین دونوں کا جنم دن پانچ مئی تھا۔
جب تک عاصمہ بیگم تھیں بچوں کے جنم دن انتہائی اہتمام سے منائے جاتے تھے۔
لیکن اُن کے جانے کے بعد اہتمام تو جاتا رہا تھا فقط رسم باقی رہ گئی تھی۔
عاصمہ کے جانے کے بعد اعجاز اور فراز کی دو سالگرہیں گزر چکی تھیں جبکہ تگین اور زرین کی دوسری سالگرہ قریب تھی۔
اعجاز اور فراز کی دونوں اور تگین اور زرین کی ایک سالگرہ بہت سادگی سے منائی گئی تھی۔ حسبِ دستور کیک کاٹ لیا جاتا جس کی سالگرہ ہوتی اُس کو دیگر اہلِ خانہ تحائف دے دیتے اور جلیس الحسن انھیں گھمانے پھرانے باہر لے جاتے۔
سالِ گزشتہ اکتوبر میں اعجاز کی دوسری سالگرہ منائی گئی۔
اور دسمبر میں فراز کی۔
ان دنوں الفت میکے گئی ہوئی تھی۔
اواخر اپریل کی ایک شام جلیس الحسن نے الفت سے کہا "پانچ مئی کو تگین اور زرین کا برتھ ڈے آرہا ہے؟"
"دونوں کا ایک ہی دن؟" الفت نے پوچھا۔
"ہاں دونوں کا ایک ہی دن!" جلیس الحسن بولے "جب تک عاصمہ تھی بچوں کی سالگرہیں ہم بڑی دھوم دھام سے منایا کرتے تھے مگر پھر...... بہرحال اس مرتبہ میں چاہتا ہوں کہ دونوں بچیوں کی سالگرہ پورے اہتمام سے منائی جائے۔"
الفت نے پورے جوش و خروش سے اُن کی تائید کی۔
"میرا خیال ہے کہ تم تگین بیٹی کے ساتھ مل کر پروگرام طے کر ڈالو تو اچھا رہے گا۔"
الفت تذبذب میں پڑ گئی۔
وہ تگین کے ساتھ مل بیٹھ کر پروگرام طے کر لینے کی بات کر رہے تھے۔
جبکہ صورتِ حال یہ تھی کہ وہ اُس کو اپنے قریب ہونے کی اجازت نہ دیتی تھی۔

کاش! وہ انھیں بتا سکتی کہ
بیک وقت دو متضاد سمتوں میں مسافرت کیسا عذاب ہے۔
ہر مرتبہ وہ خود کو مقامِ آغاز پر کھڑا پاتی تھی!
سرِ زور طوفانِ قلب کو دبا کر سکون کا مظاہرہ کرنا پڑتا تھا۔
دل کچھ کہتا تھا
زبان سے کچھ اور کہنا پڑتا تھا۔
مصلحت اور منافقت کا طوق گردن میں لٹکا کر اپنی باطنی کیفیت کے برعکس عمل کرنا پڑتا تھا۔
وہ انھیں کیونکر بتاتی کہ
اُن کے بچوں کے لیے تو اُس کے دل میں آج بھی کوئی جگہ نہ تھی۔
مگر فقط اُن کی خوشی کی خاطر اُس نے اپنے دل کو جبر کی صلیب پر لٹکا دیا تھا۔
کیسے بتاتی وہ انھیں کہ
وہ اندر سے تو آج بھی وہی پرانی والی الفت تھی!
فراز اور زرین کے اعزاز میں منعقدہ اس چھوٹی سی تقریب میں چاروں بہن بھائی شریک تو ہوئے
مگر بادلِ ناخواستہ۔
گو جلیس الحسن کو اس تقریب کے انعقاد کی خبر نہ تھی مگر وہ ہر سال کی طرح اس بار بھی دونوں بچوں کے لیے
تحائف لیتے ہوئے آئے تھے۔
الفت نے فراز کو ایک خوبصورت سا پینٹنگ سیٹ دیا تھا جبکہ زرین کو اُس نے اس کی دلچسپی کا لحاظ
رکھتے ہوئے باتصویر کہانیوں کے چار نسطرا فروز مجموعے بطور تحفہ دیے تھے۔
جلیس الحسن کی موجودگی کا لحاظ کرتے ہوئے ان دونوں نے الفت کے تحائف لے تو لیے مگر اوپر جاتے
ہی انھوں نے ان تحائف کو خاصی نفرت اور حقارت سے ایک طرف ڈال دیا۔
تگین نے دونوں تحائف پر چسپاں تہنیت ناموں کا پوسٹ مارٹم کر ڈالا۔
"ہاں! ذرا دیکھو تو جاہل لکھا کیا ہے" تگین نے مضحکہ اڑانے والے انداز میں کہا۔ "..... فراز بیٹے کے لیے... بہت سی
دعاؤں کے ساتھ......! اور یہ ہے جناب..... چھوٹی کے لیے..... ڈھیروں پیار کے ساتھ..... مما کی طرف سے.....!"
"اونہہ! مما کی طرف سے!" فراز نے سر جھٹکتے ہوئے منہ بنا کر انتہائی ناگواری سے کہا۔
"بہت مکار عورت ہے!" اعجاز نے اپنی ناک کے نتھنے انتہائی حد تک پھلاتے ہوئے تبصرہ کیا۔
"چھوٹی" تمہاری تو وہ سچ مچ ماں بننے کی کوشش فرما رہی ہیں۔ بجائے زرین کے چھوٹی لکھا ہے۔ کیا خیال ہے
چھوٹی تمہارا اپنی ممی کے بارے میں؟"
"ہائی فٹ!" زرین نے الفت کی بابت خاصا تحقیر آمیز رویہ اختیار کیا۔

دو دن بعد کا ذکر ہے۔
الفت کو وہی پینٹنگ سیٹ جو اُس نے فراز کو اُس کے پاس ہونے پر انعام کے طور پر دیا تھا، فراز کی
رائٹنگ ٹیبل پر انتہائی شکستہ حالت میں نظر آیا۔
میز پر فراز کی نئی پرانی کئی کاوشیں پڑی تھیں۔
تقریباً دو فٹ لمبی اور ڈیڑھ فٹ چوڑی ایک ڈرائنگ شیٹ پر" بوجھے تو" کی انگریزی سُرخی کے ساتھ
ایک دوسرے سے ذرا دور دور چند قلمی کارٹون بنے ہوئے تھے۔
ایک نو عمر لڑکی کا کارٹون تھا جس کا کیپشن تھا:
"مستقبل کی اگاتھا کرسٹی!"
ایک نو عمر لڑکا تھا جس کے تصور میں چہروں اور کارٹونوں کو رقصاں دکھایا گیا تھا۔
ایک نوجوان لڑکے کا کارٹون ایسا موٹر کار کے تصور میں مگن نظر آتا تھا۔

ایک نوجوان لڑکی کا کارٹون تھا جس کے منہ سے یہ الفاظ نکلتے دکھائی دے رہے تھے:
"کاش! میں جاجی سے ایک نہیں ایک سو ایک سال بڑی ہوتی!"
ایک پختہ کار مرد کا کارٹون تھا جسے وہ جمع دو چار نہیں بائیس کے پھیر میں دکھایا گیا تھا۔
ایک عورت کا کارٹون تھا جو منہ بسورتے ہوئے یہ کہتی دکھائی گئی تھی:
"افسوس مجھے کوئی پسند نہیں کرتا!"
اور اس کارٹون کے نیچے لکھا ہوا تھا
...... کے لیے
بہت نفرت کے ساتھ
فراز کی طرف سے۔
الفت سمجھ گئی کہ یہ اُس کے تحفے کا جواب تھا۔
اور اس خیال سے کہ وہ اپنی تمام تر کوشش کے باوجود جلیس الحسن کے بچوں کے دل سے اپنے خلاف
نفرت کے جذبے کو بے دخل نہیں کر پا رہی تھی، اُس کی آنکھیں بھر آئیں۔
میز پر سے اس نے قلم اُٹھایا اور اس کارٹون کے نیچے درج تحریر کے ساتھ لکھ دیا۔
"بہت شکریہ بیٹے۔
تمہاری ماں!"
پھر اُس نے جذباتی کیفیت میں فراز کی میز کی دراز میں رکھے وہ تمام کارٹون نکالے جو سوتیلی ماں کی سُرخی سے
منسوب تھے۔ اور دیوانہ وار اُن میں سے ہر ایک پر انگریزی میں "شکریہ" لکھنے کے بعد انھیں دراز میں واپس رکھ دیا۔
اور جب جلیس الحسن کے بچوں کو اُس کے اس اقدام سے آگہی ہوئی تو نہ صرف فراز بلکہ تگین اور اعجاز بھی بھونچکا
رہ گئے۔

حسنِ اتفاق کہ تگین اور زرین دونوں کا جنم دن پانچ مئی تھا۔
جب تک عاصمہ بیگم تھیں بچوں کے جنم دن انتہائی اہتمام سے منائے جاتے تھے۔
لیکن اُن کے جانے کے بعد اہتمام تو جاتا رہا تھا فقط رسم باقی رہ گئی تھی۔
عاصمہ کے جانے کے بعد اعجاز اور فراز کی دو سالگرہیں گزر چکی تھیں جبکہ تگین اور زرین کی دوسری سالگرہ
قریب تھی۔
اعجاز اور فراز کی دونوں اور تگین اور زرین کی ایک سالگرہ بہت سادگی سے منائی گئی تھی۔ حسبِ دستور
کیک کاٹ لیا جاتا، جس کی سالگرہ ہوتی اُس کو دیگر اہلِ خانہ تحائف دے دیتے اور جلیس الحسن انھیں گھمانے پھرانے
باہر لے جاتے۔
سالِ گزشتہ اکتوبر میں اعجاز کی دوسری سالگرہ منائی گئی۔
اور دسمبر میں فراز کی۔
ان دنوں الفت میکے گئی ہوئی تھی۔
اوائل اپریل کی ایک شام جلیس الحسن نے الفت سے کہا: "پانچ مئی کو تگین اور زرین کا برتھ ڈے آ رہا ہے۔"
"دونوں کا ایک ہی دن؟" الفت نے پوچھا۔
"ہاں دونوں کا ایک ہی دن۔" جلیس الحسن بولے۔ "جب تک عاصمہ تھی بچوں کی سالگرہیں ہم بڑی دھوم دھام سے
منایا کرتے تھے مگر پھر...... بہرحال اس مرتبہ میں چاہتا ہوں کہ دونوں بچیوں کی سالگرہ پورے اہتمام سے منائی جائے۔"
الفت نے پورے جوش و خروش سے اُن کی تائید کی۔
"میرا خیال ہے کہ تم تگین بیٹی کے ساتھ مل کر پروگرام طے کر ڈالو تو اچھا رہے گا۔"
الفت تذبذب میں پڑ گئی۔
وہ تگین کے ساتھ مل بیٹھ کر پروگرام طے کر لینے کی بات کر رہے تھے۔
جبکہ صورتِ حال یہ تھی کہ وہ اُس کو اپنے قریب ہونے کی اجازت نہ دیتی تھی۔

اُلفت نے سوچا۔
پھر اس مسئلے کو اپنے لیے ایک چیلنج سمجھ کر قبول کر لیا۔
اپنی خوشی کی خاطر تو بڑے بڑے جھک جایا کرتے ہیں۔
کیا عجب کہ وہ بھی جھک جائیں!
وقتی طور پر سہی...... یا دلِ ناخواستہ سہی مگر مصلحتاً سہی۔
جیسے کہ وہ خود جھک گئی تھی۔
لیکن وہ جانتی تھی کہ اگر اُس نے جلیس الحسن کی عدم موجودگی میں نگین سے بات کرنے کی کوشش کی تو وہ ٹال جائے گی۔
چنانچہ اُس نے نگین اور زرّین کے جنم دن کا پروگرام طے کرنے کے لیے جلیس الحسن کی موجودگی میں بات کرنے کا فیصلہ کیا اور اگلے ہی دن کھانے کی میز پر یہ تذکرہ چھیڑ دیا۔

"ہاں بھئی بیٹے اس مرتبہ ہم آپ کا اور زرّین کا برتھ ڈے ویسے ہی منائیں گے جیسے پہلے منایا کرتے تھے؟"
"کیا ضرورت ہے پاپا؟" نگین بولی۔
"ضرورت یہ ہے کہ عرصہ ہوا آپ کی دوستوں سے ملاقات ہوئے اس بہانے ہم اُن سے ملاقات ہی کر لیں گے۔"
"نہیں پاپا۔ میں کسی دوست کو بلانا نہیں چاہتی" نگین نے کہا۔
"کیوں؟"
"بس ایسے ہی"
"کوئی تو وجہ ہوں؟"
نگین چپ رہی۔
"بولو بیٹا" جلیس الحسن نے کہا۔
"پاپا..... وہ لوگ اُلٹی سیدھی باتیں بنائیں گی۔"
"کیسی باتیں؟"
"اُلٹے سیدھے سوال کریں گی پاپا۔"
"کیسے سوال بیٹا؟"
نگین مضطربانہ اپنی انگلیاں چٹخانے لگی۔
"بولو بیٹا" جلیس الحسن کے لہجے میں اصرار کی کیفیت عود کر آئی۔
"اوہ! پاپا میں آپ کو نہیں بتا سکتی کہ وہ کیسی کیسی باتیں کر سکتی ہیں" نگین نے اُلجھ کر کہا پھر فیصلہ کن انداز میں بولی "نہیں پاپا میں اپنی کسی دوست کو اپنے گھر بلانا نہیں چاہتی..... کیونکہ میں اُن کے سوالوں کا سامنا نہیں کر سکوں گی۔"
اُلفت کے لیے نگین کا یہ روپ قطعاً انجانا تھا۔
اُس نے تو اُسے ایک بے باک اور خود سر لڑکی کے روپ میں دیکھا تھا۔
یہ اُلجھا اُلجھا اور سہما سہما روپ وہ پہلی مرتبہ دیکھ رہی تھی۔
اُس کے دلکش چہرے پر اُداسی اور دُکھ کے سائے لرزاں تھے۔
اُس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں خفت رقصاں تھی۔
یوں لگتا تھا جیسے وہ خوف زدہ سی ہو۔
اُلفت نے گہری نگاہوں سے اُس کا جائزہ لیا۔ اور اُسے یوں لگا جیسے نگین بھی خود اُسی کی طرح دکھوں اور کچھ معلوم اور کچھ نامعلوم سے شکوک و شبہات میں محصور تھی۔
وہ نہ جانے کن خدشات کے تحت اپنی دوستوں کو گھر بلا کر اُن کے سوالوں کا سامنا کرنے سے خائف نظر آتی تھی۔
اُلفت کو یوں لگا جیسے نگین کے چہرے پر لرزاں دکھ اور اداسی کے سایوں میں وہ خود اپنا عکس دیکھ رہی ہو۔

اُس نے میز کے نیچے دھیرے سے جلیس الحسن کا پاؤں دبایا اور اُن سے اشاروں کی زبان میں کہا "بس باقی مجھ پر چھوڑ دیجیے"۔
چنانچہ جلیس الحسن نے بڑی خوبصورتی سے موضوع بدل دیا۔

جون میں نگین کے سالانہ امتحانات ہونے والے تھے۔ چنانچہ ان دنوں رات گئے تک جاگتے رہنا اس کا معمول بنا ہوا تھا۔
اُلفت رات کے کھانے کے بعد تھرماس فلاسک میں چائے بھر کر اُس کے کمرے میں پہنچوا دیا کرتی تھی۔
لیکن اس رات وہ اعجاز اور فرزانہ کے کمروں کی بتیاں گل ہو جانے کے بعد خود چائے کی فلاسک نگین کو پہنچانے اوپر جا پہنچی۔
کمرے کے نیم وا دروازے کی جھری سے اُس نے اندر جھانکا۔
زرّین سو چکی تھی۔
نگین دروازے کی جانب پشت کیے ٹیبل لیمپ کی روشنی میں اپنی پڑھائی میں منہمک تھی۔
اُس نے دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔
"آ جاؤ بھئی" نگین نے پلٹ کر دیکھے بنا کہا۔
غالباً اُسے یقین تھا کہ حسبِ معمول ملازم اُسے چائے پہنچانے آیا ہوگا۔
مگر اُلفت کو دیکھتے ہی اُس کے چہرے پر ناگواری بکھر گئی جس سے اُلفت کو قدرتی طور پر ملال ہوا۔
"ہر گھر کی کہانی مختلف ہوتی ہے" اُس نے سوچا "عام خیال کے مطابق سوتیلی ماں ظالم و جابر ہوا کرتی ہے اپنے سوتیلے بچوں سے بے رخی برتتی ہے، اُن سے نفرت کرتی ہے لیکن جس گھر کی کہانی میں میں سوتیلی ماں کا کردار ادا کر رہی ہوں وہاں سوتیلے بچوں نے بے اتفاقی اور نفرت کی انتہا کر دی ہے" دبی دبی سی ایک سرد آہ اُس کے سینے میں پھڑپھڑا کر رہ گئی۔ اُردو ادب سے چنداں دلچسپی نہ ہونے اور اشعار یاد رکھنے کے ضمن میں انتہائی کند ہونے کے باوجود اُسے ایک بار زد عام مصرعہ یاد آ گیا "شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک"
"بیٹا! چائے لائی ہوں تمہارے لیے" اُلفت نے اپنی آمد کا جواز پیش کیا۔
"سلیم روزانہ پہنچا تا ہے آپ کو تکلیف کرنے کی کیا ضرورت تھی" نگین نے تلخی اور ناگواری سے کہا۔
"چائے پینے سے تھوڑا سا تازہ دم تو محسوس کرتی ہوگی تم خود کو ہے نا؟" اُلفت نے بے تکلفی کی فضا استوار کرنے کی کوشش کی۔
نگین کچھ نہیں بولی۔
اُس نے دونوں کہنیاں میز پر ٹکاتے ہوئے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا تھا۔ یہ گویا اس امر کا خاموش اظہار تھا کہ وہ اُس سے بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔
بلکہ شاید اپنے کمرے میں اُس کی موجودگی کو بھی برداشت نہیں کر پا رہی تھی۔
مگر اُلفت بھی پسپا ہونے کے موڈ میں نہ تھی۔
"جن دنوں میرے امتحان ہوتے ہوتے تھے میں ہر گھنٹے پون گھنٹے بعد ایک کپ چائے ضرور پیا کرتی تھی۔"
"تو میں کیا کروں؟" نگین کی خاموشی نے اس کا منہ چڑاتے ہوئے کہا۔
اُلفت دوسری کرسی کھینچ کر اُس کے نزدیک بیٹھ گئی۔
نگین نے چونک کر منہ پر سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے اُسے دیکھا اور اُس کی آنکھوں میں استفہامیہ کیفیت عود کر آئی جیسے پوچھتی ہو:
"بیٹھ کیوں گئیں؟"
"بیٹا! برتھ ڈے پر تم اپنی دوستوں کو کیوں نہیں بلانا چاہتیں؟" اُلفت نے بڑی رسانیت سے پوچھا۔
نگین نے پہلے کی نسبت زیادہ چونک کر اُس کی جانب دیکھا جیسے اُسے اس سے اس قسم کے استفسار کی توقع

نہیں تھی۔

"یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔" اُس نے ترشی سے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" الفت نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "میں مانتی ہوں کہ یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے مگر بچوں کے معاملات سے والدین کو بھی تھوڑی بہت دلچسپی ضرور ہوا کرتی ہے۔ مائنڈ اِٹ بچوں کے مسائل، اُن کی اُلجھنیں، اُن کے دکھ اُن کے کامپلیکسز شیئر کیا کرتی ہیں۔"

"بٹ یو آر ناٹ مائی مدر۔" نگین نے خاصی بے رحمی سے کہا۔

الفت کو بے اختیار رعنا جمیل کی بات یاد آگئی۔

"دوسرے کے بچے کبھی اپنے نہیں بن سکتے۔ تم اپنا دل بھی نکال کر اُن کے آگے رکھ دو تو وہ تمہارے نہیں بن سکتے۔" رعنا نے کہا تھا۔

اُسے نگین کی بے رخی سے دکھ ہوا۔

لیکن پھر اُس نے بُردباری اور تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے تم مجھے ماں نہیں سمجھتیں نہ سہی۔۔۔۔ دوست ہی سمجھ لو۔"

"دوست!" نگین نے طنزیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔ "کیا آپ میری دوست ہو سکتی ہیں؟"

"کیوں نہیں؟"

"نو!" نگین نے اُس کے خیال کو یکسر مسترد کرتے ہوئے کہا۔ "آپ۔۔۔۔ آپ میری دوست نہیں ہو سکتیں۔۔۔ ہم چاروں میں سے کسی کی بھی نہیں۔۔۔۔۔ آپ تو بس ہماری ماں کی جگہ لینا چاہتی ہیں اس گھر میں۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔ ہم کبھی ایسا نہیں ہونے دیں گے۔"

الفت دم بخود رہ گئی۔

کیا یہ اُسی تصویر کا دوسرا رخ نہیں تھا جس کا اُلٹا رخ خود اُس کے لیے وحشت کا باعث تھا۔

کیا نگین کی بات کی روشنی میں اُس کا یہ خدشہ درست ثابت ہوتا نظر نہیں آتا تھا کہ وہ اس گھر سے جانے والی عورت کے نقوش یا کبھی مندمل نہ کر پائے گی!

الفت کو نگین کی بات سے انتہائی ملال ہوا۔

مگر وہ اس بار ہمت ہار کر میدان میں اُتری تھی۔

اور آخری گول تک مقابلہ کرتے رہنا چاہتی تھی۔

سو اُس نے کہا۔ "میری جان! تمہیں غلط فہمی ہے۔ یقین کرو میں کسی کی جگہ نہیں لینا چاہتی۔ اس دنیا میں کوئی شخص کسی دوسرے کی جگہ نہیں لے سکتا۔ اگر ایسا ہو سکتا تو پھر کوئی بھی جانے والوں یا مر جانے والوں کے لیے نہ روتا۔ بیٹا! انسان انسان ہوتے ہیں لوڈو کی گوٹیں نہیں کہ آپ نے چال چلتے ہوئے خانے میں بند گوٹ اُٹھا کر باہر نکال دی۔ اور جو باہر نکلی ہوئی تھی اُسے خانے میں بند کر دیا۔"

نگین کے چہرے کا رنگ قدرے متغیر نظر آنے لگا۔

وہ لاکھ ایک تیز و طرار لڑکی اور اپنے بہن بھائیوں میں سب سے بڑی کیوں نہ سہی اُس کا تجربۂ زندگی بہرحال محدود اور ناپختہ تھا۔

وہ اپنے دل کی باتیں دل کی گہرائیوں تک پنہاں نہ رکھ سکی۔

"کیا آپ ہمارے ساتھ کوئی گیم نہیں کھیل رہی ہیں؟"

الفت اپنے رویے پر اس کے بے لاگ تبصرے پر بھونچکا رہ گئی۔

ذرا دیر کو تو اُسے یوں لگا جیسے الفاظ اُس کا ساتھ چھوڑ گئے ہوں۔

احساسِ توہین سے اُس کا رواں رواں تپ اُٹھا تھا۔

اُس کا جی چاہ رہا تھا نگین کو بُری طرح پھٹکار دے لیکن اس خیال نے کہ اس کے اس اقدام سے اُس کی ساری ریاضت اکارت چلی جائے گی اُس کے ذہنی ہیجان پر بہت سے پہرے بٹھا دیے۔

"دیکھو اگر مجھے گیم کھیلنا ہی ہو گا تو اپنے برابر والوں کے ساتھ کھیلوں گی بچوں کے ساتھ کیوں؟"

نگین خاموش رہی مگر اضطراب اُس کے چہرے سے ٹپکا پڑتا تھا۔

الفت کو لوہا قدرے گرم محسوس ہوا۔

"تمہارے پاپا کی خواہش ہے کہ اس مرتبہ تم دونوں بہنوں کی سالگرہ ویسے ہی منائی جائے جیسے۔۔۔۔" اُس سے آگے الفاظ اُس کے حلق میں گھٹ کے رہ گئے کیونکہ اس سے آگے وہ جو کچھ کہنے جا رہی تھی وہ آسانی سے ادا کرنا اُس کے لیے تو وہ ایک پورا دریا عبور کرنے کے مترادف تھا۔ "۔۔۔۔ جیسے تمہاری مما کے زمانے میں منائی جاتی تھی۔"

نگین نے تڑپ کر اُس کی طرف دیکھا۔

"ہاں جان!"

اپنے ذاتی تجربے کی نسبت سے وہ لفظ "جان" کے سحر سے بخوبی آشنا تھی۔

جب جمالی جمال اُسے "جان" یا "میری جان" کہا کرتی تھیں تو اُس کا جی چاہتا تھا کہ وہ اُن پر اپنی جان نثار کر دے۔

حالانکہ جمالی کی اس "جان" اور "میری جان" کی اصلیت کھلنے پر وہ جس قدر دل گرفتہ ہوئی تھی اُس کا اندازہ بس اُسی کو تھا۔

بہرحال بعض لفظوں کا ایک ناقابلِ بیان سحر ہے اور لفظ "جان" بھی انہی میں سے ایک ہے سو الفت نے بھی نگین پر اسی افسوں کو آزمانے کی کوشش کی تھی۔

"تمہارے پاپا اس روز ایک شاندار سی تقریب منعقد کرنا چاہتے ہیں۔۔۔۔ اُن کی خواہش ہے کہ تمہاری اور تہمینہ کی ساری دوستوں کو اس تقریب میں مدعو کیا جائے۔"

"نہیں۔۔۔۔ میں۔۔۔۔ کسی دوست کو۔۔۔۔ نہیں بلانا چاہتی۔" نگین نے اپنا رخ دوسری جانب موڑتے ہوئے کہا۔

"تم بتانا پسند کرو یا نہ کرو مگر میں جانتی ہوں کہ تم انھیں کیوں بلانا نہیں چاہتیں۔"

نگین نے ایک بار پھر تڑپ کر اُس کی طرف دیکھا۔

"ہاں میں جانتی ہوں میری جان۔"

"پلیز۔" نگین نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا اور اپنا چہرہ ایک مرتبہ پھر دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا۔

الفت نے نگین سے اپنی تمام رنجشوں، شکایتوں اور رنجیدگیوں کو بالائے طاق اُٹھا رکھا اور ایک سچے مونس و غمخوار کی طرح دلسوز لہجے میں بولی۔ "میری جان! ایک بات بتاؤں تمہیں۔۔۔۔۔ اس دنیا کا دستور نرالا ہے۔" اُس نے توقف کیا۔ ایک گہری سانس کھینچی پھر کہا۔ "جو اس سے ڈرتے ہیں یہ انھیں اور ڈراتی ہے اور جو اس کے آگے سینہ تان کر مقابلے کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں اُن سے یہ ڈر کر پیچھے ہٹ جاتی ہے۔۔۔۔۔ میری جان! دنیا سے ڈرنا نہیں مقابلہ کرنا سیکھو ورنہ دنیا سے جتنا ڈرو گی یہ اتنا ہی زیادہ تمہیں ڈرائے گی اور تمہارا جینا دوبھر کر دے گی۔ ایسے کمال نہیں ہوتے اور کس کے ساتھ نہیں ہوتے۔ اس لیے تم اس یقین کو اپنے دل میں جگہ دینے کی کوشش کرو کہ جو تجربہ تمہارے ساتھ ہوا ہے وہ تم سے پہلے بھی بہت سوں کے ساتھ ہو چکا ہے۔ آخر انھوں نے بھی تو دنیا کا سامنا کیا ہے تو تم کیوں ڈرو۔"

نگین اپنے ہاتھوں کی انگلیاں مضطربانہ مروڑنے لگی۔

الفت نے اپنا ہاتھ اس کے شانے پر دھرتے ہوئے کہا۔ "میں تمہارا مسئلہ سمجھتی ہوں۔ جانتی ہوں کہ تم اپنی دوستوں کو کیوں بلانا نہیں چاہتیں۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تم اپنی دوستوں کے کن متوقع سوالات سے خوفزدہ ہو یہی نا کہ وہ تم سے تمہاری مما کے اور میرے بارے میں پوچھیں گی۔ تم گھبراؤ مت میں اُن کے سوالوں کے جواب دینا اور انھیں مطمئن کرنا جانتی ہوں۔ تمہاری سہیلیوں کو بھی مطمئن کر دوں گی اور اگر کوئی بہت ہی پریشان کن ثابت ہونے کی کوشش کرے گی تو اُس سے ہم دونوں صاف صاف کہہ دیں گے کہ وہ اپنے کام سے کام رکھے۔"

نگین خود کو ایک عجیب سی مشکل سے دوچار پا رہی تھی۔

رات کا وقت تھا۔

ہر سو سناٹا چھا چکا تھا۔

میز پر دھری گھڑی کی ٹک ٹک اور الفت کی آواز کے سوا اُسے دوسری کوئی آواز سنائی نہ دے رہی تھی۔

اُس کا سب سے بڑا ہمدرد، رازداں، بہی خواہ، مشیر، دردآشنا، غرض سب کچھ..... اُس کا عزیزاز جان بھائی اپنے کمرے میں خوابِ خرگوش کے مزے لے رہا تھا۔

یوں اس وقت اس کا مدافعتی نظام مجموعاً بہت بے بس تھا۔

اس پر مستزاد الفت کا دلسوزانہ و ہمدردانہ لہجہ جو اُسے تذبذب میں ڈالے دے رہا تھا کہ دیا تیں آج اس نے کی تھیں وہ اس سے پہلے اس سے کسی اور نے نہ کہی تھیں۔

وہ حیران ہو کر دل ہی دل میں سوچ رہی تھی:

"یہ کیسے پوچھ لیا انھوں نے کہ میں اپنی دوستوں کو اپنے گھر بلانے سے خوفزدہ کیوں ہوں؟ کیا انھیں دل کے بھید جاننے کا گر آتا ہے؟ کیا انھیں الہام ہوتا ہے؟"

اُلفت اُٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"صرف ایک دفعہ ہمت کرنے کی بات ہے۔ ایک مرتبہ جب تم لوگوں کی نگاہوں میں نگاہیں ڈال کر کھڑی ہو جاؤ گی تو ساری مشکلات، سارے مسائل آپ ہی آپ حل ہو جائیں گے۔ تم ہر خوف سے نجات حاصل کر لو گی۔"

نگین نے ذرا کی ذرا الجھی ہوئی نگاہوں سے الفت کی طرف دیکھا۔

اُس کی نگاہوں میں گہری سوچ اور ابہام کی ملی جلی کیفیت لرزاں تھی۔

"تم ذہین ہو، کچھ بھی کر سکتی ہو ڈیئر!" الفت نے اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

نگین نے چاہا کہ اس کا ہاتھ پرے جھٹک دے۔

مگر خدا جانے یہ رات کے سناٹے کا خوف تھا یا

اپنے مجموعی مدافعتی نظام کی بے بسی کا ڈر۔

یا پھر الفت کے درد آشنا ہونے کا احساس کہ وہ اُس کا ہاتھ پرے جھٹک دینے کی ہمت نہ کر سکی۔

"تمہارے پاپا تم لوگوں کو خوش دیکھنا چاہتے ہیں اور میں تمہارے پاپا کو مطمئن دیکھنا چاہتی ہوں۔ تمہیں بھی اپنے پاپا کی خوشی کو مدِ نظر رکھنا چاہیے۔ اگر وہ تم دونوں بہنوں کی سالگرہ شاندار طریقے سے منانا چاہتے ہیں تو لوگوں سے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اب جب پاپا بات کریں تم سے اس بارے میں تو کہہ دینا ٹھیک ہے پاپا جیسے آپ کی مرضی..... پھر..... سالگرہ کا پروگرام تو ہم تم دونوں مل کر بنائیں گے۔ مگر تمہاری دوستوں کے سوالات کا سامنا میں کروں گی۔ اس سلسلے میں تمہیں پریشان ہونے کی ذرا بھی ضرورت نہیں..... جان! اب یہاں میں ہوں آپ سب کے دکھ سکھ بٹانے کو۔"

نگین خاموش بیٹھی رہی۔

"آل رائٹ بیٹا..... اب میں آپ کا اور وقت نہیں لوں گی۔ گرم گرم چائے کی ایک پیالی پیو اور اپنی پڑھائی میں لگ جاؤ..... ہاں مگر اس عزم کے ساتھ کہ حالات جیسے بھی ہوں تمہیں دنیا کا سامنا کرنا ہے..... اور..... تم تنہا نہیں ہو بلکہ میں ہوں تمہارے ساتھ۔"

الفت جھکی۔ آہستہ سے نگین کے سر کو بوسہ دیتے ہوئے کہا "گڈ نائٹ!"

اس نے الفت کے شب بخیر کہنے کا کوئی جواب نہیں دیا۔

نگین گم سم بیٹھی رہی۔

اور الفت نے اس کے جواب کا انتظار کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

چپ چاپ اُس نے دروازے کا رُخ کیا اور دروازے سے نکلنے کے بعد اپنے پیچھے دروازہ بند کرنے سے قبل ایک نظر نگین کی جانب دوڑائی۔

وہ اپنی ٹھوڑی بائیں شانے پر ٹکائے کن پھٹی دزدیدہ نگاہوں سے دروازے کے رُخ دیکھ رہی تھی۔

الفت نے دھیرے سے اُس کے کمرے کا دروازہ بند کیا اور پلٹ لیتے لگ بھگ زینے کی طرف چل دی۔ اُسے یقین تھا کہ جلیس الحسن اُس کے انتظار میں جاگ رہے ہوں گے۔

پتھر پر پہلی ضرب پڑ چکی تھی۔

"تم نے مجھے کیوں نہیں جگایا؟" اعجاز نے نگین سے گزشتہ شب کی روئیداد سننے کے بعد مٹھیاں بھینچتے ہوئے کہا۔

"میں نے ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔"

"بیوقوف ہو تم۔"

"کیوں اس میں بیوقوفی کی بھلا کیا بات ہے؟"

"سراسر بے وقوفی کی تم نے..... تم مجھے جگاتیں تو سہی!"

"فرض کرو میں جگا دیتی تمہیں تو تم کیا کرتے؟"

"نکال باہر کرتا اُسے تمہارے کمرے سے۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا؟"

"فرق یہ پڑتا کہ جھگڑا ہوتا یار بگی! تم بہت بے وقوف ہو۔ تم نے جھگڑا کرنے کا ایک سنہری موقع ضائع کر دیا ہے۔"

"بھائی! تم خواہ مخواہ اپنا خون جلا رہے ہو۔ اگر میں تمہیں جگا بھی دیتی تو تمہیں جھگڑا کرنے کا کوئی موقع نہ ملتا۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟"

"ایسے کہ جھگڑا اس وقت کیا جا سکتا ہے جب دونوں پارٹیاں جھگڑے کے موڈ میں ہوں۔ آگ اور پانی میں بھی بھلا کبھی کوئی لڑائی ہو سکتی ہے؟"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ آپ تو جھگڑے پر آمادہ ہوں اور دوسرا بندہ آپ کو جھگڑے کا موقع ہی ہاتھ نہ لگنے دے تو آپ کیا کر سکتے ہیں؟"

"یار!" اعجاز سر جھٹک کر منہ بناتے ہوئے بولا "تمہیں بس باتیں ہی بنانا آتی ہیں کر کچھ نہیں سکتیں۔ بزدل ہو..... کیسے بڑے بڑے دعوے کرتی تھیں کہ آنے تو دو چار دن میں ہی گھر سے باہر نہ بھگا دیا تو نام نہیں۔ ابھی تک تو تم نے کوئی کارنامہ دکھایا نہیں ہے۔ لگتا ہے اب خود ہی کچھ کرنا پڑے گا۔"

"اب مجھے کہنا پڑے گا کہ تم بہت بے وقوف ہو۔"

"اچھا!"

"اور نہیں تو کیا..... اسے کبھی اتنی دیر سے تمہیں سمجھانے کی کوشش کر رہی ہوں کہ انھوں نے کوئی موقع ہی نہیں دیا بلکہ رات تو انھوں نے اتنی نرمی اور محبت سے بات کی جتنی پہلے کبھی نہیں کی تھی۔"

"اوہ! تو اس کا مطلب ہے کہ ان مرعوب کر دیا ہے محترمہ نے تمہیں اپنی چکنی چپڑی باتوں سے۔" اعجاز نے طنزاً کہا۔

"چکنی چپڑی نہیں جناب۔"

"تم خوشامدانہ کہہ لو۔"

"نہیں خوشامدانہ بھی نہیں۔"

"تو پھر؟"

نگین ذرا دیر کو کسی سوچ میں پڑ گئی۔ پھر دھیمے سُر میں گویا ہوئی۔

"پتا ہے جاجی، رات انھوں نے مجھ سے ایسی باتیں کیں جو اُن سے پہلے مجھ سے کسی نے نہیں کی تھیں..... پاپا نے بھی نہیں۔"

"بائی دی وے ایسی کون سی باتیں تھیں؟"

نگین نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے اپنے بالوں کو جھٹکا پھر گمبھیر لہجے میں بولی: "تم تو جانتے ہو بھیا کہ مام کے جانے کے بعد ہم چاروں نے اپنے دوستوں کو اپنے گھر بلانا اور خود بھی اُن کے گھر جانا کیوں چھوڑ دیا تھا اور اب تک سب چھوڑے ہوئے ہیں......"

نگین کے لہجے کا درد اعجاز کے چہرے پر دکھ بن کر پھیل گیا۔

"اسی لیے ناکہ......" نگین سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے بولی: "ہم کسی کو یہ بتانا نہیں چاہتے تھے کہ مام ہم سے دُور چلی گئی ہیں لیکن...... پھر...... پتا نہیں کیسے سارے کچھ دوستوں کو پتا چل گیا کہ ہماری مام ہمیں چھوڑ کر چلی گئی ہیں اور انھوں نے الٹی سیدھی باتیں بنانا شروع کر دیں۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دو بار تم نے بھی مجھ سے کہا تھا کہ تمہارے جن دوستوں کو پتا چل گیا ہے انھوں نے مام کے بارے میں الٹی سیدھی باتیں بنانا شروع کر دی ہیں۔ فرازا اور زونین کے دوستوں نے بھی سوالات کیے اور ہم چاروں میں سے کوئی بھی نہ تو مام کے بارے میں اُن کی الٹی سیدھی باتوں پر ذہنی ڈانٹ سکا نہ اُن کے عجیب و غریب سوالات کے جواب دے سکا...... پاپا کو ہم یہ بھی نہ بتا سکے کہ ہمارے دوست ہمیں کس طرح تنگ کرتے ہیں، کیسی کیسی باتیں کرتے ہیں۔ ہم خود ہی اندر ہی اندر جلتے رہے اور ہم نے چپ چاپ اپنے بہت سے دوستوں سے دوستیاں توڑ لیں اور اب عالم یہ ہے کہ ہمارے جو گنے چنے دوست رہ بھی گئے ہیں انھیں بھی نہ تو ہم اپنے گھر بلانے کی ہمت رکھتے ہیں نہ خود اُن کے گھر جاتے ہیں۔ کیونکہ ہم ڈرتے ہیں کہ خدا جانے کون کس وقت کیا پوچھ لے؟"

"تم یہ سب کچھ کیوں دہرا رہی ہو؟" اعجاز نے مداخلت کرتے ہوئے پوچھا۔

"کیونکہ کل رات سے پہلے میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ مام کے بارے میں لوگوں کی الٹی سیدھی باتوں اور ان کے عجیب غریب سوالات کا جواب کیونکر دیا جا سکتا ہے، میں سمجھتی تھی کہ اس سلسلے میں میں کبھی بھی کسی سوال کا سامنا نہ کر سکوں گی۔ مجھے اس خیال ہی سے وحشت ہوتی تھی کہ اگر کبھی مجھ سے کسی نے مام کے بارے میں پوچھ لیا تو میں کیا جواب دوں گی...... اور ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ گھر میں کوئی بڑا ایسا نہ تھا جو ہماری اس اُلجھن کو سمجھتا ہو...... لیکن کل رات......" وہ کہتے کہتے رک گئی۔

"ہاں بولو نا رک کیوں گئیں؟ کل رات؟" اعجاز نے بے تابانہ پوچھا۔

"کل رات پہلی بار مجھے معلوم ہوا کہ کوئی ہے ہمارے گھر میں جو ہماری اس الجھن کو سمجھتا ہے۔"

"کون؟"

"وہی!"

"وہی کون؟"

"جن سے تم جھگڑا نہ کر سکنے پر تم مجھے برا بھلا کہہ رہے تھے۔" نگین نے اعجاز سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

"لیکن......" اعجاز متذبذب نظر آنے لگا۔

"لیکن کیا؟"

"اُسے کیسے پتا چلا؟" اعجاز نے الفت کی بابت اپنا وہی قدرے غیر مہذبانہ طرزِ تکلم برقرار رکھتے ہوئے کہا۔

"میں نہیں جانتی۔"

"ہم چاروں میں سے کسی کے بتائے بغیر کیسے پتا چل سکتا تھا اُسے؟" اعجاز نے گہری نظروں سے بہن کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"تمہارا کیا خیال ہے کہ میں نے بتایا ہوگا؟" نگین برا مان گئی۔

"نہیں میں تمہیں کب کہہ رہا ہوں مگر کسی نے تو بتایا ہوگا...... ہو سکتا ہے پاپا نے بتا دیا ہو؟" اعجاز نے خیال آرائی کی۔

"مگر جہاں تک مجھے یقین ہے ہم میں سے کسی نے پاپا سے اس سلسلے میں کبھی کوئی بات نہیں کی۔"

"تو پھر کیسے پتا چلا اُسے؟"

"میرا خیال ہے صرف عقل سے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ رات مجھے اُن کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ وہ کافی عقل مند عورت ہیں۔"

"اے! کوئی جادو تو نہیں پڑھ کر پھونک دیا اُس نے تم پر!" اعجاز نے تیکھی تیوروں کے ساتھ کہا۔

"نہیں جادو پھونکنے کی بات نہیں...... وہ واقعی عقل مند ہیں۔"

"اب مجھے یقین ہو چلا ہے کہ وہ کہیں سے تعویذ لائی ہوگی اور وہ اُس نے تمہیں چائے میں گھول کر پلا دیا ہوگا۔"

"آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اُس وقت تک میں نے چائے نہیں پی تھی۔"

"سر پر گھما دیا ہوگا تعویذ تمہارے۔"

"جی نہیں۔" نگین ترچ ہو کر بولی: "سر پر تو انھوں نے بہت پیار سے اس وقت ہاتھ رکھا تھا جب وہ میرے کمرے سے جانے لگی تھیں۔"

"اوہ! تو نوبت یہاں تک پہنچ گئی اب تو مجھے یقین ہو گیا ہے کہ تمہارے اوپر جادو کروا دیا گیا ہے۔"

"بے وقوفی کی باتیں مت کرو...... جاہل عورتوں کی طرح۔"

"تم بے وقوفی کہہ رہی ہو اور مجھے تم پر بُری طرح غصہ آ رہا ہے۔" اعجاز واقعی غصے میں نظر آنے لگا تھا۔

"خواہ مخواہ غصہ آ رہا ہے۔"

"خواہ مخواہ!" اعجاز پاؤں پٹخ کر بولا: "تم جسے عقل مند کہہ رہی ہو وہ فراڈ ہے...... چالاک اور مکار ہے۔"

نگین اُسے غصے میں آتے دیکھ کر نرم پڑ گئی۔

"سکون سے...... اطمینان سے...... پہلے میری پوری بات تو سُن لو۔"

"کیا سُن لوں؟" وہ جھنجھلا کر بولا۔

نگین کچھ دیر چپ رہی کہ اُس کے خیال میں اعجاز کو اس کے ہیجان سے نجات دلانے کے لیے کچھ وقفہ دینا ضروری تھا۔ پھر اُس نے رسانیت سے کہا: "میں مانتی ہوں کہ وہ چالاک ہیں مگر جاجی انھوں نے مجھے ایک ایسی بات بتائی ہے جو اُن سے پہلے کسی نے نہیں بتائی تھی...... پتا ہے کیا بتایا انھوں نے؟" نگین نے خواہ مخواہ چاہت سے بھائی کو دیکھا۔

وہ زبان سے کچھ نہیں بولا مگر اُس کی آنکھوں نے پوچھا "کیا؟"

"انھوں نے مجھے سمجھایا کہ اس دنیا کا دستور ہے کہ جو اُس سے ڈرتے ہیں انھیں یہ اور ڈراتی ہے اور جو اس کے آگے سینہ تان کر مقابلے کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں اُن سے یہ ڈر کر پیچھے ہٹ جاتی ہے۔ لہٰذا دنیا سے ڈرنا نہیں اُس کا مقابلہ کرنا چاہیے اور...... جو ٹریجڈی ہمارے ساتھ ہوئی ہے، وہ ہم سے پہلے بھی بہت سوں کے ساتھ ہو چکی ہے۔ آخر انھوں نے بھی تو دنیا کا سامنا کیا ہی تو پھر ہم کیوں ڈریں!" نگین نے اُسے بتایا۔

"بس اتنی سی بات پر تم اُن کا کلمہ پڑھنے لگیں۔" اعجاز زہر خند لہجے میں بولا۔

"نہیں اور بھی بہت کچھ کہا انھوں نے...... اور تم یقین کرو جاجی کہ میں رات سے خود کو بدلا ہوا محسوس کر رہی ہوں۔ مجھے لگتا ہے جیسے اب میں واقعی دنیا کو فیس کر سکتی ہوں۔ اپنی دوستوں کا سامنا کر سکتی ہوں اور جو زیادہ گڑبڑ کرنے کی کوشش کرے اُس سے کہہ سکتی ہوں کہ ہمارے ذاتی معاملات میں دخل دینے کی کوشش مت کرو۔ مائنڈ یور اون بزنس۔" وہ کچھ بھی بول۔ "پتا ہے اتنی ہمت کیوں آ گئی ہے مجھ میں؟"

"بس اب اپنی بکواس بند کرو۔"

نگین ہنس دی۔

اعجاز کا بڑھا ہوا پارا اُسے اعجاز کے سامنے اس موضوع پر مزید کوئی بات نہ کر دینے کا مشورہ دے رہا تھا سو وہ چپ ہو رہی۔

مگر اُس نے جی ہی جی میں کہا۔

"اتنی ہمت اس لیے آ گئی ہے مجھ میں کہ انھوں نے کہا ہے میری سالگرہ میں آنے والی دوستوں کو وہ خود مطمئن کریں گی۔ اُن کے ہر سوال کا جواب دیں گی...... اور ہاں یہ بھی تو کہا ہے انھوں نے کہ گھبرانے کی ضرورت نہیں اب تم تنہا نہیں ہو۔ تمہارا دکھ بٹانے کو میں یہاں موجود ہوں۔"

"سوتیلا" بڑا ہی قابلِ نفرت لفظ ہے۔
جس رشتے کے ساتھ لگ جائے اُس کی حرمت اور تقدیس کا گلا گھونٹ دیتا ہے۔
الفت سے نگین کا رشتہ محبت کا رشتہ نہ تھا۔
بچاکہ ابتدا میں خود الفت کے ناروا طرزِ عمل کے سبب بچوں سے اُس کے تعلقات خاصے کشیدہ رہے تھے۔
اور یہ بھی تسلیم کہ دوسری بار الفت کے جلیس الحسن کے گھر آنے سے اب تک اُس کے سنجیدہ طرزِ سلوک کے باوجود بچے اُس سے کھنچے کھنچے ہی رہے تھے۔
مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ نگین اپنی ذہنی الجھنوں میں گرفتار زندگی کے نشیب و فراز سے ناآشنا ایک ناتجربہ کار نوجوان لڑکی تھی۔ اس کا تیز و طرار ہونا علیحدہ بات تھی مگر حالات کا مقابلہ کرنے کی ہمت رکھنا جُدا مسئلہ۔
زندگی کے گمبھیر مسائل سے تن تنہا نمٹنے کی ہمت نہ تھی اُس میں۔
عاصمہ بیگم کے جانے کے بعد جلیس الحسن نے بچوں کی مادی احتیاجات کی تسکین کے سلسلے میں تو کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی تھی مگر وہ اپنی عدمِ فرصت اور عدمِ واقفیت کے سبب اُن کے جذباتی مسائل پر توجہ نہ دے پائے تھے۔
سچی بات تو یہ تھی کہ عاصمہ بیگم کے جانے کے بعد خود اُن کی اپنی جذباتی کیفیت اتنی دگرگوں ہو کر رہ گئی تھی کہ انھیں خود تسلی و تشفی کی ضرورت تھی، وہ بچوں کے جذباتی مسائل پر بھلا کیا توجہ دے پاتے۔ اپنی دانست میں تو وہ یہ سمجھتے تھے کہ بچوں کی مادی احتیاجات کی تسکین اور اُن سے اظہارِ محبت ہی بچوں کے سلسلے میں اُن کی کل ذمے داری ہے۔
وہ یہ نہ جانتے تھے کہ مادی احتیاجات کی تسکین اور محبت کے علاوہ بھی بچوں کے کچھ جذباتی تقاضے تھے۔ ماں کے جانے کے بعد اُن میں سے ہر ایک اپنے خول میں محصور ہو کر رہ گیا تھا اور۔ بالکل ویسے ہی جیسے کہ وہ خود اپنے حلقۂ احباب سے کترانے اور نظریں چرانے لگے تھے۔ بچے بھی اپنے دوستوں سے کترانے اور نظریں چرانے لگے تھے۔ گو بظاہر وہ ہنستے مسکراتے تھے مگر اندر دُکھ لاوے کی طرح پک رہا تھا۔
اور جیسے وہ اپنے دوستوں کی اُلٹی سیدھی باتوں اور طرح طرح کے استفسارات سے بچنے کے لیے اُن سے کنارہ کش ہو گئے تھے ویسے ہی بچوں نے بھی اپنے دوستوں سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔
عاصمہ بیگم کے جانے کے بعد انھوں نے بچوں کا خیال رکھنے کی تو انتہائی کوشش کی مگر کبھی اُن کے دل ٹٹولنے کی کوشش نہیں کی۔
اُن سے کبھی یہ نہیں پوچھا کہ اُن کی ماں کے جانے کے بعد گھر میں اُن کے دوستوں کی آمد و رفت کیوں بند ہو گئی تھی اور خود انھوں نے بھی اپنے دوستوں کے ہاں آنا جانا کیوں ترک کر دیا تھا؟ بس اسکول یا گھر ہی کے کیوں ہو کر رہ گئے تھے؟
نگین بہن بھائیوں میں سب سے بڑی تھی۔
حالات اور واقعات کا سب سے زیادہ اثر اسی نے قبول کیا تھا۔
صنفِ نازک سے تعلق رکھنے کے سبب محبت اور احساسِ تحفظ اُس کی ذات کے دو بنیادی اور فطری تقاضے تھے
الفت نے محبت کا ایسا نوکیلا نشتر نہیں لگایا تھا۔ نگین کو اس کی دل آزاری کا یقین اور اُسے زمانے کی دستبرد سے محفوظ رکھنے کے لیے تحفظ کی پیشکش اُس نے پہلی بار کی تھی اور جس موثر انداز میں کی تھی وہ ایسی کارگر رہی تھی کہ نگین ڈانواں ڈول ہو کر رہ گئی تھی۔
ڈوبنے کو تنکے کا سہارا ہی بہت ہوتا ہے۔
الفت نے تو ذہنی الجھنوں میں گھری اور زمانے سے خائف نگین کے سر پر احساسِ تحفظ کا سائبان ہی تان دیا تھا۔ اُسے دنیا سے نہ ڈرنے کا حوصلہ دیا تھا اور اپنے تعاون کا یقین دلایا تھا۔
یہ احساس کہ کوئی ہے جو اُس کے دل کے درد سے آشنا ہے نگین کو عجیب تقویت بخش رہا تھا!

سالگرہ کی تقریب کے انعقاد کے سلسلے میں اگرچہ نگین نے الفت کے ساتھ سر جوڑ کر تو پروگرام کی تفصیلات طے نہ کیں تاہم الفت نے اس ضمن میں اس سے جب کوئی صلاح چاہی یا استفسار کیا اُس نے پہلی نسبت خاصے نرم لہجے میں جواب دیا۔
اگرچہ اعجاز اُس کی بدلی ہوئی روش پر بہت جھنجلایا اور آنکھیں نکال نکال کر اُس پر اپنی برہمی کا حتی الوسع اظہار

کرتا رہا۔
فراز اور زرین کو نگین نے اپنے اعتماد میں لے لیا تھا۔
جلیس الحسن کی زمانہ شناس نگاہیں بھی اُلفت اور نگین کے مابین تعلقات کی اس استواری کو محسوس کر رہی تھیں اور وہ خوش تھے۔ اس خوشگوار تبدیلی پر اپنی مسرت اور طمانیت کے اظہار کے لیے انھوں نے دونوں بیٹیوں کا جنمِ دن پُرشکوہ انداز میں منانے کے انتظامات کیے۔
پانچ مئی کی صبح جب حسن لاج کے وسیع و عریض سبزہ زار اور احاطے میں شامیانے نصب کیے جا رہے تھے۔
اُلفت نے نگین سے کہا۔
"بیٹیا! ایک بات کا خیال رکھنا کہ مہمانوں کے سامنے ہم اپنی کوئی کمزوری ظاہر نہ ہونے دیں گے... میرا مطلب ہے ویسے چاہے تم مجھ سے بات کرو یا نہ کرو لیکن مہمانوں کے سامنے ہرگز یہ ظاہر نہ ہونے دینا کہ تم عام زندگی میں مجھ سے کم کم بات کرتی ہو.... بات یہ ہے جان کہ لوگوں کو دوسروں کے بارے میں باتیں بنانے اور اُن پر ہنسنے کو بس ایک بہانہ چاہیے ہوتا ہے بلکہ متعدد بھی ہوتے ہیں جو دوسروں کو اپنے بارے میں باتیں بنانے یا ہنسنے اور پر ہنسنے کا موقع نہیں دیتے... تقریب میں ہم ایک دوسرے سے بے تکلف ہو کر بات کریں گے..... ٹھیک ہے؟"
"جی.... جی ٹھیک ہے۔"
پھر اُس نے نگین ہی کی موجودگی میں زرین کا گھیراؤ کیا۔
"چھوٹی! بیٹے ایک بات کا خیال رکھنا کہ اپنی دوستوں کے سامنے مجھے غصے سے نہیں دیکھو گی۔ اور جب میں تم سے بات کروں گی تو جواب ضرور دو گی ورنہ آپ کی دوست کہیں گی، شاید بہت ہی خراب ہیں زرین کی ماما تب ہی تو زرین اُن سے بات نہیں کرتی۔ پھر وہ پیچھے بھی باتیں کریں گی، ہماری فیملی کا مذاق اُڑائیں گی.... نہ میری جان، دوسروں کو اپنی فیملی کا مذاق اُڑانے کا موقع نہیں دیں گے ہم۔"
پھر جب ہال رنگ برنگی قمقموں سے آراستہ کیا جا رہا تھا اور فراز پنڈال کے ایک گوشے میں بیٹھا اسٹیج کی آرائش کو ستائشی نظروں سے دیکھ رہا تھا تو الفت نے اُس کے عقب سے اُس کے سر پر اپنا ہاتھ دھرتے ہوئے کہا۔
"چھوٹے شہزادے! آپ کی بہنوں کی پارٹی تو ہم اور بھی زیادہ شان سے منائیں گے مگر دیکھو آج اپنے دوستوں کے سامنے ہرگز یہ ظاہر نہ ہونے دینا کہ آپ اپنی ماما سے بات نہیں کرتے ہیں ورنہ وہ ہنسیں گے کہ فراز تو اپنی ماما سے بولتا ہی نہیں...... اُن کے سامنے بات کر لینا مجھ سے، پیچھے پھر جتنے مرضی آئے کارٹون بنا دینا میرے میں مائنڈ نہیں کروں گی۔"
اعجاز صرف الفت سے بدستور دور دور رہتا بلکہ جب سے اُس نے نگین کو بدلتا دیکھا تھا وہ اُس سے بھی اینٹھا ہوا تھا۔ فراز اور زرین کو بھی موقع دیکھتے ہی جھڑک دیتا۔ وہ سالگرہ کی تقریب کی تیاریوں سے اتنا ہی دور دور تھا جتنا کہ کوئی کافر!
تاہم سالگرہ کی تقریب میں تو اُسے بہرصورت شرکت کرنی تھی کیونکہ تقریب گھر ہی میں ہو رہی تھی۔ پاپا کی مرضی اور خوشی اس تقریب میں شامل تھی اور پاپا سے اُس کی رگ دبتی تھی۔ ویسے بھی انھوں نے اُس کے اے لیول آنے کی صورت میں کالج آنے جانے کے لیے نئی موٹر کار دلوانے کا وعدہ کر رکھا تھا۔
نئی موٹر کار کے لالچ میں تو وہ نگین اور زرین کی سالگرہ کی تقریب میں بھی شریک ہو سکتا تھا مگر جلیس الحسن نے دانستہ اُس پر ایسی کوئی ذمے داری یا پابندی عائد کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ زور و جبر سے کام لینے کے بجائے اُسے بھی ایک روز نگین کی طرح آپ ہی آپ الفت کے ساتھ اپنا رویہ بدل لینے پر مجبور دیکھنا چاہتے تھے۔
اُن کی زمانہ شناس نگاہیں سمجھ چکی تھیں کہ آج نگین تھوڑا سا نرم پڑی ہے کل گھل مل بھی جائے گی۔ کیا عجب کہ ایک روز اعجاز کے ساتھ بھی یہی ہو جائے!
سہ پہر کو جب جلیس الحسن اپنے ہمراہ الفت کو لیے پنڈال کا حتمی جائزہ لینے کے لیے نکلے تو الفت نے بالائی منزل کو جانے والے زینے کے قریب رک کر کہا۔ "ذرا بچوں کو تو آواز دے لیجیے۔"
"کیوں؟"
"کیونکہ تقریب انھی کی ہے۔ انھیں پوری اہمیت دی جانی چاہیے۔"
جلیس الحسن پہلے تو اُس کا منہ دیکھتے رہ گئے پھر دھیرے سے مسکرا دیے۔

"کسی دانا نے سچ کہا ہے کہ عورت کبھی ایک تھیلی ہے۔" انھوں نے جی ہی جی میں سوچا اور بالائی رُخ دیکھتے ہوئے آواز بلند نگین کو پکارا۔

"جی پاپا!" ٹیرس میں زرین کا چہرہ چمکا۔

"بیٹے! نگی باجی سے کہو وہ تم سب کو ساتھ لے کر شامیانے میں آجائیں اور دیکھ لیں کہ سارے انتظامات ٹھیک تو ہیں!"

"جی اچھا۔"

تب ہی نگین بھی ٹیرس میں آپہنچی۔

"آپ نے مجھے پکارا پاپا؟"

"بیٹے تم سب بہن بھائیوں کو لے کر شامیانے میں آجاؤ اور دیکھ لو کہ سب ٹھیک ٹھاک ہے یا کوئی کسر باقی ہے؟ ابھی وقت ہے اگر کچھ اضافہ یا تبدیلی کروانی ہو تو کروالیں گے۔ ہم لوگ بھی ادھر ہی جا رہے ہیں تم بھی آجاؤ۔"

"آل رائٹ پاپا!" نگین نے انتہائی سعادت مندی سے کہا۔

جلیل الحسن نے پنڈال کا رُخ کیا۔

نگین نے پہلے فراز کے کمرے میں ناک لگائی پھر اعجاز کے کمرے کا رُخ کیا۔

"بھائی! ہمارے ساتھ نیچے چلو!" اُس نے نہتا طالبے میں کہا۔

"کیوں؟"

"پاپا نے کہا ہے کہ تم سب آکر دیکھ لو کہ سارا انتظام ٹھیک تو ہے کچھ تبدیلی تو نہیں کروانی۔"

"آئی ایم سوری مس نگین صاحبہ میں نہیں جا سکتا!" اعجاز نے ٹھنڈے پن سے کہا۔

نگین کھلکھلا کر ہنس دی۔

"یہ مس نگی سے مس نگین صاحبہ کب سے ہوگئی؟" اُس نے پوچھا۔

"جب سے آپ ہماری دشمن کی گڈ بکس میں آئی ہیں!"

"اچھا اچھا اب زیادہ ڈائیلاگ مت بولو سیدھی طرح اُٹھ جاؤ!"

"یہ تقریب آپ کی ہے آپ جائیں!"

"جلو مت! یہ تقریب صرف میری ہی نہیں ہے چھوٹی کی بھی ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔"

"تو چھوٹی کی خاطر ہی چلے چلو۔"

"نہیں۔"

"اس کا مطلب ہے تم ہماری تقریب میں شامل ہی نہیں ہو گے؟"

"نہیں شامل تو خیر ضرور ہوں گا ورنہ تم مجھے طعنہ دو گی کہ کنٹ دینے کے مارے نہیں آئے مگر ابھی میں نہیں جاؤں گا وہاں۔"

"کیوں؟"

"تم اچھی طرح جانتی ہو کہ مجھے اس سے نفرت ہے۔ میں اُس کی صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔"

"ٹھیک ہے تمہاری مرضی!" نگین نے اُس سے بحث میں اُلجھنا مناسب نہیں سمجھا۔ "مجھے تو پاپا نے بلایا ہے اس لیے جا رہی ہوں۔"

"جاؤ!"

نگین اپنے ہمراہ فراز اور زرین کو لیے پنڈال میں پہنچی تو جلیل الحسن نے اُسے استفہامیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "اعجاز کہاں ہیں؟"

"وہ اپنے کمرے میں ہے پاپا!" نگین نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔ "شاید سو رہا ہے۔"

مگر اس کا چہرہ جملہ صورتِ احوال کی چغلی کھا گیا۔

"نگی بیٹے! سب ٹھیک ٹھاک ہے یا......؟" الفت نے نگین کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

جلیل الحسن کی سماعت کے لیے یہ ایک نیا اور خوشگوار تجربہ تھا۔

"جی ٹھیک ہے۔" نگین نے پنڈال پر ایک طائرانہ نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔

"تمہاری دوستوں کے لیے یہ حصہ مخصوص رہے گا۔" الفت نے انگلی کے اشارے سے بتایا۔ "ٹھیک ہے نا؟"

"جی۔"

"چھوٹی! آپ کی سہیلیاں اُدھر بیٹھیں گی۔" الفت نے زرین کو بتایا۔

"فراز میاں آپ کہاں بٹھانا پسند کریں گے اپنے دوستوں کو؟"

فراز کچھ نہیں بولا۔

"بھئی بولو نا؟"

"کہیں بھی۔" فراز نے اپنی فطری سنجیدگی کو جانے نہ دیا۔

"گڈ! آپ کو اور بھائی جان کو پوری آزادی ہوگی جہاں مرضی آئے بٹھا دیجیے گا اپنے دوستوں کو۔"

مسرت کا احساس نگین اور زرین کے چہروں سے جھلکا پڑ رہا تھا۔

تقریباً پون گھنٹے وہ سب پنڈال میں رہے اور الفت نے اس دوران بچوں سے مزید بے تکلفی اختیار کرنے کی کوشش کی۔

جلیل الحسن خاصے مطمئن اور مسرور تھے۔

سرِ شام "حسن لاج" جگمگا اُٹھا۔

نگین اور زرین اپنے یکساں خوش رنگ اور نظر افروز ملبوسات میں ملبوس مہمانوں کے استقبال کو الفت اور جلیل الحسن کے ہمراہ پنڈال کے محرابی در کے نزدیک موجود تھیں۔ فراز بھی قرب و جوار میں ہی موجود تھا۔ اعجاز باپ کا لحاظ رکھتے ہوئے آتو گیا تھا مگر الگ تھلگ کھڑا تھا۔

الفت نے نگین اور زرین کی سہیلیوں اور فراز کے دوستوں کا ایک چھوٹے سے یادگاری تحفے کے ساتھ استقبال کیا۔ اعجاز نے اپنے کسی دوست کو مدعو نہیں کیا تھا۔

آٹھ بجے شب تک بیشتر مہمان آچکے تھے۔

ساڑھے پانچ سو سے زیادہ مہمانوں کا اجتماع تھا۔

سالگرہ کیا تھی ایک بڑے جشن کا سا سماں تھا۔

نگین اور زرین اپنی ماں کے زمانے میں منعقد ہونے والی اپنی اور اپنے بھائیوں کی برتھ ڈے پارٹیز کو بھول گئیں۔

الفت کا اپنے دورِ معلمی میں طالبات کی ہم نصابی سرگرمیوں کی نگران کمیٹی کی رکن ہونے کا تجربہ اس موقع پر خاصا کام آیا۔ اُس کے ذہن میں بچوں کی تفریحِ طبع کے لیے کئی آئٹم محفوظ تھے۔

کیک کٹنگ کی روایتی رسم اور خورد و نوش کے علاوہ ضیافتِ طبع کا اہتمام بھی تھا۔

چھوٹوں اور بڑوں کی مجموعی دلچسپی کے حامل کئی آئٹم شامل پروگرام تھے۔

نئی نسل کے ایک مقبول پاپ سنگر کے علاوہ ایک ایسے کامیڈین کو بھی بلوایا گیا تھا جو بچوں اور بڑوں دونوں کی ضیافتِ طبع کا سامان کرنے میں کمال رکھتا تھا۔

نگین، زرین اور فراز نے تو اپنے دوستوں کو بلایا ہی تھا جلیل الحسن نے بھی اپنے ایسے بہت سے دوستوں کو اس تقریب میں مدعو کر رکھا تھا جن سے ناصرہ بیگم کے جانے کے بعد ربط و ضبط تقریباً ترک ہی ہو گیا تھا۔

یوں گویا یہ تقریب تجدیدِ رسم و راہ کی تقریب بھی تھی۔

الفت نے بھی اپنے میکے سے بہت سوں کو بلایا ہوا تھا۔

اپنے دوستوں میں سے اُس نے رعنا جمیل، اُن کے میاں اور بچوں کو مدعو کیا تھا۔ رعنا کے ننھے منے بیٹے کو دیکھ کر الفت کے دل میں بھی ایک لطیف فطری خواہش انگڑائیاں لینے لگی!

امی اور بابا الفت کو اپنے گھر میں خوش دیکھ کر پھولے نہ سما رہے تھے۔

سب ہی خوش تھے سوائے اعجاز کے جو پنڈال کے ایک گوشے میں منہ بنائے بیٹھا تھا۔ الفت کی نگاہ جتنی دفعہ بھی اُس کی طرف اٹھی اُس نے اُس کی نظروں میں اپنے لیے ناگواری ہی پائی۔

الفت ہی کو کیا اعجاز تو نگین کو بھی گھور رہا تھا۔ اُسے نگین پر جی ہی جی میں سخت غصہ آ رہا تھا۔ جو اپنے دلکش لباس میں ملبوس خاصی مسرور نظر آ رہی تھی۔

ترزین کا حال بھی نگین سے چنداں مختلف نہ تھا۔ بعینہٖ نگین جیسے لباس میں ملبوس وہ اپنی ہم سن سہیلیوں کے جھرمٹ میں کسی خوش رنگ تتلی کی مانند ادھر سے اُدھر پھدکتی پھر رہی تھی۔

فراز اگر بہت خوش نہ تھا تو اعجاز کی طرح افسردہ اور الگ تھلگ بھی نہ بیٹھا تھا۔

تہنیت کی دعوت میں میزبانی کا تجربہ اس تقریب میں الفت کے بہت کام آیا۔

ویسے تو اُس نے ایک ایک مہمان کا بنفسِ نفیس خیال رکھنے کی کوشش کی لیکن تقریب کے آغاز سے اختتام تک بچوں کے دوستوں بالخصوص نگین کی سہیلیوں پر خصوصی التفات رکھا۔

ترزین کی سہیلیوں سے پیار چمکار سے بات کی۔

نگین کی سہیلیوں سے چلتے پھرتے لپکتے جھپکتے باتیں کرتی رہی۔

اُن سے عمر و مراتب کا لحاظ رکھتے ہوئے ہنسی مذاق بھی کیا۔

کسی کے لباس کی تراش خراش کی تعریف کی۔

کسی کی آرائشِ گیسو کی۔

کسی سے کہا "تم ہنستی ہوئی بہت خوبصورت لگتی ہو۔"

کسی کی مسکراہٹ کو مونا لیزا کی مسکراہٹ سے تعبیر کیا۔

کسی سے پوچھا "تم نے اپنی قمیص پر کڑھائی کہاں سے کروائی بہت نفیس ہے؟"

کسی کی جیولری کو سراہا۔

کسی کو ڈیئر کہا کسی کو ڈارلنگ۔

کسی کو بیٹی کسی کو جان۔

اُن میں سے ہر ایک کا فرداً فرداً تعارف حاصل کیا۔

اُن کے مشاغل اور مصروفیات کی بابت استفسار کیا۔

چلتے پھرتے ٹی وی کے فنکاروں اور نئے پُرانے ٹی وی پروگراموں پر خیال آرائیاں بھی ہوئیں۔

اُن کے سامنے نگین کی خوبیوں اور اُس کی تعریفوں کے اونچے اونچے پُل بھی باندھے۔

اور اُن کی موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے نگین سے بے تکلف ہونے کی کوشش بھی کی۔

اُس نے اُن کی خاطر مدارات میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔

الغرض اُس نے نگین کی نوجوان سہیلیوں پر اپنی توجہ کی ایسی یورش رکھی اور اُنھیں اپنی ہی باتوں اور استفسارات میں اس طور اُلجھائے رکھا کہ انھیں نگین سے کوئی الٹی سیدھی بات کرنے یا سوال پوچھنے کی مہلت ہی نہ دی بلکہ باتوں ہی باتوں میں بالواسطہ طور پر یہ بھی جتا دیا کہ دوسروں کے ذاتی معاملات میں مداخلت یا ایسی باتوں کے بارے میں استفسار جو دوسرے بتانا نہ چاہیں کچھ مستحسن بات نہیں ہوتی۔

نگین کی دوستوں کے ساتھ ساتھ اُس نے جلیس الحسن کے دوستوں اور اُن کی بیگمات اور اپنے میکے والوں کی آؤ بھگت میں بھی کسر نہ چھوڑی۔

شام چھ بجے شروع ہوئی تقریب رات ایک بجے کے لگ بھگ اختتام پذیر ہوئی۔ نگین اور ترزین کی بعض دوستوں کو اُن کے گھر بھی پہنچوانا پڑا۔

تقریب کے اختتام تک الفت کی پنڈلیاں اور ایڑیاں بُری طرح دُکھنے لگی تھیں۔ درد کے مارے سر پھٹا جا رہا تھا۔

مگر بُری طرح تھک جانے کے باوجود اُس کی پیشانی پر ایک ہلکی سی شکن بھی نہ تھی۔

وہ خوش تھی کہ سب کچھ بہت اچھی طرح انجام پا گیا تھا۔

خوش تو نگین بھی کچھ کم نہ تھی کہ اُس کی دوستوں نے تقریب کے جملہ انتظامات کو سراہا تھا۔ اُس سے کوئی اُلٹا سیدھا سوال نہ کیا تھا۔ مم کے بارے میں کچھ نہ پوچھا تھا۔

ان سب کی متفقہ رائے یہی تھی کہ:

"تمہاری نئی ممی بہت اچھی ہیں۔"

لالہ رُخ نے جو اُس کی سہیلیوں میں سب سے زیادہ شوخ اور ملبوس تھی کہا تھا "یار نگین! ذرا تم اپنے پاپا سے پوچھ کر بتانا کہ اس قسم کی ممیاں کہاں ملتی ہیں۔ میں بھی اپنے ڈیڈی سے ایک دو منگواؤں گی۔"

نگین کی دوستوں کا جتھا کا جتھا لالہ رُخ کی اس بات پر زعفران زار ہو گیا تھا۔

کھانے کے دوران جب الفت نگین کی ایک ایک سہیلی کی پلیٹ میں ڈشیں ڈالتی اور تکلف سے کام نہ لینے کا اصرار کرتی پھر رہی تھی تو نگین کی دوست ربیکا نے کہا تھا "نگین ڈارلنگ! تم نے اپنی اتنی سوئیٹ سی ممی کو ہم سب سے کیوں چھپا رکھا تھا اب تک؟"

"تاکہ نظر نہ لگ جائے۔" سیما حبیب الدین نے برجستہ کہا۔

رخصت ہوتے سمے اُن سب نے فرداً فرداً الفت سے کہا "آنٹی! آپ ہمارے ہاں آئیے گا۔"

"ضرور آؤں گی بیٹا۔" اُلفت مسکرا مسکرا کر کہتی رہی۔

اُن میں سے بعض نے نگین سے کہا "نگین! تم کسی روز اپنی ممی کو ہمارے گھر لے کر آؤ نا۔"

"اچھی بات ہے آؤں گی۔" نگین کو کہنا پڑا۔

جلیس الحسن کو ایک بڑی تقریب کے بخیر و خوبی انجام پذیر ہونے کی جو خوشی تھی سو تھی اس سے زیادہ خوشی انھیں اس بات کی تھی کہ دورانِ تقریب نگین اور ترزین نے الفت سے خاصی مفاہمت کا مظاہرہ کیا تھا۔ فراز بھی ٹھیک ٹھاک ہی رہا تھا۔

ایک ایک مہمان کو رخصت کرنے اور بچوں کو شب بخیر کہنے کے بعد جب وہ اور الفت خلوت میں آئے تو انھوں نے الفت کو اپنے بازوؤں کے حصار میں لیتے ہوئے کہا "شکریہ۔"

"کس بات کا؟" اُس نے سر اٹھا کر اُن کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میرے بچوں کی خوشی میں خوش ہونے کا۔"

"آپ شاید بھول رہے ہیں کہ" الفت نے شکوہ کُن لہجے میں کہا "وہ صرف آپ کے نہیں میرے بھی بچے ہیں۔"

"تھینک یو.... تھینک یو ویری مچ ڈارلنگ۔" وہ جذبات کی شدت سے بوجھل آواز میں بولے۔

لیکن "حسن لاج" کی بالائی منزل پر رات کے پچھلے پہر اعجاز نگین سے معرکہ آرائی میں مصروف تھا بلکہ نگین ہی کیا وہ تو ترزین اور فراز سے بھی خفا تھا۔

"میں سب دیکھ رہا تھا کیسے دانت نکال نکال کر ہنس رہی تھیں تم اپنی دوستوں کے ساتھ اُس کے سامنے۔" اُس نے نگین سے غصے میں کہا۔

"تو کیا تمہاری طرح مُنہ بسور کر بیٹھی رہتی۔"

"باتیں بھی کی جا رہی تھیں!"

"مجبوری تھی۔"

"اونہہ! مجبوری! ایسی کیا مجبوری آ پڑی تھی؟"

"اب اپنی دوستوں کے سامنے تو میں اُن سے مُنہ پھلا کر بیٹھنے سے رہی تھی۔ وہ اتنی محبت سے بات کر رہی تھیں کہ اگر میری جگہ تم ہوتے تو تم بھی جواب دینے پر مجبور ہو جاتے۔"

"ہاہ!" وہ منہ اوپر کر کے طنزاً ہنسا "محبت سے بات کر رہی تھیں!" اُس نے جلے بھنے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"فار گاڈز سیک جاجی۔" وہ اُس کے لہجے کی چبھن کی تاب نہ لا سکی۔

"اس غلط فہمی میں تم کب سے مبتلا ہو گئیں کہ وہ عورت تم سے محبت سے بھی بات کر سکتی ہے؟"

"جاجی! تم میری بات سمجھنے کے بجائے غصے میں دیوانے ہوئے جا رہے ہو۔"

"ہاں.... ہاں.... میں تو دیوانہ ہوں.... پاگل ہوں.... بے وقوف ہوں۔ اُفوہ! سب کچھ ہوں۔ عقلمند تو بس تم ہی ہو۔" وہ پوری قوت سے کرسی کو لات مار کر اُسے دور گراتے ہوئے بولا۔

"مائی گاڈ!" نگین نے اپنا سر ہاتھوں میں تھام لیا۔

اعجاز نے روئے سخن زرتین کی طرف کیا۔

"اور چھوٹی تم بھی..... ! تم بھی بہت خوش تمیز ہو، ہے نا؟"

زرتین جو اُسے بڑی بہن سے اُلجھتے دیکھ کر سہمی جا رہی تھی اب مزید خوف زدہ ہو گئی۔

"بھائی! میں نے تو کچھ نہیں کیا!" زرتین منمنائی۔

"میں سب دیکھ رہا تھا!"

"اس پر زیادہ رعب جمانے کی ضرورت نہیں کیا سمجھے!" نگین نے زرتین کو اپنی آڑ میں لیتے ہوئے اعجاز کو پھٹکارا۔

"ورنہ کیا بگاڑ لو گی تم میرا؟"

"ظاہر ہے میں کسی پاگل کا کیا بگاڑ سکتی ہوں!"

"اوہ!" اعجاز نے انتہائی ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے حسبِ عادت دیوار پر دو تین مُکّے جما دیے۔

فراز کی بدبختی کہ وہ بھی جائے واردات پر موجود پایا جا رہا تھا۔

"آپ کو بھی دیکھ رہا تھا میں!" اعجاز نے چھوٹے بھائی کو زہرخند نگاہوں سے گھورتے ہوئے کہا۔ "تم بھی بہت چہک رہے تھے!"

"کب بھائی؟" فراز بھونچکا رہ گیا۔

"پارٹی میں اور کب؟"

"سوری بھائی!" فراز کان کھجاتے ہوئے بولا۔

"دانت نکل جاتے ہیں کتنے تمہارے بھی!"

"تو کیا وہ بھی تمہاری طرح بہنوں کی برتھ ڈے میں منہ لٹکائے بیٹھا رہتا!" نگین نے فراز کا دفاع بھی کرنے کی کوشش کی۔

"تم اپنی چونچ بند رکھو میں تم سے بات نہیں کر رہا ہوں!" اعجاز نے نگین پر آنکھیں نکالیں۔

"تم چھوٹے بہن بھائیوں کو ڈانٹنے اور ڈرانے دھمکانے کی کوشش کرو گے تو میں ضرور بولوں گی!" نگین بھی مقابلے پر اُتر آئی۔

"میں اُن کو ڈانٹ سکتا ہوں کیونکہ میں اُن کا بڑا بھائی ہوں!"

"میں انہیں تمہاری ڈانٹ پھٹکار سے بچانے کے لیے اُن کا دفاع کر سکتی ہوں کیونکہ میں اُن کی بڑی بہن ہوں!"

"بڑی آئیں کہیں سے بڑی بہن!"

"اور تم بھی بڑے آئے کہیں سے بڑے بھائی!"

اُن کے مابین معرکہ اپنا روایتی روپ دھارنے لگا۔

"تم بہت بدتمیز ہو!" نگین نے کہا۔

"اور تم بھی کچھ کم نہیں!"

"بکواس بند کرو!"

"یو شٹ اپ!"

نگین آگے بڑھی، میز پر سے الفت کے انبار سے وہ دو تحائف نکالے جن میں سے ایک اعجاز نے اُسے دیا تھا اور دوسرا زرتین کو۔ زرتین کا تحفہ اُس نے زرتین کو تھمایا اور اپنا اعجاز کی طرف اُچھالتے ہوئے غصے سے بولی۔ "یہ لو، نہیں چاہیے مجھے تمہارا گفٹ!" پھر زرتین سے بولی۔ "چھوٹی تم بھی واپس کر دو اسے اپنا گفٹ!"

"اسے مت بہکاؤ!" اعجاز دہاڑا۔

"بہکاؤں گی۔ بہکاؤں گی۔ بہکاؤں گی!" نگین نے ایک سانس میں کہا۔

زرتین نے اپنا تحفہ اعجاز کی طرف بڑھا دیا۔

اعجاز نے اُسے غصے سے گھورا اور بولا۔ "ڈونٹ بی سلی!"

زرتین رونے لگی کہ یہ اُس کا آزمودہ نسخہ تھا!

"دیکھا رُلا دیا نا اُسے!" نگین نے دانت پیسے۔

"میں نے یا تم نے!"

"میں نے..... کیا میں نے رُلایا ہے اسے؟" نگین نے اعجاز کو گھورا۔

"اور نہیں تو کیا!"

"میں نے کیوں رُلایا ہوتا!"

"گفٹ واپس کرنے کو جو کہا اس سے!"

"تو کیا وہ اس لیے رو رہی ہے؟"

"اور نہیں تو کیا..... کتنے دنوں سے کہہ رہی تھی کہ بھائی! برتھ ڈے پر مجھے واکی ٹاکی لاکر دیجیے گا!"

"ہائے تو کیا تم نے اسے واکی ٹاکی گفٹ کیا تھا؟" نگین نے آنکھیں پھیلاتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں!"

"اور مجھے؟"

"امپورٹڈ جیولری!"

"بے ایمان! کتنے آرام سے میرا گفٹ واپس لے لیا۔ دے دو گے اپنی کسی گرل فرینڈ کو ہے نا؟ لاؤ..... لاؤ میرا گفٹ واپس کرو مجھے..... اور چھوٹی کا چھوٹی کو..... بے ایمان لڑکے! ہم نے تو سوچا تھا کل آرام سے اپنے سارے گفٹس کھول کر دیکھیں گے۔ کتنے آرام سے واپس رکھ لیے تم نے ہمارے گفٹس۔ فوراً واپس کرو!"

یوں اُن کا جھگڑا تو حسبِ روایت ہی اختتام کو پہنچا مگر اعجاز کو اُن سے جو شکایت اور خفگی تھی سو برقرار رہی۔

وہ کسی قیمت پر نہ تو خود الفت سے مفاہمت کرنا چاہتا تھا نہ اپنے بھائی بہنوں کو اس سے مفاہمت کرتے دیکھنا چاہتا تھا۔

غالباً وہ اس گھر میں الفت کا سب سے بڑا اور آخری حریف ثابت ہونے کے درپے تھا!

بسا اوقات انسان کی زندگی کے بعض یادگار دن دبے پاؤں آتے ہیں اور اُس کی راہوں میں پھول بکھیرتے چلے جاتے ہیں۔

وہ بھی کچھ ایسا ہی دن تھا۔

الفت کو یاد تو تھا، مگر وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ کوئی اور بھی اُنتیس مئی کو یاد رکھے ہوئے تھا یا نہیں؟

صبح آنکھ کھلتے ہی اُسے ٹھیک ایک برس پہلے کا یہی دن یاد آیا تھا۔

اس روز کتنی دلگیر اور بے کل تھی وہ!

بے یقینی کا عفریت اُس کے دل کو مٹھی میں دبوچے لیتا تھا۔

مستقبل کس قدر مبہم نظر آتا تھا!

وہ دن بھر چپکے چپکے روتی رہی تھی۔

عظمت آپا اور بھابی جان بار بار اُسے کسی چھوٹی سی بچی کی طرح پیار کرتیں، چمکارتیں اور سمجھاتی بجھاتی رہی تھیں۔ "بس یہ آج ہی آج کا رونا ہے میری جان!" بھابی نے کہا تھا۔ "کل جب وہاں سے یہاں آؤ گی تو کہو گی بس بھئی مجھے تو اب اپنے گھر جانا ہے۔ یہاں میرا جی نہیں لگتا!..... کیوں عظمت! میں ٹھیک کہہ رہی ہوں کہ نہیں؟"

عظمت آپا ایک لمبی سانس لے کر بیٹھ گئیں۔

"بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔ سچ کہتی ہوں عجیب رشتہ ہوتا ہے عورت اور اُس کے گھر کے بیچ کہ شادی کے بعد کہیں اور جی ہی نہیں لگتا کہیں چلے جاؤ کتنی ہی دور کیوں نہ نکل جاؤ قدم اپنے گھر ہی کی طرف لوٹتے ہیں!"

"بھئی میرا یہ حال ہے کہ امی کے ہاں چلی تو جاتی ہوں مگر گھنٹہ دو گھنٹے یا حد سے حد صبح سے شام ہوئی کہ مجھے خفقان ہونے لگتا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ بس اپنے گھر لوٹو!" بھابی جان بولیں۔ "کبھی روز مائے باندھے امی ایک آدھ رات کو روک لیں تو نیند نہیں آتی ہے مجھے وہاں اور جب امی سے کہو تو وہ کہتی ہیں لو کیا پہلے نہیں سوتی تھیں تم اس گھر میں! اب کیا کہوں میں امی سے کہ امی جان اپنا گھر اپنا ہی ہوتا ہے!"

"واقعی!" عظمت آپا نے تائید کی۔

"تو پھر جانِ الفت گھبراؤ مت تمہارا بھی یہی حال ہونے جا رہا ہے۔" بھابی نے کہا تھا۔
خیر اگلے ہی روز تو اُس کا یہ حال نہ ہوا تھا۔
بلکہ وہ تو اپنے گھر میں بولائی بولائی رہی تھی۔
پھر درمیان میں ایک زبردست بحران نے اُسے آ لیا تھا۔

اور تب اُسے اپنے گھر کی اہمیت کا احساس ہوا تھا۔
مگر آج اُسے اپنے گھر سے ویسا ہی پیار ہو چکا تھا جس کا تذکرہ ٹھیک ایک برس پہلے عظمت آپا اور بھابی جان اُس کے سامنے کر رہی تھیں۔

واقعی اپنا گھر اپنا ہی ہوتا ہے۔
اپنے گھر سے محبت کا نشہ اس کی رگوں میں سرایت کر چکا تھا۔
گھر پیا کا گھر کیسا بامعنی فقرہ ہے۔
الفت کو اپنے گھر سے ایسی محبت ہو چکی تھی کہ اب کئی کئی دن تک امی کے ہاں جانے کا خیال نہ آتا تھا۔
بس فون ہی پر بات ہوتی رہتی۔ پھر جلیس الحسن خود ہی کہتے "کیا بات ہے بھئی امی کے گھر کو بالکل ہی بھلا دیا ہے کیا؟ چلو جلدی سے تیار ہو جاؤ۔"
وہ امی کے ہاں جتنی دیر بھی رہتی اُس کا دھیان گھر ہی میں پڑا رہتا۔
عظمت آپا نے سچ ہی کہا تھا کہ
"عجیب رشتہ ہوتا ہے عورت اور اُس کے گھر کے بیچ کہ شادی کے بعد کہیں اور جی ہی نہیں لگتا کہیں چلے جاؤ کتنی ہی دلچسپیاں نہ کھل جاؤ قدم اپنے گھر ہی کی طرف لوٹتے ہیں۔"
اس روز صبح آنکھ کھلتے ہی اُسے پہلا خیال یہی آیا تھا کہ اس گھر میں آئے اُسے ایک برس ہو چکا تھا۔ اس ایک برس میں اُس نے کیسے کیسے نشیب و فراز دیکھے تھے۔
کتنی کٹھنائیوں سے گزری تھی!

شروع شروع اسے اس گھر میں اپنے قدموں تلے زمین ساگر کنارے بھی ریت کی طرح بے بھرم سی لگا کرتی تھی مگر اب بے یقینی کی وہ کیفیت نہ تھی۔

شاید اسی لیے وہ متوحش ہونے کے بجائے بڑی استقامت سے یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ اس کی نسبت سے اس دن کی اہمیت کو کون یاد رکھتا ہے؟
جونہی وہ بستر سے اٹھی اُس کی نظر سائیڈ بورڈ پر دھرے ایک دلکش تہنیت نامے پر پڑی جس کے قریب ہی ایک نقرئی ڈبا دھرا تھا۔
"ہیپی انیورسری" تہنیت نامہ اپنی بے زبانی کے باوجود کہہ رہا تھا۔
بلاشبہ یہ تہنیت نامہ جلیس الحسن کی جانب سے تھا۔
مگر وہ تو یہی سوچ کر حیران ہو رہی تھی کہ اسے انھوں نے اس کے سرہانے آراستہ کس وقت کیا تھا کیونکہ اُن کے سونے تک تو وہ جاگ رہی تھی۔

اُس نے تہنیت نامہ اُٹھا کر کھولا۔

اندر لکھا تھا:

جاناں!

شادی کی پہلی سالگرہ مبارک ہو۔

نیک تمناؤں کے ساتھ

تمہارا اپنا

جلیس

اس تہنیت نامے کے ساتھ دھری نقرئی ڈبیا کھولی تو اس میں لاکٹ اور انگوٹھی پر مشتمل ہیروں کا ایک

سیٹ جگمگا رہا تھا۔
اور اُس قدر اہتمام سے یاد رکھا تھا انھوں نے یہ دن!
جبکہ اُس نے تو کوئی اہتمام نہ کیا تھا۔
اس لیے نہیں کہ وہ اہتمام کرنا نہیں چاہتی تھی۔
بلکہ اُسے خدشہ تھا کہ انھیں اس دن کی اہمیت یاد نہ رہی ہو گی۔ اگر وہ کوئی اہتمام کرے گی تو انھیں احساسِ خفت ہو گا۔
مگر انھوں نے تو اُلٹا اسی کو شرمندہ کر دیا تھا!
اور اب وہ ہراساں تھی کہ کیا کرے۔
ابھی وہ کوئی تدبیر نہ کر پائی تھی کہ وہ جاگ گئے اور انھوں نے مسکرا کر کہا "شادی کی پہلی سالگرہ مبارک۔"
"آپ کو بھی۔"
"تحفہ پسند آیا؟" انھوں نے اُس کے ہاتھ میں ڈبا دیکھتے ہوئے کہا۔
"بہت!"
انھوں نے بستر سے اُٹھ کر اُسے اپنے بازوؤں کے حصار میں لے لیا۔
"آئی لَو یو ڈارلنگ۔" وہ دھیرے سے بولے۔
"آئی لَو یو ٹو۔" اُس نے اپنا سر اُن کے سینے سے ٹکا دیا۔
"آج شام تم میری طرف سے ریوالونگ ریسٹورنٹ میں مدعو ہو۔" وہ بولے۔
"اور بچے؟" اُس نے سر اُٹھا کر اُن کی طرف دیکھا۔
"صرف ہم دونوں ہوں گے اور کوئی نہیں۔"
وہ چند لمحوں تک ٹکٹکی باندھے انھیں دیکھتی رہی۔ پھر اُن کی نگاہوں کی تاب نہ لا کر بولی "جیسے آپ کی مرضی۔"
لیکن سرِ شام امی، ابا، بھیا اور بھابی لدے پھندے آ پہنچے!
پھر عظمت آپا اور اُن کے دو لفانے بچوں سمیت آ گئے!!
اُن کے بعد تہنیت اور نبیل!!!
اور پھر فضیلت اور اُس کے دولہا!!!!
بیٹھے بٹھائے ایک چھوٹا سا جشن ہو گیا جس میں نگہت، ذہین اور فراز بھی شریک ہوئے۔
شام ڈھلے نیلم اور بختیار ہمدانی بھی اس جشن میں آ شامل ہوئے۔
ان سب کے جاتے جاتے رات ہو گئی اور ریوالونگ ریسٹورنٹ والا پروگرام نشستند ہی رہ گیا۔
مہمانوں سے نمٹ کر اور بچوں کو شب بخیر کہنے کے بعد جب جلیس الحسن اپنے کمرے میں آئے تو بولے۔
"ایسا روفینٹک پروگرام بنایا تھا دھرا کا دھرا رہ گیا۔"
الفت مسکرا دی۔
"بچوں سے یہ ایمانی راس آ سکتی تھی بھلا۔" اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"بہرحال ہماری خوشی میں سب شامل ہو گئے۔"
"مجھے یقین نہ تھا کہ سب لوگ اس دن کو اتنی محبت سے یاد رکھیں گے۔" الفت جذبات سے بوجھل آواز میں بولی۔
"ہاں، مجھے بھی گمان نہ تھا۔"
"مجھے آپ سے معذرت کرنی ہے۔"
"کیسی معذرت؟"
"کہ میں آپ کو کوئی چھوٹا سا گفٹ بھی نہ دے سکی۔"
"میرے لیے اس سے بڑا گفٹ کیا ہو سکتا ہے الفت کہ تم نے مجھے خوشی دی ہے اطمینان دیا ہے۔"
الفت کو یوں لگا جیسے اُس کا وجود ہلکی ہلکی پھوار میں بھیگتا چلا جا رہا ہو۔
"اور یہ آپ کا دیا ہوا تحفہ سب کو پسند آیا۔" اُس نے اپنے کانوں کی لو پر جگمگاتے ٹاپس کو چھوتے ہوئے کہا۔
"شادی کی پہلی سالگرہ پر تحفہ تو میں نے سیٹ ہی دیا تھا مگر سونے کا۔"

الفت دم بخود رہ گئی۔
یہ کیسے نازک لمحوں میں انھوں نے عاصمہ کا ذکر چھیڑ دیا تھا۔
کاش! اُن کی زبان اس نام سے ناآشنا ہوتی۔

الفت سے نگین کی استواری مراسم بتدریج اُس کی مستقل ضرورت بلکہ شاید مجبوری بن گئی۔

ماں کے جانے کے بعد نگین کی شخصیت میں سب سے بڑی تبدیلی تو یہ رونما ہوئی تھی کہ وہ باپ بیٹے خود کو سب بڑا و ساعجاز کی بھی فراز اور زرین کی گویا بزرگ گردانے لگی تھی۔ نہ جانے کن چور دروازوں سے اُس کے دل میں چھوٹے بہن بھائی کے لیے ممتا کا دریا امڈ آیا تھا وہ خود کو ان کی بہن سمجھنے کے بجائے اُن کی ماں سمجھنے لگی تھی۔

دوسرے یہ کہ ماں کے جانے کے بعد اُسے لوگوں کی نگاہوں اور اُن کی زبانوں سے خوف آنے لگا تھا۔ کیا جانے کون کس وقت کیا کہہ بیٹھے۔ اُس نے خود کو ایک خول میں محصور کر لیا تھا اور اپنی دوستوں سے بھی دُور ہو گئی تھی۔

الفت نے اس کا اعتماد بحال کیا۔

لوگوں کی نگاہوں اور زبانوں کا خوف اُس کے دل سے زائل کیا۔

اور اُسے احساس دلایا کہ بہن بھائیوں سے محبت کے معاملے میں اُس کا رویہ معقول ہونا چاہیے۔ اگر وہ ان کی بزرگ بننے کی کوشش کرے گی تو زندگی کی بہت سی ایسی خوشیوں سے محروم رہ جائے گی جن پر اس کا حق بنتا ہے۔ منقطع روابط بحال ہو گئے تھے۔

جلیس الحسن کے احباب اور بچوں کے دوستوں نے "حسن لاج" میں پھر ویسے ہی آنا جانا شروع کر دیا تھا جیسے کہ وہ عاصمہ بیگم کے زمانے میں آیا جایا کرتے تھے۔ الفت اُن کی ایسی پذیرائی کرتی کہ وہ اس کا کلمہ پڑھتے واپس لوٹتے۔

نگین کی سہیلیوں کے ساتھ تو اُس نے ایسا دوستانہ رویہ روا رکھا تھا کہ وہ تو نگین کے سامنے اُس کی تعریفیں کرتی نہ تھکتی تھیں۔

کبھی ایک سہیلی اپنی ممی کو اُس سے ملوانے کے لیے چلی آتی کبھی دوسری۔

آئے دن نگین کو اپنی سہیلیوں کی جانب سے دعوت نامے ملنے لگے۔

کبھی کسی سہیلی نے اپنے جنم دن کی تقریب میں شرکت کا بلاوا تو کبھی۔۔۔ کسی کی بہن کی منگنی یا شادی کی دعوت۔

کوئی اپنے بھائی کے ولیمے میں بلا رہی ہے تو کوئی بھتیجے کے عقیقے میں۔

کبھی کسی پکنک میں شرکت کی پُرزور دعوت تو کبھی لالہ رُخ جیسی امیر کبیر باپ کی بیٹی کی جانب سے مضافات میں واقع فارم پر چلنے کا اصرار۔

الغرض نگین کی دوستوں میں الفت کی خاصی شہرت ہو گئی اور الفت سے مزید بے تکلفی اختیار کرنا نگین کی ضرورت اور مجبوری بن گئی۔

چونکہ فراز اور زرین دونوں ہی نگین کے زیرِ اثر زیادہ تھے اس لیے الفت کے ساتھ نگین کے بدلے ہوئے طرزِ عمل کا انھوں نے براہِ راست اثر قبول کیا۔

فراز نے الفت سے نامہ کار طور نزاعت کرنے اور نگین کے ایما پر الفت کے ساتھ تمیز سے پیش آنے لگا تھا۔ زرین نے الفت کی نقالی کر کے بہن بھائیوں کو محظوظ کرنا ترک کر دیا تھا اور فراز کی طرح وہ بھی الفت کے ساتھ تمیز داری کا مظاہرہ کرنے لگی تھی۔

گھر میں بتدریج ایک نمایاں اور خوشگوار تبدیلی ظہور پذیر ہوتی چلی جا رہی تھی۔

نگین کے امتحانات ختم ہو چکے تھے۔

اعجاز کو تو امتحانات سے فراغت پا کر گھر بیٹھے ڈھائی ماہ سے زائد عرصہ ہونے کو آیا تھا معتبر ذرائع کے مطابق ابھی اس کا نتیجہ آنے میں کم از کم ڈیڑھ ماہ اور درکار تھا۔

فراز اور زرین کی موسم گرما کی تعطیلات شروع ہوئیں تو جلیس الحسن نے ایک رات الفت سے کہا۔

"تمہارا ایک قرض ہے مجھ پر بچوں کی چھٹیاں ہیں موقع غنیمت ہے تمہارا قرض نہ اتار دیا جائے؟"

"کیسا قرض؟" الفت نے حیرانی سے پوچھا۔

"ہنی مون؟"

"اوہ! رہنے بھی دیجیے۔" الفت نے محجوب ہو کر کہا۔ "اب برس بھر بعد آپ کو ہنی مون کا خیال کیوں آیا؟"

"کیونکہ اب ہنی مون منانے کا موڈ ہو رہا ہے۔" وہ معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔

الفت گلنار ہو گئی۔

"کام کر کر کے تھک گیا ہوں اور پچھلے دو ڈھائی برس کے دوران اتنا اپ سیٹ رہا ہوں کہ اب ایک ڈیڑھ ماہ کو آرام اور تفریح کرنا چاہتا ہوں۔" انھوں نے اپنا سر الفت کے زانو پر رکھتے ہوئے کہا۔

"تفریح کے لیے جائیں گے کہاں؟" الفت نے اُن کے بالوں میں انگلیاں گھماتے ہوئے پوچھا۔

"تم کہاں جانا چاہو گی؟" وہ اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام کر بولے۔

"جہاں آپ لے جائیں۔"

"یورپ چلو گی؟"

اُسے ایک خوشگوار حیرانی نے آ لیا۔

وہ تو زیادہ سے زیادہ مری اور سوات تک ہی جانے کا سوچ سکتی تھی کیونکہ وہ ایسا ایسے ہی متوسط گھرانے سے جلیس الحسن کی منکوحہ بن کر "حسن لاج" میں آئی تھی جہاں رہنے والی دوشیزائیں شادی کے بعد ہنی مون کے لیے زیادہ سے زیادہ سوات، مری، کاغان یا کشمیر ہی جانے کا تصور کر سکتی ہیں۔ یورپ اس کے گمان سے بہت باہر تھا۔

"بولو یورپ چلنا ہے؟"

"بہت دُور نہ ہو گا اور۔۔۔۔۔۔؟"

"ہاں اور کیا؟"

"بہت مہنگا بھی۔ ہم چار افراد ہوں گے بہت اخراجات ہو جائیں گے۔"

وہ یوں مسکرا دیے جیسے اُس نے کوئی احمقانہ یا بچگانہ سی بات کہہ دی ہو۔

"جانِ من! نہ دُوری کو خاطر میں لاؤ نہ اخراجات کو۔۔۔۔ کتنا اندھیرے یہاں سے نکلیں گے شب کو یورپ میں ہوں گے۔ رہی اخراجات کی بات تو بندہ پیسہ کماتا کس کے لیے ہے؟ اپنے بیوی بچوں ہی کے لیے تو۔" انھوں نے توقف کیا پھر بولے۔ "تمہاری جگہ اگر عاصمہ ہوتی تو فوراً کہتی کل کے چلتے آج ہی چلیے۔ ہر دوسرے برس وہ یورپ کی سیر کی فرمائش کیا کرتی تھی اور میں لے بھی جایا کرتا تھا۔"

عاصمہ کے ذکر پر الفت ہمیشہ کی طرح دم بخود رہ گئی تھی۔

کسی بھی سبب سے سہی اُس نے عاصمہ کے بچوں کو تو قبول کر لیا تھا مگر جلیس الحسن کی زبان سے کسی بھی حوالے سے عاصمہ کا نام سُن کر اُس کے رگ و پے میں آگ سی دوڑ جایا کرتی تھی۔

گو اُس نے حالات سے مفاہمت تو کر لی تھی مگر اُس کے دل میں یہ خدشہ ہنوز کنڈلی مارے بیٹھا تھا کہ عاصمہ اس گھر میں کبھی بھی واپس آ سکتی تھی کیونکہ اس گھر میں اُس کے بچے تھے جن سے اُس کا ناتا بدستور برقرار تھا۔

"بچوں کے پاسپورٹ تو موجود ہیں تمہارے ارجنٹ پاسپورٹ کی درخواست ایک آدھ روز میں جمع کروائے دیتا ہوں۔۔۔۔ ہاں کل پہلی فرصت میں تمہاری تصویریں کھنچوانی ہیں پاسپورٹ کے لیے۔۔۔۔ ٹھیک ہے؟"

مگر وہ تو خدا جانے کہاں پہنچی ہوئی تھی۔

"کس سوچ میں پڑی ہوئی ہو؟"

"آں۔۔۔۔ جی۔۔۔۔ جی کچھ نہیں۔"

"یورپ ان دنوں اپنے جوبن پر ہو گا۔ وہاں کے حساب سے ہمیں بہترین موسم ملے گا لیکن یہاں کے حساب سے قدرے

ٹھنڈک ہوگی..... مجھے یقین ہے تمہیں یورپ پسند آئے گا۔ زیادہ سے زیادہ دس بارہ روز میں ہم یہاں سے نکل لیں گے۔ بچوں کی تعطیلات ختم ہونے تک واپس آسکیں۔ تم کل ہی سے تیاریاں شروع کردو۔ گرم کپڑے بھی ساتھ لینے ہوں گے۔ ہاں یہ بتاؤ بچوں کے ہوم ورک کا کیا ہوگا؟"

"اس کی آپ فکر نہ کریں' وہ ہوجائے گا۔"

"کب جانے سے پہلے یا واپس آنے کے بعد؟ یا اُن کے اسکول بیگ سامان سفر میں شامل کرنے پڑیں گے۔ ماسیو جانے سے پہلے سارا ہوم ورک کروا لیا کرلی تھی۔" انھوں نے اُن بات کی۔

پھروہی تذکرۂ رقیب روسیاہ۔

اُسے اپنی رگوں میں خون کی جگہ آگ گردش کرتی محسوس ہونے لگی۔ مگر اس نے بڑے تحمل سے کہا "اب بھی جانے سے پہلے ہی ہوم ورک ختم کرکے جائیں گے۔ وہاں سیر و تفریح کے لیے جائیں گے۔ میں سمجھتی ہوں اسکول بیگز کا لے جانا عبث ہوگا۔ ایسا ہی ہے تو چند کتابیں ساتھ لے لیں گے یا کاپیاں جن میں سے کچھ یاد کرنے کا کام کیا جاسکے۔"

"کیا تمہارے خیال میں آئندہ آٹھ دس روز میں تینوں بچے انھیں کام ختم کرا سکے گا؟"

"وہ کروا سکیں یا نہ کروا سکیں میں بہرحال انھیں ہوم ورک کروا دوں گی۔"

"پکی بات؟"

"جی بالکل پکی۔"

"شاباش ہے تو کل صبح ناشتے پر میں انھیں یہ خبر سنانے جارہا ہوں کہ اس مرتبہ وہ اپنی تعطیلات یورپ میں گزارنے جارہے ہیں۔"

"بہتر۔"

اور اگلی صبح جب جلیس الحسن نے ناشتے کے دوران بچوں کو یہ خبر سنائی تو اعجاز سمیت چاروں ہی خوشی سے اُچھل پڑے۔ تاہم اعجاز نے ناشتے کی میز پر الفت کی موجودگی کے سبب اظہار مسرت میں باقی تینوں کی نسبت انتہائی ضبط و برداشت سے کام لیا۔

"رئیلی؟" نگین کی آنکھیں فرطِ مسرت سے دمک رہی تھیں۔

"ہاں بیٹے۔"

"مگر ایک شرط بھی ہے تمہارے پاپا نے۔" الفت بولی۔

"وہ کیا؟" نگین نے بے ساختہ پوچھا۔

اعجاز نے الفت کی مداخلت پر قدرے منہ بنا کر اپنی ناگواری کا اظہار کیا۔

"کہ فراز اور زرتاشین کو جانے سے پہلے اپنا ہوم ورک ختم کرنا ہوگا۔"

"اور ہم جا کب رہے ہیں؟"

"دس بارہ دن کے اندر اندر۔"

"پھر تو پرابلم ہوجائے گی۔ ہوم ورک تو ان لوگوں کو بہت سارا ملا ہے' اُن کے ماسٹر صاحب تو صرف ایک گھنٹہ پڑھاتے ہیں۔"

"کوئی بات نہیں میں انھیں روزانہ چار گھنٹے پڑھانے کو تیار ہوں اور زیادہ سے زیادہ ایک ہفتے میں ان کا سارا ہوم ورک ختم کروانے کا ذمہ لیتی ہوں بشرطیکہ یہ دونوں مجھ سے پڑھنے میں اور ہوم ورک کے سلسلے میں میرے ساتھ تعاون کرنے پر آمادہ ہوں۔ تھوڑی سی مدد مجھے تمہاری بھی درکار ہوگی۔"

"یورپ جانے کی خاطر تو میں تھوڑی نہیں بہت سی مدد کو تیار ہوں۔" یہ کہتے ہوئے نگین کی نگاہ غیر اختیاری طور پر اعجاز کی جانب اُٹھ گئی۔

وہ اُسے غصے سے گھورتے ہوئے منہ بنا رہا تھا۔

"پہلے ان دونوں سے تو پوچھ لو کہ یہ مجھ سے پڑھیں گے یا نہیں؟" الفت مسکرا کر بولی۔

"اگر انھیں ہمارے ساتھ جانا ہوگا تو ضرور پڑھیں گے۔" نگین نے کہا۔

"پھر بھی پوچھ لینے میں کیا حرج ہے؟"

"ٹھیک ہے پوچھ لیتی ہوں۔" نگین نے کہا پھر فراز اور زرتاشین کو دیکھتے ہوئے بولی "کیوں بھئی پڑھو گے نا تم؟"

"یہ تو بتاؤ بیٹی انھیں کس سے؟" جلیس الحسن نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے نگین کو ایک عجیب سی مشکل میں ڈال دیا۔

اگرچہ الفت سے ان تینوں کے خوشگوار تعلقات استوار ہوچکے تھے مگر جلیس الحسن نے دیکھا تھا کہ الفت سے بات کرتے ہوئے ان تینوں میں سے کوئی بھی اُسے ممّا یا اسی قبیل کے کسی لفظ سے مخاطب نہ کرتا تھا بلکہ لفظ "آپ" سے کام چلایا کرتے تھے۔

بار بار یہ بات نوٹ کرنے کے بعد جلیس الحسن نے نگین کا بڑے موقع سے آڑے ہاتھوں گھیراؤ کر ڈالا۔

نگین کی حالت دیدنی تھی۔

وہ ایک لفظ گویا اُس کے حلق میں اٹکا جارہا تھا۔

اور جلیس الحسن اُس کی زبان سے وہ لفظ ادا کروانے کے درپے تھے۔

"بیٹا بتاؤ انھیں کس سے پڑھنا ہوگا؟"

"ماما سے۔" نگین نے بمشکل تمام کہا۔

"جی پڑھیں گے۔" زرتاشین نے ہامی بھرلی۔

"اور فراز میاں آپ؟ آپ کی کیا مرضی ہے؟" جلیس الحسن نے پوچھا۔

فراز جس نے اعجاز کے تنبیہی تیوروں سے ڈر کر نظریں جھکا رکھی تھیں دھیرے سے بولا "جی پڑھوں گا۔"

"گڈ۔" جلیس الحسن نے اعجاز کو خوردیدہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے فراز کی پیٹھ تھپک رہا۔ وہ الفت سے اپنے تین بچوں کی مفاہمت کے بعد انتہائی مطمئن اور مسرور تھے اور اعجاز کی بابت ہنوز اسی پالیسی پر عمل پیرا رہنے کے حق میں تھے کہ اُسے زبردستی نہ جھکایا جائے بلکہ ایسے حالات پیدا کیے جائیں کہ وہ آپ ہی آپ مفاہمت پر آمادہ ہوجائے۔

وہ اعجاز کے چہرے سے ہویدا ناگواری کو خوردیدہ نگاہوں سے دیکھ تو رہے تھے مگر اس ضمن میں انھیں زیادہ تشویش ہرگز نہ تھی۔ تینوں بچوں سے الفت کے خوشگوار تعلقات قائم ہوجانے کے بعد انھیں امید تھی کہ آج نہیں تو کل اعجاز بھی سپر ڈال دے گا بشرطیکہ الفت کے قدم نہ ڈگمگائے۔

اس سلسلے میں اُن کے تشویش میں نہ پڑنے کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ وہ جانتے تھے کہ اعجاز اپنے پیچھے بر تاو دھرنے دے یا نہ دے کھونٹے سے رسی تڑا کر بھاگ جانے کی جسارت کبھی نہ کرپائے گا کیونکہ جتنی پُرآسائش زندگی وہ ان کے بیٹے کی حیثیت سے بسر کر رہا تھا اتنی اور کہاں اور کس حیثیت سے بسر کرسکتا تھا؟ اور جیسے درخشاں مستقبل کا یقین وہ دلا سکتے تھے اور کون دلا سکتا تھا؟

سارے کام نمٹائے ہوتے چلے گئے۔

الفت کا پاسپورٹ بھی بن گیا۔

سب کے پاسپورٹوں پر ویزا کا اندراج بھی ہوگیا۔

سفر کے لیے جہاز کے ٹکٹ بھی آگئے۔

فراز اور زرتاشین نے الفت اور نگین کی باہمی نگرانی میں لگاتار کئی کئی گھنٹے کام کرکے اپنا ہوم ورک بھی ختم کرلیا۔ نگین کی مدد سے الفت نے رختِ سفر تیار کرلیا اور جلیس الحسن کی ہدایت کے بموجب ہر ایک کے لیے گرم کپڑے بھی ہمراہ لے جانے کو اسبابِ سفر میں شامل کرلیے۔

جلیس الحسن روانگی سے ایک روز قبل تک اپنے دفتر میں خاصا ضروری کام نمٹا دینے میں مصروف رہے۔

پھر روانگی کی صبح آپہنچی۔

امی اور ابا سے تو وہ گزشتہ رات جلیس الحسن کے ساتھ جاکر مل آئی تھی۔ نگین فراز اور زرتاشین بھی ہمراہ تھے۔ امی اور ابا بہت خوش ہوئے۔ صبح انھیں رخصت کرنے کے لیے ایئرپورٹ آنے کا ارادہ بھی ظاہر کیا مگر اس نے انھیں اس خیال سے منع کردیا کہ ناحق زحمت ہوگی۔

بھابی اور بھیا سے بھی ملاقات رہی تھی۔

عظمت آپا۔ فضیلت اور تہذیب سے گزشتہ روز تو ملاقات نہ ہوئی تھی البتہ دو روز قبل وہ اُن سب سے مل آئی

تھی گزشتہ رات صرف فون ہی پر بات ہو سکی تھی ان تینوں کے گھر پر۔

لیکن اگلی صبح تین بجے کے لگ بھگ جب وہ جلیس الحسن اور بچوں کے ہمراہ یورپ روانگی کے لیے ائیرپورٹ پہنچی تو تینوں بہنیں معہ اپنے شوہروں کے بھتیا، بھابی اور بابا انھیں رخصت کرنے آئے ہوئے تھے۔

وہ خوش تو تھی

مگر خوشی کا مظاہرہ زیادہ کر رہی تھی۔

بہنیں اور بھاوج اُسے رشک سے دیکھ رہی تھیں۔

اُس نے جلیس کی قرض اتارنے والی بات اُن سب کو دانستہ سنائی۔

ڈیپارچر لاؤنج کے باہر بابا نے اُس کے سر پر ہاتھ دھرتے ہوئے کہا "بیٹی! بہت خوش ہوں میں تمہیں خوش دیکھ کر۔"

بابا کی یہ بات جہاز تک میں اُس کے ساتھ در آئی۔

جب چاق و چوبند فضائی میزبان خواتین مسافروں کو صبح کا ناشتہ کروا چکیں تو..... نگین اور اعجاز موسیقی سے لطف اندوز ہونے لگے اور فراز اور نزین ٹی وی اسکرین پر فلم دیکھنے میں مصروف ہو گئے جلیس الحسن اُس سے کچھ دیر باتیں کرتے رہے پھر رات بھر کی جگائی کا حساب بے باق کرنے کو انھوں نے آنکھیں موند لیں اور الفت کو جہاز کی بند کھڑکی کے شیشے سے باہر بادلوں کے سمندر کو دیکھتے ہوئے بے اختیار بابا کی بات یاد آ گئی۔

"بیٹی! بہت خوش ہوں میں تمہیں خوش دیکھ کر۔"

اُس کی آنکھوں کے کنارے بھیگ گئے۔

"اوہ بابا! آپ سب لوگ تو یہی سمجھتے ہیں کہ میں بہت خوش ہوں۔" اُس نے جی ہی جی میں کہا۔ "مگر سچ یہ ہے کہ میں اتنی خوش ہرگز نہیں ہوں جتنی کہ آپ سب کو دکھائی دینے کی کوشش کرتی ہوں..... یہ زندگی جو میں ان دنوں گزار رہی ہوں مفاہمت اور سمجھوتے کی زندگی ہے۔ بہت سی کڑوی حقیقتوں کا مزہ چکھنے کے بعد میں نے حالات سے سمجھوتا کر لیا ہے..... مگر بڑی منافقانہ زندگی بسر کر رہی ہوں میں ان دنوں..... جلیس کے بچے آج بھی مجھے برے لگتے ہیں مگر اپنی باطنی کیفیت کو ضبط اور منافقت کی بھاری سل تلے دبا کر میں بظاہر اُن سے محبت کا مظاہرہ کرتی ہوں..... میرا دل انھیں مخاطبات سنا رہا ہوتا ہے مگر زبان سے میں پھول جھاڑنے کی کوشش کر رہی ہوتی ہوں۔ میرے دل میں اُن کے لیے لاوا پک رہا ہوتا ہے مگر اپنی آنکھوں سے میں انھیں پیار و محبت پلانے کی کوشش کیا کرتی ہوں..... اُن کے خلاف اپنے دل میں بسی نفرت کو دبا کر میں انھیں یوں محبت سے دیکھنے کی اداکاری کرتی ہوں جیسے میرے لیے جانِ جہاں وہی تو ہیں..... بابا! جلیس کی زبان سے اُن کی پہلی بیوی کا نام سن کر میرے تن بدن میں آگ سی لگ جاتی ہے۔ میں دم بخود رہ جاتی ہوں لیکن میں صبر اور خاموشی سے برداشت کرنے کی کوشش کرتی ہوں..... آپ نے کہا تھا ناں بابا کہ عورت کے پاس صبر اور خاموشی دو ایسے ہتھیار ہیں جن کو استعمال میں لا کر وہ اپنے گھر کی سلطنت کی بے تاج ملکہ بن سکتی ہے۔ اور ہاں..... آپ نے..... آپ نے عظیم الشان مملکتِ روما کے حکمران مارکس اوریلیس کے حوالے سے کہا تھا کہ سچی خوشی ان لوگوں کو ملتی ہے جو اپنے اوپر حکومت کرنا جانتے ہوں اور جنھوں نے خود غرضی کو دل سے علیحدہ کر دیا ہو..... بابا خود غرضی کو تو میں اپنے دل سے نہیں نکال پائی ہوں کہ آخر کو انسان ہوں البتہ خود پر حکومت کرنے کی کوشش ضرور کر رہی ہوں لیکن کبھی کبھی..... مجھے ڈر سا لگنے لگتا ہے..... کہ کہیں کوئی ایسا بود امقام نہ آ جائے کہ آتش فشاں پھٹ جائے اور میری لگامیں بے بس ہاتھوں سے چھوٹ جائیں..... اوہ بابا! کاش میں آپ کو بتا سکتی کہ میں اندر سے کتنی خوف زدہ ہوں! کسی کمزور لمحے کا خوف مجھے سہمائے دیتا ہے یہ احساس کہ میں منافقت کی زندگی گزار رہی ہوں مجھے ایک نامعلوم سے احساسِ جرم سے دوچار کیے دیتا ہے کیا ساری زندگی مجھے اسی احساسِ جرم سے دوچار رہ کر گزارنی ہوگی..... کیا ساری زندگی مجھے کانچ کے پل پر چلتے رہنا ہوگا؟"

آنسوؤں کی زد کو اپنے ہمسفروں اور فضائی میزبانوں سے پنہاں رکھنے کی خاطر اُس نے آہستگی سے آنکھوں کو بند کیا مبادا آبگینوں کو ٹھیس لگ جانے کا اندیشہ ہو!

جلیس الحسن کا کہا ہوا حرف بحرف سچ ثابت ہوا۔

صبح وہ وطن کی فضاؤں کے دوش پر عازمِ سفر ہوئے تھے اور شب کو ہزاروں میل دور پردیس میں پہنچ چکے تھے!

تقریباً ڈیڑھ ماہ تک جلیس الحسن اُسے اور چاروں بچوں کو یورپ کے طول و عرض میں گھماتے پھرے۔ انھوں نے پانی کی طرح پیسہ بہایا۔ بچوں کو اور الفت کو بے دریغ خریداری کروائی۔ الفت نے اپنے لیے تو کم ہی خریداری کی، امی، بابا، بہنوں، بہنوئیوں، بھتیا، بھابی، بھانجے، بھانجیوں اور بھتیجیوں کے لیے سوغاتیں زیادہ خریدیں۔ رعنا جمیل کے بیٹے کے لیے بھی اُس نے چھوٹی دو تین سوغاتیں لیں۔

رعنا کے اپنے بیٹے کے لیے ایک بابا سوٹ خریدتے ہوئے اُس کے دل میں وہ فطری خواہش تیر کی طرح مچلنے لگی جو ہر شادی شدہ عورت کی ہوا کرتی ہے۔

"خدا جانے کب وہ تابناک سورج میری زندگی کے آسمان پر طلوع ہوگا؟" اُس نے بصد حسرت سوچا۔

کہنے کو تو جلیس الحسن نے اس دُور دراز سفر کو "ہنی مون" قرار دیا تھا۔ مگر اسے وہ بچوں کی "ہالیڈیز" زیادہ محسوس ہوئیں۔

اُس نے پردیس میں ملنے والے ہم وطن اور ہم زبان بھائی بندوں کو بھولے سے کبھی یہ نہیں بتایا کہ وہ کن کن کے لیے تکلی ہوئی تھی بلکہ اُس نے تو نگین کی عمر کا حساب رکھتے ہوئے ہر پوچھنے والے سے بشرطیکہ وہ جلیس الحسن کا پُرانا آشنا سا نہ ہوا یہی کہا کہ اُس کی شادی کو اٹھارہ برس بیت چکے ہیں۔

ڈیڑھ ماہ کے دوران بے شمار مواقع ایسے آئے جب اُسے بچوں کا ساتھ بہت ناگوار لگا کبھی کبھی تو وہ بقول رعنا جمیل کے انتہائی بے موقع ٹپک پڑتے تھے۔ مگر الفت نے اپنے جذبات کو مکمل طور پر قابو میں رکھا وہ ذرا سی لغزش سے اپنی صبر آزما ریاضت کو داؤ پر نہ لگانا چاہتی تھی!

بچوں نے خاصا پُرلطف وقت گزارا۔ اعجاز اگرچہ الفت سے دُور ہی دُور رہا مگر اُس نے بھرپور حظ اٹھانے کی کوشش کی۔

ڈیڑھ ماہ یورپ کی سحر انگیز فضاؤں میں گزارنے کے بعد جب وہ سب واپس وطن پہنچے تو ایک خوش خبری کو اپنا منتظر پایا۔

اعجاز میٹرک کے امتحان میں درجۂ اوّل میں کامیاب قرار دیا جا چکا تھا۔

"پاپا! آپ کو اپنا وعدہ تو یاد ہے نا؟" اعجاز نے باپ سے کہا۔ "کب دلوا رہے ہیں آپ مجھے نئی گاڑی؟"

"جب آپ گاڑی ڈرائیو کرنے کے اہل قرار پا جائیں گے۔"

"پاپا!" اعجاز نے حیرانی سے کہا۔ "کیا مجھے ڈرائیونگ نہیں آتی؟"

"گاڑی ڈرائیو کر سکنے اور لائسنس یافتہ ڈرائیور ہونے میں بڑا فرق ہے۔"

اعجاز نے چونک کر استفہامیہ نگاہوں سے اُن کی طرف دیکھا۔

"آئی ایم سوری بیٹے کہ میں نے آپ سے ایک ایسا وعدہ کیا جس سے میں روگردانی تو نہیں کرنا چاہتا مگر آپ کے بھلے کی خاطر اس وعدے کو نبھانے کے لیے کچھ مہلت چاہتا ہوں۔ وعدہ اپنی جگہ برقرار ہے جس دن آپ کو لائسنس مل جائے گا آپ کو گاڑی بھی مل جائے گی۔"

اعجاز پر ایک ہیجانی سی کیفیت طاری ہونے لگی۔

اگرچہ اُس نے لاکھ چاہا کہ باپ کے سامنے کوئی سہو اس سے سرزد نہ ہو جائے مگر اپنے فطری مزاج کے سبب وہ لاکھ کوشش کے باوجود خود پر قابو نہ رکھ سکا۔

"پاپا! آپ کو منع کر دیا ہوگا کہ آپ مجھے گاڑی نہ دلوائیں۔"

جلیس الحسن بچے نہ تھے سمجھ گئے کہ وہ کیا کہنا چاہتا تھا۔ وہ دھیرے سے مسکرائے اور انھوں نے کہا "بیٹے جی! مجھے کون منع کر سکتا ہے بھلا!"

"میں جانتا ہوں..... میں اچھی طرح جانتا ہوں پاپا کہ آپ کو کون منع کر سکتا ہے۔"

جلیس الحسن اپنی عمر سے کہیں لمبا نظر آنے والے نوجوان بیٹے کے روبرو آ کھڑے ہوئے اور انھوں نے اس کے شانوں پر ہاتھ دھرتے ہوئے محبت سے کہا۔ "بیٹا! کسی کے خلاف اپنے دل میں بے بنیاد غلط فہمیوں کو جگہ دینا اچھی

بات نہیں ہوتی۔ غلطی میری ہے کہ میں محبت کے جوش میں تم سے ایک غیر مشروط وعدہ کر بیٹھا۔ میں خود کو کوئی بہت ہی بااصول آدمی تو نہیں سمجھتا۔ اپنے مفاد کی خاطر اکثر بے اصولی سرزد ہو جاتی ہے مجھ سے لیکن بیٹے! میں تمہیں کسی ناگہانی مصیبت میں پڑتے نہیں دیکھنا چاہتا۔ میں نہیں چاہتا کہ تم بلا لائسنس گاڑی چلاتے ہوئے سرکاری اہلکاروں کے ہاتھوں دھر لیے جاؤ۔ تب تمہیں بھی پریشانی ہوگی اور مجھے پریشانی کے ساتھ ساتھ شرمندگی بھی ہوگی۔ یہ مت سمجھو کہ میں اپنے وعدے سے روگردانی کی کوشش کر رہا ہوں یا خدانخواستہ کسی کے منع کر دینے پر ایسا کہہ رہا ہوں۔ گاڑیاں تمہارے لیے ایک نہیں دس۔ آج ہی تمہارے لیے گاڑی خرید کر پورچ میں کھڑی کر سکتا ہوں مگر لائسنس ملنے تک تم اسے باہر سڑک پر نہ نکالو گے۔"

"تو ایسی گاڑی کا فائدہ کیا ہوگا؟"

"اسی لیے تو کہہ رہا ہوں تھوڑا سا انتظار کر لو اور مجھے بھی تھوڑی سی مہلت دو تاکہ میں بے خوف و خطر اپنا وعدہ نبھا سکوں۔"

اعجاز نے شاکی نگاہوں سے انہیں دیکھا۔

"مجھے غلط سمجھے! الفت کے بارے میں دل میں کسی غلط فہمی کو جگہ دینے کی کوشش مت کرو بیٹا۔ اگر کر سکتے ہو تو میری اس بات کا یقین کر لو کہ وہ بری عورت نہیں ہے۔ ماضی میں اس نے تمہارے ساتھ جو بھی زیادتی کی ہو یا اس سے جو بھی غلطی سرزد ہوئی ہو مگر وہ اچھی عورت ہے۔"

اعجاز نے اپنے جبڑے باہم بھینچ لیے۔

"اونہہ اچھی عورت!" اس نے جی ہی جی میں کہا۔ "میں اسے کبھی بھی ایک اچھی عورت نہیں سمجھ سکتا۔ وہ ایک جادوگرنی ہے جس نے آپ سب پر جادو کر دیا ہے۔ مگر مجھ پر اس کا جادو کبھی کام نہیں کر سکے گا۔"

وقت بھی گویا پر لگا کر اڑتا ہے۔
لگتا تھا کل ہی کی بات تھی جب وہ ماں باپ سے رخصت ہو کر اس گھر میں آئی تھی۔
پانچ برس بیت چکے تھے۔
نگین یونیورسٹی میں ایم ایس سی کی طالبہ تھی۔
اعجاز انجینئرنگ یونیورسٹی میں زیر تعلیم۔
فراز انٹرمیڈیٹ کا طالب علم۔
اور زرین کا اسکول میں آخری سال تھا۔
نگین، فراز اور زرین، تینوں الفت کا انتہائی احترام کرتے تھے۔
یہ احترام، یہ مقام الفت نے آسانی سے حاصل نہ کیا تھا۔
اسے مسلسل ریاضت کرنی پڑی تھی اور اب بھی اپنے ریاض میں کمی نہ آنے دیتی تھی۔
مگر اعجاز پر اس کی کوئی ریاضت کوئی کام نہ دکھا سکی تھی۔
اعجاز ان ضدی اور ہٹ دھرم لوگوں میں سے تھا جو آسانی سے ہتھیار نہیں ڈالتے۔
جو کسی سے محبت کرتے ہیں تو قلب و روح کی انتہائی گہرائیوں کے ساتھ
اور نفرت کرتے ہیں تو پوری شدت کے ساتھ۔
اب یہ اور بات تھی کہ الفت سے اس کی نفرت کے مقابلے میں تین بھائی بہنوں کی خوشگوار تعلقات اس کی ناگواری پر غالب آ جاتی تھی۔
اپنے پرائے الفت سے نگین اور زرین کے باہمی تعلقات کو رشک سے دیکھتے تھے۔ اعجاز کے سوا

تینوں بچے الفت کے میکے آیا جایا کرتے تھے اور الفت کی نسبت سے انہوں نے اس کے میکے والوں سے خوشگوار مراسم اور ناتے استوار کر لیے تھے۔

بابا اور امی کو وہ نانا جان اور نانی اماں کہا کرتے تھے۔ عظمت، اقبال اور تہذیب میں سے ہر ایک کو آنٹی، ان کے شوہروں کو انکل، بھیا کو ماموں جان اور بھابی کو ممانی جان۔ ان سب نے بچوں کو وہ بڑی فراخدلی کے ساتھ قبول اور تسلیم کرتے تھے۔

بابا الفت سے اکثر کہتے:
"بیٹی! تم نے میدان مار لیا اور میرا سر اونچا کر دیا۔"

جلیس الحسن یوں تو اس کے میکے کے ہر فرد کو عزت دیتے تھے لیکن بابا کے لیے تو وہ تا حد نظر فرش راہ کر دیا کرتے تھے۔

امی الفت کو اس کے گھر میں خوش دیکھ کر شکرانے بجا لاتیں۔
وہ بابا سے کہتیں:
"ہم آپ کتنے پریشان رہا کرتے تھے الفت کے لیے مگر اللہ کے فضل سے سب سے زیادہ سکھی اپنے گھر میں وہی ہے۔ جلیس الحسن پھولوں پر رکھتے ہیں اسے۔"

"سچ ہے، ہماری الفت نے بھی تو ان کے گھر کے نکھار کے لیے قربانی دی ہے۔ ورنہ آج کل پڑھی لکھی اور خود کفیل لڑکیاں تو اکڑا جایا کرتی ہیں۔ جھکنے کے بجائے ٹوٹ جانے کو ترجیح دیتی ہیں۔ تعلیم کا مطلب ان کی نظر میں اپنی انا کی خاطر دوسروں کو بھی آزمائش کی بھٹی میں ڈال دینے سے دریغ نہیں کرتیں۔ اگر سچ پوچھو تو میں الفت کے اپنے گھر میں ہنسی خوشی آباد ہونے کا سہرا الفت ہی کے سر باندھتا ہوں۔ اس لیے نہیں کہ وہ میری بیٹی ہے بلکہ اس لیے کہ اس نے جلیس الحسن کے جھکنے کا انتظار کیے بغیر خود سپر ڈال دی تھی۔ خدانخواستہ جلیس میاں کی اچھائیوں اور خوبیوں سے مجھے انکار نہیں مگر فطری زعم کے معاملے میں وہ دوسروں سے چنداں مختلف ثابت نہ ہوئے تھے۔ الفت کے گھر آ بیٹھنے کے بعد انہوں نے پلٹ کر خبر لینے کی زحمت نہیں کی تھی۔ میں تو اس سلسلے میں الفت کو قابل تحسین سمجھتا ہوں کہ اس نے اپنی انا کا گلا گھونٹ کر ہم سب کو بچا لیا۔ میں تم سے کہا کرتا تھا کہ الفت ہمارے بچوں میں سب سے زیادہ سمجھدار اور عقلمند ہے۔ بس یہ کہو کہ وہ شروع میں حالات سے سمجھوتا نہ کر سکی تھی۔"

"اب تو جلیس الحسن بھی اس کا کلمہ پڑھتے ہیں۔" امی فخر سے کہتیں۔

"کیوں نہ پڑھیں گے۔ اچھی شریک زندگی کا ہر آدمی کلمہ پڑھتا ہے۔ تمہارا ہی کو دیکھ لو تو تمہارے نام کے ساتھ کلمہ پڑھا کرتا ہے۔"

"ارے بس رہنے دیجیے اپنا ذکر۔"

"بیوی! ہم دونوں خدا کا جتنا شکر ادا کریں کم ہے کہ خدا کے فضل سے ہمارے سارے بچے اپنے اپنے گھروں میں ہر لحاظ سے مطمئن اور مسرور ہیں۔"

"ہاں بس اللہ میاں الفت کو اولاد اور دے دیتے۔"

"نیک بخت زندگی میں کمی اور کسر تو کہیں نہ کہیں جھیلنی ہی پڑتی ہے۔ خدا ہر انسان کو سبھی کچھ دے دیتا تو دل دکھ کی کیفیت سے بھلا کیسے آشنا ہوتا۔"

بابا خدا کی رضا میں راضی رہنے والے صابر اور شاکر بندوں کی طرح الفت کے بے اولاد رہنے کے معاملے میں بھی صبر و رضا کا پہلو نکال لیتے۔

خواہش بسیار کے باوجود الفت کے دل کی یہ فطری تمنا پوری نہ ہو سکی تھی جو عورت کو روئے زمین پر اس کا بہترین روپ عطا کیا کرتی ہے اور
بقول ملٹن اسے آسمان کا بہترین اور آخری تحفہ قرار دیتی ہے۔
اس کی انتہائی خواہش کے پیش نظر شادی کے چوتھے برس جلیس الحسن اسے انگلستان تک لے گئے تھے۔
میڈیکل ٹیکنالوجی میں حرف آخر کی سند رکھنے والے ولایتی ڈاکٹروں نے دیسی ماہرین کی اس رائے پر مہر تصدیق ثبت کر دی تھی کہ:

وہ کبھی ماں نہ بن سکے گی!

جب عالمی شہرت رکھنے والے انگریز گائناکولوجسٹ نے اُسے اپنی نیلی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے معذرت آمیز لہجے میں کہا تھا:

"مجھے افسوس ہے مسز حسن!"

تو اُس کی آنکھوں میں دریا سا سمٹ آیا تھا۔

"میں بے اولاد جوڑوں کے کرب سے بخوبی آشنا ہوں۔" بلڈی میری نے کہا۔

"آپ لوگ تو میڈیکل ٹیکنالوجی میں سرِ فہرست ہیں ڈاکٹر!" وہ اسے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

وہ مدبرانہ مسکرا دیا۔

"مگر خدا کی مرضی کے آگے ہم بھی بے بس ہیں۔" اُس نے کہا۔

وہ بہت تڑپی تھی۔

جلیس الحسن اپنی قیام گاہ پر واپس پہنچنے کے بعد تادیر اُسے دلاسا دیتے رہے۔

"الفت! ہم بے اولاد تو نہیں ہیں۔" انھوں نے الفت کو سمجھانے کی کوشش کی۔ "ویسے بھی اگر تم سچ پوچھو تو ان جوان بچوں کی موجودگی میں پھر ایک ننھے بچے کا باپ بننا اچھا نہیں لگے گا۔"

وہ ان کا منہ دیکھتی رہ گئی۔

اُسے یقین نہ آیا کہ وہ اتنے مہربان ہوتے ہوئے بھی ایسی بے رحمی سے اُس کے جذبات کو نظر انداز کر سکتے ہیں۔

ٹھیک ہے انھیں مزید اولاد کی طلب نہ تھی کیونکہ وہ بے اولاد نہ تھے۔

چار بچوں کے باپ تھے۔

انھیں بھلا ایک بچے کا باپ بن جانے یا نہ بن سکنے سے بھلا کیا فرق پڑتا۔

مگر اُسے تو اولاد کی طلب تھی۔

وہ تو اپنے ادھورے وجود کو پورا دیکھنا چاہتی تھی۔

جلیس الحسن تو بڑے آرام سے کہہ دیا کرتے تھے۔ "ہم بے اولاد کب ہیں؟"

وہ بے شک بے اولاد نہ تھے لیکن وہ تو تھی!

دوسری عورت کے بطن سے جنم لینے والے بچوں کی ماں کا لیبل اپنے وجود پر چسپاں کر لینے اور خود اپنی کوکھ سے جنم دینے والے بچے کی ماں بننے میں بڑا فرق ہے۔

یہ دو مختلف حقائق ہیں۔

دو یکسر جُدا تجربے۔

موخر الذکر تجربے کی لذت ہی جُدا ہے۔

تخلیق کا کرب جھیلے بنا عورت مکمل نہیں ہوتی۔

ادھوری رہتی ہے۔

ادھوری رہ جانے کا دکھ الفت کو مارے ڈالتا تھا۔

بہنیں، بھاوج اور دیگر عزیز و اقارب خیال آرائیاں کرتے۔

"ایک اولاد ہی تو نہیں دی الفت کو خدا نے ورنہ اور کس چیز کی کمی ہے! ہاں کبھی کوئی نہ کوئی کسر تو برداشت کرنا ہی پڑتی ہے اور پھر.... اگر ایمان داری سے دیکھا جائے تو ایسی کوئی بہت کسر بھی نہیں۔ سوتیلے ضرور ہیں مگر کیسے سعادت مند بچے دے رکھے ہیں خدا نے الفت کو! ارے بعض ایسی سعادت مندی تو اپنی سگی اولاد بھی نہیں دکھاتی تمام کہتے منہ سوکھتا ہے ان کا۔"

کاش وہ انھیں بتا سکتی کہ کس پل صراط سے گزرنے کے بعد وہ اس مقام تک پہنچی تھی۔ بہت سی دیگر کڑوی حقیقتوں کی طرح اُسے اس حقیقت کا زہراب بھی پینا پڑا تھا کہ وہ کبھی ماں نہ بن سکے گی۔

کھلی کھڑکی سے باہر لندن کا ابر آلود آسمان اُسے خود اپنی ہی طرح سوگوار لگا۔

"اے خدا کہاں ہے تو؟" اُس نے آسمان کی وسعتوں میں اپنی نگاہیں دوڑاتے ہوئے سوچا۔ "ساری ناانصافیاں میرے ساتھ ہی کیوں؟ سارے دکھ میری ہی جھولی میں کس لیے؟"

بہنوں میں سب سے چھوٹی بہن تہنیت بھی دو بچوں کی ماں بن چکی تھی۔

بس ایک وہی تھی جو تشنہ اب رہی تھی۔

اور ماہرین کی رائے میں یہ تشنہ کامی اُس کے مقدر کی لکیروں میں شامل تھی۔

بہت پہلے اُس نے کہیں سنا یا پڑھا تھا کہ کسی عورت کے بطن سے جنم لینے والے بچے وہ ملنا ہیں ہوتی ہیں جو اُس کے مرد سے اُس کے تعلقات کو مستحکم کرتی ہیں اور اُس کے گھر کی زمین پر اُس کے قدم زیادہ مضبوطی سے جماتی ہیں۔

انگلستان سے بھی مایوس ہو کر وطن واپس لوٹنے کے بعد سے وہ اکثر ہول کر سوچنے لگتی تھی۔ "کیا جلیس سے میرا تعلق غیر مستحکم اور اُس کے گھر کی زمین سے میرے قدم اکھڑے اکھڑے رہیں گے؟"

"کیا اُس کے گھر کی زمین پر اُس کے قدم مضبوطی سے نہ جم سکیں گے؟"

"کیا میں اک خیمہ بے طناب رہوں گی؟"

اعجاز کا کامل اعتماد کے ساتھ اکھڑا اکھڑا رویہ اُسے مزید ہمانے لگتا تھا!

گو وہ بظاہر پر تو آمادہ نظر نہ آتا

لیکن الفت کو اس کی خاموشی سے بھی ڈر لگتا۔

وہ جانتی تھی کہ ہر خاموشی کے پیچھے ایک تلاطم پنہاں ہوتا ہے۔

اعجاز کو جلیس الحسن نے اُس کی فیسٹ سے نئی شراڈ خرید کر دی تھی جو کالج کے آنے جانے میں تو اُس کے جو کام آئی تھی سو آئی تھی۔ انجینئرنگ یونیورسٹی میں اُس کے داخلے کے بعد کہیں زیادہ سہولت فراہم کر رہی تھی۔

اعجاز کی ڈرائیونگ کے سلسلے میں جلیس الحسن کی بے لاگ رائے یہ تھی کہ وہ اپنے موڈ کے مطابق گاڑی چلاتا ہے۔

کبھی کبھی وہ ہنس کر کہا کرتے تھے:

"جاجی میاں کی گاڑی اگر لہراتی بل کھاتی سڑک پر نظر آئے تو سمجھ لیجیے کہ گاڑی میں اُن کی پسند کا کوئی نغمہ گونج رہا ہے۔ اور وہ اسی کی دھن پر گاڑی چلا رہے ہیں اور اگر ان کی گاڑی بندوق کی گولی کی طرح ناک کی سیدھ میں لپکی چلی جا رہی ہو تو اس کا مطلب ہے شاہزادے غصے میں ہیں۔"

خدا جانے اس روز کس موڈ میں تھا اعجاز کہ شام کے وقت اپنے کسی دوست سے ملنے کے لیے ڈیفنس سے ناظم آباد جاتے ہوئے کالا پل پر کس گاڑی مخالف سمت سے آنے والی ایک بس سے اس بُری طرح ٹکرائی کہ لمحے بھر میں بس کے زنانہ حصے میں ایک کہرام سا مچ گیا۔ ٹریفک جام ہو گیا اور ذرا دیر پہلے زندگی کی رعنائیوں سے بھرپور نظر آنے والے راستے ایک ہیبت ناک منظر پیش کرنے لگے۔

یہاں سے وہاں تک آگے پیچھے گاڑیاں ہی گاڑیاں تھیں جن کے ہارن بُری طرح بجائے جا رہے تھے۔ حادثے میں ملوث بس میں سوار خواتین گاڑیوں کے ہجوم کے باعث نیچے اُترنے کی ہمت نہ کر پا رہی تھیں کیونکہ دائیں بائیں آگے پیچھے گاڑیاں ہی گاڑیاں تھیں۔ بس کا ڈرائیور حادثے کے بعد بھاگ نکلا تھا۔ بس میں سوار خواتین آہ و بکا اور سینہ کوبی کر رہی تھیں۔

حادثے کا شکار ہونے والی گاڑی میں نوجوان اعجاز شدید زخمی حالت میں بے سدھ پڑا تھا۔ ونڈ اسکرین چکنا چور ہو چکا تھا۔ گاڑی کا بونٹ بُری طرح پچک جانے کے باعث گاڑی کی صورت خاصی ہیبت ناک نظر آ رہی تھی۔

شہر کا سب سے بڑا اسپتال قریب ہی تھا۔ اعجاز کو بمشکل تمام گاڑی سے نکالنے کے بعد مذکورہ اسپتال پہنچوایا گیا۔

گاڑی میں خوش قسمتی سے اعجاز کی ایک ڈائری بھی تھی جس کے صفحہ اوّل پر اُس کا نام پتا ہی نہیں فون نمبر بھی درج تھا جس سے متعلقہ اہلکاروں کو اس حادثے کی اطلاع متعلقین کو دینے میں دقت نہ ہوئی۔

ٹیلیفون کال نجمن نے ریسیو کی اور ذرا سی دیر میں گھر میں کہرام سا مچ گیا۔

حادثے کی اطلاع دینے والے نے خاصی عجلت میں حادثے کی خبر دینے کے بعد کہا تھا: "زخمی کی حالت نازک ہے۔ آپ لوگ فوراً اسپتال کے شعبہ حادثات میں پہنچیں۔"

جلیس الحسن کو خبر ملی تو وہ جہاں کے تہاں رہ گئے۔ اعجاز اُن کا بڑا بیٹا تھا۔ اس سے تو وہ بہت جانے کتنی اُمیدیں

وابستہ کیے بیٹھے تھے۔

نگین پر غشی کے دورے پڑنے لگے۔

فرازنہ رو رہی تھی۔

زرتاشین یوں بلک بلک کے رو رہی تھی کہ خدا کی پناہ!

نور جہاں بھی وحشت زدہ ہو گئے۔

صدمہ تو الفت کو بھی پہنچا مگر وہ واحد فرد تھی جس نے اپنے حواس قابو میں رکھتے ہوئے نگین، فرازنہ اور زرتاشین کو تسلی دی اور جلیس محسن کو بھی سہارا دینے کی کوشش۔

اسپتال جانے سے قبل اُس نے انتہائی عجلت میں اپنے میکے بھی اس حادثے کی اطلاع دے دی۔

جب تک وہ اسپتال پہنچے اعجاز کو آپریشن تھیٹر لے جایا جا چکا تھا۔

شعبہ حادثات میں ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹروں کے بیان کے مطابق اُس کا چہرہ بُری طرح مضروب ہوا تھا۔ دو پسلیاں ٹوٹ گئی تھیں۔ بایاں شانہ بُری طرح زخمی ہوا تھا اور دائیں پنڈلی تین مقامات سے ٹوٹی تھی۔ حادثہ اتنا شدید تھا کہ صدمے کی شدت سے وہ گہری بے ہوشی میں چلا گیا تھا اور مزید خون بہنے کے احتمال کے سبب اُسے فوری آپریشن تھیٹر لے جانا پڑا تھا۔

تھوڑی دیر میں پاپا اور بھیا بھی اسپتال آ پہنچے۔ اُن کے آ جانے سے الفت کی ہمت بندھ گئی۔

رات ساڑھے بارہ بجے تک وہ سب آپریشن تھیٹر کے باہر راہداری میں پڑی چوبی بینچوں پر بیٹھے رہے۔

زرتاشین اور نگین کا رو رو کر بُرا حال ہو گیا۔

فرازنہ کا بس نہ تھا کہ بلک بلک کر رونے لگتا۔

جلیس محسن کی زرد رنگت الفت کو تشویش میں مبتلا کیے دے رہی تھی۔ وہ ساکت بیٹھے تھے۔ پاپا اور بھیا کچھ بولتے تو ہوں ہاں کر لیتے اور بس۔

ساڑھے بارہ بجے شب کے لگ بھگ جب اعجاز کو آپریشن تھیٹر سے باہر لایا گیا تو اُس کا چہرہ اور جسم کے بہت سے حصے پٹیوں اور پلاسٹر میں جکڑے ہوئے تھے۔

زرتاشین پر تو تشنج سا طاری ہو گیا۔

نگین بلک بلک کر رونے لگی۔

جلیس محسن اپنے گھٹنے پکڑ کر بینچ سے اٹھے تو بھیا نے انہیں سہارا دیا۔

اعجاز کو پٹیوں میں جکڑا دیکھ کر الفت کے ہاتھ پیروں کی بھی جان جاتی رہی مگر نہ جانے کیوں کر وہ خود کو سنبھالے رہی اور کبھی نگین کو، کبھی زرتاشین کو دلاسا دینے کی کوشش کرتی رہی۔

"ڈاکٹر صاحب خطرے کی تو کوئی بات نہیں؟" جلیس محسن نے آپریشن تھیٹر سے برآمد ہوتے ڈاکٹر سے پوچھا۔

"دعا کریں۔" ڈاکٹر نے جلیس محسن کے شانے پر ہاتھ دھرتے ہوئے کہا۔

اگلے چند روز نہایت منحوس بن کر گزرے۔

اعجاز کم جو حال تھا سو تھا، متعلقین کا حال اُس سے سوا تھا۔

جلیس محسن کو گھر، دفتر، کام کسی بھی بات کی پروا نہ تھی سوائے اعجاز کے۔ تینوں بھائی بہنوں کا اکلوتا بڑا بھائی تھا۔ وہ اور تینوں ہی اُس کی تعیناتی رہتی تھیں۔ اسپتال سے گھر جانے پر بڑی مشکل سے آمادہ ہوتیں، جاتیں اور پھر پلٹ آتیں۔ فوزی کی حالت تو یہ تھی، جم تھی وہ بہنوں کی طرح آنسو بہانے سے تو قاصر تھا مگر وہ اُس کے چہرے پر خوف آنے کا احتمال تھا جیسا کہ وہ اندر ہی اندر جیسے ہی اُس کے چہرے پر تھی شاید کسی اور کے چہرے پر نہ تھی۔

الفت نے دن رات ایک کر دیا تھا۔ اعجاز کے پاس سے ہٹتی ہی نہ تھی۔ پلک جھپکائے بنا راتیں گزار دیتی۔ اس کے میکے سے اعجاز کی عیادت کو آنے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ پاپا تو دن میں دو دو چکر لگا جاتے۔

اعجاز مسلسل بے ہوشی کی حالت میں تھا۔ اس بے ہوشی کا سبب خدانخواستہ دماغ کا مضروب ہونا نہ تھا بلکہ ڈاکٹروں کے خیال کے مطابق حادثے کا صدمہ اتنا شدید تھا کہ اعجاز صدمے کی اس شدت کی تاب نہ لاتے ہوئے بے ہوش ہو گیا تھا۔ اس پر مستزاد وہ کاری زخم جو اُس کے چہرے اور جسم کے دیگر حصوں پر آئے تھے۔

حادثے کا ذمے دار ڈرائیور مفرور تھا۔ پولیس تھانے میں گاڑی کھڑی کر دی گئی تھی۔ بس کا مالک پولیس کے اہلکاروں کے ہمراہ جلیس محسن کے پاس اس پیشکش کے ساتھ آیا تھا کہ وہ اعجاز کے علاج معالجے کے سلسلے میں اُن کے ساتھ ہر ممکن تعاون کو تیار ہے۔ تھانے ہی میں معاملہ رفع دفع کرانے کی خاطر وہ جلیس محسن کے قدموں میں جھک گیا تھا۔

جلیس محسن کو خدا کے فضل سے اعجاز کے علاج معالجے کے سلسلے میں اُس کے اس تعاون کی چنداں ضرورت نہ تھی جس کی وہ بات کر رہا تھا اور تھانے ہی میں معاملہ رفع دفع کر دینے کے حق میں وہ ہرگز نہ تھے۔ مگر جب بس کے مالک نے گڑگڑا کر اللہ اور رسول کا واسطہ دیا اور بیٹے کی جان کے صدقے معاف کر دینے اور رحم کرنے کی درخواست کی تو الفت نے انہیں یہی مشورہ دیا کہ بات آگے نہ بڑھائیں۔

یہ تو وہ خود بھی جانتے تھے کہ اُن کے چاہنے یا نہ چاہنے سے بگڑا ہوا آوا سنور تو نہیں سکتا۔ ہر روز نہ جانے کتنے انسانیت سے عاری ڈرائیور سڑکوں پر انسانی جانوں کو پامال کرتے گزرتے چلے جاتے ہیں یا فرار ہو جاتے ہیں۔ اور ایک روز پھر کھلی سڑکوں پر آزادانہ ویسے ہی دندناتے پھر رہے ہوتے ہیں۔

اعجاز کی گاڑی کی تباہ شدہ حالت دیکھ کر جلیس محسن ذرا دیر کو تو سکتے میں رہ گئے تھے۔ گاڑی کا اگلا حصہ جس بُری طرح تباہ ہوا تھا اُس سے گاڑی کی صورت اتنی مسخ ہو گئی تھی کہ دیکھ کر خوف آتا تھا۔ جلیس محسن تو شکر بجا لائے کہ اعجاز شدید زخمی حالت میں ہی سہی بقید حیات تو تھا ورنہ گاڑی کی مسخ صورت حادثے کی شدت کے سلسلے میں جو گواہی دے رہی تھی اُس سے تو دل سہم ہی جاتا تھا۔

جلیس محسن اعجاز کی طرف سے اتنے فکرمند تھے کہ انہیں اپنی بھی سُدھ بُدھ نہ رہی تھی۔ جوان بیٹے کو زندگی اور موت کے بیچ معلق دیکھنا ایک تجربۂ جانگسل تھا۔

وہ اپنے اس بیٹے کو جو بہت ضدی، ہٹیلا اور غصہ ور ہوتے ہوئے بھی انہیں عزیز از جان تھا، جلد از جلد موت کا منہ چڑاتے اور زندگی سے پُرجوش معانقہ کرتے ہوئے دیکھنا چاہتے تھے۔

گرد و پیش سے بے خبر پڑے اعجاز کے پاس بیٹھ کر انہیں نہ جانے کب کب کی پرانی سے پرانی باتیں یاد آنے لگی تھیں۔

اعجاز ان دنوں بہت چھوٹا سا تھا۔ غالباً ڈیڑھ برس کا جب وہ گھر کے برآمدے میں دوڑتے ہوئے منہ کے بل اوندھا گر پڑا تھا۔ آہنی کھلونا موٹر کار کا ایک نکیلا حصہ اُس کی پیشانی کو زخم دے گیا اور آن کی آن خون اُس کی پیشانی سے بہتا ہوا اُس کے گریبان تک جا پہنچا تھا۔ عاصمہ بیگم نے تو ہاتھ پاؤں چھوڑ دیے تھے۔ بھاگم بھاگ اعجاز کو ڈاکٹر کے پاس لے جایا گیا جس نے فوری طور پر تین ٹانکے لگا کر زخم کی رفوگری کی۔ بعد میں زخم تو بھر گیا مگر نشان باقی رہا۔ وہ نشان اعجاز کی پیشانی پر آج بھی موجود تھا۔ عاصمہ بیگم اکثر اس نشان کو دیکھ کر کہا کرتی تھیں "میرے چاند کو داغ لگ گیا ہے ننھا سا!" تب عاصمہ بیگم کو کیا خبر تھی کہ ایک روز پورا چاند ہی گہنا جائے گا!

آنکھ، ناک، ہونٹ، رخسار، پیشانی غرض اعجاز کے چہرے کا کون سا حصہ تھا جہاں کوئی زخم نہ لگا تھا یا نیل نہ پڑا تھا۔

جن دنوں اعجاز پانچویں جماعت میں تھا ایک روز اسکول سے فون آیا کہ پلے گراؤنڈ میں ہاکی کھیلتے ہوئے اُس کی ٹانگ میں ایک دوسرے کھلاڑی طالب علم کی ہاکی لگ گئی ہے، خون کافی نکل رہا ہے شاید اسپتال لے جانا پڑ جائے اس لیے والدین یا کوئی سرپرست اسکول پہنچیں۔ گھر پر اس وقت عاصمہ ہی تھیں، جلیس محسن تو دفتر میں تھے۔ گھبراہٹ میں روتے ہوئے انہوں نے میاں کو فون پر اطلاع دی کہ اعجاز اسکول میں کھیلتے ہوئے زخمی ہو گیا ہے اُس کی ٹانگ میں چوٹ آئی ہے۔ فوری اسکول پہنچنا ہے۔ آپ دفتر سے اسکول پہنچیں میں ڈرائیور کے ساتھ پہنچتی ہوں۔ اسکول پہنچے تو پتا چلا زخم تو معمولی سا تھا مگر خون کچھ زیادہ ہی بہہ گیا تھا جس سے اسکول والے بھی متفکر ہو گئے تھے۔ جلیس محسن اعجاز کو گاڑی میں ڈال کر اسپتال لے گئے۔ دو ٹانکے لگے اور زخم کا منہ بند ہو گیا۔ مگر اعجاز کو دو تین دن بستر پر رہنا پڑا۔ عاصمہ بیگم ان دو تین دنوں میں انتہائی بے کل رہیں۔

آج اگر وہ زندہ ہوتیں اور دنیا و مافیہا سے بے خبر پٹیوں اور پلاسٹر میں جکڑا زندگی اور موت کے درمیان جھولتے دیکھتیں تو شاید فرطِ غم سے اُن کا کلیجا پھٹ ہی جاتا!

اور نہ جانے کب کب کی بھولی بسری باتیں یاد آرہی تھیں جلیس الحسن کو۔
گھنٹوں بیٹے کے پاس بیٹھے اُسے دیکھتے رہتے۔
کیسا کڑیل نوجوان تھا اور کیا حالت کردی تھی اس منحوس حادثے نے اُس کی!
گاڑی میں بیٹھتا تو گاڑی اُس کے دم سے سج جایا کرتی تھی۔ جلیس الحسن تو اُسے نظر لگ جانے کے خوف سے آنکھ بھر کر دیکھتے بھی نہ تھے۔
نہ جانے کس کی نظر لگ گئی تھی!
تمکین اور زرین کو نہ کھانے پینے کا ہوش تھا نہ یونیورسٹی اور اسکول جانے کا۔ باپ کی طرح وہ دونوں بھی مشکل بامشکل بصد حسرت بھائی کو دیکھے جاتیں۔
الفت تسلی دیتیں "بیٹیا! زیادہ پریشان ہونے کی بات نہیں۔ بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گے بھائی۔"
"اسے ہوش کیوں نہیں آتا؟ آنکھیں کھول کر دیکھتا کیوں نہیں کہ ہم سب اُس کے لیے کتنے پریشان ہیں؟" تمکین کے لیے آنسو روکنا مشکل تھے۔
"جان! آجائے گا ہوش...... ڈاکٹر کہتے ہیں شدید نوعیت کا شاک کبھی کبھی انسان کے بے ہوشی میں چلے جانے کا سبب بن جاتا ہے۔ خدا کا شکر ادا کرو کہ دماغ پر خدانخواستہ کوئی چوٹ نہیں تھی۔ ورنہ شاید پریشانی بڑھ جاتی۔"
"اس سے کہیں نا یہ اُٹھے اور مجھ سے لڑے۔ میں چپ چاپ سنتی رہوں گی!" تو ہر روز بھی اعجاز کے ہوش میں نہ آنے پر تمکین بلبلا کر رونے لگی۔
الفت کا جی کٹنے لگا۔
ایک بہن کو بھائی سے کتنی محبت ہوا کرتی ہے اس کا اُسے بخوبی اندازہ تھا۔ بھیا اگر ایک روز بھی بخار یا نزلہ زکام سے بستر پر پڑے رہتے تھے تو اُس کے دل پر عجیب سی وحشت طاری ہونے لگتی تھی۔
"میری جان! ہمت سے کام لو۔ خدا نے چاہا تو اعجاز بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔ پھر تم دونوں آپس میں لڑنا اور میں سنوں گی بھی، دیکھوں گی بھی!"
اعجاز کی یونیورسٹی کے بے شمار ساتھی اُس کی عیادت کو آئے اور انھوں نے جلیس الحسن اور الفت سے اس طور اظہار ہمدردی کیا کہ اُسے یوں لگا کہ جیسے وہ سچ مچ اعجاز کی ماں ہی تو تھی۔
"آنٹی! ہم سب اعجاز کے دوست ہونے کے ناتے سے آپ کے بیٹے ہیں۔" انھوں نے کہا۔
اُن میں سے بعض نے اعجاز کی تیمارداری کے لیے اُس کے پاس ٹھہرنے کی پیشکش کی۔ بعض اپنے نام اور فون نمبر دے گئے کہ رات کے پچھلے پہر بھی کسی سلسلے میں ہماری ضرورت ہو تو تامل نہ کیجیے گا۔
دو دوستوں نے اعجاز کے لیے خون بھی دیا۔
اُس کا ہر دوست مغموم اور متفکر تھا۔
"بہت پیارا دوست ہے یہ ہمارا۔" اُس کے اکثر دوستوں نے کہا۔
انجینئرنگ یونیورسٹی کے چند اساتذہ بھی اعجاز کو دیکھنے کے لیے آئے اور انھوں نے جلیس الحسن اور الفت سے انتہائی ہمدردی کا اظہار کیا۔
اس حادثے کے بعد جلیس الحسن کو معلوم ہوا کہ اُن کا بیٹا اپنے دوستوں میں کتنا مقبول تھا اور اُس کے اساتذہ اُسے کس قدر چاہتے تھے!
الفت اگرچہ اُس کی ماں نہ تھی اور شاید ذاتی طور پر ماں نہ بن سکنے کے سبب اولاد کی بابت ایک ماں کے جذبات کا صحیح طور پر ادراک بھی نہ رکھتی تھی مگر ان دنوں اُسے یوں لگ رہا تھا، جیسے وہ سچ مچ اعجاز کی ماں ہی تھی۔
گو پچھلے پانچ برسوں میں اُس کے ساتھ اعجاز کا رویہ خاصا معاندانہ رہا تھا اور الفت کو اُس کی نگاہوں میں اپنے لیے نفرت کے سوا کبھی کوئی نرم و ملائم جذبہ نظر نہ آیا تھا اور اُس کے رویے پر وہ جی ہی جی میں ملول بھی رہا کرتی تھی اور خود کو اُس کے خلاف شاکی بھی پاتی تھی۔ مگر ان دنوں تو جیسے اعجاز کے خلاف اُس کے دل پر لکھا ہر حرفِ شکایت مٹ گیا تھا۔
تمکین، فراز اور زرین کے ساتھ بھی اُس کے رویے میں ایک باطنی اور شعوری انقلاب رونما ہوا تھا۔ دل سے کدورت اور منافقت جاتی رہی تھی۔

پہلے اُس کے دل میں کچھ ہوتا تھا مگر مصلحتاً زبان سے کچھ اور کہنا پڑتا تھا۔ اُن دنوں وہ اپنے دل میں بھی وہی پیار رکھتی تھی جو اُس کی زبان پر تھا۔
جلیس الحسن لاکھ چاہتے کہ وہ گھر جا کر آرام کرے مگر وہ اسپتال سے گھر جانے پر آمادہ ہی نہ ہوتی تھی۔ تمکین اور زرین اُس کی ضرورت کی چیزیں لے آتی تھیں۔ دونوں وقت گھر سے کھانا بھی آتا تھا مگر کھانے کو دل کس کا چاہتا تھا۔ زبردستی دو چار نوالے حلق سے اتار لیں کہ اعجاز کی تیمارداری کی ہمت رہے۔
ایک اعجاز ہی کیا اُسے تو ان دنوں جلیس الحسن، تمکین، زرین اور فراز سب ہی کا خیال رکھنا پڑ رہا تھا۔ صدمہ، فکر اور نہ کھانے پینے سے اُن سب کی حالت بگڑی ہوئی تھی۔
الفت دن رات قرآنی آیات پڑھ پڑھ کر اعجاز پر دم کیے جاتی۔ اُس کی صحت یابی اور درازیٔ عمر کی دعائیں کرتی۔
یہ تو خیر وہ جانتی تھی کہ جلیس الحسن کو اپنے بچوں سے پیار ہے مگر اس درجہ عشق کا اُسے گمان بھی نہ تھا۔
وہ جلیس الحسن جن کے لباس کو اُس نے کبھی ملگجا یا شکن آلود نہ دیکھا تھا جن کے بال کبھی بے ترتیب نہ ہوتے تھے۔ جن کا سراپا ہمیشہ اُن کی پسندیدہ خوشبو میں بسا رہا کرتا تھا جس نے انھیں بہت باہمت اور اولوالعزم پایا تھا، ان دنوں عجیب وحشت خیزی کا شکار نظر آرہے تھے!
"الفت! اگر اعجاز کو کچھ ہو گیا تو میں پاگل ہو جاؤں گا۔" انھوں نے ایک رات اعجاز کے سرہانے الفت سے کہا۔
"خدا پر بھروسا رکھیے۔"
"یہ بچے میری زندگی ہیں، میری خوشی ہیں۔" جلیس الحسن روہانسے ہو رہے تھے۔
"میں جانتی ہوں۔"
"اُس نے تمہارے ساتھ جو زیادتیاں کیں انھیں معاف کر دو۔"
"پلیز!" الفت نے تڑپ کر اُن کی طرف دیکھا۔ "ایسی باتیں مت کیجیے۔"
"میں جانتا ہوں...... مجھے احساس ہے کہ اس سے تمہارے معاملے میں خطائیں سرزد ہوئی ہیں۔ میں نے مداخلت نہیں کی، یہ دوسری بات ہے مگر مجھے احساس ہے کہ تم نے انتہائی صبر و تحمل سے کام لیا ہے۔ پلیز اسے معاف کر دو۔۔۔" وہ انتہائی جذباتی ہو رہے تھے۔
الفت کی آنکھیں بھر آئیں۔
"اگر آپ مجھے اپنے بچوں کی ماں سمجھتے ہیں تو آپ کو مجھ سے ایسی بات نہیں کرنی چاہیے۔" اُس نے بھیگی ہوئی آواز میں کہا۔ "کیا آپ کے خیال میں کوئی ماں اپنے دل میں اولاد کے خلاف کدورت رکھ سکتی ہے؟ میں یہ دعویٰ تو نہیں کر سکتی کہ یہ بچے مجھے بھی اُسی قدر عزیز ہیں جتنے آپ کو ہیں مگر یہ مجھے عزیز ہیں کیونکہ مجھے آپ کی زندگی اور آپ کی خوشی دونوں عزیز ہیں۔"
اعجاز کی عیادت کے لیے جلیس الحسن کے عزیز و اقارب کا بھی آنا جانا لگا ہوا تھا۔ اعجاز کے سرہانے الفت کی ہمہ وقت موجودگی اور اعجاز کی پورے انہماک سے تیمارداری کو اپنی ذہنیت اور اپنے ظرف کے مطابق معانی اخذ کیے جا رہے تھے۔
بعض کا خیال تھا کہ وہ جلیس الحسن کو مرعوب کرنے اور دنیا والوں کی ہمدردیاں اور واہ واہ سمیٹنے کی خاطر دکھاوا کر رہی ہے۔
جبکہ وسیع القلب اور اعلیٰ ظرف لوگ الفت کے خلوص اور اس کی بےغرضی کا کھلے دل سے اعتراف کرتے ہوئے اُسے قابلِ توصیف قرار دے رہے تھے۔
تمکین اور زرین کی کئی سہیلیاں بھی اعجاز کی عیادت کو آئیں۔
الفت کے میکے والوں بالخصوص بابا، بھیا اور تہنیت کے دولہا سہیل نے جس خلوص کا مظاہرہ کیا اُس سے جلیس الحسن کے دل میں اُن کی قدر بہت بڑھ گئی تھی اور الفت سربلندی محسوس کر رہی تھی۔
خدا خدا کر کے تیرھویں دن اعجاز کو ہوش آیا اور نیم جان متعلقین کو اپنے قلب و روح میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑنے کا احساس ہوا۔
مگر ہوش میں آنے کے بعد اعجاز کو اپنی تکلیف کا احساس جس شدت سے ہوا وہ ان سب کے لیے سوہانِ روح بن گیا۔

زخم دیکھیں لیتے تو اس بُری طرح چلّاتا اور تڑپتا کہ وہ سب جی جان سے لرز جاتے۔ چونکہ الفت ہمہ وقت اس کے پاس ہوتی اس لیے اس پر اعجاز کے تکلیف سے تڑپنے کا زیادہ اثر ہوتا۔

اس میں شک نہ تھا کہ حادثے کے بعد اعجاز کی تیرہ روزہ بے ہوشی کے دوران اس نے ایسی بے غرضی اور لگن کا مظاہرہ کیا تھا کہ یہ تیرہ دن اُس کی برسوں کی ریاضت پر بھاری تھے۔

اعجاز جب تک بے ہوش رہا اُسے کچھ خبر نہ تھی کہ کون اُس کی تیمارداری کر رہا تھا، کون اس کی دیکھ بھال کی خاطر رت جگے کر رہا تھا۔ کون اُس کی عیادت کو آیا اور کس نے کس طور اُس سے اپنی محبت کا اظہار کیا۔

کاش اُس کی بے ہوشی کے دوران اُس کا ذہن گزشتہ تیرہ روز کے شب و روز کی عکس بندی کر سکتا تو وہ جان پاتا کہ اُس کے چاہنے والے اُس سے کتنی محبت کرتے تھے۔

ہوش میں آنے کے بعد اُس نے تکلیف کا اظہار جو کیا سو کیا، پوری طرح ہوش میں آنے کے بعد اپنے قریب الفت کی موجودگی پر شدید ردِعمل کا اظہار کیا۔

یہ تو اُس سے نہ کہہ سکتا تھا کہ میرے پاس سے چلی جاؤ مگر اُس کی صورت نہ دیکھنے کی خاطر وہ جاگتے میں بھی آنکھیں زیادہ تر موندے ہی رکھتا۔

دوا عموماً نرس ہی پلاتی تھی لیکن کبھی کبھار الفت کو بھی یہ ذمے داری پوری کرنی پڑتی، ایسے میں اعجاز کے چہرے کے تاثرات دیدنی ہوتے۔

وہ بے بس تھا کہ ہاتھ پاؤں ہلانے سے قاصر بستر پر پڑا تھا ورنہ الفت کے ہاتھ سے دوا تو دوا امرت بھی نہ پیتا۔

غذا رقیق دی جا رہی تھی۔ کیونکہ بائیں جبڑے پر شدید ضرب آئی تھی۔ کھلانے پلانے کا فریضہ زیادہ تر الفت ہی انجام دے رہی تھی مگر اُس کے ہاتھ سے کھاتے پیتے ہوئے بھی اعجاز آنکھیں بند رکھتا۔

اعجاز کے ہوش میں آنے اور ایک دو روز میں حالت قدرے سنبھلنے کے بعد الفت نے جلیس الحسن کو زبردستی اپنے دفتری معمولات کی جانب راغب ہو جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ فراز، نگین اور زرین کو بھی سمجھا بجھا کر اسکول، کالج اور یونیورسٹی جانے کا پابند کیا۔ اُس نے ان سب کو یقین دلایا کہ اعجاز کی وہ چنداں فکر نہ کریں۔ وہ اُس کی دیکھ بھال کو ہمہ وقت اُس کے پاس تھی۔ ویسے بھی خدا کے فضل سے اب وہ خطرے سے باہر تھا۔

اعجاز کی باطنی کیفیت سے الفت بے خبر نہ تھی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اعجاز اپنے قریب اس کی موجودگی کو بحالتِ مجبوری جبراً اور قہراً برداشت کر رہا ہے۔ وہ دیدہ منظروں سے وہ اعجاز کے گھائل چہرے پر بکھری ناگواری دیکھ جاتی۔ مگر اپنے دل میں اُس کے خلاف کوئی حرفِ شکایت نہ آنے دیتی۔

اعجاز سے اُسے جتنی شکایتیں تھیں، وہ اُس نے بے ہوشی کے تیرہ دنوں میں اپنے دل سے اکھاڑ پھینکی تھیں اور اب انہیں کسی صورت بھی اپنے دل میں جڑ پکڑنے نہیں دینا چاہتی تھی۔

اعجاز کے ہوش میں آنے کے بعد جلیس الحسن اور بچوں نے لاکھ چاہا کہ اب ایک دو روز کو وہ گھر جا کر آرام کرے اور ان میں سے کوئی اعجاز کے پاس رک جائے مگر الفت نے منع کر دیا۔

ایک روز اس سلسلے میں جلیس الحسن کا اصرار حد سے بڑھا تو اُس نے سرگوشی میں اُن سے کہا "کیا آپ کو مجھ پر بھروسا نہیں ہے؟"

"نہیں..... ایسی تو کوئی بات نہیں۔" وہ خفت سے بولے۔

"بس تو اصرار مت کیجیے، مجھے اعجاز کے پاس رہنے دیجیے۔"

"میں تو اس خیال سے کہہ رہا ہوں کہ تم تھک گئی ہو گی۔" جلیس الحسن نے صفائی پیش کی۔

"جی نہیں بلکہ سچ پوچھیے تو اعجاز کی دیکھ بھال کر کے مجھے سکون ملتا ہے۔"

جلیس الحسن اُس کا منہ دیکھتے رہ گئے۔

پھر ایک روز نگین نے کہا "ماما! آج آپ گھر چلی جائیں، میں جاجی کے پاس رک جاتی ہوں۔"

"بیٹا! تمہیں یونیورسٹی جانا ہو گا۔"

"کل فرائی ڈے ہے ماما۔"

"اچھا!" الفت مسکرا دی پھر اُس کا ہاتھ تھام کر بڑی محبت سے بولی "جب بڑے موجود ہوں تو بچے بالخصوص بچیاں تیماردار بن کر اسپتال میں رہتی اچھی نہیں لگتیں۔"

"آئی ایم ناٹ اے بچی ماما۔ میں ایم ایس سی کی اسٹوڈنٹ ہوں۔"

"میری جان! ہمارے لیے تو تم ہمیشہ بچی ہی رہو گی۔"

"اوہ ماما! آپ کے پاس تو ہر بات کا جواب ہوتا ہے۔" نگین مسکرا دی اور اُس نے اصرار کیا "آپ کتنے دنوں سے اسپتال میں ہیں تھک گئی ہوں گی اب آپ ایک دو روز نہیں کم از کم آج رات تو گھر جا کر آرام کر لیجیے۔ یہاں کتنی بے آرام رہتی ہیں آپ۔"

"تمہیں کیا معلوم کہ کتنے آرام سے رہتی ہوں میں یہاں۔ گھر جاؤں گی تو یہی فکر رہے گی کہ خدا جانے اعجاز کو بروقت دوا ملی ہو گی کہ نہیں؟ اُسے تکلیف تو زیادہ نہیں۔ بیڈ پین کلر کی ضرورت تو نہیں؟"

"میں سب دیکھ لوں گی۔"

"نہیں بیٹا! میں تو اب جاجی کے ساتھ ہی اسپتال سے ڈسچارج ہوں گی۔"

نگین مسکرا دی۔

"کیا یہ آپ کا آخری فیصلہ ہے؟"

"بالکل آخری۔"

"ٹھیک ہے ماما آپ جیتیں ہم ہارے۔"

فراز نے بھائی کے پاس رکنا چاہا تو الفت نے کہا "نہیں بھئی تمہیں تو میں ہرگز اجازت نہیں دوں گی۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ مرد اچھے نرس ثابت ہو سکتے تو آج دنیا بھر کے اسپتالوں میں فیمیل نرسیں نہ بکھری پڑی ہوتیں۔"

"یقین کیجیے میں ایک اچھا میل نرس ثابت ہوں گا۔"

"نرسنگ کا کوئی سابقہ تجربہ ہے؟"

"نہیں۔"

"تو پھر زبانی کلامی آپ کے یقین دلانے سے میں کیسے یقین کر لوں کہ آپ ایک اچھے میل نرس ثابت ہو سکتے ہیں۔"

فراز جھینپ کر مسکرا دیا۔

الغرض الفت نے اعجاز کی تیمارداری کا فریضہ ایک رات کے لیے بھی کسی اور کو سونپ کے نہ دیا۔

اور اُس کی استقامت نے اعجاز کو عجیب مشکل میں ڈال دیا۔ دن تو جوں توں گزر جاتا مگر رات کو بھی اس کی موجودگی اعجاز کو سخت گراں گزرتی۔

وہ آنکھیں موند کر سوتا بن جاتا لیکن پلکوں کے موہوم جھروکوں سے الفت کو دیکھے جاتا۔ اُس کے قریب ہی ایزی چیئر پر بیٹھی وہ رات گئے تک کچھ نہ کچھ پڑھتی رہتی۔ قرآن مجید پڑھ کر آہستہ آہستہ اُس پر دم کرتی رہتی۔ بیٹھے بیٹھے تھک جاتی تو ذرا دیر کو پڑ رہتی لیکن کچھ دیر بعد پھر اُس کے نزدیک آ بیٹھتی۔ کبھی جھک کر اُس کے چہرے کے زخموں کا جائزہ لینے لگتی۔

سات آٹھ روز تک تو اعجاز نے بادلِ ناخواستہ الفت کو اپنی تیماردار کی حیثیت سے برداشت کیا پھر اُس نے ایک روز نگین سے اس وقت جبکہ جلیس الحسن الفت کے ہمراہ باہر میز و نائن پر پڑی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے کہا "نگی! آئی کانٹ ٹالریٹ ہر۔"

نگین نے بھائی کے بالوں میں پریم سے اپنی انگلیاں گھماتے ہوئے کہا "بھائی! اب ایسی باتیں مت کرو۔"

"کیوں؟ اب کوئی خاص بات ہو گئی ہے کیا؟"

"ہاں۔" نگین نے کہا "تم تو یہ کہتے ہو کہ تم انھیں برداشت نہیں کر سکتے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ تمہارے ایکسیڈنٹ کے بعد انھوں نے تمہارا اتنا خیال رکھا ہے کہ شاید ہماری اپنی ماما بھی نہ رکھ پاتیں۔ انھوں نے بہت کچھ کیا ہے بھائی....."

نگین نے توقف کیا پھر بولی "ہم سب تو پاگل ہو گئے تھے تمہارے ایکسیڈنٹ کے بعد۔ پاپا کا الگ بُرا حال تھا۔ اب میں سوچتی ہوں کہ اگر اس موقع پر یہ نہ ہوتیں تو ہم لوگ کیا کرتے۔ ہم میں سے ایک ایک کو تسلی اور سہارا دیا۔ پھر تمہاری جس طرح سے دیکھ بھال کی اُن کے اس احسان کو میں تو کم از کم کبھی نہیں بھول سکوں گی۔"

"بہرحال میں..... میں زیادہ دیر برداشت نہیں کرسکتا انھیں۔"

نگین نے ایک غیر معمولی تبدیلی محسوس کی۔

اعجاز الفت کے بارے میں ہمیشہ اہانت آمیز لہجہ اختیار کرتا رہا تھا۔ اُس کی لغت میں الفت کے لیے اب سے پہلے "انھیں" کا لفظ تو گویا تھا ہی نہیں۔

الفت کے لیے اُس نے پہلی بار "انھیں" کا لفظ استعمال کیا تھا اور نگین اُسے ایک خوش آئند تبدیلی سمجھنے میں حق بجانب سمجھی جاسکتی تھی۔

"وہ بہت اچھی ہیں اعجاز۔"

"ہوں گی۔ آئی ڈونٹ کیئر۔"

"اچھا ایک بات بتاؤ اب تو بہت دن ہو گئے بلکہ کئی سال ہو گئے اب تک اُن سے تمہاری نفرت کی وجہ؟"

"بس مجھے اچھی نہیں لگتیں۔"

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔"

"بات ہو یا نہ ہو میں نے اپنے دل کی بات تمہیں بتا دی ہے۔ وہ مجھے ذرا اچھی نہیں لگتیں۔"

"ایک بات کہوں بھائی؟"

"ہاں کیا؟"

"بعض لوگ ہمیں اچھے نہیں لگتے مگر درحقیقت وہ بہت اچھے ہوتے ہیں۔ میں سمجھتی ہوں تمہارا اور مما کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ مما تمہیں اچھی نہیں لگتیں مگر درحقیقت وہ بہت اچھی ہیں اور دیکھو تم نے یہ بات کہ تم انھیں برداشت نہیں کرسکتے مجھ سے تو کہی اور میں نے سُن کر تمہیں سمجھا بجھا بھی دیا لیکن اگر یہ بات تم کسی اور سے بلکہ میں سمجھتی ہوں کہ پاپا سے بھی کہو گے تو وہ زبان سے کہیں یا نہ کہیں دل میں بہ ضرور سوچیں گے کہ یہ کیسا احسان فراموش لڑکا ہے کہ جس نے اس کے لیے دن رات ایک کر دیے مسلسل تیرہ راتیں ایک ٹانگ سے کھڑے ہو کر اس کا خیال رکھا اُسی کو بُرا کہہ رہا ہے۔" نگین نے توقف کیا پھر دلسوز لہجے میں بولی "نہیں جانی کسی اور کے سامنے ایسی بات زبان سے کبھی مت نکالنا اور بہتر ہے اب ان کے خلاف اپنے دل سے کدورت کو دُور کرکے اس اعتراف کو دل میں جگہ دینے کی کوشش کرو کہ وہ بہت اچھی ہیں۔"

اعجاز کچھ بولا نہیں۔

اُس نے آنکھیں موند لی تھیں۔

نگین سمجھ گئی کہ وہ اس سلسلے میں مزید کوئی بات کرنا چاہتا تھا نہ سُننا۔

"اب تکلیف زیادہ کہاں ہوتی ہے؟"

"شانے میں اور پنڈلی میں۔"

"چہرے کے زخم تو تقریباً سب ہی سوکھ چلے ہیں۔" نگین نے اُس کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا "جبڑے کا کیا حال ہے؟"

"برائے نام تکلیف رہ گئی ہے۔" اعجاز نے بدستور آنکھیں موندے رکھیں۔

"خدا کا شکر ہے۔"

"فراز اور زرین نہیں آئے آج؟"

"زرین کا کل فزکس کا ٹیسٹ ہے پاپا نے فراز سے کہا تم بہن کے ساتھ گھر پر رکو ہم دونوں اسپتال ہو آتے ہیں۔"

وہ کچھ دیر کو چپ ہو رہا پھر اس نے آنکھیں کھول کر دروازے کے رُخ دیکھا اور دھیرے سے بولا "کسی نے ممی کو تو اطلاع نہیں کی؟"

ذرا دیر کو نگین سکتے میں رہ گئی۔

کہیں وہ یہ تو نہیں کہنا چاہ رہا تھا کہ ممی کو اس حادثے کی اطلاع دینی ضروری تھی!

"اُن کا ایڈریس ہی کب تھا ہمارے پاس۔" نگین نے بوجھل آواز میں کہا۔

"خیر اطلاع تو عالیہ آنٹی، عارفہ آنٹی یا انکل کے ایڈریس پر دی جاسکتی تھی۔"

"کیا تمہارے خیال میں انھیں اطلاع دینی چاہیے تھی؟"

اعجاز کچھ نہیں بولا۔

"کبھی کبھی میں سوچتی ہوں جانے کیا انھیں کبھی ہمارا خیال نہیں آتا ہوگا؟" نگین نے گمبھیر آواز میں کہا۔

اعجاز نے آنکھیں دوبارہ موند لی تھیں۔ اس کے پپوٹوں پر لرزش سی طاری تھی۔

نگین کا جی کٹ سکے رہ گیا۔

وہ اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھی کہ کئی برس گزر جانے کے باوجود بھی اعجاز ماں کے بارے میں ویسا ہی جذباتی تھا جیسا اُن کے جانے کے بعد پہلے دن! اُن کی تصویر آج بھی اُس نے اپنے سرہانے دیوار پر لگا رکھی تھی۔

شاید اس لیے کہ وہ اُن لوگوں میں سے تھا جن کے دلوں میں آباد محبتیں گرم و سرد زمانے سے بے نیاز ہو کر سدا سرسبز رہتی ہیں۔

یا پھر یہ اس رشتے کا سحر تھا جو ممی اور ان چاروں کے درمیان تھا۔

وہ سب اچھی طرح جانتے تھے کہ لغزش ممی سے سرزد ہوئی تھی۔

غلطی سراسر انھی کی تھی۔

مگر پھر بھی ان میں سے کوئی بھی انھیں قابلِ نفرین قرار نہ دے پایا تھا۔

اور یہ بڑی عجیب غیر معمولی اور غیر فسانوی سی بات لگتی تھی۔

قصے کہانیوں میں تو انھوں نے یہی پڑھا اور تمثیل میں دیکھا تھا کہ بچوں کو چھوڑ کر چلی جانے والی ماؤں سے اُن کے بچے محبت کرنا ترک کر دیتے ہیں۔

مگر اُن کا ذاتی تجربہ یہ ثابت کرتا تھا کہ ماں اس لحاظ سے خوش قسمت ہوتی ہے کہ اس کی لغزش کے باوجود اولاد عموماً محبت ہی کرتی ہے اور قابلِ نفرین نہیں قرار دے پاتی۔

نہ جانے کیوں بعض ایسی اولاد کے بھروسے اور اعتماد اُس کی محبت اور چاہت کو ٹھکرا کر اپنے منتخب کردہ راستوں پر چل پڑتی ہیں۔

اعجاز کو اسپتال سے تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد ڈسچارج کیا گیا۔

بیشتر زخم مندمل ہو چکے تھے۔

کاری زخم دھیرے دھیرے بھر رہے تھے۔

مگر مضروب ہڈیوں پر پلاسٹر چڑھا ہوا تھا۔

اسپتال سے ڈسچارج کرتے وقت ڈاکٹروں نے بتا دیا تھا کہ پلاسٹر کھلوانے کے لیے اعجاز کو کس دن اسپتال لانا ہوگا۔

الفت کی خواہش کے مطابق اعجاز کے گھر پہنچتے ہی صدقہ دیا گیا۔ شہر کے ایک معروف ادارے میں خیرات بھجوائی گئی۔ اہلِ خانہ نے شکرانے کے نوافل ادا کیے۔

آنے کو اعجاز اسپتال سے خوش خوش گھر آیا مگر بہت سی مشکلات بھی ساتھ ہی چلی آئیں۔ ہنسلی، شانہ، پسلیاں اور پنڈلی سب ہی تو مضروب تھے۔ ڈاکٹروں کی رائے کے مطابق ابھی اُسے کافی دن بستر ہی پر گزارنے تھے۔

اسپتال سے اعجاز کے گھر واپس آنے کے بعد پہلا مسئلہ تو یہ درپیش ہوا کہ اعجاز کو اوپر اُس کے کمرے میں لے جایا جائے یا نیچے ہی رکھا جائے۔ اعجاز تو یہی چاہتا تھا کہ اُسے بذریعہ اسٹریچر اُسی کے کمرے میں پہنچا دیا جائے۔

لیکن الفت نے جلیس محسن کو یہ رائے دی کہ اعجاز کو نیچے ہی رکھا جائے تاکہ اُس کی مناسب دیکھ بھال کی جاسکے۔ اعجاز کو بھی سہولت تھی اور تیمارداری کرنے اور عیادت کے لیے آنے والوں کو بھی۔

اعجاز کے کمرے سے اس کا اسباب نیچے لے آنا چنداں دشوار نہ تھا مگر اعجاز کو اوپر دقت ہونے کا

احتمال تھا۔ اب جبکہ الفت گھر آ چکی تھی اُسے خانہ داری پر بھی توجہ دینی تھی۔ اعجاز کے زیریں منزل پر رہنے کی صورت میں وہ خانہ داری اور اعجاز دونوں پر توجہ دے سکتی تھی۔

نیچے تین کمرے خالی پڑے تھے۔ اُن میں سے ایک جلیل احسن اور الفت کے کمرے سے متصل تھا۔ الفت نے اعجاز کے لیے وہی کمرہ آراستہ کروا دیا۔

گو واحد مسئلہ یہی نہیں تھا۔

اگرچہ اسپتال میں الفت اس کی بیشتر ضروریات کے سلسلے میں اُس کی مددگار رہی تھی لیکن اُسے حوائج ضروری سے وارڈ بوائے ہی فارغ کرواتے تھے۔ مگر گھر آنے کے بعد اعجاز نے اس سلسلے میں افرادِ خانہ یا نوکروں میں سے کسی کو اپنے نزدیک آنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ انتہائی عجلت میں ایک قریبی نجی اسپتال کی انتظامیہ کی مدد سے ایک کل وقتی مرد خدمتگار کا بندوبست کیا گیا۔

الفت نے اعجاز کے نئے کمرے میں ہر ممکنہ سہولت فراہم کرنے کی کوشش کی۔ اس کی کتابیں، اخبارات، رسائل، جرائد، ریڈیو کیسٹ پلیئر، ٹیلیویژن غرض تفریح کا ہر سمعی و بصری ذریعہ اُس نے اعجاز کے کمرے میں مہیا کر دیا۔ گھر میں دو ٹیلیفون تو تھے ہی ایک اُس کے سرہانے لا دھرا تاکہ وہ جب جی چاہے اپنے دوستوں سے باتیں کر کے جی بہلا سکے۔

علاوہ ازیں اُس کے کمرے میں چھوٹے سائز کے ایک فریج کی سہولت بھی بہم پہنچا دی گئی جس میں اسبابِ خورد و نوش رکھوا دیا گیا۔

ماسوا اس کے کہ اعجاز زیادہ چلنے پھرنے، خود کروٹ لینے یا چلنے پھرنے سے قاصر تھا خدا کے فضل سے اس کی حالت ہرگز ایسی نہ تھی کہ کسی کو اس کے سرہانے بیٹھ کر راتیں آنکھوں میں گزارنے کی ضرورت درپیش آتی۔ چنانچہ خدمتگار کا بندوبست ہو جانے پر اعجاز کے کمرے میں اُس کے لیے بھی الفت نے سنگل بیڈ ڈلوا دیا۔

اسپتال سے گھر آ جانے اور اعجاز کے لیے خدمت گار کا بندوبست ہو جانے کے باوجود الفت نے اعجاز کی تیمارداری کی بیشتر ذمہ داریاں بدستور اپنے ہی ذمے رکھیں تاہم نگین، نسرین اور فراز بھی اس کا ہاتھ بٹانے کی کوشش کرتے۔ ایسے وقت پر دوا اور وقت پر کھانا کھلانا الفت کے نزدیک ہر دوسرے کام سے زیادہ اہم قرار پا چکا تھا۔

الفت کو اس امر کا اندازہ تو اسپتال ہی میں ہو چکا تھا کہ اعجاز اُس کے قرب اور اُس کے ہاتھ سے دوا لینے اور کھانے پینے کو پسند نہیں کرتا۔ گھر آنے اور خدمت گار کا بندوبست ہو جانے کے بعد اعجاز نے اس سلسلے میں اپنی برملا ناگواری کا اظہار شروع کر دیا۔

مگر الفت نے اس کی ناگواری کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ وہ جانتی تھی کہ اعجاز کو اپنے اعتماد میں لینے اور اس کے دل میں گھر کر لینے کا یہ بہترین موقع تھا اگر یہ ہاتھ سے نکل گیا تو شاید وہ اعجاز کے نزدیک کبھی بھی نہ ہو سکے گی کیونکہ اب وہ عمر کی اس منزل میں داخل ہو چکا تھا جہاں فرد کے ذہن میں پختہ نظریات جڑیں پکڑنے لگتے ہیں۔

اور کچھ عجیب بات یہ تھی کہ اسپتال میں تقریباً ڈیڑھ ماہ تک اُس نے اعجاز کی ایسی ناز برداری اور تیمارداری کی تھی کہ جب وہ اعجاز کو اسپتال سے ڈسچارج کیے جانے کے بعد اُسے لے کر گھر آئی تو اُس کا دل کچھ ایسی کیفیت سے معمور تھا جیسے وہ اپنا بچہ اسپتال سے لے کر لوٹی ہو!

اُس نے اعجاز کے لیے اپنے دل کے سارے دروازے وا کر دیے تھے۔

چنانچہ جب اعجاز نے اُس کے خاطر داری کرنے اور خدمت گار کے ہوتے ہوئے بھی خدمت گاری کرنے کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھنا اور ناگواری کا برملا اظہار کرنا شروع کیا تو ایک روز الفت نے اُس سے واشگاف الفاظ میں کہہ دیا۔

"بیٹا! آپ پسند کرو یا نہ کرو کھانا پینا تو آپ کو میرے ہی ہاتھ سے پڑے گا۔"

"اچھی زبردستی ہے۔" وہ منہ بنا کر بولا۔

"اب تو یہی ہوگا۔" الفت نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اور اُس کی مسکراہٹ نے اعجاز کی جھنجھلاہٹ پر وہی کام کیا جو جلتی پر تیل کیا کرتا ہے!

"مسٹر برکت! مجھے کروٹ تو بدلوا دیں۔" اعجاز نے خدمت گار سے کہا۔

"کروٹ بھی لے لینا بیٹے پہلے یہ دلیہ تو کھا لو جو میں تمہارے لیے بنا کر لائی ہوں۔"

"مجھے بھوک نہیں ہے۔"

"پلیز!" اُس نے لجاجت سے کہا۔

خدمت گار مسکرا دیا اور الفت اُسے مسکراتے دیکھ کر خجل ہو گئی۔

"ذرا دیکھیے تو مسٹر برکت بھی مسکرا رہے ہیں کہ یہ کیسے ماں بیٹے ہیں جو ہر وقت ایک دوسرے سے الجھتے ہی رہتے ہیں۔"

الفت نے اپنی خجالت کو مسکراہٹ کی آڑ میں چھپانے کی کوشش کی۔

"آئی سو سوری میڈم!" خدمت گار نے کہا۔ "ہم اپنا پورا لائف میں آپ کا مانک اسٹیپ مدر نہیں دیکھا۔"

"اسٹیپ مدر؟" الفت نے استعجاب کا اظہار کیا۔ "آپ سے کس نے کہا مسٹر برکت کہ... میں اسٹیپ مدر ہوں؟"

"وہ کک... آئی مین... کھانساماں نے بتایا۔"

الفت جی ہی جی میں خانساماں پر تاؤ کھا کے رہ گئی۔

"مسٹر برکت۔" اُس نے بڑے تحمل سے کہا "ماں صرف ماں ہوتی ہے۔"

"یو آر رائٹ میڈم۔" اعجاز کے خدمت گار نے کہا۔

"تھوڑا سا کھا لو بیٹا۔" الفت نے اعجاز کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔ پھر سرگوشی میں انتہائی لجاجت سے بولی "کم از کم مسٹر برکت کو تو یہ تاثر نہ ملے کہ تم میرے ہاتھ سے اس لیے کھانا پینا پسند نہیں کرتے کہ میں تمہاری سوتیلی ماں ہوں۔"

اعجاز نے بادلِ ناخواستہ ہتھیار ڈال دیے۔

اسپتال سے اعجاز کے گھر آ جانے کے بعد اُس سے ملنے کے لیے آنے والوں کا تانتا بندھ گیا جو اسپتال میں عیادت کو آتے رہے تھے وہ بھی آئے اور ان کے علاوہ کئی متعدد دوست احباب۔ ایک جاتا تو دوسرا آتا۔

الفت کے گمان میں بھی نہ تھا کہ اُس کے اتنے بہت سے دوست ہوں گے۔

شام کے وقت تو باقاعدہ بیٹھک جمنے لگی جو رات تک جاری رہتی۔ الفت نے کمرے میں کئی کرسیاں اور فینسی موڑھے ڈلوا دیے تھے۔ اعجاز کے پلنگ کے اردگرد بیٹھ کر سارے دوست وہ بلند بانگ قہقہے لگاتے کہ الاماں! اعجاز کا دل بہلا رہتا۔

اعجاز کے بستر پر پڑنے سے گھر میں نئے انداز کی گہما گہمی آ گئی تھی۔

الفت اعجاز کی عیادت کو آنے والے دوستوں کی خاطر مدارات میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتی۔ جب ان کی نشست جمتی تو بذاتِ خود اُن سے چائے یا کافی کی بابت استفسار کرتی۔ چائے اور کافی بھجواتی تو بسکٹ، کیک، پھل، مٹھائی اور میوہ جات قسم کے لوازمات بھی ضرور ہوتے۔

موقع اور محل کے اعتبار سے کبھی کبھار کچھ دیر کو اُن کے ساتھ جا کر بیٹھ بھی جاتی لیکن چونکہ وہ اُس کی موجودگی میں سنجیدہ اور محتاط ہو جایا کرتے تھے اس لیے کم ہی مخل ہوتی تاہم جب کبھی اُن سے بات کرنے کا اتفاق ہوتا بہت تحمل، شائستگی اور محبت سے کرتی اور انہیں نوجوان اور لاابالی سمجھ کر نظرانداز کرنے کی کوشش نہ کرتی بلکہ پوری اہمیت اور احترام دیتی۔

نتیجتاً اعجاز کے دوستوں میں بھی اُس کی مقبولیت کا گراف کچھ اسی طور اوپر گیا جیسا کہ نگین کی سہیلیوں میں گیا تھا۔

"یار! تمہاری والدہ بہت اچھی خاتون ہیں۔" کوئی کہتا۔

"یار اعجاز! تم خوش قسمت ہو کہ تمہیں نوجوان نسل کے جذبات کا بھرپور احساس رکھنے والی ماں ملی ہیں ورنہ عام طور تو مائیں رعب جمانی ہی رکھتی جاتی ہیں۔" بے لاگ تبصرہ کیا جاتا۔

"شی از ویری نائس!" برملا اعتراف کیا جاتا۔

"بہت اچھی ہیں تمہاری مدر۔" خراجِ تحسین پیش کرنے کی یہ بھی ایک صورت تھی۔

اعجاز کے دوستوں کی موجودگی میں الفت اعجاز سے جان بوجھ کر ضرورتاً یا برسبیل تذکرہ ہمکلام ہونے کی کوشش کرتی۔

نگین کی طرح اعجاز بھی [illegible] شفقت کے ساتھ [illegible] طرزِ عمل میں وہ حق بجانب تھا یا اُس کے دوستوں کی آرا درست تھیں۔

مقررہ مدت کے بعد جب اعجاز کی پنڈلی پر چڑھا پلاسٹر کاٹا گیا تو اعجاز اپنی دانست میں اس گمان میں تھا کہ پلاسٹر کے اترتے ہی وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو جائے گا اور اسٹریچر پر نہیں بلکہ اپنے پیروں پر چلتا گھر واپس جائے گا۔

لیکن وہ اس وقت انتہائی مایوسی سے دوچار ہوا جب پلاسٹر اتارے جانے کے بعد اس نے اپنی ٹانگ کو حرکت دینے کی کوشش کی تو اُسے شدید اذیت کا احساس ہوا اور وہ اپنی ٹانگ کو حرکت دینے سے قاصر رہا۔

قریب کھڑے ڈاکٹر نے مسکرا کر کہا "نہیں جناب! ابھی آپ اپنی ٹانگ کو حرکت نہ دے سکیں گے۔ کچھ وقت لگے گا۔"

"لیکن کیوں؟ اب تو پلاسٹر اُتر چکا ہے۔"

"بے شک۔" ڈاکٹر نے کہا "لیکن کئی ہفتوں تک آپ کی ٹانگ پلاسٹر میں جکڑی ایک ہی پوزیشن میں پڑی رہی ہے۔ ظاہر ہے سُن ہو گئی ہو گی۔ اسے دوبارہ اس کی فعالیت پر لانے میں کچھ وقت لگے گا۔"

"فزیو تھراپی ڈاکٹر صاحب؟" جلیس الحسن کے اس فقرے میں پورا سوال پنہاں تھا۔

"صاحب! اگر مجھ سے پوچھیں تو میں تو یہی مشورہ دوں گا کہ آپ یہاں اسپتال کے چکر لگانے کے بجائے گھر پر ہی کچھ بندوبست کر لیں تو بہتر رہے گا۔"

"نو پرابلم ڈاکٹر صاحب... فزیو تھراپسٹ کا میں بندوبست کر سکتا ہوں۔"

"سچ پوچھیے تو کسی پیشہ ور فزیو تھراپسٹ کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ گھر ہی پر روغنِ زیتون کا ہلکا ہلکا مساج روز کا معمول بنا لیا جائے اور یہ ٹانگ کو خود ہی بتدریج حرکت دینے کی کوشش کریں۔ کچھ عرصے کے لیے انھیں بیساکھی کی ضرورت بھی پڑے گی۔" ڈاکٹر نے کہا۔

جلیس الحسن رنجیدہ نظر آ رہے تھے۔

ڈاکٹر نے اعجاز کی جانب توجہ کی اور اُس کے چہرے پر گہرے تفکر اور مایوسی کے سائے لرزاں دیکھ کر اُس کا شانہ دھیرے سے تھپتھپا کر بولا "ڈونٹ وری ینگ مین۔ یو ول بی آل رائٹ۔"

اعجاز نے اپنے لبوں کو پوری شدت سے باہم بھینچ لیا۔

الفت اور جلیس کے لیے یہ اندازہ کرنا محال نہ تھا کہ وہ اس نئی صورتِ حال سے خاصا مایوس اور دل گرفتہ ہوا تھا۔

"اب آپ انھیں گھر لے جا سکتے ہیں... لیکن اسٹریچر پر۔" ڈاکٹر نے کہا۔

"جی بہتر۔"

ڈاکٹر کے جانے کے بعد جلیس الحسن نے فراز سے کہا "چلو بیٹے! ایمبولنس کا بندوبست کیا جائے۔"

"پاپا! میں تو سمجھ رہا تھا کہ بھائی ٹانگ کا پلاسٹر کھلتے ہی اپنے پیروں پر اُٹھ کھڑے ہوں گے"

جلیس الحسن کچھ نہیں بولے۔

ناتجربے کاری بھی انسان کو بعض اوقات بڑی اذیت سے دوچار کر دینے کا سبب بن جایا کرتی ہے۔

جلیس الحسن خود بھی اسی گمان میں تھے کہ اعجاز پلاسٹر کھلتے ہی اپنے پیروں پر اُٹھ کھڑا ہو گا۔ چنانچہ پیش آمدہ صورتِ حال نے انھیں بھی دل گیر کیا تھا۔

فراز کی بات کے جواب میں الفت نے جلیس الحسن کے چہرے پر دل گرفتگی کے سائے مزید گہرے ہوتے دیکھے تو وہ فراز کی طرف دیکھتے ہوئے بولی "بیٹا! انشاء اللہ جلد ہی تمہارا بھائی اپنے پیروں پر بھی اُٹھ کھڑے ہوں گے۔ ڈاکٹر صاحب ٹھیک ہی تو کہہ گئے ہیں کہ جب گزشتہ کئی ہفتوں سے اعجاز کی ٹانگ ایک ہی پوزیشن میں پڑی رہی ہے تو اب اُسے دوبارہ فعال ہونے میں کچھ وقت درکار ہو گا۔"

فراز زبان سے کچھ نہیں بولا مگر اُس کی آنکھوں نے کہا "مجھے تو کچھ گڑبڑ لگتی ہے۔"

پھر فراز اور جلیس الحسن اعجاز کے لیے ایمبولنس کا بندوبست کرنے چلے گئے اور الفت اعجاز کے پاس ہی ٹھہری رہی۔

اعجاز نے آنکھیں بند کر لی تھیں مگر رنج کی شدت اتنی زیادہ تھی کہ وہ اپنی قلبی کیفیت کو اپنے چہرے پر اُمڈ آنے سے نہ روک پا رہا تھا۔

الفت چپ چاپ اُس پر نظریں جمائے کھڑی ہو گئی۔

دفعتاً اعجاز کی بند آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے اور اُس کی کنپٹیوں کو بھگوتے اُس کے بالوں میں گم ہونے لگے۔

اعجاز جیسے کڑیل نوجوان کی آنکھوں سے آنسو بہتے دیکھ کر الفت کو دکھ ہوا۔

وہ ایک دو دن نہیں تقریباً ڈیڑھ ماہ اعجاز کی تیمار داری کرا سپتال میں اُس کے ساتھ رہی تھی۔ تیرہ روزہ بے ہوشی کے بعد جب وہ ہوش میں آیا تو اُس کے جسم کے متضروب حصّوں میں شدید تکلیف تھی لیکن شدید تکلیف کے عالم میں بھی وہ رویا ہرگز نہیں تھا۔ الفت نے پہلی بار اُس کی آنکھوں سے آنسو بہتے دیکھے تھے!

وہ اعجاز پر جھک گئی اور اُس نے اپنے دوپٹے کے پلو میں اُس کے آنسو جذب کرتے ہوئے دھیرے سے کہا۔ "بیٹا! حوصلہ رکھو..... تم جیسے جوان بچے ہمت نہیں ہارا کرتے..... دیکھو تمہارے تندرستی میں جو تکلیف تھی اُس کا بہت ساحصہ تو تم برداشت کر چکے۔ اب تھوڑی سی تکلیف اور ہے پھر انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

اعجاز نے تڑپ کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

"انشاء اللہ بہت جلد تم اپنے پیروں پر چل سکو گے۔"

"نو..... نو..... نیور......" وہ گھٹی گھٹی آواز میں بولا "ڈاکٹر جھوٹ بولتا ہے..... اُس نے جھوٹی تسلی دی ہے..... وہ جانتا ہے کہ میں اب کبھی اپنے پیروں پر نہ چل سکوں گا۔ مجھے بیساکھی پر چلنا پڑے گا۔"

الفت کے لیے یہ اندازہ کرنا مشکل نہ تھا کہ وہ اس وقت رنج و مایوسی کی انتہائی کیفیت سے مغلوب تھا۔ اس امر کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا تھا کہ وہ پہلی بار الفت پر اپنی قلبی کیفیت کا برملا اظہار کر رہا تھا۔

الفت!

جسے وہ اوّل دن سے اپنی دشمنِ جاں گردانتا رہا تھا۔

"بیٹا! مایوس مت ہو..... بیساکھی کی ضرورت تو تمہیں عارضی طور پر رہے گی پھر انشاء اللہ تم اپنے پیروں پر چلنے لگو گے بالکل پہلے کی طرح۔"

وہ کچھ نہیں بولا اور اپنا چہرہ بدستور دوسری جانب موڑے رہا۔

الفت نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ رو رہا تھا اُس سے تو کچھ کہنا سننا مناسب نہیں سمجھا مگر دل ہی دل میں اُس نے بڑی فکر مندی سے سوچا "اگر خدانخواستہ اعجاز دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑا نہ ہو سکا تو پھر کیا ہو گا؟"

جلیس الحسن کی طرح وہ بھی اس ضمن میں اپنی ناتجربے کاری کی بنا پر ہی ایسا سوچ رہی تھی۔ ورنہ ڈاکٹر نے جو کچھ کہا تھا وہ غلط نہ تھا۔

ٹوٹے ہوئے اعضائے انسانی کو دوبارہ فعال ہونے میں واقعی کچھ وقت درکار ہوا کرتا ہے۔

نئی صورتِ حال نے اعجاز کو نفسیاتی طور پر کافی متاثر کیا۔

سب سے پہلے اس نے جس شدید نفسیاتی ردِ عمل کا اظہار کیا وہ یہ تھا کہ اپنے خدمت گار سے کسی بھی قسم کی خدمت لینے سے انکار کر دیا۔

"میں ساری زندگی کسی دوسرے انسان کے رحم و کرم پر ہرگز نہیں رہنا چاہتا۔" اُس نے چلا کر کہا۔

جلیس الحسن بڑبڑا کر رہ گئے اور الفت مسٹر برکت کو بہانے سے باہر لے گئی۔

مسٹر برکت اعجاز کی بہت سی ذاتی ضرورتوں میں اُس کے معاون تھے۔ اُسے بیڈ پین دینا، تم تولیوں سے اس کے جسم کا مساج کرنا، اُس کی شیو بنانا اور چھوٹے موٹے بہت سے کام تھے جنہیں اعجاز خود انجام دینے سے قاصر تھا۔

"آرام سے..... آرام سے بیٹا...... ذرا یہ تو سوچو کہ مسٹر برکت کے جانے کے بعد کتنی مشکل ہو جائے گی تمہیں ۔۔۔"

جلیس الحسن نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"تو کیا میں ساری زندگی مسٹر برکت کے رحم و کرم پہ رہوں گا!" وہ چلایا۔

"کچھ دن کی بات اور ہے۔"

"نہیں یہ آپ کی بھول ہے۔ اب یہ ساری زندگی کی بات ہے اور میں ساری زندگی مسٹر برکت کے رحم و کرم پر نہیں

پڑا رہ سکتا ہے۔"

"بیٹا! پریشانی ہو جائے گی۔ کون کرے گا تمہارے وہ بہت سے کام جو مسٹر برکت کیا کرتے ہیں؟"

"کسی کو کرنے کی ضرورت نہیں.... میں.... میں خود کروں گا.... اپنے کام۔" اس پر ہیجان سا سوار ہو گیا۔ اور وہ ایکا ایکی مسہری کے سرہانے کا سہارا لے کر کھڑا ہونے کی کوشش کرنے لگا۔

"ارے.... یہ کیا کر رہے ہو تم!" جلیس الحسن گھبرا کر اس کی طرف بڑھے اور اُسے اپنے بازوؤں میں سنبھال کر بولے۔

"ہو سکتا ہے جوڑ ابھی کچے ہوں۔ ابھی تمہیں اپنے سہارے پر کھڑا ہونے کی کوشش نہیں کرنا چاہیے۔"

"فار گاڈز سیک لیومی الون۔" وہ اپنی کوشش ناکام رہ جانے پر چلا دیا۔

جلیس الحسن جہاں کے تہاں رہ گئے۔

اعجاز نے اس سے پہلے کبھی اُن سے اس لہجے میں بات نہیں کی تھی۔

ذرا دیر کو وہ دم بخود رہ گئے پھر انھوں نے اس کی ابتر نفسیاتی کیفیت کے پیش نظر اُس کے درشت لہجے کو نظر انداز کرتے ہوئے اُس کے شانے پر ہاتھ دھر کر کہا: "آل رائٹ بیٹا! میں چلا جاتا ہوں لیکن.... تمہیں وعدہ کرنا ہوگا کہ تم کبھی بغیر کسی سہارے کے کھڑے ہونے کی کوشش نہیں کرو گے۔"

وہ کچھ دیر اُس کی یقین دہانی کے پیش نظر کھڑے رہے۔

لیکن جب وہ کچھ نہ بولا تو وہ اپنی بات کو دوسرا رخ دے کر بولے: "میں تمہیں اپنی جان کی قسم دے کر جا رہا ہوں کہ تم کبھی بغیر کسی سہارے کے نہیں کھڑے ہو گے۔"

پھر وہ اُسے تنہا چھوڑ کر کمرے سے نکل گئے۔

فراز کو انھوں نے ہدایت کی کہ وہ کچھ دیر تک مسٹر برکت کو مصروف رکھے۔ پھر انھوں نے الفت کو اعجاز کے کمرے میں اس کی عدم موجودگی میں پیش آنے والی جملہ روداد سنا کر اُس سے مشورہ چاہا۔ اسی دوران نگین بھی آموجود ہوئی۔

الفت کے کچھ کہنے سے پیشتر ہی نگین نے کہا: "پاپا! اعجاز کی طبیعت سے آپ واقف ہیں کہ وہ کتنا ضدی ہے۔ میرا خیال ہے اب وہ مسٹر برکت سے کوئی خدمت لینے پر آمادہ نہ ہوگا۔"

"تو پھر کام کیسے چلے گا؟"

"دیکھیے کچھ دن ہم مل بانٹ کر کام چلا لیں گے پھر اللہ مالک ہے۔"

"اُسے بیڈ پین دینے اور نہلانے دھلانے کا مسئلہ ہوگا۔"

"کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ خدا کے فضل سے ٹیک لگا کر تو وہ کتنے دنوں سے بیٹھنے ہی لگا ہے۔ بیڈ پین کا کیا ہے میں دے دیا کروں گی۔ بیڈ پین وہ فراغت کے بعد نیچے رکھ دیا کرتا ہے مسٹر برکت کی جگہ میں اٹھا لوں گی تو کیا فرق پڑ جائے گا؟"

"آپ.... ما!" نگین نے بے یقینی سے کہا۔

"کیوں بیٹا! اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟ جب بچے چھوٹے ہوتے ہیں تب بھی تو ماں اُن کے سارے کام کیا ہی کرتی ہے۔"

نگین تو پہلے ہی استعجاب کا اظہار کر چکی تھی۔

اب جلیس الحسن بھی تصویر حیرت بن گئے۔

"رہی بات نہلانے دھلانے کی تو فراز زندہ باد! اعجاز کے دوستوں کی مدد لے لیا کریں گے۔"

"پھر بھی اچھی طرح سوچ بچار کر لو مسٹر برکت ابھی یہیں ہیں۔"

"مسٹر برکت کو آپ اعتماد میں لے کر سمجھا دیں کہ بچہ کچھ ڈپریسڈ ہے اُس کے نارمل ہونے کے بعد اگر ان کی ضرورت محسوس کی گئی تو ہم اُن سے رابطہ قائم کر لیں گے۔" الفت نے صلاح دی۔

"ٹھیک ہے۔"

چنانچہ الفت کی صلاح کے مطابق جلیس الحسن نے مسٹر برکت کو اعتماد میں لیتے ہوئے انھیں جملہ صورت حال اور اپنی دشواری سے آگاہ کر دیا۔

"آل رائٹ سر! ہم آپ کا پرابلم سمجھ سکتا ہے۔" مسٹر برکت نے کہا۔ "ویسا ڈاکٹر لوگ آپ کو بالکل ٹھیک بولا ہے۔ مسٹر اعجاز جلدی اپنے پیروں پر بالکل چلیں گا بٹ اٹ ول ٹیک ٹائم۔ ہم اپنا پروفیشنل لائف میں ایسا بہت کیس دیکھا

اٹ رئیلی ٹیکس ٹائم.... پیشنٹ کو پیشنٹ رہنا مانگتا.... کیا!"

مسٹر برکت کو جلیس الحسن نے اُن کے حساب کتاب سے زیادہ دے دلا کر رخصت کیا۔

دوسرے دن انھوں نے ایک معروف معالج سے تفصیلی معائنہ کروایا۔ مذکورہ معالج کی رائے میں اعجاز کی ٹوٹی ہوئی ہڈیاں بالکل ٹھیک جڑ گئی تھیں مگر ٹانگ کو فعال ہونے کے لیے کچھ وقت درکار تھا۔

خود کردہ را علاجے نیست کے مصداق مسٹر برکت کی چھٹی کرانے کے بعد اعجاز خود بڑی مشکل میں پڑ گیا۔ کھڑا ہونے کی بس ایک ہی دفعہ ناکام کوشش کی پھر ہمت ہی نہ کر پایا۔ اول تو تکلیف ہوتی تھی دوسرے یہ خدشہ بھی دکھائی دیتا کہ کہیں کچھ اور ہی نہ ہو جائے۔ جوڑ پھر چٹخ جائیں اور معاملہ کچھ سے کچھ ہو جائے۔

جیسے تیسے الفت ہی بیڈ پین دیتی اور چلمچی میں ہاتھ منہ دھلواتی رہی۔ اعجاز کو بیڈ پین کی ضرورت ہوتی تو اُس کے پلنگ کے نزدیک بیڈ پین اور لوٹا رکھ کر کمرے سے نکل آتی اور دروازہ بند کر دیتی۔ جب وہ فراغت پانے کے بعد گھنٹی بجا دیتا جس کا اُس کے سرہانے اہتمام کر دیا گیا تھا تو وہ اُس کے کمرے میں دوبارہ داخل ہوتی تو پلنگ کے نیچے دھرا بیڈ پین جبیں پر ایک شکن لائے یا منہ بنائے بغیر اٹھاتی اور ملحقہ باتھ روم کا رخ کرتی۔

شروع شروع تو اعجاز کو اس کا بیڈ پین دینا بہت عجیب لگا تھا مسٹر برکت کی چھٹی کیے جانے کے بعد کوئی آٹھ دس گھنٹے تو وہ ضبط کیے پڑا رہا تھا مگر کب تک۔ حوائج ضروریہ کے معاملے میں انسان آخر کب تک برداشت اور ضبط سے کام لے سکتا ہے۔ جب برداشت کی آخری حد آ پہنچی تو اُس نے مجبوراً کہا: "مجھے بیڈ پین چاہیے۔"

اُس کے کمرے میں اس وقت نگین، فراز، نازنین اور الفت موجود تھے۔ اُس کا خیال تھا کہ فراز اس کے لیے بیڈ پین لائے گا لیکن ہوا یہ کہ نگین، فراز اور نازنین تینوں خاموشی سے اٹھ کر کمرے سے نکل گئے بس الفت رہ گئی۔

جب الفت اٹیچڈ باتھ روم سے اُس کے لیے پہلی بار بیڈ پین اور لوٹا لے کر آئی تو وہ سکتے میں رہ گیا۔

"بیٹا! بیڈ پین یہیں پلنگ کے نیچے واپس رکھ دینا۔" الفت نے کہا۔

اُس کی جو کیفیت تھی بس وہی جانتا تھا۔

دم بخود!

سانس گویا اوپر کا اوپر نیچے کا نیچے رہ گیا تھا۔

تب اُسے اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ مسٹر برکت کی چھٹی کرا کے اُس نے اچھا نہیں کیا تھا۔ اب اگر باپ سے کہتا کہ دوبارہ مسٹر برکت کو بلا لیں یا کسی اور خدمت گار کا بندوبست کریں تو گویا اپنے تھوکے کو چاٹنے والی بات ہوتی۔

ناچار چپ رہا۔

اور الفت کی خدمت گاری پر قناعت کرنا پڑی۔

اُسے بیڈ پین دینا اور صاف کرنا الفت ہی کے نام وقف ہو گیا۔

صبح، دوپہر، شام وہ چلمچی اور لوٹا لے کر اُس کا ہاتھ منہ دھلوانے کو بھی کمربستہ ہو جاتی۔

مسٹر برکت کے جانے کے بعد تیسرے روز بالٹی بھر نیم گرم پانی سلیم سے کمرے میں اٹھوا لائی۔ پھر چلمچی لوٹا اور شیمپو کی بوتل اٹھا لائی اور بولی: "اعجاز بیٹے لاؤ آج تمہارا سر دھلا دوں۔"

اعجاز پہلے تو ہکا بکا ہو کر اُس کی صورت دیکھنے لگا پھر اُس نے تردد کیا مگر الفت نے اپنے آگے اُس کی ایک نہ چلنے دی۔

ہنس کر بولی: "گھبراؤ مت بیٹے جان تمہاری آنکھوں میں صابن نہیں لگنے دوں گی۔"

پھر اعجاز کا سر دھلانے کی خاطر جانے کیا کیا تدبیریں کیں۔

سلیم سے نگین کو بلوایا۔

اعجاز کو بستر پر آڑا کر کے لٹایا۔

اُس کا سر بستر سے آگے کر کے نیچے جھکایا۔

سلیم سے کہا کہ اپنے دونوں ہاتھوں میں اعجاز کا سر تھامے رکھے۔

سر کے نیچے چلمچی دھری۔

اور سلیقی کے نیچے پلاسٹک کی ایک بڑی شیٹ بچھائی ہے تاکہ پانی سلیقی سے باہر گرے تو کمرے میں بچھا ہوا قالین نہ بھیگے۔

نگین سے کہا بالٹی سے پانی لوٹے میں بھر بھر کر اعجاز کا سر دھلواتی رہے۔

اور خود نیچے بیٹھ کر اعجاز کا سر دھویا۔

سر دھلوانے کے بعد نیم گرم پانی میں بھیگے تولیوں کی بڑی ٹرے لے آئی۔

اعجاز کی گردن بازوؤں سینے اور پیٹھ کا آہستہ آہستہ مساج کیا۔ صاف ستھرے استری شدہ کپڑے تو پہلے ہی اعجاز کے پلنگ کے نزدیک اُس کی رسائی میں ایک سٹینڈ پر لٹکا دیے تھے۔

سر اور اگلے دھڑ کی صفائی کے بعد اُس نے نچلے دھڑ کا مساج خود اعجاز پر چھوڑا اور بھیگے ہوئے تولیوں کی ٹرے اُس کے نزدیک رکھ کر کمرے سے نکل گئی۔ دروازہ باہر سے بند کر دیا اور جب اُس نے گھنٹی بجا کر فراغت پا لینے کی اطلاع دی تو پھر سارا اسبابِ غسل اُس کے کمرے سے ملازم لڑکے سلیم کی مدد سے سمٹوایا۔

اعجاز کے پلنگ کی چادر بدلوائی۔

کمرے میں ایئر فریشنر اسپرے کیا۔

اور خود اعجاز کو بھی سر تا پا خوشبو میں بسا دیا۔

اعجاز کو شیو کرنا ہوتی تو شیو کا ضروری اسباب اُس کے سامنے دھر کر خود آئینہ دونوں ہاتھوں سے اس کے سامنے تھام کر بیٹھ جاتی۔

اُس کے بتدریج تامل کے باوجود صبح و شام اُس کے جسم کے متاثرہ حصوں بالخصوص پنڈلی پر روغنِ زیتون کا دھیرے دھیرے مساج کرتی۔

اس خدمت گزاری سے قطع نظر اُس نے اعجاز کے لیے ایک ماہرِ تغذیہ سے متوازن اور مقوّی غذا کا ایک ہفتے وار جدول بنوا لیا تھا۔ اور اُس کی سختی سے پابندی کر رہی تھی۔

یہی نہیں بلکہ اعجاز کے دل بہلانے کی خاطر وہ اُس کے قریبی دوستوں کو خود فون کر کے گھر بلاتی کہ وہ کچھ وقت اعجاز کے ساتھ گزار سکیں۔

اعجاز کو اپنے تعلیمی سلسلے میں رخنہ پڑنے کا بہت قلق تھا۔ الفت اُس کے دل سے اس قلق کو دور کرنے کے لیے بالواسطہ اور بلاواسطہ تدبیریں آزما رہی تھی۔

"مسلسل ٹپکنے والا قطرہ آب تو سیسۂ سنگ میں بھی دریچہ کھول دیتا ہے۔

اعجاز کے سینے میں تو گوشت پوست کا نرم و نازک دل تھا۔

الفت کے حسنِ سلوک کی مستقل اور مسلسل یورش نے اُس کے دل میں بھی ننھے ننھے دریچے وا کر لیے۔

اب یہ اور بات تھی کہ ان دریچوں پر ابھی پردے پڑے تھے۔

الفت کی بیس پچیس روز کی مسلسل ریاضت کے نتیجے میں اعجاز بیساکھی کے سہارے بستر سے اٹھنے کے لائق ہو گیا۔ اگرچہ وہ ابھی ٹانگ پر پورا زور اور اُسے بخوبی حرکت تو نہ دے پاتا تھا مگر اتنا ہو گیا کہ ٹانگ پھیلا کر کموڈ پر بیٹھنے لگا اور اپنی ایزی چیئر پر جو الفت نے مستقلاً باتھ روم میں ہی رکھوا دی تھی بیٹھ کر خود ہی غسل بھی لینے لگا۔

الفت کو اب اُسے بیڈ مین دینے، اُس کا سر دھلوانے اور مساج کرنے کی ضرورت تو نہ رہی تھی تاہم بقیہ معمولات بدستور برقرار تھے۔ اُس کے جسم کے متاثرہ حصوں پہ روغنِ زیتون کی مالش وہ باقاعدگی سے کیا کرتی تھی۔

اعجاز کے موجودہ کمرے کے علاوہ جو تیسرے چوتھے دن اس کا بالائی منزل پر واقع کمرہ بھی صاف ستھرا کرواتی رہتی تھی اس کمرے سے اعجاز کا بیشتر ضروری اسباب اُس نے نیچے اُس کے کمرے میں منتقل کروا دیا تھا لیکن غیر ضروری سامان اوپر پڑا رہنے دیا تھا۔

مگر اس کمرے میں ایک چیز ایسی بھی تھی جس کو اُس نے اعجاز کے نقطۂ نظر سے اہم سمجھنے کے باوجود بھی اوپر ہی پڑا رہنے دیا تھا۔ اور وہ تھی اُس کی ماں کی تصویر جو اُس کے سرہانے دل رُبا کرتی تھی۔

چونکہ اعجاز کی مسہری نیچے نہ لے جائی گئی تھی اُس کے لیے متبادل پلنگ فراہم کر دیا گیا تھا اس لیے اس تصویر کا نیچے

نہ لے جا سکنا بلا جواز نظر نہ آتا تھا۔ خود اعجاز نے بھی مذکورہ تصویر کی بابت کوئی استفسار نہ کیا تھا۔

اُس روز صبح تقریباً گیارہ کا عمل تھا۔

نگین یونیورسٹی، فرازانہ اپنے کالج اور زرین اسکول جا چکی تھی۔ جلیس الحسن کو بھی دفتر گئے دیر ہو چکی تھی۔ اعجاز اپنے کمرے میں بستر پر دراز اپنے نصاب کی کتاب کے مطالعے میں مستغرق تھا۔ الفت بالائی منزل پر ماجراں سے صفائی ستھرائی کروا رہی تھی۔ جب وہ اوپر سے نیچے آنے لگی تو اُس نے اعجاز کے کمرے سے عاصمہ بیگم کی فریم شدہ تصویر اُس کے سرہانے سے نکال لی۔

نیچے آنے کے بعد اُس نے اعجاز کے کمرے کی کھڑکی سے اُس کے کمرے میں جھانکا۔ وہ بستر پر دراز کتاب کے مطالعے میں مستغرق تھا۔

الفت نے آگے بڑھ کر اُس کے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔

"کم اِن" اعجاز نے دروازے کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

دروازہ کھلنے پر الفت کا چہرہ دکھائی دیتے ہی وہ دوبارہ کتاب کی جانب متوجہ ہو گیا۔ الفت کا اس کے کمرے میں آنا کوئی غیر معمولی بات نہ رہی تھی۔ وہ اکثر چیزوں کو اُٹھانے دھرانے اور اعجاز کو دیکھنے، اس کی ضروریات کی بابت استفسار کرنے اور آئے وقفے وقفے سے خورد و نوش کا سامان بہم پہنچانے اُس کے کمرے میں آتی ہی رہتی تھی۔

اعجاز نے جو اپنے کمرے میں الفت کی آزادانہ آمد و رفت کا عادی ہو چکا تھا اور جسے اسپتال میں اور اسپتال سے گھر آنے کے بعد بالخصوص مسٹر برکت کی خود اسی کی جھلاہٹ پر چھٹی کیے جانے کے بعد الفت کے حسنِ سلوک نے گنگ کر کے رکھا تھا اس کے اپنے کمرے میں آنے کا کچھ زیادہ نوٹس نہیں لیا اور اس پر اچٹتی ہوئی نظر ڈالنے کے بعد دوبارہ مطالعے میں مستغرق نظر آنے لگا۔

الفت نے عاصمہ کی فریم شدہ تصویر اعجاز کے سرہانے سائیڈ بورڈ پر رکھ دی پھر اعجاز کو مخاطب کرتے ہوئے بولی "بیٹے! ذرا دیکھو تو تمہارے کمرے میں کون آیا ہے؟"

اعجاز نے چونک کر پہلے دروازے کی سمت دیکھا پھر چہار اطراف ایک طائرانہ نظر دوڑائی۔

"اِدھر دیکھو" الفت نے آنکھ کے اشارے سے اُس کی توجہ سائیڈ بورڈ کی طرف مبذول کرائی۔ اُس نے دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔

"اس میں شک نہیں کہ تمہاری مم بہت خوبصورت ہیں۔" اُس نے بظاہر مسکراتے ہوئے کہا لیکن اس کا دل ہی جانتا تھا کہ اُس نے اس منزل سے سُرخرو ہو کر گزرنے کی کتنی بڑی قیمت ادا کی تھی۔

اعجاز ساکت و صامت آنکھیں پھاڑے بے یقینی سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

جب بسلطے ہے کہ دنیا کی ہر شے فانی ہے اُسے ختم ہو جانا اور سرے سے مٹ جانا ہے۔

تو پھر جذبے فانی کیوں نہیں ہو سکتے؟

ہر جذبے کی ایک عمر ہوتی ہے اور اس عمر کی انتہا کو پہنچنے کے بعد وہ جذبہ آپ ہی آپ دم توڑ دیتا ہے، مٹ جاتا ہے، فنا ہو جاتا ہے۔

اعجاز کے دل میں الفت کے خلاف نفرت کی بس اتنی ہی عمر تھی۔

اعجاز کے دل نے اس سے پوچھا:

"بتا اب کیا جواز ہے تیرے پاس اس عورت سے نفرت کرنے کا؟"

دریچہ ہائے دل پر پڑی چلمنیں یک بیک اُٹھ گئیں۔

"آئی ایم سوری۔" اُس نے سر جھکا کر کہا۔

الفت اُس کے پائنتی نے بیٹھ گئی۔

"کیا ہوا؟" اُس نے اعجاز سے پوچھا۔

"میں نے آپ کے ساتھ بہت زیادتی بہت بدتمیزی کی ہے۔" اعجاز نے کسی عادی مجرم کی طرح اعترافِ جرم کرنے کے بعد بوجھل آواز میں کہا۔ "کیا آپ مجھے معاف نہیں کر سکتیں؟"

"ایسی بات مت کرو بیٹا۔" الفت نے کہا۔ "چھوٹوں کی ہر غلطی کی بنیاد بڑوں کا کوئی رویہ، کوئی خطا، کوئی لغزش ہوا کرتی ہے۔" وہ کچھ ٹھہر کر پھر اُس نے بوجھل آواز میں کہا۔ "شاید مجھ سے شروع میں غلطی سرزد ہوئی ہو تو تم اتنے سال مجھ سے دور رہتے۔"

اعجاز نے بےیقینی سے اُس کی طرف دیکھا۔

"آئی نو یو بیٹا..... مجھے..... تم چاروں سے محبت ہے..... یو آر مائی لو..... تم چاروں اس گھر کی رونق ہو۔ بہار ہو۔"

اعجاز نے اپنے سرہانے دھری اپنی ماں کی تصویر کو دیکھا۔

پھر اُس کی نگاہیں الفت کے چہرے پر اٹکیں

کچھ دیر وہ اُسے ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔

اُس کے دل نے کہا:

"یہ عورت نفرت کیے جانے کے لیے نہیں بنائی گئی ہے۔"

اعجاز کے لبوں کو جنبش ہوئی۔

اُس نے مدھم سُروں میں کہا۔ "ممی ٹھیک ہی کہتی ہے۔ آپ واقعی عظیم ہیں!"

الفت کے لیے اُس کے یہ چند الفاظ نوبل انعام سے بڑھ کر تھے۔

منافقت سے محبت تک کا یہ سفر کس قدر روح پرور تھا۔

پاپا نے سچ ہی کہا تھا کہ

"سچی خوشی انھیں ملتی ہے جو خود غرضی کو اپنی ذات سے علیحدہ کر کے اپنے اوپر حکومت کرنا جانتے ہیں۔"

اُس نے عورت کے سب سے بڑے ہتھیار صبر اور خاموشی سے کام لے کر خود پر حکومت کرنا سیکھ لیا تھا!

خدا کے فضل سے اعجاز مکمل طور پر صحت یاب ہو چکا تھا۔ انتہائی دیکھ بھال اور متوازن غذا کے استعمال سے اُس کی صحت پہلے سے زیادہ اچھی ہو گئی تھی جوانی کا خون سُرخی بن کر چہرے سے جھلکتا تھا۔ رخسار دمکتے تھے اور آنکھیں ہیروں کی مانند دمکتی تھیں۔

بیساکھی کو اُس نے ان اذیت ناک دنوں کی یادگار کے طور پر ایک چادر میں محفوظ کروا کے رکھ لیا تھا۔ اب جب کہ وہ اپنے پیروں پر چلنے لگا تھا ان دنوں کو اکثر یاد کرتا تھا اور اپنی پنڈلی پر سے پلاسٹر اُتارے جانے کے بعد اپنی قلبی کیفیت کو وہ اکثر بالخصوص دہرایا کرتا تھا۔

"مائی گاڈ! اپنی زندگی کے وہ چند دن تو میں کبھی نہیں بھول سکتا..... مجھے یوں لگتا تھا جیسے میں ہمیشہ کے لیے اپاہج ہو چکا ہوں اور اب کبھی اپنے پیروں پر کھڑا نہ ہو سکوں گا..... میں اتنا مایوس تھا کہ مجھے ساری دنیا بُری لگتی تھی..... میرا جی چاہتا تھا کہ اپنے پیروں پر چلتے دنیا بھر کے انسانوں کی ٹانگیں توڑ دوں۔ مجھے ان سے حسد محسوس ہوتا تھا اور میں سوچتا تھا کہ جب میں اپنے پیروں پر نہیں کھڑا ہو سکتا تو پھر یہ لوگ بھی چلتے پھرتے کیوں نظر آئیں..... میرے خدا! وہ میری زندگی کے بدترین دن تھے۔"

اعجاز زبان سے اقرار کرنا یا نہ کرتا ان اذیت ناک دنوں کی نسبت الفت کے لیے بےپایاں خلوص کا وہ دل سے معترف تھا جس قدر خدمت گزاری اُس کی الفت نے کی شاید اُس کی اپنی ماں بھی نہ کر سکتی تھی۔

یہی وجہ تھی کہ وہ الفت کا بہت احترام کرنے لگا تھا۔ الفت کے خلاف دل میں جتنی کدورت اور نفرت تھی اُسے اُس نے جڑ سے اُکھاڑ پھینکا تھا۔ اب وہ اُس کے سامنے بہت ہی سعادت مند بیٹوں کی طرح سر جھکائے رہتا تھا۔

اعجاز کی اُلفت نے جس تن دہی سے دیکھ بھال کی تھی اور اُس کے لیے جو کچھ کیا تھا اُسے اپنے پرائے سب ہی سراہتے تھے جلیس الحسن تو گویا اُس کے بندۂ بے دام بن کر رہ گئے تھے۔

جس روز اعجاز پہلی بار کسی سہارے کے بغیر اپنے پیروں پر چند قدم چلا اُس روز جلیس الحسن کی مسرت دیدنی تھی۔ اُس روز انھوں نے الفت سے تخلیے میں کہا تھا۔ "جانِ جلیس! کیونکر شکریہ ادا کروں میں تمہارا؟"

"کس بات کا شکریہ؟" اُلفت اُن کی بات کا مطلب سمجھتے ہوئے بھی انجان بن گئی۔

"تم نے اعجاز کے لیے جو کچھ کیا ہے وہ شاید اُس کی سگی ماں بھی نہیں کر سکتی تھی۔"

"براہِ کرم آپ مجھے یہ احساس دلانے کی کوشش مت کیجیے کہ میں اعجاز کی سگی ماں نہیں ہوں۔"

"اوہ! خدانخواستہ میرا یہ مقصد تو نہیں۔"

"تو پھر اور کیا مطلب ہے؟"

"میں تو تمہارا شکریہ ادا کرنا اور اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

"صفائی میں؟" اُس نے قدرے تعجب سے اُن کے الفاظ دُہرائے۔

"ہاں!" وہ سر جھکا کر بولے۔

الفت متذبذب نگاہوں سے انھیں دیکھنے لگی۔

جلیس الحسن نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھا کر اُس کی جانب دیکھا پھر دوبارہ سر جھکا کر خفیف سے لہجے میں بولے۔

"بہت دنوں سے میں تم سے یہ بات کہنے کا موقع تلاش کر رہا تھا۔" انھوں نے پل بھر کے توقف کے بعد کہا۔ "یہ مت سمجھنا جانِ من کہ میں تمہاری نسبت بےحس، کٹھور، بےپروا یا بےخبر تھا۔ دوسری بار تمہارے اس گھر میں آنے کے بعد سے اب تک میں نے اس گھر میں رُونما ہونے والے حالات اور واقعات پر بڑی گہری نظر رکھی ہے..... بہت معذرت کے ساتھ یہ کہوں گا کہ پہلی بار مکمل واقعی تمہاری تھی لیکن دوسری مرتبہ تمہارے اس گھر میں آنے کے بعد بچوں نے واقعی بہت ناروا سلوک روا رکھا تمہارے ساتھ....."

اُلفت نے بےساختہ چونک کر اُن کی طرف دیکھا۔

"اگرچہ تم نے اس سلسلے میں مجھ سے کبھی گلہ شکوہ نہیں کیا۔" وہ اپنا سلسلۂ کلام بدستور جاری رکھتے ہوئے بولے۔ "لیکن میں بچہ نہیں ہوں۔ زمانے کے سرد و گرم سے آشنائی رکھتا ہوں۔ حالات اور واقعات کا جائزہ لے کر بخوبی سمجھ سکتا ہوں اور نتائج اخذ کر سکتا ہوں..... چھوٹی چھوٹی باتیں مجھے بعض بڑی باتیں سمجھا دینے کے لیے کافی ہوتی ہیں۔ چنانچہ مجھے اندازہ ہے کہ کافی دنوں تک تم نے چپ چاپ ثمین، زرین اور فراز کی بدتہذیبیاں برداشت کیں۔ فراز کے بناتے ہوئے اپنے جن کارٹونز پر تم نے شکریہ لکھا تھا وہ سوئے اتفاق تمہارے شکریہ لکھنے کے بعد میری نظر سے بھی گزرے تھے۔"

الفت ایک بار پھر چونکی۔

"شاید تم جاننا چاہو گی کہ کس طرح؟" انھوں نے ایک گہری سانس کھینچنے کے بعد کہا۔ "تمہیں شاید یقین نہ آئے مگر ان دنوں میں گھر میں رونما ہونے والے حالات سے باخبر رہنے کے لیے کوڑا دانوں میں بھی جھانکنے سے گریز نہیں کیا کرتا تھا۔ فراز نے ان تمام کارٹونوں کے ٹکڑے کر کے انھیں اپنے کمرے کے دروازے کے باہر رکھے کوڑا دان میں پھینکا تو میں نے انھیں نکالا اور جوڑ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ..... خیر یہ واقعہ میں نے محض اس لیے بیان کیا تاکہ تم جان سکو کہ میں کس طور حالات سے باخبر رہنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ پھر کتنی مرتبہ میں نے تمہاری اور بچوں کی باتیں چھپ چھپ کر سنیں میں اپنے ذرائع کو کام میں لاتے ہوئے اس امر سے بھی باخبر رہا کہ وہ دوپہر کا کھانا بچے تمہارے ساتھ کھانے کے بجائے اوپر کھانا پسند کرتے تھے اور تم بغیر نوالہ توڑے اُٹھ جایا کرتی تھیں....."

"یہ..... یہ آپ کو..... کس نے بتایا؟" اُس نے بےساختہ چونک کر پوچھا۔

جلیس الحسن دھیرے سے مسکرا دیے۔

"ہاں تو میں کہہ رہا تھا....."

"نہیں پہلے آپ میری بات کا جواب دیجیے۔"

"بھئی ہماری بھی اپنی سی آئی ڈی ہے۔"

"پلیز! مذاق میں ٹالنے کی کوشش مت کیجیے..... بتائیے نا!"

"ایک پرائیویٹ سراغرساں تعینات کر رکھا تھا۔"

"کون؟" وہ انھیں گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "خانساماں؟"

انھوں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"تو پھر سلیم؟"

"بھئی یہ تم گٹھلیاں گننے کے چکر میں کیوں لگ گئیں؟"

"تاکہ آئندہ ذرا سنبھال کر قدم رکھا کروں!"

وہ ہنس دیے۔

پھر الفت کی بات کی نفی کرتے ہوئے بولے۔ "میں تمہارے اس کردار سے کبھی ناآشنا نہیں رہا کہ تم نے جیسے کبھی بچوں کی طرف خلوص اور محبت کا ہاتھ بڑھایا، انھوں نے تمہارا ہاتھ بری طرح جھٹک دیا۔۔۔۔ المختصر یہ سمجھو کہ دوسری بار تمہارے گھر آنے کے بعد میں تمہارے ساتھ بچوں کی ناچاقی اور زیادتیوں سے بخوبی واقف رہا لیکن میں بظاہر انجان بنا رہا کیونکہ اوّل تو میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ بچے میری مداخلت کو تمہارے ساتھ میری جانب داری پر محمول کرتے ہوئے مجھ سے بدگمان اور تم سے مزید متنفر ہو جائیں کیونکہ اپنی ماں کے جانے کے بعد اور پھر میری دوسری شادی کے باعث وہ نفسیاتی طور پر پہلے ہی کافی اُلجھے ہوئے تھے اور۔۔۔۔ دوسری بات یہ کہ میں دُور سے تمہاری سرخروئی کا نظارہ دیکھنا چاہتا تھا۔۔۔۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ اگر تم خدانخواستہ شکست خوردہ ہو تو کسی کو مورد الزام نہ ٹھہرا سکو اور اگر فاتح بن کر ابھرو تو کوئی دوسرا تمغہ سرخروئی اپنے سینے پر سجانے کی کوشش نہ کر سکے۔" انھوں نے توقف کیا پھر مزید کہا۔ "مجھے اعتراف ہے کہ بعض مواقع ایسے بھی آئے جب میں نے تمہارے ساتھ بچوں کے نامناسب طرز عمل سے جانتے بوجھتے بھی نظر پوشی کی، تمہاری جگہ اگر کوئی اور عورت ہوتی تو شاید میرے اس جانب داری پر میرا گریبان پکڑ لیتی مگر تم نے انتہائی صبر و تحمل سے کام لیا۔۔۔۔ الفت! زمین کے ٹکڑوں کو بزورِ طاقت فتح کر لینا کوئی بڑی بات نہیں، دل کو تسخیر کر لینا بڑی فتح ہے۔ تم نے ایک نہیں پانچ دھڑکتے دلوں کو تسخیر کیا ہے۔۔۔۔ مجھے تم پر فخر ہے۔ میں اپنے بچوں سے شرمندہ نہیں ہوں کہ میں انھیں ایک اچھی ماں نہ دے سکا۔۔۔۔ مجھے واقعی تم پر فخر ہے۔ آمنا اسیر تو مجھے عاصمہ بھی نہ کر سکی تھی جتنا کہ تم نے کر لیا ہے۔ تم نے دونوں ہاتھوں سے لوٹ لیا ہے جلیس کو۔"

الفت پر ایک عجیب سی سرشاری طاری ہوتی چلی گئی۔

اُسے یوں لگ رہا تھا جیسے جلیس الحسن نے اُس کی آنکھوں کی سُوئیاں بھی چن لی ہوں اور وہ ایک دم ہی پھر سے جی اٹھی ہو!

اُس نے جی ہی جی میں اپنے آپ سے پوچھا:

"کیا میں اس خراجِ تحسین کی واقعی اہل ہوں؟"

اور اُسے جھرجھری سی آ گئی۔

یہ راز تو شاید وہ کسی کو کبھی نہ بتا سکتی تھی کہ اس منزل تک جس پر کہ وہ اب تھی، پہنچنے کی خاطر وہ ایک عرصے تک مصلحت اور منافقت کے راستے پر آبلہ پائی کرتی رہی تھی۔

اُس کا دل جلیس الحسن کے بچوں کو گالیاں دے رہا ہوتا تھا، بُرا بھلا کہہ رہا ہوتا تھا، انھیں کوس رہا ہوتا تھا اور اُس کی زبان سے پھول جھڑ رہے ہوتے تھے۔

یہ اور بات تھی کہ اب یہی غیر شعوری طور پر منافقت کا یہی راستہ محبت کا راستہ بن گیا تھا اور جب وہ نظرِ دوڑاتی تھی تو اُسے اپنے چہار اور پھول ہی پھول کھلے نظر آتے تھے۔

جلیس الحسن کے بچے اُسے اپنے ہی جگر گوشے محسوس ہوتے تھے۔

ایسا شاید اس لیے بھی تھا کہ اُس نے اس حقیقت کو چپ چاپ تسلیم کر لیا تھا کہ وہ کبھی اپنے بچے کی ماں نہیں بن سکتی تو کیوں نہ دوسری عورت کے بچوں ہی کی ماں بننے کی کوشش کرے۔

جلیس الحسن کے بچوں کو اب وہ ایک ماں کی ہی نظر سے دیکھتی تھی۔

اعجاز کے جشنِ صحت یابی کے موقع پر وہ حقیقتاً ان چاروں کی ماں ہی نظر آ رہی تھی۔

جلیس الحسن نے اعجاز کو پھر سے ایک نئی گاڑی خرید دی تھی اور وہ دوبارہ یونیورسٹی جانے لگا تھا۔

رات کا پچھلا پہر تھا۔

"حسن لاج" کے مکین خوابِ خرگوش کے مزے لے رہے تھے۔

ٹیلیفون کی تیسری گھنٹی پر الفت ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی۔ ریسیور اٹھانا ہی چاہتی تھی کہ جلیس الحسن نے لیٹے ہی لیٹے ہاتھ بڑھا کر سائیڈ بورڈ پر دھرے ٹیلیفون کا ریسیور اُٹھا کر کان سے لگا لیا۔

الفت کا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔

لمحہ بھر میں کئی خدشات اُس کے دل کو ہولا گئے تھے۔

رات کے پچھلے پہر کوئی فقط خیر و عافیت پوچھنے کو تو فون نہ کر سکتا تھا۔

"خدا خیر کرے امی ابو یا ابا کی طبیعت ٹھیک ہو۔" اُس نے سہم کر سوچا۔

جلیس الحسن اُٹھ بیٹھے تھے اور مسلسل ہیلو! ہیلو! کر رہے تھے۔

ریسیور میں ایسی گڑگڑاہٹ تھی کہ وہ دوسری جانب سے آواز صاف نہ سُن پا رہے تھے۔

"کس کا فون ہے؟" الفت نے متوحش لہجے میں پوچھا۔

"کچھ سُنائی نہیں دے رہا۔" جلیس الحسن بولے اور پھر ہیلو! ہیلو! کی گردان کرنے لگے۔ ناچار انھیں ریسیور رکھ دینا پڑا۔

الفت کے دل پر وحشت طاری تھی۔

اُس کا دھیان مستقل اپنے میکے کی طرف لگا ہوا تھا اور وہ جی ہی جی میں وہاں سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہونے کی دُعا مانگ رہی تھی۔

دو تین منٹ کے توقف سے دوبارہ گھنٹی بجی۔

"ہیلو!" اس مرتبہ الفت نے کال ریسیو کی۔

ایک زنانہ آواز نے فون نمبر کی توثیق چاہی پھر پوچھا۔ "آپ کون صاحبہ بات کر رہی ہیں؟"

"جی۔۔۔۔ میں مسز جلیس ہوں آپ کون ہیں اور آپ کو کس سے بات کرنی ہے؟"

"میں نیویارک سے عالیہ رفیق احمد بات کر رہی ہوں مجھے جلیس الحسن صاحب سے بات کرنی ہے۔"

نیویارک سے عالیہ رفیق احمد!

الفت کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔

نگین کے ساتھ بیٹھ کر۔۔۔۔ ایک روز اُس نے اس کے کمرے میں رکھی چاروں البم دیکھی تھیں۔ اُن میں نگین کی دونوں خالاؤں، اکلوتے ماموں اور اُن کے اہلِ خانہ کی متعدد تصاویر بھی تھیں۔ نگین نے اُسے اُن کے نام بھی بتائے تھے۔ عاصمہ سے بڑی بہن کا نام عالیہ رفیق احمد تھا اور چھوٹی بہن کا نام عارفہ رشید۔ ماموں کا نام شجاع احمد۔

الفت نے ریسیور جلیس الحسن کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "نیویارک سے کال ہے آپ کے لیے!"

اپنی آواز اُسے اندھے کنوئیں سے آتی محسوس ہوئی۔

"میرے لیے!" جلیس الحسن تعجب سے بولے پھر انھوں نے ریسیور کان سے لگاتے ہوئے کہا۔ "جلیس الحسن اسپیکنگ!"

"عالیہ بول رہی ہوں نیویارک سے۔" دوسری طرف سے آواز سُنائی دی۔ "عاصمہ کی بہن!"

جلیس الحسن سکتے میں رہ گئے۔

یہ ٹھیک ہے کہ ماضی میں عاصمہ کی نسبت سے اُن کا عالیہ رفیق احمد سے گہرا تعلق رہا تھا مگر عاصمہ کے بعد وہ اُن کے لیے غیر ہی قرار پا چکی تھیں۔

اُن کا جی چاہا ریسیور واپس رکھ دیں مگر یہ خیال مانع رہا کہ ہزاروں میل دُور سے عالیہ رفیق احمد نے بلاسبب فون نہ کیا ہوگا اور پھر عاصمہ بیگم کی لغزش میں اُن کا کیا دوش تھا۔

"پہچانے؟"

"جی!"

"کیسے ہو؟"

"ٹھیک ٹھاک!" وہ سرد لہجے میں بولے۔

"گھر میں سب خیریت؟" اُن کے لہجے سے تشویش عیاں تھی۔

"جی ہاں۔"
"وہ..... بھئی..... ہم تو بہت پریشان ہیں۔"
"وجہ؟"
"آج ہی کسی ذریعے سے اطلاع ملی کہ خدانخواستہ اعجاز کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ کئی گھنٹے ہو گئے تم سے بات کرنے کی کوشش کرتے۔ خدا جانے کیا بات تھی کال لگ ہی نہیں رہی تھی، مل بھی تو آواز صاف سنائی نہ دے رہی تھی۔ بہرحال اب بیٹا بتاؤ کیا یہ خبر درست ہے؟" وہ ایک ہی سانس میں کہہ گئیں۔
"جی ہاں! بالکل درست!"
"خدایا! کب؟ کیسے ہوا ایکسیڈنٹ؟" وہ گھبرا کر بولیں۔
"ہوا تھا، اب تو وہ صحت یاب بھی ہو چکا۔"
"چوٹ کہاں آئی تھی؟"
"چہرے پر کافی چوٹیں تھیں۔ شانہ بری طرح زخمی ہوا تھا۔ دو پسلیاں ٹوٹ گئی تھیں، ایک پنڈلی میں کپاؤنڈ فریکچر تھا، تین جگہوں سے ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔"
"میرے خدا! اب کہاں ہے؟ کیسا ہے وہ؟" بہت ہی تشویش کے ساتھ پوچھا گیا۔
"خدا کے فضل سے مکمل طور پر صحت یاب ہو چکا ہے۔"
"سچ کہہ رہے ہو؟"
"مجھے جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں۔" انھوں نے الفت کے چہرے پر اچٹتی ہوئی نظر ڈالتے ہوئے کہا۔
"اوہ نو! میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا..... میرا مطلب ہے کہیں ایسا تو نہیں کہ تم مجھے اطمینان دلانے کے لیے کہہ رہے ہو کہ وہ ٹھیک ہو چکا ہے۔ مجھے تو جب سے خبر ملی ہے پریشان ہوں۔ عاصمہ کو اطلاع دینے سے قبل تم سے کنفرم کر لینا ضروری سمجھتی تھی۔"
"ہونہہ!" وہ طنز سے ملکی سی ہنسی ہنسے۔ "عاصمہ کو بھلا اعجاز سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے!"
"ایسا نہ کہو۔" وہ لجاجت سے بولیں۔ "آخر کو وہ ماں ہے۔"
"ماں!" جلیس الحسن نے طنزاً اُن کی بات دہرائی۔
"کیا میں اعجاز سے بات کر سکتی ہوں؟"
"وہ اپنے کمرے میں سو رہا ہے۔ دراصل اس وقت یہاں رات کے سوا تین بجے ہیں۔ ہم لوگ بھی سوتے سے اٹھے ہیں۔"
"اوہ! سوری! میں نے تمہاری نیند میں خلل ڈالا..... دراصل مجھے جب سے خبر ملی تھی میں اتنی پریشان تھی کہ کسی بھی طور پاکستان سے اعجاز کی خیریت معلوم کرنے کو بے چین تھی۔ میں نے کراچی اور نیویارک کے اوقات میں فرق کو بھی ملحوظِ خاطر نہیں رکھا..... میں معذرت خواہ ہوں۔"

جلیس الحسن کو خیال آیا کہ کبھی عالیہ رفیق احمد اُن کے لیے انتہائی محترم ہوا کرتی تھیں۔
"کوئی بات نہیں۔" وہ قدرے رسانیت سے بولے۔
"ویسے سچی بات بتاؤں کہ تم نے اگرچہ اطمینان تو دلا دیا ہے اعجاز کے بارے میں مگر میرا دل اب بھی بہت بے چین ہے اُس کے لیے۔"
"آپ میری بات کا یقین کر سکتی ہیں۔ اگر وہ سو نہ رہا ہوتا تو میں اُس کی آپ سے بات بھی کرا دیتا۔"
"اب تو بڑا ہو گیا ہو گا وہ؟"
"جی ہاں..... ماشاء اللہ مجھ سے اونچا۔" وہ پدری شفقت سے معمور لہجے میں بولے۔
"ماشاء اللہ! اور باقی تینوں بچے؟" عالیہ رفیق احمد کے لہجے میں استفہامیہ کیفیت تھی۔
"وہ بھی خیریت سے ہیں۔"
"ماشاء اللہ کافی بڑے ہو گئے ہوں گے؟"
"جی ہاں۔"
"کیا کیا کر رہے ہیں؟"

جلیس الحسن کا جی چاہا کہیں:
جب آپ کی ہمشیرہ ہی نے واسطہ نہ رکھا تو آپ کے ان استفسارات کا فائدہ!
مگر انھوں نے بڑے تحمل سے انھیں بتایا۔
"ثمین ایم ایس سی کر رہی ہے۔ اعجاز انجینئرنگ یونیورسٹی میں ہے، فراز کالج میں سیکنڈ ایئر کا طالب علم ہے اور زرین کا اسکول میں آخری سال ہے۔"
"لگتا ہے کل ہی کی بات ہے جب میں نے انھیں چھوٹا چھوٹا سا دیکھا تھا۔"

"جی ہاں۔ آپ کو پاکستان آئے ہوئے ہو بھی تو گئے برسوں۔"
"ہاں! شاید آٹھ برس کے لگ بھگ..... عاصمہ کے یہاں آنے کے بعد وہاں آنا ہی نہ ہوا۔ عاصمہ وہاں ہوتیں تو اس دوران ایک دو چکر تو لگ ہی جاتے۔"
"ہاں! اس کے بعد آپ کا یہاں تھا ہی کون۔"
عالیہ رفیق احمد اُن کے طنز کو پا گئیں۔
"تم جانتے ہو کہ میں کتنی مصروف رہتی ہوں۔" انھوں نے ایک سرد آہ کھینچی پھر بولیں۔ "ویسے عاصمہ نے بڑی غلطی کی۔"
"غلطی!" جلیس الحسن نے طنز اور استعجاب سے اُن کا لفظ دہرایا۔ "آپ لوگوں کی تو خواہش تھی کہ عاصمہ وہاں آ بسیں۔"
"ہاں! یہ ٹھیک ہے کہ ہم دونوں بہنیں اور بھائی عاصمہ کے بھی امریکا آ بسنے کے خواہاں تھے مگر اس طور ہرگز نہیں جیسی غلطی کہ اس نے کی۔"
جلیس الحسن نے خاموشی پر اکتفا کیا۔
"ہیلو!" ادھر سے چونک کر کہا گیا۔
"جی سن رہا ہوں۔"
"ہم بھائی بہنوں کی خواہش تھی کہ عاصمہ تمہارے اور بچوں کے ساتھ یہاں آ بسیں۔ ہم نے خدانخواستہ یہ ہرگز نہیں کہا تھا کہ وہ ہماری خاطر اپنی ایسی بسائی جنت کو ٹھکرا دیں۔" انھوں نے توقف کیا پھر بولیں۔ "بہرحال ہر غلطی کی ایک سزا ہوا کرتی ہے سو عاصمہ کو بھی اپنی غلطی کی سزا تو بھگتنی پڑی۔"
"گویا سزا اور جزا پر یقین رکھتی ہیں آپ؟"
"الحمدللہ مسلمان ہوں..... اصولاً مجھے تمہارے اس طنز کا برا ماننا چاہیے تھا مگر میں برا نہیں مناؤں گی کیونکہ جانتی ہوں کہ تم کس کرب سے گزرے ہو گے۔"
"بہرحال اب میں مطمئن اور خوش ہوں۔"
"خدا کا شکر ادا کیا کرو۔" انھوں نے کہا۔
"کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کی ہمشیرہ محترمہ کو سزا کس طور ملی؟" وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر پوچھ بیٹھے۔
"کیا تمہیں کوئی سن گن نہیں ملی کہیں سے؟"
"میں غیر متعلق لوگوں کے معاملات سے زیادہ دلچسپی رکھنے کی کوشش نہیں کرتا!"
"تو پھر اب کیوں پوچھ رہے ہو؟" عالیہ رفیق احمد نے انھیں رنگے ہاتھوں پکڑنے کی کوشش کی۔
"بس یونہی..... بائی دی وے۔"
"کیا تمہیں واقعی خبر نہیں؟"
"کس بات کی؟"
"کہ عاصمہ کے ساتھ کیا ٹریجڈی ہوئی؟"
"جی نہیں۔"
"عاصمہ اور اسد کا بمشکل دو برس ساتھ رہا پھر اختلافات ہو گئے اور دونوں میں علیحدگی ہو گئی۔"
"اچھا!"
"ہم لوگوں نے عاصمہ کو بہت سمجھایا کہ بچوں کے پاس واپس چلی جاؤ مگر شاید وہ یہ سوچتی ہوں گی کہ اب کس منہ سے جاؤں۔"

کچھ بھی تھی عاصمہ ایک دو برس اٹھارہ برس جلیس الحسن کی رفیقِ سفر رہی تھیں، انھیں عاصمہ کی ہمشیرہ کی زبانی یہ سب کچھ سن کر ملال ہوا۔

"پھر اب؟ اب کہاں ہیں عاصمہ؟"

الفت جو دم سادھے جلیس الحسن کے مکالمات سن رہی تھی، اُن کی زبان سے عاصمہ کا نام ادا ہوتے سن کر بے اختیار چونکی۔

"عاصمہ تو ان دنوں سان فرانسسکو میں جاب کر رہی ہیں۔"

"امریکا میں رہنے کی آرزو تو پوری ہو گئی۔" جلیس الحسن نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"بس آرزو کیا پوری ہوگئی۔ وہ جو کہتے ہیں ناں خود کردہ را علاجے نیست تو بس وہی مثل صادق آتی ہے بے چاری عاصمہ پر۔"

جلیس الحسن ایک ٹھنڈی سانس بھر کے رہ گئے۔

"اچھا ہاں! بہت عرصہ ہوا کراچی سے آنے والے کسی دوست احباب کے توسط سے اُڑتی اُڑتی خبر ملی تھی کہ تم نے دوسری شادی کر لی ہے اور ابھی کچھ دیر پہلے جن محترمہ نے فون ریسیو کیا وہ بھی خود کو مسز جلیس کہہ رہی تھیں۔"

"جی وہ واقعی مسز جلیس ہی ہیں۔" جلیس الحسن نے مسکراتے ہوئے الفت کی جانب دیکھا۔

"کیسی ہیں تمہاری دوسری بیگم؟"

"بہت اچھی۔" جلیس الحسن کی نگاہیں بدستور الفت پر ٹکی تھیں۔

"بچوں کے ساتھ رویہ کیسا ہے؟"

"مثالی۔"

"یقین نہیں آتا۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ سوتیلی ماں عام طور پر اچھی نہیں ہوتی۔"

"بعض سگی مائیں بھی اچھی نہیں ہوتیں۔"

عالیہ رفیق احمد پھر اُن کے طنز کو سمجھ گئیں۔

"یو آر رائٹ۔" انہوں نے دھیمی آواز میں کہا پھر معذرت خواہانہ لہجے میں بولیں۔ "آئی ایم سوری جلیس کہ میں نے تمہیں اس وقت پریشان کیا، دراصل میں پریشان بہت تھی...... خیر مطمئن تو اب بھی کچھ زیادہ نہیں ہوں...... بہرحال آپ کو بے وقت تکلیف دینے پر معذرت چاہوں گی...... بہت وقت لیا تمہارا، میری طرف سے بچوں، اعجاز، فرازا اور روزی چاروں کو بہت بہت دعا پیار دینا۔"

"آپ یہ سب کچھ اُن سے خود بات کر کے کہہ دیجیے گا۔"

"جلیس الحسن!" وہ ایک لمبی سانس کھینچ کر بولیں۔ "کیا بتاؤں تمہیں کس قدر مصروف اور خود غرض ہے زندگی یہاں کی۔ تمہیں تو معلوم ہے کہ ایک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سے وابستہ ہوں میں یہاں۔ کبھی کبھی روز تو اپنے بچوں سے بات نہیں ہوتی، باقی الیسی بھاگ دوڑ ہے کہ الاماں! عاصمہ سے بھی گزشتہ چار پانچ ماہ سے بات نہیں ہو سکی ہے۔ بس محبت کا جوش کہہ لو یا بے تابی کی کشش کہ اعجاز کے ایکسیڈنٹ کا سنا تو بیٹھ گئی فون کے پاس کہ جب تک بات نہیں ہو جاتی نہیں اٹھوں گی۔ اب تم نے اطمینان دلا دیا ہے تو تسلی کر لیا ہے۔ ویسے بھی میرا قیاس ہے کہ ماں کے رشتے داروں سے بچے اپنی ماں کی نسبت سے محبت کرتے ہیں اور باپ کے رشتے داروں سے اُس کی نسبت سے۔ اب میں جو بھی اُنہیں چھوڑ جائے اُس کے رشتے داروں کے سلسلے میں بچوں کے جذبات وہ نہیں رہتے جو کہ اُس کے ساتھ رہتے ہوئے ہوا کرتے ہیں۔ اس وقت رواداری میں اعجاز سے یا باقی تینوں بچوں سے بات ہو جاتی تو دوسری بات تھی لیکن اب میں انہیں نہ ہی ڈسٹرب کروں تو بہتر ہوگا۔ راکھ میں دبی چنگاریاں دبی رہیں تو اچھا ہے ورنہ بسا اوقات ایسی بھڑک اٹھتی ہیں کہ الاماں!

"کیا اس سلسلے میں مجھے قصور وار گردانتی ہیں آپ؟"

"ہرگز نہیں۔ غلطی سراسر میری بہن کی ہے لیکن میں نے تمہیں بتایا ناں کہ وہ اپنی غلطی کی سزا بھگت چکی ہے بلکہ ہنوز بھگت رہی ہے...... اچھا...... بہت لمبی بات ہو گئی، بہت وقت لے لیا میں نے تمہارا...... اب اجازت چاہوں گی۔"

"بہتر۔"

"خدا حافظ۔"

"خدا حافظ!"

جلیس الحسن ریسیور کریڈل پر رکھنے کے بعد الفت کی جانب متوجہ ہوئے تو اُسے گہری تشویش میں ڈوبی آنکھوں سے اپنی طرف دیکھتے پایا۔

"عاصمہ کی بڑی بہن عالیہ رفیق احمد کا فون تھا۔" وہ بولے۔

"جی میں جانتی ہوں۔"

"بڑی لائق فائق خاتون ہیں۔ فارماکولوجسٹ ہیں۔ ایک تحقیقاتی ادارے سے وابستہ ہیں نیویارک میں رہتی ہیں۔ کسی ذریعے سے انھیں اعجاز کے ایکسیڈنٹ کی خبر ملی تھی اسی سلسلے میں فون کیا تھا۔"

الفت کو عاصمہ کی اُن دیکھی بہن سے حسد محسوس ہوا۔

"بہت جلدی خیال آیا انھیں۔" وہ تلخ لہجے میں بولی۔

"آج ہی خبر ملی تھی انھیں۔"

"کیا اسی بات کی منتظر تھیں وہ کہ اعجاز کے ایکسیڈنٹ کی خبر ملے تو وہ فون کریں۔ پہلے کبھی تو کر سکتی تھیں فون کیوں نہ کیا؟"

"بس نہیں کیا...... میں نے بتایا ناں تمہیں کہ ایک تحقیقاتی ادارے سے وابستہ ہیں۔ بہت مصروف خاتون ہیں۔"

"تو اب فرصت کیونکر مل گئی؟"

اپنی جہاندیدگی کے سبب جلیس الحسن اس کے لہجے میں حسد و رقابت کی تپش محسوس کیے بنا نہ رہ سکے۔

"بس اب سو جاؤ یار۔" وہ بولے۔ "صبح اٹھنا بھی ہے۔ نیند خراب کر دی اس وقت ان کے فون نے۔"

جلیس الحسن نے یہ ظاہر کیا گویا عاصمہ کی بہن کا فون کرنا اُن کے لیے غیر اہم سی بات تھی۔ لیکن درحقیقت عالیہ رفیق احمد کے فون نے انھیں بے حد مضطرب کر کے رکھ دیا تھا۔ عاصمہ بیگم کی نسبت سے اُن کا عالیہ رفیق احمد اور عاصمہ کے دوسرے رشتے داروں سے کبھی خاصا گہرا تعلق رہا تھا۔ عرصے بعد عالیہ رفیق احمد سے بات ہوئی تھی اب ماضی کھل جانے کے مترادف تھا۔

الفت کچھ دیر بے چینی سے منتظر رہی کہ جلیس الحسن کچھ اور بتائیں لیکن جب انتظار لاحاصل رہتا نظر آیا تو اُس نے اُن کے دوبارہ سو جانے کے خوف سے از خود ہی پوچھا۔ "اپنی ہمشیرہ صاحبہ کا کبھی تو کچھ ذکر فرما رہی تھیں؟"

"عاصمہ کا؟"

"جی ہاں۔"

"ہاں بس سرسری سا ذکر۔" وہ ٹالنے والے انداز میں بولے۔

"کیا کہہ رہی تھیں؟"

"یہی کہ لاس اینجلز میں رہ رہی ہیں۔ جاب کر رہی ہیں اور راسد علیم سے اُس کی بمشکل دو سال بعد ہی علیحدگی"

لحظہ بھر کو تو الفت کو یوں لگا جیسے اُس کا دل دھڑکنا بھول گیا ہو۔

عاصمہ کی دوسرے خاوند سے علیحدگی ہو چکی تھی!

کیا اس صورتِ احوال میں اُس کی بہن کا فون آنا خطرے کی گھنٹی نہیں ہو سکتی تھی!

"سو جاؤ۔" جلیس الحسن بولے۔

اُس نے آنکھیں تو بند کر لیں مگر نیند اُسے اپنی آنکھوں سے کوسوں دور محسوس ہو رہی تھی۔

کچھ یہی حال خود جلیس الحسن کا بھی تھا۔

اگلی صبح جب ناشتے کی میز پر جلیس الحسن نے اعجاز کو بطورِ خاص مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "اعجاز بیٹے! رات نیویارک سے آپ کی عالیہ آنٹی کا فون آیا تھا۔" تو وہ چاروں یک بیک چونک گئے۔

الفت نے دُزدیدہ نظروں سے ان چاروں کے تاثرات کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔

اُن کے چہروں پر حیرانی اور دبی دبی مسرت کی ملی جلی کیفیت اُبھری لیکن ذرا سی دیر میں دُھندلا گئی۔

"کوئی خاص بات پاپا؟" اعجاز نے پوچھا۔

"انھیں کسی سے تمہارے ایکسیڈنٹ کا پتا چلا تھا۔ تمہاری خیریت معلوم کرنے کے لیے فون کیا تھا انھوں نے!"

"بہت جلدی خیال آ گیا!" اعجاز نے تلخ لہجے میں کہا۔

الفت کو اُس کے جواب سے یک گونہ طمانیت ہوئی۔

"بیٹے! انھیں اطلاع ہی کل ملی تھی۔ فوراً ہی انھوں نے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی۔" جلیس الحسن بولے۔

"ٹھیک ہے پاپا! حادثے کے ایکسیڈنٹ کی خبر تو انھیں کل ملی لیکن ہم لوگ تو یہاں کل سے پہلے بھی تھے۔ دکھ سُکھ تو پہلے بھی ہمارے ساتھ تھے۔" تمکین نے کہا۔

"ہاں اور کیا!" اعجاز نے بہن کی تائید کی۔

"اور فون بھی کیا تو خالہ آنٹی نے!" فراز تلخی سے بولا۔ "کیا کسی اور کو خیال نہیں آیا؟"

اُن میں سے کسی کے لیے یہ سمجھنا محال نہ تھا کہ "کسی اور" سے فراز کی مراد کیا تھی۔

وہ یقیناً یہی کہنا چاہتا تھا کہ کیا ماں کو اعجاز کی خیریت معلوم کرنے کا خیال نہیں آیا؟

"چھوڑو اس قصے کو۔" اعجاز نے کہا۔

اُس کے لہجے میں موہوم سا دکھ تھا۔

الفت طمانیت محسوس کر رہی تھی۔

لیکن جلیس الحسن کو بچوں کے ملول چہروں کو دیکھ کر ملال ہوا کہ کیوں انھوں نے صبح ہی اُن سے یہ ذکر کر دیا تھا۔ انھوں نے تو اپنی دانست میں یہ قیاس کیا تھا کہ وہ چاروں اپنی خالہ کے فون کرنے کی خبر سُن کر خوش ہوں گے انھیں خبر ہوئی کہ وہ دکھی ہو جائیں گے تو کم از کم صبح ناشتے کی میز پر یہ "تذکرہ" نہ کرتے اور اب جب کہ یہ ذکر چھیڑ ہی دیا تھا تو وہ انھیں وہ سب کچھ بتائے بنا نہ رہ سکتے تھے جو وہ یقیناً جاننا چاہتے ہوں گے۔

"آپ کی مَم تو سان فرانسسکو میں رہ رہی ہیں!"

اُن میں سے کوئی زبان سے کچھ نہیں بولا

لیکن زرّیں کی آنکھوں نے اُن سے تقاضا کیا:

"مَم کے بارے میں کچھ اور بتائیے پاپا!"

"آپ کی آنٹی بتا رہی تھیں کہ اسد سے تو اُن کی دو سال بعد ہی سیپریشن ہو گئی تھی!" انھوں نے توس پر جام لگانے کے بہانے اُن سے نظریں چراتے ہوئے بتایا۔

ان چاروں نے بے ساختہ چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا۔

ان کی آنکھوں میں بیک وقت کئی دیے سے روشن نظر آئیں۔

پھر اُن کے چہرے دھواں دھواں نظر آنے لگے۔

اُلفت دزدیدہ نگاہوں سے اُن کے تاثرات دیکھ رہی تھی۔

جلیس الحسن نے ٹکٹکی اور جام لگے توس کا ایک ٹکڑا دانتوں سے کاٹ کر منہ میں تو لے لیا تھا اور آہستہ آہستہ منہ بھی چلا رہے تھے مگر اُسے نگلنا انھیں کوہ گراں عبور کرنے کے مترادف محسوس ہو رہا تھا۔

بچوں کے ملول چہرے انھیں بھی دل گرفتہ کیے دے رہے تھے۔

عاصمہ کی بڑی ہمشیرہ عالیہ رفیق احمد کا فون آئے تقریباً دو ہفتے گزر چکے تھے۔

تمکین، اعجاز، فراز اور زرّیں میں سے ہر ایک کا دل گواہی دیتا تھا کہ اُن کی ماں کا فون بھی ضرور آئے گا۔

ہر صبح وہ اسی گمان کے ساتھ ناشتے کی میز پر آتے کہ شاید آج پاپا یہ کہیں کہ رات اُن کی ماں نے فون کیا تھا۔

وہ اپنے اسکول، کالج اور یونیورسٹی تو چلے جاتے مگر دل میں یہی گمان ہلکورے لیتا رہتا کہ شاید فون کی گھنٹی بجنے پر جب گھر میں کسی نے فون ریسیو کیا ہوگا تو ایک مدھر آواز نے جس سے "حسن لاج" کے بام و در بخوبی آشنا

تھے کہا ہوگا: "میں عاصمہ بول رہی ہوں۔"

جب وہ گھر واپس لوٹتے تو اُن کی پُر اُمید نگاہیں الفت سے ایک ہی سوال پوچھتی دکھائی دیتیں: "کوئی فون تو نہیں آیا تھا؟"

اس امر کی گواہی تو جلیس الحسن کا دل بھی دیتا تھا کہ اعجاز کی خیریت معلوم کرنے کے لیے عاصمہ بیگم بھی ضرور فون کریں گی۔

عاصمہ کی بہن کا فون آنے کے بعد سے اُلفت جس دہشت کا شکار تھی اس کا اندازہ کچھ اسی کو تھا۔ جب بھی فون کی گھنٹی بجتی دیگر اہل خانہ کے ساتھ اُس کے کان بھی یک بیک کھڑے ہو جاتے اور دل بُری طرح دھڑکنے لگتا۔ دوسروں کی طرح اُس کے دل کی گواہی بھی یہی تھی کہ عاصمہ کا فون ضرور آئے گا۔

عالیہ رفیق کا فون آنے کے بعد کوئی آٹھ دس روز تو اپنی جگہ وہ سب ہی بے قرار رہے مگر پھر جلیس الحسن اور چاروں بچوں کے دل پر چھاتے انتظار اور بیتابی کا رنگ دھیرے دھیرے پھیکا پڑنے لگا۔

"وہ ہمارے لیے فکرمند کیوں ہونے لگیں بھلا!" بچے دکھ سے سوچتے۔

"جب اتنے برس عاصمہ نے پلٹ کر بچوں کی خبر نہیں لی تو اب بھلا کیا لے گی!" جلیس [illegible] ہی آپ سوچتے۔

مگر الفت کے دل کو جو کھٹکا لگا تھا وہ بدستور رہا۔

وہ جانتی تھی کہ طوفان آنے سے پیشتر سناٹا چھا جایا کرتا ہے!

اس سناٹے سے اُسے خوف محسوس ہوتا تھا۔

اپنے باطن میں وہ بہت خوف زدہ تھی۔

کسی بھی لمحے کچھ ہو جانے کا خوف اُسے سہمائے دیتا تھا۔

کانچ کا جو محل اُس کی رہ گزر تھا ایک ہی ٹھیس سے اُس کے پارہ پارہ ہو جانے کا ڈر اُس کے دل کو مٹھی میں دبوچے لیتا تھا۔

پھر وہ لمحہ آ پہنچا!

جلیس الحسن شہر کے ایک معروف صنعت کار کی محل نما کوٹھی کے مجوزہ نقشے میں اُلجھے بیٹھے تھے کہ اُن کی سکریٹری نے انٹرکام پر انھیں اطلاع دی:

"سر! ہوٹل تاج محل سے کوئی خاتون آپ سے بات کرنا چاہتی ہیں۔"

مصروفیت کیسی ہی کیوں نہ ہو کسی خاتون کی فون کال پر اُس سے بات نہ کرنے کی حماقت تو کوئی بد ذوق مرد ہی کر سکتا تھا۔

جلیس الحسن بد ذوق نہ تھے!

"بات کرایئے۔" انھوں نے اپنی خاتون سکریٹری سے کہا۔

"رائٹ سر۔"

اور دو گھڑی بعد ہی مذکورہ خاتون لائن پر تھیں۔

"مسٹر جلیس!" استفہامیہ لہجے میں کہا گیا۔

اس آواز سے گہری آشنائی کے احساس نے جلیس الحسن کی رفتارِ دل بڑھا دی۔ یہ آواز تو وہ قرنوں بعد اُفق پار سے بھی پہچان سکتے تھے۔

مگر وہ تو ہزاروں میل دُور بس رہی تھی۔

جبکہ فون کال سکریٹری کی اطلاع کے مطابق تاج محل سے تھی۔

"اسپیکنگ۔" انھوں نے کہا۔

"عاصمہ بول رہی ہوں۔"

"اوہ! تم! مگر سکریٹری [illegible] تاج محل سے فون ہے۔"

"ہاں میں تاج محل

"کیا تم یہاں ہو؟ کراچی میں؟"

"ہاں آج ہی پہنچی ہوں مگر فون کرنا مناسب نہیں سمجھا۔"

اور تب جلیس الحسن کو جو اس عورت کی آواز سُن کر یک بیک سا جذباتی ہو گئے تھے جس کے ساتھ انھوں نے اٹھارہ برس انتہائی خوش و خرم ازدواجی زندگی بسر کی تھی اور جس کے بطن سے جنم لینے والے چار بچے انھیں اپنی متاعِ حیات محسوس ہوتے تھے احساس ہوا کہ اس عورت سے تو کئی برس ہوئے اُن کا ناتا ٹوٹ چکا تھا۔ دوسری غیر عورتوں کی طرح اب وہ بھی اُن کے لیے غیر ہی تھی۔

"کیسے ہیں آپ؟" اُس کا لہجہ خفت کی چغلی کھا رہا تھا۔

"زندہ ہوں اور بہت خوش۔" وہ تیکھے لہجے میں بولے۔

"اور بچے؟"

"کون سے بچے اور کس کے بچے؟"

"آپ کے اور میرے بچے۔"

"اونہہ! وہ تمھیں تم ٹھکرا کر چلی گئی تھیں!" وہ طنز سے بولے۔

"پلیز! طعن و تشنیع کی ضرورت نہیں۔" عاصمہ نے ایک ٹھنڈی سانس بھرنے کے بعد کہا۔ "مجھے عالیہ آپا کے ذریعے اعجاز کے ایکسیڈنٹ کی خبر ملی تھی۔ اُسے دیکھنے اور چاروں سے ملنے کے لیے آئی ہوں۔"

"تم بہت ظالم ہو...... بہت ظالم ہو عاصمہ۔"

"فار گاڈ سیک...... مجھے کچھ نہ کہیں...... میں اپنی غلطی کی سزا بھگت چکی ہوں، کچھ بھگت رہی ہوں۔" عاصمہ نے بھیگی ہوئی آواز میں کہا پھر جلیس الحسن کو سسکیاں سُنائی دینے لگیں۔

عاصمہ سے جلیس الحسن کو کتنے ہی گلے شکوے کیوں نہ ہوں، برسوں عاصمہ سے اُن کی دکھ سکھ کی ساجھے داری رہی تھی۔ وہ اُن کی من چاہی عورت اور اُن کی رفیقِ سفر رہی تھی...... اُس کی سسکیاں سُن کر وہ موم ہو گئے۔

"اعجاز اب بالکل ٹھیک ہے۔" وہ خفا مگر رسان بھرے لہجے میں بولے۔

"یہ اطمینان تو مجھے عالیہ آپا نے بھی دلا دیا تھا، لیکن مجھے قرار نہیں آیا۔ میں اُسے اپنی آنکھوں سے دیکھنا...... اُس سے ملنا چاہتی ہوں...... میں...... میں ان چاروں سے ملنا چاہتی ہوں...... اُن کو دیکھ کر اپنے جلتے ہوئے دل کو ٹھنڈک پہنچانا چاہتی ہوں۔"

"کاش! تم نے اس وقت سوچا ہوتا۔"

"تب کا ذکر مت چھیڑیں۔" عاصمہ نے بلبلا کر کہا۔ "اب کی بات سنیے اور اب کی بات کیجیے۔"

جلیس الحسن نے ایک گہری سانس کھینچی پھر بولے۔ "وہ ٹھیک ٹھاک ہیں مطمئن اور خوش ہیں تم ملو گی تو پھر ڈسٹرب ہو جائیں گے۔"

"پلیز! مجھ پر یہ ظلم نہ کریں...... آئی وانٹ ٹو سی دیم...... میں اُن سے ملنا چاہتی ہوں...... اپنی پیاس بجھانے کے لیے آئی ہوں...... کنوئیں کے پاس آکر واپس نہیں پلٹوں گی۔" عاصمہ کی آواز آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ "خدا کے واسطے مجھے اُن کی دید سے محروم نہ کیجیے گا۔"

پھر جلیس الحسن کو عاصمہ کے پھوٹ پھوٹ کر رونے کی آواز سُنائی دی۔

وہ پگھل گئے۔

"آل رائٹ۔ اگر وہ تم سے ملنا چاہیں گے تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔"

"تھینک یو...... تھینک یو ویری مچ......" عاصمہ نے کہا۔ "اب مجھ پر ایک مہربانی اور کیجیے۔"

"کیسی مہربانی؟"

"میں جانتی ہوں انھیں مجھ سے بہت شکایتیں ہوں گی، بہت متنفر ہوں گے وہ مجھ سے۔" عاصمہ نے پل بھر کو توقف کرنے کے بعد انتہائی لجاجت سے کہا۔ "آپ کو ان برسوں کی قسم جو ہم نے اکٹھے گزارے اُن تک میری رسائی کے لیے راستہ ہموار کر دیجیے۔ میں...... میں اُن کی نگاہوں میں اپنے لیے نفرت اور بیزاری نہیں دیکھنا چاہتی۔"

جلیس الحسن سوچ میں پڑ گئے۔

ماں کے معاملے میں انھوں نے بچوں کے جذبات کو کبھی ٹٹولنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔

کیا عجب وہ اتنے متنفر ہو چکے ہوں اس سے کہ اُس کا نام سُننا بھی گوارا نہ کریں۔

"آپ کو ان لمحوں کی قسم جو ہم نے ساتھ گزارے۔" عاصمہ نے گڑگڑا کر کہا۔

"میں کوشش کروں گا۔"

"کوشش کرنے کی بات نہیں وعدہ کیجیے۔ مجھے یقین ہے وہ آپ کی بات نہیں ٹالیں گے کیونکہ وہ آپ سے محبت کرتے ہیں...... آپ کی عزت کرتے ہیں...... آپ کو خدا اور اُس کے رسولؐ کا واسطہ جلیس۔"

جلیس الحسن دم بخود رہ گئے۔

اس قدر لجاجت سے، اتنا تڑپ کر تو عاصمہ نے اُن سے کبھی کچھ مانگا نہیں تھا۔

"ٹھیک ہے میں اپنی سعی ہر ممکن کوشش کروں گا۔"

"آج ہی بات کریں گے اُن سے...... ہے نا؟" عاصمہ نے بڑے کرب سے کہا۔

"ہاں۔"

"مجھ سے ملنے کے لیے آئیں گے آپ؟"

جلیس الحسن کو ایک موہوم سے دکھ کے احساس نے آ لیا۔

وہ عورت جو کبھی اُن کے نزدیک جانِ جہاں رہی تھی، جب وہ ساتھ تھی تو اُن کے نزدیک اُس سے جدائی کا تصور بھی اُن کے لیے محال تھا آج انتہائی بے بسی سے پوچھ رہی تھی "مجھ سے ملنے کے لیے آئیں گے آپ؟"

"مجھے ڈر ہے عاصمہ کہ میں تم سے اکیلے تو ملنے نہ آ سکوں گا۔" انھوں نے کہا۔

"سوری۔" عاصمہ نے ایک سرد آہ کھینچتے ہوئے کہا۔ "میں بھول گئی تھی کہ اب آپ محض میرے بچوں کے باپ ہی نہیں ایک دوسری عورت کے شوہر بھی ہیں۔"

"بہرحال میں بچوں کے ہمراہ آنے کی کوشش کروں گا۔"

"میں انھیں دیکھنے کے لیے بے چین ہوں۔ ایک ایک پل بھاری ہے۔ زیادہ دیر مت کیجیے گا۔"

"میں سمجھتا ہوں۔"

"کیا واقعی؟" عاصمہ نے بے یقینی سے کہا۔

"ہاں میں جانتا ہوں کہ دوسروں کے دیے ہوئے گھاؤ سے زیادہ انسان کو اپنے ہاتھوں خود کو دیے گئے زخموں کی تکلیف کہیں زیادہ محسوس ہوا کرتی ہے۔"

"تھینک یو...... تھینک یو جلیس کہ آپ نے میرا دکھ سمجھنے کی کوشش کی۔" عاصمہ بیگم نے بوجھل آواز میں کہا اور انھیں اپنا کمرہ نمبر بتا دیا۔

بچوں کو یہ خبر سُنانے اور اُن کا ردِ عمل دیکھنے سے پہلے جلیس الحسن نے الفت کو یہ خبر سُنانے، اُس کا ردِ عمل دیکھنے اور اُسے اعتماد میں لینے کی کوشش کی۔

الفت حواس باختہ ہو کر رہ گئی۔

اُس کی سماعت میں خطرے کی گھنٹیاں سی بجنے لگیں۔

کانچ کے پیالے میں بال دکھائی دینے لگا۔

"کیوں آئی ہے وہ یہاں؟"

"میں نے تمھیں بتایا نا بچوں سے ملنے۔ اعجاز کو بطورِ خاص دیکھنے۔"

"وہ اس گھر میں نہیں آئے گی اگر اُسے بچوں سے ملنا ہے تو اس گھر سے باہر ہی ملے۔"

"اگر وہ آ بھی گئی اس گھر میں تو کیا فرق پڑ جائے گا۔" جلیس الحسن نے رسانیت سے کہا۔

"فرق!" الفت نے پھر کہا۔ "کیا وہ اپنے دوسرے شوہر سے علیحدہ نہیں ہو چکی ہے؟"

"ہاں تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"آپ کے لیے نہ سہی مجھے بہت فرق پڑتا ہے۔"

"مثلاً؟"

"بس میں اسے اپنے گھر میں نہیں آنے دوں گی۔"

جلیس الحسن دھیرے سے مسکرا دیے۔

اُلفت انھیں گھائل ہرنی کی طرح متوحش نظر آ رہی تھی۔

"وہ بچوں سے ملنا چاہتی ہے کیا عجب کہ بچے بھی اُس سے ملنا چاہیں!"

"بچوں کو بتانے کی ضرورت ہی کیا ہے!"

"فرض کرو میں انھیں نہیں بتاتا ہوں، کیا تمہارے خیال میں وہ اُن تک پہنچنے کا کوئی اور ذریعہ نکالنے کی کوشش نہیں کر سکتی؟ وہ انھیں فون کر سکتی ہے اور ہم فون پر پہرا نہیں لگا سکتے۔ وہ اِدھر اُدھر سے معلومات فراہم کر کے ان کے اسکول، کالج یا یونیورسٹی پہنچ سکتی ہے۔ اور کچھ نہیں تو وہ انھیں راستے میں گھیر سکتی ہے۔ ہم کہاں کہاں پہرے لگا سکتے ہیں!"

"ٹھیک ہے اُسے بچوں سے ملنا ہے تو گھر سے باہر ملے۔ اس گھر میں اُسے ہرگز نہیں آنے دوں گی۔"

"میں پوری کوشش کروں گا کہ ایسا ہی ہو لیکن بالفرض بچوں نے خود اُس سے ملنے کے لیے جانے کے بجائے بہ جا ہا کہ وہ اُن سے ملنے کے لیے خود گھر آئے تب تو میں مجبور ہوں گا۔"

الفت زیادہ ہراساں نظر آنے لگی۔

جلیس الحسن اس کی وجہِ پریشانی سے نا آشنا نہ تھے۔

انھوں نے بڑے پریم سے اپنے دونوں ہاتھ اُس کے شانوں پر دھر دیے اور بڑی محبت سے اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولے۔ "کیا تمہیں مجھ پر بھروسا نہیں ہے؟"

اُس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو اُمڈ آئے اور اُس نے اپنا چہرہ اُن کے سینے میں چھپا لیا۔

"مجھ پر بھروسا رکھو۔" وہ اُس کے بالوں میں سہج سہج ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔ "تم نے اس گھر کی شیرازہ بندی میں جو اہم اور بھرپور کردار ادا کیا ہے اُس سے کوئی احسان فراموش ہی منکر ہو سکتا ہے اور.... میں احسان فراموشوں اور کم ظرفوں میں سے نہیں ہوں۔"

وہ چاہنے کے باوجود اُن سے یہ نہ کہہ سکی کہ لمحہ لمحہ وہ اُس لمحے سے خائف رہی تھی جب اُن کی زندگی سے نکل جانے والی عورت کی واپسی اس کے سکون کو تہ و بالا کر دے۔

اُس نے جی ہی جی میں سوچا۔ کاش! میں آپ کو بتا سکتی کہ اس عورت کا خیال میرے لیے کس کس طور سوہانِ روح بنا رہا تھا!

کاش! وہ انھیں بتا سکتی کہ اُن کے ساتھ چلتے ہوئے وہ ایک قدم بھی اس زعم کے ساتھ نہیں اٹھا سکی تھی کہ اُس کے ہم قدم چلنے والا مرد صرف اور صرف اُس کا ہے۔

پہلی بار اس سے وحشتناکی میں جو کبھی غلطی سرزد ہوئی ہو، دوسری بار گھر آنے کے بعد سے اب تک اس نے ہر قدم اس حزم و احتیاط کے ساتھ اٹھایا تھا جیسے کانچ کی رہگزر پر چل رہی ہو!

"تمہیں عاصمہ کی آمد سے خائف ہونے کی ضرورت نہیں جانِ من۔" انھوں نے اُسے سمجھایا۔ "تم میں اور اُس میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اُس نے مجھے منتشر کر کے رکھ دیا تھا تم نے مجھے ریزہ ریزہ سمیٹا ہے۔ اُس نے عورت ذات پر میرا اعتماد متزلزل کر دیا تھا تم نے اُسے بحال کیا ہے..... وہ میری محبوبہ تھی تم میری محبت ہو۔"

الفت نے چونک کر سر اٹھایا اور اُن کی طرف دیکھا۔

"کیا تم جانتی ہو کہ جب کوئی مرد کسی عورت کو اپنی محبوبہ نہیں بلکہ اپنی محبت قرار دیتا ہے تو اُس کا کیا مطلب ہوتا ہے؟"

"کیا؟" اُس نے بے ساختہ پوچھا۔

وہ دھیرے سے مسکرا دیے اور اُس کی ناک کی پھننگ کو چھوتے ہوئے بولے۔ "اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ مرد اس عورت کو بے حد عزیز رکھتا ہے۔"

وہ شکل باندھے بھیگی ہوئی آنکھوں سے انھیں دیکھتی رہی۔

"الفت! تم نے بہت سی کڑی منزلیں بہت بہادری اور جرأت کے ساتھ سر کی ہیں، یہ آخری منزل اور سہی۔"

"کاش! آپ اندازہ کر سکتے کہ یہ منزل کتنی گراں ہے!" اُس نے جی ہی جی میں سوچا۔

اُن کی تمام تر یقین دہانیوں اور تسلیوں کے باوجود اُس کے من پر چھا جانے والی گھٹا چھٹنے نہ پا رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے گرج چمک کے ساتھ طوفان آئے گا۔

عاصمہ کے جانے کے بعد جلیس الحسن کی بچوں سے اُس کے بارے میں کم ہی بات ہوئی تھی بلکہ نہ ہونے کے برابر ہی۔ خصوصاً الفت کے مورچا سنبھال لینے کے بعد تو عاصمہ کا ذکر گویا شجرِ ممنوعہ بن گیا تھا۔

وہ اس حقیقت سے تو بے خبر نہ تھے کہ بچے ماں کو بھلا نہ سکتے تھے، مگر اب اُس کی آمد پر اُن کے کیا جذبات ہو سکتے تھے اس کا انھیں صحیح اندازہ نہ تھا۔

وہ یہ بھی جانتے تھے کہ الفت سے بچوں کے کیسے ہی خوشگوار مراسم کیوں نہ استوار ہو چکے ہوں، بعض معاملات میں وہ اس سے متخالف نظر آنے لگتے تھے۔

چنانچہ اسی خدشے کے تحت کہ شاید بچے الفت کے سامنے ماں کی آمد پر اپنے دلی جذبات کا اظہار نہ کر پائیں، انھوں نے بچوں سے مصلحتاً الفت سے علیحدگی میں بات کرنا مناسب جانا۔ اس ضمن میں وہ الفت کو پہلے ہی اعتماد میں لے چکے تھے۔

"کچھ بعید نہیں کہ بچے عاصمہ سے ملنے سے قطعاً انکار کر دیں۔" انھوں نے اُلفت سے کہا تھا۔

"تب؟" الفت نے خدشات سے لبریز نگاہیں اُن پر ٹکا دی تھیں۔

"تب ظاہر ہے عاصمہ کو مایوس ہونا پڑے گا۔"

"خدا کرے ایسا ہی ہو۔" الفت نے دل ہی دل میں خاموشی سے دعا کی۔

اس رات جب جلیس الحسن نے ان چاروں کو یکجا کر کے الفت سے علیحدگی میں انھیں بتایا کہ اُن کی ممی پاکستان آئی ہوئی ہے تو اُن کے چہروں پر حیرانی اور خوشی کی ایسی بھرپور کیفیت عود کر آئی کہ جلیس الحسن دیکھتے ہی رہ گئے۔

"رئیلی پاپا؟" زرین کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"ہاں بیٹا! وہ آئی ہوئی ہیں۔"

"کب سے آئی ہوئی ہیں؟" زرین نے بیتابانہ پوچھا۔

"کیسی مجبوری سے تو اُن کے بیان کے مطابق وہ آج ہی پہنچی ہیں۔"

تمکین، اعجاز اور فراز دم بخود بیٹھے تھے۔

اور زرین جو باپ کی چہیتی اور لاڈلی ہونے کے سبب اکثر اُن کی مشکل آسان کر دیا کرتی تھی اس وقت بھی اُن کی مشکل آسان کیے دے رہی تھی۔

"کیا..... آپ سے بات کی انھوں نے؟" زرین نے حیرانی سے آنکھیں پھیلائیں۔

"ہاں۔ آج دفتر کے نمبر پہ بات کی تھی انھوں نے مجھ سے۔"

"کس وقت؟"

"سہ پہر کو۔"

"ائیرپورٹ سے بات کی تھی؟"

"نہیں تاج محل سے جہاں وہ ٹھہری ہوئی ہیں۔"

"آئی کیوں ہیں، اُن کا تو کوئی رشتے دار یہاں نہیں رہتا۔" اعجاز نے گمبھیر آواز میں کہا۔

"تم لوگوں سے ملنے..... بالخصوص تمہیں دیکھنے۔"

"مجھے!" اعجاز منہ اوپر کر کے شنشنا اٹھا۔ "مجھ سے کیا تعلق ہے ان کا؟"

"بیٹے ہو تم اُن کے۔"

"فادر گاڈ سیک پاپا!" اعجاز نے سر جھٹک کر کہا۔
جلیس محسن کو حیرانی نے آلیا۔

اگر وہ واقعی ماں سے متنفر تھا تو اس کی تصویر اس نے اپنے کمرے میں کیوں سجا رکھی تھی!
"اب تو ہم بہت بڑے ہو گئے ہیں پاپا۔" فراز نے کہا۔
"تو؟" جلیس محسن نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔
"تو یہ کہ ہمیں ان سے ملنے کی ضرورت نہیں!"
جلیس محسن کی سماعت میں عاصمہ بیگم کی سسکیاں بازگشت کی صورت ابھرنے اور ڈوبنے لگیں۔
"شی از ڈائنگ ٹو سی یو۔" جلیس محسن نے عاصمہ کی وکالت کی۔
"تو ہم کیا کریں..... ہماری پروا کب کی تھی انھوں نے!" فراز تلخ لہجے میں بولا۔
جلیس محسن نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔
کچھ دیر کو خاموشی چھا گئی۔
پھر جلیس محسن نے رسانیت سے کہا: "وہ تمہاری ماں ہیں!"
"سو واٹ پاپا! ہم بھی تو اولاد تھے ان کی!" اعجاز بلبلا کر بولا۔
"بہت بے چین ہیں وہ تم لوگوں سے ملنے کے لیے۔" نگین اور زرین انتہائی مضطرب دکھائی دینے لگیں۔
"مگر ہم بے چین نہیں ہیں ان سے ملنے کے لیے۔"

"چاچی! ڈونٹ بی سو کرول۔" نگین نے تڑپ کر کہا۔
جلیس محسن نے چونک کر نگین کی طرف دیکھا۔
"تم تو تم مجھے ظالم کہتی ہو، یہ جانتے ہوئے بھی کہ ظلم کس نے کیا تھا؟ ظالم کون ہے؟" اعجاز بھبک کر بولا۔
"ٹھیک ہے۔" نگین نے سر جھٹک کر کہا۔ "مگر ایک تم ہی پر تو ظلم نہیں ٹوٹا تھا۔ ہم سب شامل تھے۔ سب سے زیادہ ظلم تو زرین پر ہوا تھا کتنی چھوٹی سی ہوا کرتی تھی یہ ان دنوں!"

"تم کہنا کیا چاہ رہی ہو؟" اعجاز نے اسے تیکھی نگاہوں سے دیکھا۔
نگین نے سر جھکا لیا پھر دھیمے سُروں میں بولی۔ "ہمیں پاپا سے زیادہ بحث کرنے کی ضرورت نہیں۔ پاپا سے پوچھو کہ وہ کیا چاہتے ہیں؟" اس نے توقف کیا پھر ذرا کی ذرا باپ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "پاپا! آپ نے ہمیشہ ہمیں راستہ دکھایا ہے اور ہم نے ہمیشہ آپ ہی کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے کی کوشش بھی کی ہے۔ اب بھی آپ ہی بتائیے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"
جلیس محسن نگین کا منہ تکتے رہ گئے۔
بے شک وہ ایم ایس سی کی طالبہ تھی۔
چاروں بھائی بہنوں میں سب سے بڑی تھی۔
سمجھدار بھی تھی۔
مگر انھیں اس سے ایسی دانشمندی کی توقع ہرگز نہیں تھی۔
کس دانشمندی اور خوبصورتی سے اس نے نہ صرف اپنا بلکہ باقی بہن بھائیوں کے دامن بھی صاف بچاتے ہوئے جملہ بوجھ انھی پر ڈال دیا تھا۔
وہ کچھ دیر منتظر رہی۔
پھر اس نے کہا "آپ کی کیا رائے ہے پاپا؟"
"میری رائے؟" وہ چونکے "کس سلسلے میں؟"
"اسی سلسلے میں کہ ہمیں ان سے ملنا چاہیے یا نہیں؟" نگین نے بڑی چابکدستی سے پانسا پھینکا۔
"تمہاری کیا مرضی ہے؟" جلیس محسن نے الٹ چال چلنے کی کوشش کی۔
"ہم وہی کریں گے جو آپ چاہیں گے۔" نگین نے پھر دانشمندی کا مظاہرہ کیا۔
جلیس محسن کشمکش و پیچ میں پڑ گئے۔

کیسا الجھا کے رکھ دیا تھا نگین نے انھیں!
سارا بوجھ انھی پر ڈال دیا تھا۔
اعجاز اور فراز کے جارحانہ رویے کے پیش نظر وہ تو کچھ دیر قبل یہ سوچ رہے تھے کہ اب وہ عاصمہ کو جتا سکیں گے کہ بعض غلطیوں کا انجام اتنا بھیانک بھی ہوا کرتا ہے کہ اپنے وجود کے حصے بھی اپنے نہیں رہتے۔
ان کا خیال تھا عاصمہ تڑپے گی، روئے گی، بلبلائے گی۔
شاید دیواروں سے بھی سر ٹکرائے گی۔
وہ دست بستہ ان کے سامنے آ کھڑی ہو گی۔
گڑگڑائے گی، معافیاں مانگے گی۔
وہ اس کے چہرے پر پچھتاووں کے سائے لرزاں دیکھ سکیں گے۔
اور یوں شاید کسی حد تک ان دکھوں کا تاوان ادا کر دے گی جو اس کے جانے کے بعد انھوں نے اور بچوں نے بھگتے تھے۔

پھر وہ بچوں کو اس سے ملنے پر مجبور کر کے کسی غیور فاتح کی طرح اپنی گردن اکڑا لیں گے!
مگر!
نگین نے تو بساط ہی الٹ دی تھی۔
انھوں نے تو عاصمہ کے جانے کے بعد ہمیشہ یہی سوچا تھا کہ اگر کبھی حساب کتاب کا موقع آیا تو عاصمہ ہی نقصان میں رہے گی۔
لیکن
یہاں تو کچھ اور ہی صورت حال بن رہی تھی۔

"بتائیں پاپا!" نگین نے تقاضا کیا۔
"کیا بیٹے؟" وہ جانتے بوجھتے انجان بن گئے۔
"کہ ہمیں ان سے ملنا چاہیے یا.....؟" اس نے پھر اپنا سوال دہرایا۔
"میرے خیال میں تو مل لینے میں کوئی حرج نہیں۔" وہ محتاط لہجے میں بولے۔
"ٹھیک ہے پاپا!" نگین نے سعادت مندی سے گردن ہلائی۔
"کیا ٹھیک ہے؟" اعجاز بھبک کر بولا۔
"اگر پاپا یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے ان سے مل لینے میں کوئی حرج نہیں تو ہمیں ان سے مل لینا چاہیے۔"
"یو آر سلی!"
"سلی میں ہوں یا تم جو ہر وقت پارا چڑھائے رکھتے ہو!"

"دیکھ رہے ہیں پاپا آپ اسے!" اعجاز نے شکایتی لہجے میں کہا۔
"آل رائٹ..... آل رائٹ....." جلیس محسن نے اپنے ہاتھوں سے امن و آشتی کے علم کا کام لینے کی کوشش کی۔
"لڑنے جھگڑنے کی ضرورت نہیں۔ جو کچھ کرنا ہے باہم اتفاق سے!"
"چاچی کو سمجھائیں پاپا کہ کبھی کبھی غصہ طاق میں بھی اٹھا رکھنا چاہیے آخر اس کا بھی آرام کرنے کو جی چاہتا ہو گا۔" نگین بولی۔
جلیس محسن مسکرائے بنا نہ رہ سکے۔
اعجاز نے منہ پھلا لیا۔
ذرا سے توقف سے جلیس محسن نے ان چاروں کے چہروں کا جائزہ لیتے ہوئے کہا: "تو آپ لوگ اپنی ماں سے ملنے کے لیے تیار ہیں؟"
"ایبسولیوٹلی پاپا!" نگین نے کہا۔
"اعجاز بیٹے! تمہاری کیا مرضی ہے؟"

اعجاز کچھ نہیں بولا بدستور منہ پھلائے بیٹھا رہا۔

"فراز بیٹے تمہارا کیا خیال ہے؟"

"ٹھیک ہے پاپا جیسے آپ کی مرضی۔" فراز نے ہتھیار ڈال دیے۔

اعجاز نے چونک کر فراز کو دیکھا۔

زرّین کچھ دیر لب منتظر رہنے کے بعد بولی۔ "پاپا آپ نے مجھ سے نہیں پوچھا؟"

جلیس الحسن مسکرا دیے۔

"چلو تم بھی بتا دو کہ تمہاری کیا مرضی ہے؟"

"میرا ووٹ نگی باجی اور فراز بھائی کے ساتھ ہے۔"

"گڈ۔"

"پاپا! ایک بات تو بتائیے۔" زرّین نے کہا۔

"ہاں پوچھو۔"

"مم ہوٹل میں کیوں ٹھہری ہیں؟"

"کیونکہ یہاں اُن کا کوئی عزیز رشتے دار نہیں رہتا۔"

"ہم لوگ تو تھے پاپا۔" زرّین نے جو اُن کی لاڈلی بیٹی تھی بلا تامل کہا۔

جلیس الحسن نے چونک کر اس کی طرف دیکھا پھر قدرے تلخ لہجے میں بولے۔ "بیٹا! آپ لوگوں سے انھوں نے تعلق ہی کہاں رکھا، کس منہ سے وہ آتیں یہاں؟"

حقیقت یہ تھی کہ اس وقت جلیس الحسن کو عاصمہ سے حسد محسوس ہو رہا تھا کہ انھوں نے گزشتہ برسوں کے دوران بچوں کے لیے کیا کچھ نہیں کیا تھا۔ انھیں اپنا بنائے رکھنے کی خاطر تو انھوں نے الفت کو ایک مسلسل آزمائش کی بھٹی میں جھونک دینے سے بھی دریغ نہ کیا تھا تب کہیں جا کے ان کی نظروں میں سرِ بلند رہے تھے جبکہ عاصمہ..... ایک بڑی لغزش کے باوجود بھی نقصان میں نہ رہتی نظر آتی تھی!

اُن کے گمان میں نہ تھا کہ حقیقت روایتی نقطوں اور داستانوں سے اس درجہ مختلف بھی ثابت ہو سکتی ہے!

"تو کل آپ چل رہے ہیں؟" جلیس الحسن نے اُٹھتے ہوئے پوچھا۔

"کہاں پاپا؟" نگین نے حیرانی سے پوچھا۔

"اپنی مم سے ملنے۔"

"کیا وہ یہاں نہیں آئیں گی؟" نگین کی حیرانی بڑھ گئی۔

"آنا تو انھی کو چاہیے۔ ہم کیوں جائیں ملنے!" فراز نے زبان کھولی۔ "وہ ہمیں چھوڑ کر گئی تھیں، ہم نے تو انھیں نہیں چھوڑا تھا۔" اس نے زہر خند لہجے میں مزید کہا۔

جلیس الحسن کو تھوڑی سی تقویت تو ملی۔

"فراز ٹھیک کہتا ہے۔" اعجاز نے پہلو بدل کر کہا۔

جلیس الحسن چونکے اور انھوں نے اعجاز کو دیکھا۔

کیا اُس کا فراز کی تائید کرنا اس امر کا اظہار نہ تھا کہ ماں کی نسبت اُس کے خیالات میں واضح لچک موجود تھی۔

لیکن مسئلہ یہ بھی تو تھا کہ الفت نہیں چاہتی تھی کہ عاصمہ گھر آئے۔

چنانچہ انھوں نے کہا۔ "میری رائے تو یہ ہے کہ آپ لوگ ایک دفعہ اُن سے خود جا کر مل لیں پھر اُن کی مرضی کہ وہ آئیں یا نہ آئیں۔"

"پاپا!" زرّین نے ہچکچاتے ہوئے۔ "کیا ابھی نہیں چل سکتے ہم لوگ؟"

جلیس الحسن نے گہری نگاہوں سے اُسے دیکھا پھر ہلکی سی ناگواری کے ساتھ بولے۔ "بہت بیتاب ہوتی جا رہی ہو تم!"

زرّین خجل سی ہو گئی۔

نگین نے جب زرّین سے اس جیسی محبت تھی اُسے خجل ہوتے دیکھا تو اُس کی مدافعت کرتے ہوئے بولی۔

"اِٹ از جسٹ نیچرل پاپا!"

"جی پاپا!" اعجاز نے بھی تائید کی۔ "اس میں زرّین بے چاری کا کیا قصور! یہ تو بالکل فطری سی بات ہے۔"

جلیس الحسن اعجاز کا منہ دیکھتے رہ گئے۔

"ہاں پاپا۔ مم اگر ہمیں چھوڑ کر چلی گئی تھیں تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہمارے دل سے بھی اُن کی محبت ختم ہو گئی۔" نگین نے کہا۔

یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔

ان چاروں کی خوبی یہی تھی کہ آپس میں لاکھ معرکہ آرئیاں ہوتیں لیکن جب کہیں اور سے اپنوں میں سے کسی پر بھی آنچ آتے دیکھتے تو متحد ہو کر مقابلہ کرتے۔

جوان بچوں کے جواز و دلائل، اُن کی دانشمندی، اُن کی ترپ چالوں کے آگے جلیس الحسن خود کو بے دست و پا محسوس کر رہے تھے۔

انھیں عاصمہ پر رشک ہو رہا تھا۔

"کل کس وقت چلیں گے پاپا؟" نگین نے پوچھا۔

"سہ پہر کو بیٹا!"

"کیا آپ دفتر سے جلدی آجائیں گے؟"

"ہاں۔"

"بھائی تم بھی چلو گے نا؟" نگین نے مسکراتے ہوئے اعجاز کو دیکھا۔

"میں تمہاری طرح احمق نہیں ہوں۔" اعجاز نے غصّے سے کہا۔

"مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس گھر میں ایک افلاطون بھی بستا ہے۔" نگین نے زیرِ لب مسکرا کر کہا۔

"تو آپ نہیں چلیں گے؟" فراز نے بھائی سے پوچھا۔

"تب کی بات تب دیکھی جائے گی۔"

جلیس الحسن کو اُن کی اپنی ڈپلومیسی حیران کیے دے رہی تھی۔

اعجاز تو "صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں" کی تفسیر دکھائی دے رہا تھا۔

وہ بے چارہ بھی کیا کرتا۔

محبت کی بعض اقسام ایسی بھی ہیں جو انسان کو صحیح یا غلط، جائز یا ناجائز، مناسب یا نامناسب، فائدہ یا نقصان سے ماورا کر دیتی ہیں۔

ماں سے اولاد کی محبت بھی ایسی ہی اقسام کے زمرے میں آتی ہے!

اگلے روز سہ پہر کے وقت جب جلیس الحسن نگین، فراز اور زرّین کو لے کر عاصمہ سے ملوانے کے لیے لے جا رہے تھے تو الفت کے دل پر ایک ناقابلِ بیان وحشت سوار تھی۔

ان تینوں کی سج دھج اور اُن کے چہروں پر بہانے بہانے سے اُمڈ آنے والی مسکراہٹ اُسے بے کل کیے دے رہی تھی۔

عاصمہ سے اُسے انجانا سا حسد محسوس ہو رہا تھا۔

"ایسی عورتیں کتنی خوش قسمت ہوا کرتی ہیں کہ جو مرضی آئے کر لیا پھر بھی بازی انھی کے ہاتھ رہا کرتی ہے۔" وہ انتہائی رشک سے سوچ رہی تھی۔

کم و بیش کچھ ایسی ہی کیفیت سے جلیس الحسن بھی دوچار تھے۔

"کیسی عجیب بات ہے عاصمہ کہ تم میری توقع کے برخلاف نقصان میں نہیں رہیں۔" وہ دل ہی دل میں سوچ رہے تھے۔

کاش!

الفت اور جلیس الحسن سطحی صورتِ حال سے نتائج اخذ کرنے کے بجائے گہرائیوں میں جھانک سکتے۔

عاصمہ جیسی عورتیں خوش قسمت کب ہوا کرتی ہیں!

بچوں سے دُور ہو جانے کے بعد وہ جس کرب سے گزر رہی تھیں اس کا اندازہ کوئی اور نہ کر سکتا تھا۔
رات رات بھر وہ انگاروں پر لوٹا کرتی تھیں۔
بچوں کا خیال اُن کے دل میں ہمیشہ ہی مچا کرتا تھا۔
امریکا جیسی روشن اور پُرمسرت دنیا میں بھی وہ خود کو تاریکیوں میں گھرا محسوس کرتی تھیں۔
امریکا میں موجود مختلف تیرا غلوں کی ماؤں کے ساتھ اُن کے بچے دیکھ کر وہ مضطرب اور متوحش ہو جایا کرتی تھیں۔

ہر رات انہیں خواب میں دیکھا کرتی تھیں۔
برس کے برس آنسوؤں کا چراغاں کرتے تمام اُن کے جنم دن مناتی رہتی تھیں۔
اُن میں سے ہر ایک کے نام جنم دن کا تہنیت نامہ لکھ کر اپنے پاس ہی رکھ لیا کرتی تھیں کہ ارسال کرنے کی تو ہمت نہ ہوتی تھی۔

اسد حلیم سے اُن کی نباہ نہ ہو سکنے کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ وہ اُن بچوں کو بھلا پائی تھیں جنہیں وہ ہزاروں میل دور چھوڑ آئی تھیں۔

اپنی دانست میں تو جلیس الحسن اور الفت دونوں ہی اُن کی خوش قسمتی پر رشک کیا کرتے تھے۔ مگر اس سے بڑی بدقسمتی اور کیا ہو سکتی تھی عاصمہ بیگم کی کہ جس گھر پر کبھی ان کے حکم کا سکہ چلتا تھا، جس راجدھانی کی وہ بے تاج مہارانی تھیں، آج اس گھر کے دروازے ان کے لیے بند تھے اور اس راجدھانی پر آج ایک دوسری عورت کے حکم کا سکہ چل رہا تھا۔

اپنی گم گشتہ جنت کی یاد میں بی بی حوا کی طرح تڑپ رہی تھیں۔
اپنی بدقسمتی پر وہ کتنی ملول و گرفتہ تھیں یہ کوئی اُن کے دل سے پوچھتا!

عاصمہ بیگم سے بچوں کی ملاقات ایک انتہائی جذباتی منظر تھا۔
عاصمہ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔
چہرے پر پچھتاوؤں کے سائے لرزاں تھے۔
وہ ان میں سے کسی سے بھی نظریں نہ ملا پا رہی تھیں۔
جلیس الحسن سے بھی نہیں!
جو کبھی رگِ جاں سے بھی قریب تر ہوا کرتے تھے۔
جن سے کوئی حجاب کوئی پردہ نہ تھا۔
جلیس الحسن نے دزدیدہ نگاہوں سے انہیں دیکھا۔
آنکھوں کے گرد متورم فصیل، گھبرے میک اپ اور تراشیدہ زلفوں والی یہ عورت اس عاصمہ سے کتنی مختلف تھی جو کبھی اُن کی رفیقۂ حیات ہوا کرتی تھی۔
اُن کی نگاہیں کیبارگی پلیں پھر جھک گئیں۔
نہ جانے کب کب کی پُرانی یادیں اُن کے دلوں پر آ کر گھمڈ کر چھانے لگیں۔
تینوں بچے عاصمہ بیگم سے مل تو لیے تھے مگر محجوب محجوب سے۔ انہیں اپنے اور ماں کے بیچ ایک اَن دیکھی خلیج حائل محسوس ہو رہی تھی۔
شدتِ جذبات نے کچھ دیر تو انہیں گنگ کر دیا۔ عاصمہ بیگم کسی مجرم کی طرح سر جھکائے بیٹھی رہیں پھر انہوں نے نفیس نظروں سے نگین کو خط کر کو دیکھا اور نظریں جھکا کر بہت دھیمی آواز میں پوچھا: "اعجاز نہیں آئے؟" ان کے لہجے میں تشویش تھی۔
"جی نہیں۔" نگین نے کہا۔

اُس کا یہ جواب عاصمہ بیگم کی تشنگی نہ بجھا سکا۔
"ٹھیک تو ہیں نا وہ؟" عاصمہ نے مضطرب ہو کر پوچھا۔
"جی۔"
"پھر کیوں نہیں آئے؟"
نگین نے امداد طلب نظروں سے باپ کی طرف دیکھا۔
جلیس الحسن نے کھنکھارتے ہوئے نامک پر ناک دھری پھر بولے: "وہ آج بھی ویسا ہی ضدی اور ہٹ دھرم ہے۔ شاید وہ یہ چاہتا ہے کہ تم خود اس سے ملنے آؤ۔"
"میں؟"
عاصمہ بیگم کے چہرے پر سوگواری مسکراہٹ پھیل گئی۔
"میں تو اس کے لیے سر آنکھوں کے بل جانے کو تیار ہوں بشرطیکہ......" وہ کہتے کہتے رک گئیں پھر خجل نگاہوں سے جلیس الحسن کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں: "مجھے اس کی اجازت ہو۔"
جلیس الحسن نے بے ساختہ چونک کر اُن کی طرف دیکھا۔ انہیں افسوس ہوا کہ عاصمہ بیگم اُن سے اس گھر میں داخلے کی اجازت طلب کر رہی تھیں جہاں کبھی اُن کی اجازت کے بغیر پتا نہ ہلتا تھا۔
عاصمہ بیگم نے زرین کو ممتا بھری نظروں سے دیکھا پھر اس کا دایاں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اسے بیتابانہ چومنے لگیں۔ اُن کی آنکھوں سے پھر آنسو بہنے لگے تھے۔
انہیں بیک وقت بے بس اور بے قرار دیکھ کر جلیس الحسن بھی آزردہ خاطر نظر آنے لگے کہ کچھ بھی ہو عاصمہ سے بھی اُن کا یک جان و دو قالب کا رشتہ رہا تھا۔
نگین، فراز اور زرین تینوں ماں کو مضطربانہ روتے دیکھ کر آزردہ ہو رہے تھے۔
"کتنی بڑی ہو گئی ہے میری بیٹی!" انہوں نے بڑے ہی پریم سے زرین کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔
پھر وہ نگین اور فراز سے بولیں: "تم دونوں بھی میرے پاس آکر بیٹھو۔"
وہ دونوں ہچکچائے۔
مگر جلیس الحسن نے ان دونوں کو آنکھوں ہی آنکھوں میں ماں کے نزدیک جا بیٹھنے کا اشارہ کیا۔
دونوں قدرے تامل سے عاصمہ بیگم کے پاس جا بیٹھے۔
"بیٹا! اعجاز تو ٹھیک ہے نا؟" انہوں نے نگین سے پوچھا۔ اُن کے لہجے سے ہنوز تشویش عیاں تھی۔
"جی۔"
"چوٹ کہاں کہاں آئی تھی اُسے؟"
"جی...... وہ...... چوٹیں تو بہت آئی تھیں۔ پسلیاں ٹوٹ گئی تھیں۔ پنڈلی میں کمپاؤنڈ فریکچر تھا مگر اب وہ بالکل ٹھیک ہے۔"
"وہ بھی آ جاتا تو اچھا تھا۔" عاصمہ بیگم بصد حسرت بولیں پھر انہوں نے پچھتاوے سے عبارت آواز میں کہا: "لگتا ہے وہ تم سب سے زیادہ خفا ہے مجھ سے۔" انہوں نے زرین کا ہاتھ چھوڑ دیا اور اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا کر لرزتی ہوئی آواز میں کہا: "اُسے بلکہ تم سب کو پورا حق ہے مجھ سے ناراض ہونے کا!"
پھر جتنی دیر بچے اُن کے پاس رہے وہ دزدیدہ مگر ممتا بھری نگاہوں سے انہیں دیکھتی رہیں۔
جلیس الحسن بچوں کے چہروں پر محبت اور مسرت کا ایک غیر مرئی احساس ہلکورے لیتے دیکھ سکتے تھے۔

اس اَن دیکھی خلیج کا پاٹ بتدریج سمٹتا چلا جا رہا تھا۔
"حسن لاج" میں اپنی اپنی جگہ اعجاز اور الفت دونوں ہی مضطرب تھے۔
اعجاز سوچ رہا تھا "ان لوگوں کے ساتھ میں بھی چلا گیا ہوتا تو بہتر تھا۔"
اور الفت کی نظریں بار بار گھڑی کی جانب اٹھ رہی تھیں۔
"کتنی دیر ہو گئی۔" وہ فکرمند ہو کر سوچ رہی تھی۔
اس پر عجیب سی بولاہٹ طاری تھی۔

عاصمہ بیگم نے بچوں کی مدارات میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔
انھیں بہت پیار کیا۔
کافی دیاُن کے ساتھ گزارنے کے بعد شام ڈھلے جب جلیس الحسن نے رخصت ہونے کا ارادہ کیا تو عاصمہ بیگم نے بچوں کو چند تحائف بھی دینے کی کوشش کی۔ انھوں نے تردد کیا تو وہ گلوگیر آواز میں بولیں "بیٹا! خطا کی سزاوار ہوں مگر تمہاری ماں ہوں، بہت دکھ ہوگا مجھے اگر تم نے ان چیزوں کو قبول نہ کیا۔"
عاصمہ بیگم نے یہ بات اتنے درد بھرے لہجے میں کہی کہ جلیس الحسن کا دل بھی پگھل گیا۔
"لے لو بیٹے!" انھوں نے بچوں سے کہا۔
انھیں تو گویا اجازت ہی درکار تھی۔
پھر عاصمہ بیگم نے پولی تھین کے ایک شاپنگ بیگ میں ملفوف سوغات جلیس الحسن کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا "یہ آپ کے لیے ہے۔"
"یہ کیا؟" وہ چونک کر بولے اور انھوں نے عاصمہ بیگم کی پیش کردہ سوغات کو لینے سے تردد کیا۔
"پلیز! مجھے مایوس نہ کیجیے گا۔" انھوں نے اس قدر لجاجت سے کہا کہ جلیس الحسن کو لیتے ہی بنی۔
"مجھے یقین ہے آپ کو پسند آئے گا۔" عاصمہ بیگم بولیں۔
"پاپا! دکھائیے تو ذرا اس میں کیا ہے؟" زرین آگے بڑھی۔
جلیس الحسن نے شاپنگ بیگ اُسے تھما دیا۔
زرین نے شاپنگ بیگ میں ملفوف تحفہ نکال کر جلیس الحسن کے سامنے کیا تو وہ ششدر رہ گئے۔
عاصمہ بیگم اُن کی پسندیدہ برانڈ کی خوشبویات کا ایک خوبصورت سیٹ لائی تھیں۔
"تمہیں یاد رہا کہ میں کون سی خوشبو استعمال کرتا ہوں!" وہ بے ساختہ چونکے۔
"بھولنا آسان تو نہیں تھا۔" وہ خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ بولیں۔
جلیس الحسن اُن کا منہ دیکھتے رہ گئے۔
جب وہ چلنے لگے تو عاصمہ بیگم نے دبی زبان سے کہا "کیا میں اعجاز سے ملنے کے لیے آپ کے گھر آسکتی ہوں؟"
آپ کے گھر!
عاصمہ کے ان الفاظ پر جلیس الحسن سکتے میں رہ گئے۔
وقت نے انھیں کس موڑ پر لا کھڑا کیا تھا۔
وہ جانتے تھے کہ الفت کو عاصمہ کا گھر آنا گوارا نہ ہوگا۔
کم از کم اتنی جلد تو ہرگز نہیں۔
اور وہ اپنے گھر کے خوشگوار اور پُرسکون ماحول میں کوئی تلخی پیدا نہ کرنا چاہتے تھے۔
سو انھوں نے اعجاز کو آڑ بناتے ہوئے کہا "میں سمجھتا ہوں تمہیں اعجاز کو اس کی آمادگی کے لیے کچھ وقت دینا چاہیے۔"
"کتنا وقت؟" وہ بیتابانہ بولیں۔
"کم از کم دو چار دن تو ضرور دو۔"
"اس سے کچھ فرق پڑے گا؟"
"ہاں میں سمجھتا ہوں ضرور پڑنا چاہیے۔ اس دوران یہ تینوں تمہارے پاس آتے جاتے رہیں گے جب وہ انھیں تم سے ملتے جلتے دیکھے گا، اُن سے تمہاری باتیں سنے گا تو یقیناً تم سے ملنے پر آمادہ ہو جائے گا۔"
حقیقت یہ تھی کہ چند دن کا یہ وقفہ وہ اعجاز کے لیے کم الفت کے لیے زیادہ ضروری سمجھتے تھے۔
"ٹھیک ہے۔" عاصمہ بیگم نے بوجھل آواز میں کہا "جیسے آپ کی مرضی۔"
"اچھا اب ہم لوگ چلتے ہیں۔"
"بیٹا اب کب آؤ گے تم لوگ میرے پاس؟" عاصمہ بیگم نے بچوں سے پوچھا۔
وہ تینوں ان کے سوال کا جواب دینے کے بجائے باپ کی جانب دیکھنے لگے۔

"یہ تو آتے رہیں گے۔" جلیس الحسن نے کہا۔
"کل پھر لائیں گے انھیں میرے پاس؟" انھوں نے بڑی لجاجت سے کہا۔
ان کے لہجے کی لجاجت نے جلیس الحسن کو پگھلا کے رکھ دیا۔
اگرچہ عاصمہ بیگم سے ان کا ناتا ٹوٹے عرصہ ہو چکا تھا۔
مگر ماضی میں تو بہرحال ان سے گہرا تعلق رہا تھا۔
"ہاں۔" انھوں نے کہا "کل شام کو لاؤں گا انھیں تمہارے پاس۔"
"تھینک یو ... تھینک یو ویری مچ۔" وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولیں۔
الفت اور اعجاز دونوں ہی جلیس الحسن اور اُن تینوں کی واپسی کے بے قراری سے منتظر تھے۔ اعجاز بھائی بہنوں کی زبانی ماں سے ملاقات کی روئیداد سننا چاہتا تھا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ ماں سے ان کی کیا باتیں ہوئی تھیں؟
اور کیا وہ اس کو دیکھنے کے لیے بے چین تھیں۔
الفت مضطرب تھی کہ انھیں اتنی دیر کیوں ہو گئی تھی۔
رات ہونے کو تھی اور وہ اب تک واپس نہ لوٹے تھے۔
بار بار اس کی نگاہیں گھڑی پر جا رہی تھیں۔
وہ بولائی بولائی سی گھر میں پھر رہی تھی۔
بار بار اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر جھانکنے لگتی۔
گھبرا گھبرا کر برآمدے میں نکل آتی اور کوٹھی کے صدر دروازے کی سمت نگاہیں لگا کے کھڑی ہو جاتی۔
جیسے ہی جلیس الحسن کی گاڑی کوٹھی میں داخل ہوتی دکھائی دی، وہ وسیع برآمدے کی آخری سیڑھی پر جا کھڑی ہوئی۔
"بہت دیر کر دی!" اس نے جلیس الحسن کے گاڑی سے اُترنے کے بعد برآمدے تک آپہنچنے کا بھی انتظار نہ کیا۔
"ہاں ... ہاں ..." انھوں نے اس کی تشویش کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے کمرے کا رُخ کیا۔
الفت کی نگاہیں بتا رہی تھیں کہ وہ خاصی بازپرس کے موڈ میں تھی اور جلیس الحسن اس سے بچوں کے سامنے کچھ کہنا سننا نہ چاہتے تھے۔
تینوں بچے خاصے مسرور دکھائی دے رہے تھے۔
"ہیلو ممّا ..." ان میں سے ہر ایک نے کہا۔
"ہیلو جان۔" اس نے حسب معمول محبت سے جواب دینے کی کوشش کی۔
کمرے میں آتے ہی اس نے پھر کہا "بہت دیر لگائی آپ نے؟"
"بچے بھی کئی سال کے بعد ماں سے ملے تھے، اتنی رعایت تو انھیں دینا ہی تھی۔"
"آپ کی بھی تو کئی برس بعد ملاقات ہوئی تھی۔" وہ معنی خیز لہجے میں بولی۔
"کیا مطلب؟" انھوں نے چونک کر الفت کی طرف دیکھا۔
"مطلب یہ کہ رعایت کی ضرورت بچوں کو تھی یا آپ کو؟" الفت نے انھیں مشکوک نگاہوں سے دیکھا۔
"بچوں کی سی باتیں مت کرو۔"
"میں سب سمجھتی ہوں۔"
"تم کچھ بھی نہیں سمجھتیں۔" وہ جز بز نظر آنے لگے۔
"ایک تو میری سمجھ میں نہیں آتا بچے کیسے ہیں جو بڑے فخر سے اُس ماں سے ملنے چل دیے جو انھیں چھوڑ کر چلی گئی تھی۔"
"الفت!" وہ متانت سے بولے "آدمی خطا کا پتلا ہے، غلطی مجھ سے، تم سے کسی سے بھی ہو سکتی ہے۔ خطا کار کو ہمیشہ کے لیے مصلوب کر دینا انصاف نہیں ... اور جہاں تک بچوں کے جانے کا سوال ہے تو کچھ بھی سہی عاصمہ اُن کی ماں ہے۔ ان سے ان کا محبت کرنا قطعاً فطری ہے۔"
الفت ان کا منہ دیکھتی رہ گئی۔

ہفتہ بھر گزر چکا تھا۔

اور اس دوران نگین، فراز اور تزئین کی عاصمہ سے چار ملاقاتیں ہو چکی تھیں۔

وہ تینوں ماں سے مل کر بے حد خوش تھے۔ ہر مرتبہ ماں سے مل کر آنے کے بعد وہ تینوں تادیر اس ملاقات کا ذکر کرنے میں منہمک رہتے۔ اور پاپا اعجاز انھیں رشک سے دیکھے جاتا جب وہ تینوں اُس کے سامنے ماں کی باتیں کرتے تو اُس کے دل میں عجیب سی چبھن ہونے لگتی۔

کتنی عجیب بات تھی کہ ماں کے جانے کے بعد اُسی نے ماں کو سب سے زیادہ یاد رکھا تھا۔ ماں سے اُس کی محبت کا سب سے بڑا ثبوت تو یہ تھا کہ کئی برس تک اُس نے اُن کی تصویر اپنے سرہانے دبا کے رکھی تھی جو اُس کے ایکسیڈنٹ کے بعد الفت کی وسیع القلبی کے سبب اب سائیڈ بورڈ پر دھری نظر آنے لگی تھی۔

مگر جب ماں اُن سے ملنے کے لیے لوٹی تو وہی نقصان میں رہا تھا۔ باقی تینوں بھائی بہن تو ماں سے کئی مرتبہ مل چکے تھے اور اب تک اُن کی ایک جھلک بھی نہ دیکھ پایا تھا۔

نگین، فراز اور تزئین سے ملنا اپنی جگہ ایک تسکین تھی مگر اعجاز کے لیے عاصمہ بیگم کے دل کا ایک گوشہ بدستور تڑپ رہا تھا۔ وہ اس سے ملنے کے لیے انتہائی بے چین تھیں اور جب وہ اپنی بے چینی کا جلیس الحسن کے سامنے اظہار کرتیں تو وہ کہتے۔ "انشاءاللہ اس سے بھی جلد مل لو گی۔"

کبھی کبھی تو عاصمہ بیگم کو یہ واہمہ آگھیرتا کہ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ جلیس الحسن انھیں اعجاز کے بجائے اُس کے بارے میں کسی روح فرسا خبر کا سامنا کرنے کے لیے تیار کر رہے ہوں!

چنانچہ جب تینوں بچے اُن سے ملنے کے لیے آتے تو وہ بار بار اُن سے پوچھتیں۔ "بیٹا! اعجاز ٹھیک تو ہیں نا؟"

"جی! بالکل ٹھیک۔" اُن میں سے ہر ایک کا یہی جواب ہوتا مگر عاصمہ ماں تھیں اُن کے دل کو قرار نہ آتا۔

سچی بات تو یہ تھی کہ اگر وہ اعجاز سے ملنے کے لیے بے چین تھیں تو اعجاز بھی اُن سے ملنے کے لیے کچھ کم مضطرب نہ تھا اور جی ہی جی میں پچھتاتا تھا کہ کیوں نہ وہ بھی اپنے باقی بھائی بہنوں کی طرح ماں سے ملنے چلا گیا۔

نگین اور فراز بھائی کی قلبی کیفیت سے آشنا تھے مگر یہ سمجھنے سے قاصر کہ پاپا اعجاز کی مم سے ملاقات کروانے میں غیر ضروری تاخیر کیوں کر رہے تھے!

بالآخر ایک دن نگین نے کہہ ہی دیا۔ "پاپا! آپ اعجاز سے مم کے پاس چلنے کو کہیں تو سہی، میرا خیال ہے اب وہ راضی ہو جائے گا۔"

مگر اب جلیس الحسن عاصمہ کو اعجاز سے ملاقات کے بہانے گھر بلا کر انھیں اپنی پُرمسرت اور مطمئن زندگی کا نقشہ بھی تو دکھانا چاہتے تھے!

اُن کا خیال تھا کہ دو چار روز کی مہلت الفت کو موم کر دے گی مگر ان کا یہ خیال ہفتہ بھر گزر جانے کے بعد بھی خیالِ خام ثابت ہوا۔

بالآخر ماں سے اپنی چوتھی ملاقات میں نگین نے انھیں از خود ہی گھر آنے کی دعوت دے دی۔

"بیٹا! میں تو تمہارے پاپا کی اجازت کی منتظر ہوں۔" عاصمہ نے کہا۔

"پاپا!" نگین نے باپ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "مم کیا کہہ رہی ہیں؟"

"ٹھیک ہے۔" جلیس الحسن نے نیم دلی سے کہا۔

"یعنی میں آسکتی ہوں؟" عاصمہ بیگم کی آنکھیں دمکنے لگیں۔

جلیس الحسن نے رضامندی میں سر ہلا دیا۔

"تھینک یو... تھینک یو ویری مچ۔" اُن کی آواز میں آنسوؤں کی نمی تھی۔

"کب آؤ گی؟"

"میں تو ابھی اسی وقت چلنے کو تیار ہوں۔"

"نہیں... میرا خیال ہے کل پر رکھو۔"

"کل کس وقت؟"

"بچے تو عموماً دوپہر کے بعد ہی گھر پر ہوتے ہیں۔"

"دوپہر کے بعد آجاؤں؟ میرا مطلب ہے سہ پہر کو؟"

"میرے خیال میں شام کو رکھو، میں بھی ہوں گا گھر پر۔"

"رائٹ۔"

"میں ڈرائیور کو بھیج دوں گا تمہیں لینے کے لیے۔"

"میں..... خود آجاؤں گی۔"

"ڈرائیور چھ بجے تک تمہیں لینے پہنچ جائے گا۔"

"پاپا!" نگین نے سرگوشی میں کہا۔ "مم کل رات کا کھانا ہمارے ساتھ ہی کیوں نہ کھائیں؟"

"پوچھ لو ابھی مم سے۔"

"کیا؟" عاصمہ بیگم نے اپنی نگاہیں اُن پر ٹکا دیں۔

"آپ..... کل رات کا کھانا..... گھر پر ہی کھائیں..... ہم سب کے ساتھ۔"

عاصمہ بیگم نگاہیں جھکا کر تشکر آمیز انداز میں مسکرا دیں اور جب انھوں نے اپنی نظریں اوپر اٹھائیں تو اُن کی نگاہوں میں آنسو لرزاں تھے۔

"پہلے اپنے پاپا سے تو اجازت لے لو۔" وہ بوجھل آواز میں بولیں۔

"اجازت کی کیا بات ہے۔" وہ وقتی جوش کے زیر اثر کہہ بیٹھے اور یکسر بھول گئے کہ الفت کے عاصمہ کے بارے میں کیا جذبات تھے۔

"اوکے..... اوکے بیٹا!" عاصمہ بیگم نے نگین کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے اُس کی دعوت قبول کر لی۔

الفت کو اس امر سے آگاہ کرنا کہ عاصمہ بیگم کل ان کی مہمان ہونے جا رہی تھیں جلیس الحسن کے نزدیک ایک کارِ گراں تھا۔

گزشتہ ایک ہفتے کے دوران انھوں نے جب بھی الفت سے عاصمہ بیگم کے موضوع پر کوئی بات کرنا چاہی تھی، اُس نے شدید ناگواری کا اظہار کیا تھا۔

اُسے تو بچوں کا عاصمہ بیگم سے ملنے جانا بھی گوارا نہ تھا۔ بس جبراً قہراً برداشت کرنے والی بات تھی۔

اس روز بھی جب جلیس الحسن نے عاصمہ بیگم کی اعجاز سے ملنے کے لیے بیتابی کا ذکر چھیڑا تو اس نے ویسی ہی ناگواری کا اظہار کیا۔

"کل وہ اعجاز سے ملنے کے لیے گھر آرہی ہے۔" جلیس الحسن نے اس کی ناگواری کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "بچوں نے اُسے رات کا کھانا اپنے ساتھ کھانے کی دعوت دی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ گھر میں کوئی بدمزگی ہو۔"

الفت جہاں کی تہاں رہ گئی۔

کیا جلیس الحسن اُسے تنبیہ کر رہے تھے اس عورت کی بابت جس کے تصور نے اُسے اپنے لیے جلیس الحسن کا پیغام منظور کیے جانے کے بعد سے متوحش کرنا شروع کر دیا تھا؟

کیا کانچ کی وہ رہگزر جس پر اس نے ہر قدم بصد احتیاط اٹھایا تھا، پارہ پارہ ہونے جا رہی تھی؟

کیا شیشے کا وہ گھر جس کے بام و در پر جلیس الحسن کی زندگی سے نکل جانے والی عورت کی پرچھائیاں لرزاں تھیں بکھرنے جا رہا تھا؟

اوہ!

اوہ خدا!

یہ کیسا عذاب آیا چاہتا تھا!

کیا اس کی ساری ریاضت اکارت ہونے جا رہی تھی!

اس کا سر بری طرح گھوم رہا تھا۔

اس رات وہ پل بھر بھی نہ سو سکی۔ کروٹ پر کروٹ بدلتی رہی۔

پھر وہ مہیب شام آ پہنچی جس کے خوف نے اسے برسوں سے سہما رکھا تھا۔

اس نے عاصمہ بیگم کو دیکھا اور دیکھتی ہی رہ گئی۔

وہ واقعی ایک حسین عورت رہی ہوں گی۔

اب بھی کچھ کم دلکش اور دلربا نہ تھیں۔

عاصمہ کے مقابلے میں کم مائیگی کا احساس الفت کے دل کو اپنی مٹھی میں دبوچنے لگا۔

عاصمہ بیگم اعجاز سے ٹوٹ کر ملیں۔

اگرچہ اعجاز اپنے حقیقی جذبات پر پہرے بٹھا کر اُن کے سامنے آیا تھا مگر انھوں نے اپنا دل کھول کر اعجاز کے سامنے رکھ دیا۔

اس کا ماتھا، اُس کے بال، اس کے گال، اُس کے ہاتھ انھوں نے اس بے تابی اور بے قراری سے چومے جیسے کوئی تشنہ کام جی بھر کر پیاس بجھانا چاہتا ہے۔

انھوں نے الفت سے بظاہر مسکراتے ہوئے ہیلو ہائے کی اور الفت نے جواب بھی دیا مگر بباطن اُن کی کیفیات کچھ اور تھیں۔

وہ ایک دوسرے کو حریفانہ نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔

عاصمہ بیگم کو الفت پر رشک آ رہا تھا جو اُن کی سالہا سال راجدھانی پر راج کر رہی تھی۔

اور الفت خائف تھی کہ کہیں عاصمہ بیگم قزاق بن کر لوٹنے تو نہیں آئی تھیں!

اعجاز کے ساتھ وہ الفت کے لیے بھی چند تحائف لائی تھیں جنھیں الفت نے بے دلی سے قبول تو کر لیا مگر اپنے کمرے میں بے پروائی سے ایک طرف ڈال دیا۔

اعجاز تھوڑی دیر تو اکڑا اکڑا سا رہا پھر دھیرے دھیرے کھلتا نظر آنے لگا۔

نگین، فرزانہ اور نازنین کے چہرے وفورِ مسرت سے دمک رہے تھے اور وہ بات بات پر کھلکھلا پڑ رہے تھے۔

جلیس الحسن اگرچہ بہت خوشی کا اظہار نہ کر رہے تھے تو سنجیدہ یا خاموش بھی نہ تھے۔

اور تو اور گھر کے ملازم اپنی سابقہ مالکن کی آمد پر بچھے بچھے جا رہے تھے۔

وہ اکیلی تو فقط الفت تھی جسے یہ خوف مارے ڈال رہا تھا کہ جلیس الحسن کی زندگی سے نکل جانے والی عورت پلٹ آئی تھی۔ اور اس کے اردگرد گھیرا تنگ سا ہو رہا تھا!

جبکہ وہ خود کو اندھیروں میں گھرا محسوس کر رہی تھی۔

اب اسے اپنے سہو کا احساس ہو رہا تھا کہ اگر اس کڑے وقت میں میکے سے کسی کو بلا لیا ہوتا تو کچھ تو حوصلہ بلند رہتا اور ہمت بندھی رہتی۔

لیکن نہیں..... اچھا ہی ہوا کہ اس نے کسی کو نہ بلایا۔

کوئی وہاں سے آ بھی جاتا تو کیا کر لیتا؟

جلیس الحسن، اُن کے بچوں اور نوکروں کے چہروں پر سے جب وہی مسرت کے احساس کو نہ نوچ پا رہی تھی تو اس کے میکے سے آنے والا کون نفس کیا کر لیتا۔

جو کچھ بھگتنا تھا اسی کو بھگتنا تھا۔ اسی خیال کے تحت اس نے تو اب تک اپنے میکے میں عاصمہ کی خبر بھی نہ دی تھی۔

کھانے پر انتہائی اہتمام کیا گیا تھا۔

نگین نے اپنی یونیورسٹی اور نازنین نے اسکول سے چھٹی کی تھی۔ صبح ہی سے وہ رات کے کھانے کی تیاریوں میں لگ گئی تھیں۔ باہم مل جل کر کئی چینی کھانے تیار کیے تھے۔ کھانے کی میز کو خوبصورتی سے آراستہ کیا تھا۔

خانساماں بھی دن بھر ہی تو لگا رہا تھا۔

باوجود ناخواستہ الفت نے بھی آنے والی مہمان کے استقبال کی تیاریوں میں دلچسپی لی تھی۔ جلیس الحسن نے گزری رات بھی اسے سمجھایا تھا کہ یہ اس کے سفر کی آخری کڑی منزل ہوگی۔

کھانے کے دوران الفت دزدیدہ نظروں سے ایک ایک کو دیکھتی رہی۔

کھانے کی میز پر اس روز غیر معمولی رونق تھی۔

سوائے الفت کے سب ہی بہت زیادہ مسرور تھے اور کھانے کے دوران بے تکلفی سے باتیں کیے جا رہے تھے۔

کئی برس کی جدائی کے بعد اگرچہ یہ عاصمہ سے اعجاز کی پہلی اور باقی تینوں کی پانچویں ملاقات تھی لیکن وہ ایک دوسرے سے کافی گھلے ملے لگتے تھے۔ جلیس الحسن بھی شریکِ گفتگو تھے۔ الفت ہوں ہاں اور زبردستی کی مسکراہٹ سے کام چلا رہی تھی۔

عاصمہ بیگم بچوں کو اُن کے بچپن کے قصے سنا رہی تھیں اور ماضی کے نہاں خانے سے نہ جانے کب کب کے قصے نکال نکال کر لا رہی تھیں۔

وہ چاروں انتہائی دلچسپی اور انہماک سے سن رہے تھے۔ اُن کے چہرے مسرت سے دمک رہے تھے۔

الفت پر تشنج سا طاری ہوا جا رہا تھا۔ نوالے اس کے حلق میں پھنسے جا رہے تھے۔

وہ خود کو بے حد تنہا محسوس کر رہی تھی!

وہ سب کس قدر خوش اور سرشار تھے!

اپنی خوشی اور سرشاری میں وہ کھانے کی میز پر اس کی موجودگی کو جیسے بھلا ہی بیٹھے تھے۔

جلیس الحسن کو کھانے کی میز پر ہنستی مسکراتی عاصمہ بیگم اپنی خطا پر رنجیدہ و دل گرفتہ عاصمہ سے قطعاً مختلف نظر آ رہی تھیں۔ انھیں یوں لگ رہا تھا جیسے برسوں پرانی اُن کی عاصمہ بیگم واپس لوٹ آئی ہوں۔

گھر میں کتنی رونق تھی!

الفت جلیس الحسن کو بار بار عاصمہ کی طرف دیکھتے ہوئے پکڑ رہی تھی۔

بچوں نے اس وقت اپنی ماں پر جس طور توجہ مرتکز کر رکھی تھی اسے دیکھ کر اسے رعنا جمیل کی بات یاد آ رہی تھی۔ انھوں نے کہا تھا:

"دوسرے کے بچوں کے آگے اپنا دل بھی نکال کر رکھ دو تو وہ اپنے نہیں بنتے!"

اسے اپنی غلط فہمی پر ملال ہو رہا تھا۔

وہ دیوانی تھی جو اپنے تئیں اس خوش فہمی میں مبتلا ہو گئی تھی کہ جلیس الحسن کے بچے اس کے بن گئے ہیں۔

آج وقت نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ تو انھی کے تھے جس کی کوکھ سے انھوں نے جنم لیا تھا۔

کھانے کے بعد سب سبزہ زار پر جا بیٹھے مگر وہ کچھ دیر بعد ہی سر درد کا بہانہ کر کے اپنے کمرے میں چلی آئی۔ اس سے وہ سب کچھ برداشت ہی نہیں ہو رہا تھا۔

اس کے اٹھ آنے کے بعد عاصمہ بیگم نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ اب مجھے چلنا چاہیے!"

"پلیز ابھی نہیں!" نازنین نے مچل کر کہا۔

عاصمہ بیگم اس کی خواہش کے آگے بے بس ہو کر رہ گئیں۔

الفت نے اپنے کمرے کی سبزہ زار کی سمت کھلنے والی کھڑکی کھول دی تھی تاہم پردے بدستور گرے رہنے دیے تھے۔ وہ میز پر سے سر درد کا بہانہ کر کے اس گمان کے ساتھ اٹھی تھی کہ جلیس الحسن اس کے پیچھے پیچھے لپکے ہوئے آئیں گے۔

مگر اس کے گمان نے اس کا منہ چڑا دیا تھا!

اسے کمرے میں آئے خاصی دیر ہو چکی تھی مگر وہ اب تک اس کی خبر لینے نہ آئے تھے۔

"ہاں وہ کیوں آئیں گے بھلا اس پری کو چھوڑ کر!" اس نے بڑی کلفت سے سوچا۔

سبزہ زار پر معنی کے فوارے چھوٹ رہے تھے اور وہ نیم تاریک کمرے میں دلگیر پڑی تھی۔
دفعتاً ایک زوردار قہقہہ سنائی دیا اور وہ دم بخود رہ گئی کہ یہ قہقہہ تو جلیس الحسن کا تھا۔
اُف! کس قدر خوش تھے وہ!
کھانے کی میز پر بھی اُن کی نظریں بار بار عاصمہ کی طرف اٹھ رہی تھیں۔
جلیس الحسن خوش تھے۔
بچے مسرور تھے۔
نوکر بچھے جا رہے تھے۔
شاید گھر کے بام و در بھی مسرور ہوں!
تو پھر اس گھر میں اس کا کون تھا؟
اور کیا تھا؟
اُس کی گردن پر سناٹا سا طاری ہونے لگا۔
کنپٹیاں چٹخنے لگیں۔
وہ اٹھی اور دیوانہ وار کمرے میں ٹہلنے لگی۔
ہوا کمرے کی کھڑکی تک پہنچنے پر وہ کھڑکی کے پردے کی اوٹ سے باہر جھانکتی۔
باہر سبزہ زار پر محفل سجی ہوئی تھی۔
جلیس الحسن جو شریک مہمانوں کی خوشنودی کا خیال عزیز رکھتے ہوئے بیٹھے رہے تھے اب کچھ مضطرب ہو رہے تھے۔ اُن کی نگاہیں بار بار اپنی خواب گاہ کی جانب اٹھ رہی تھیں .... وہ جانتے تھے الفت نے عاصمہ کی آمد کو اُن کے سمجھانے بجھانے پر قہراً جبراً برداشت کیا تھا۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ الفت نے سر درد کا محض بہانہ کیا تھا۔ درحقیقت وہ اپنے گھر میں عاصمہ کی موجودگی کو برداشت نہ کر پا رہی تھی!
عاصمہ بیگم جب بھی جانے کا ارادہ کرتیں زرینہ کہتی: "تھوڑی دیر اور!"
بالآخر پونے بارہ بجے عاصمہ بیگم اٹھ ہی گئیں۔
"ڈارلنگ! آئی مسٹ گو ناؤ" انھوں نے زرینہ کو پیار کرتے ہوئے کہا۔
"کل پھر آئیں گی؟" زرینہ نے پوچھا۔
"بیٹا! کل تم لوگ آؤ! میرے پاس اکٹھے دن گزاریں گے" وہ بولیں پھر انھوں نے جلیس الحسن سے کہا۔ "کل کا دن آپ انھیں میرے ساتھ گزارنے کی اجازت دیں۔"
"مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟" وہ بولے۔
"ایسا کرو بیٹا کل سہ پہر کو تم لوگ میرے پاس آجاؤ۔ ہم سب مل کر باہر چلیں گے۔" انھوں نے اعجاز کا بازو تھام کر لجاجت سے کہا۔ "آؤ گے نا بیٹا؟"
"کوشش کروں گا" اعجاز نے جواباً کہا۔
"فار مائی سیک بیٹا" وہ منت آمیز لہجے میں بولیں۔
"بھائی پلیز! کہہ دیجیے ہاں" زرینہ گڑگڑائی۔
اعجاز چند لمحوں کو سوچ میں پڑ گیا۔ پھر اس نے گردن اثبات میں ہلاتے ہوئے کہا: "ٹھیک ہے۔"
"تھینک یو" عاصمہ بیگم نے کہا "اچھا اب چلتی ہوں۔"
"اعجاز بیٹے!" جلیس الحسن نے اعجاز کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "اپنی مام کو اُن کے ہوٹل تک تو چھوڑ آؤ۔"
"نہیں نہیں" عاصمہ بیگم گھبرا کر بولیں "میں خود چلی جاؤں گی۔ ابھی تو بارہ بھی نہیں بجے ٹیکسی مل جائے گی۔"
"آپ اس وقت ٹیکسی میں اکیلی جائیں گی؟" نگین نے تشویش ظاہر کی۔
"ہاں تو کیا ہوا؟"
"یہ پاکستان ہے آپ کا امریکا نہیں۔"
"ڈارلنگ! میں نے جوڈو کراٹے کے داؤ پیچ سیکھ رکھے ہیں۔"
"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ہیں تو آپ ایک خاتون ہی۔"

"گھبراؤ مت" عاصمہ بیگم نے نگین کا رخسار تھپتھپاتے ہوئے کہا "میں اکیلی جا سکتی ہوں اور وقت پڑنے پر اپنا دماغ رکھتی ہوں۔"
جلیس الحسن جو ماں بیٹی کے درمیان مکالمہ سن رہے تھے بولے "آخر اعجاز کے ساتھ جانے میں کیا قباحت ہے؟"
"بس میں خود چلی جاؤں گی۔"
"میرے ساتھ کیوں نہیں جانا چاہتیں آپ؟" اعجاز نے انھیں گہری نگاہوں سے دیکھا۔
عاصمہ بیگم نے اس کا بازو تھام کر ممتا بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا "میں تمہیں ڈرائیونگ کرتے دیکھنا ہی نہیں چاہتی۔"
جلیس الحسن اُن کے تردد کا سبب سمجھ گئے۔
وہ اعجاز کے ایکسیڈنٹ سے اس درجہ خائف ہو کر اپنے ماں ہونے کا ثبوت دے رہی تھیں۔
"فراز بیٹے تم چھوڑ آؤ اپنی ماں کو" جلیس الحسن نے فراز کو مخاطب کیا۔
"نہیں فراز بھی نہیں۔"
"کیوں؟ فراز بھی کیوں نہیں؟"
"کیونکہ میرے لیے فراز بھی اتنا ہی پیارا ہے جتنا کہ اعجاز۔"
"پاپا آپ چھوڑ آئیں نا" زرینہ نے کہا اور اس کی اس تجویز نے جلیس الحسن کو چونکا دیا۔
"لٹس گو ٹوگیدر" نگین چہک اٹھی "بلکہ پاپا آپ کے ساتھ تو ہم سب چلیں گے مام کو چھوڑنے۔"
عاصمہ بیگم نے جلیس الحسن کو متذبذب دیکھا تو بولیں "ارے نہیں نہیں میں خود چلی جاؤں گی۔"
"پاپا آپ چھوڑنے کے لیے چلیں مام کو" نگین نے کہا۔
"ہاں پاپا!" زرینہ مچل گئی۔
"اچھا ایک منٹ" جلیس الحسن نے قدرے ہچکچاتے ہوئے کہا "میں آتا ہوں۔"
وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے برآمدے کی سمت چل دیے۔
جونہی وہ اپنے کمرے میں داخل ہوئے الفت نے ترچھی نگاہوں سے انھیں دیکھتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا "فرصت مل گئی آپ کو؟"
انھوں نے اس کی اس بات کو نظرانداز کرتے ہوئے گاڑی کی چابی اٹھاتے ہوئے کہا "میں ذرا عاصمہ کو ہوٹل تک چھوڑنے جا رہا ہوں۔"
"کیوں؟" وہ بھبک کر بولی۔
"کیونکہ رات کافی ہو چکی ہے اور اس وقت کسی عورت کا تنہا ٹیکسی میں کہیں جانا مناسب نہیں۔"
"بہت خیال ہے!"
جلیس الحسن کچھ نہیں بولے اور انھوں نے دروازے کا رخ کیا۔
"کوئی اور چھوڑنے نہیں جا سکتا کیا؟" الفت کی غصے میں ڈوبی آواز نے اُن کے قدم پکڑ لیے۔ وہ پلٹ کر اس کے قریب آ رکے۔
"میں تو چاہ رہا تھا کہ اعجاز یا فراز چھوڑ آئیں مگر عاصمہ بیگم کو وہم ستا رہا ہے کہ کہیں خدانخواستہ پھر کوئی ایکسیڈنٹ .... ماں ہے نا اس لیے۔"
"اتنے برس یہ چاہت یہ ماں پن کہاں تھا؟" وہ تڑخ کر بولی۔
"یہ بحث کا موقع نہیں ہے" انھوں نے ایک بار پھر دروازے کا رخ کرتے ہوئے کہا "بچے بھی ساتھ جا رہے ہیں اس لیے تمہیں زیادہ متفکر ہونے کی ضرورت نہیں۔"
پھر وہ مزید کچھ کہے سنے بنا تیزی سے کمرے سے نکل گئے۔
الفت کو ہیجانی کیفیت نے آ لیا۔
اس پر لرزہ سا طاری ہو گیا۔ جی چاہ رہا تھا کہ باہر جا کر عاصمہ کو اتنا بُرا بھلا کہے کہ وہ دوبارہ اس گھر کا رخ کرنا بھول جائے۔
ابھی وہ اسی ہیجانی کیفیت سے دوچار دم بخود کھڑی تھی کہ باہر گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی۔

وہ کھڑکی کی طرف بڑھی اور اُس نے دیوانہ وار پردے سمیٹ دیے۔
مصنوعی روشنیوں کے اُجیارے میں اُس نے دیکھا، اگلی نشست پر جلیس الحسن کے برابر زرّین اور زرّین کے ساتھ عاصمہ بیگم بیٹھی ہوئی تھیں۔
عقبی نشست پر یقیناً نگین، اعجاز اور فراز ہی تھے۔
بے اختیار اُس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔
اُس نے کمرے کا دروازہ بند کیا اور بے دم سی بستر پر پڑ گئی۔
"آہ! کس بے رخی سے وہ یہ کہہ کر چل دیے کہ یہ بحث کا موقع نہیں۔" اُس نے چھت سے آویزاں فانوس کو تکتے ہوئے سوچا۔
گرم گرم آنسو اُس کی کنپٹیوں کو بھگوتے اُس کے بالوں کی بھول بھلیوں میں اُترنے لگے۔
روتے روتے اُس کی آنکھ لگ گئی۔
دروازے پر دستک سُن کر جب اُس کی آنکھ کھلی تو رات کے تقریباً ایک بجے کا عمل تھا۔
کوٹھی کی بالائی منزل سے ہنسنے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔
اُس نے جلیس الحسن سے کوئی پرسش نہیں کی۔ دایاں بازو آنکھوں پر دھر کر لیٹ گئی۔
"اُلفت!" انھوں نے اُس پر جھکتے ہوئے کہا۔ "سمجھنے کی کوشش کرو..... وہ اعجاز یا فراز کے ہمراہ جانے پر آمادہ نہ تھیں اور بچے اِس وقت اُنہیں اکیلے جانے نہ دینا چاہتے تھے۔ مجھے مجبوراً بچوں کی خوشی کی خاطر جانا پڑا۔"
اُس نے ذرا کی ذرا اپنی آنکھوں سے بازو ہٹایا اور بھیگی ہوئی آواز میں بولی۔ "میں سب سمجھتی ہوں۔" پھر وہ کروٹ لے کر لیٹ گئی۔
جلیس الحسن مزید کچھ کہے بغیر اپنا بستر پر لیٹ گئے۔

***

اگلی صبح انھوں نے الفت کو بجھا بجھا سا پایا۔
انھوں نے اُس کے سامنے کوئی وضاحت یا صفائی پیش کرنا مناسب نہیں جانا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ وقت سے بڑا شارح کوئی نہیں۔ بسا اوقات، بالخصوص ازدواجی معاملات میں زیادہ وضاحت اور صفائی بھی معاملات کو سلجھانے کے بجائے اُلجھا دیتی ہے۔
وہ جانتے تھے کہ عاصمہ بیگم بچوں سے ملنے آئی تھیں اور اُن کے جانے کے بعد الفت کے تمام شکوک رفع ہو جانے تھے۔
دوپہر کو انھیں عاصمہ بیگم نے اُن کے دفتر کے نمبر پر فون کیا۔ اُن کی سیکریٹری کے کال ٹرانسفر کرنے کے بعد جب جلیس الحسن نے کہا "جلیس۔" تو انھوں نے اپنا نام بتانے کے بجائے کہا "میں بول رہی ہوں۔"
"میں سُن رہا ہوں۔" انھوں نے برجستہ کہا۔
اور وہ ہنس دیں۔
وہی برسوں پہلے والی مست ترنم ہنسی۔
"کیسے ہیں؟"
"خدا کے فضل سے ٹھیک ٹھاک۔"
"رات بیگم صاحبہ بہت خفا تو نہیں ہوئیں؟"
"کس بات پر؟"
"مجھے میرے ہوٹل تک چھوڑنے اور زرّین کی فرمائش پر آئس کریم کھلانے کے چکر میں دیر ہو جانے پر۔"
"نہیں۔" جلیس الحسن نے مصلحتاً دروغ گوئی سے کام لیا۔
"حیرت ہے!"
"نہیں..... ایسی کوئی خاص حیرت کی بات نہیں، وہ ایک اچھی اور سمجھ دار عورت ہے۔"

"ہوں!" عاصمہ بیگم کی "ہوں" خاصی معنی خیز تھی۔ "اچھا یہ بتائیے، بچے آج آ رہے ہیں نا؟"
"ہاں ضرور۔"
"آپ خود ہی لے کر آ جائیے گا، انھیں بچگانہ اعجاز یا فراز کے حوالے مت کر دیجیے گا۔"
"میں تو نہ لا سکوں گا۔"
"اوہ! تو کیا بچوں میں سے کوئی ڈرائیو کرے گا؟"
"ہاں تو اس میں حرج ہی کیا ہے۔ آخر اعجاز اپنی یونیورسٹی بھی تو جاتا ہی ہے۔ فراز بھی ڈرائیونگ میں پرفیکٹ ہے۔"
"نہ جانے کیوں میں ان دونوں میں سے کسی کو ڈرائیونگ کرتے نہیں دیکھنا چاہتی..... آپ نہیں جانتے کہ جب مجھے خالہ آپا کی زبانی اعجاز کے ایکسیڈنٹ کی خبر ملی تو میرا کیا حال ہوا تھا، میرے بچوں کو ویسے ہی کیا کم دکھ ملے ہیں..... اب میں انھیں کسی تکلیف میں نہیں دیکھنا چاہتی۔"
"دکھ دیے کس نے؟" وہ شاکی لہجے میں بولے۔
"ہاں مجھے اعتراف ہے، دکھ میں نے دیے..... مگر..... اب..... اب میں انھیں کسی دکھ سے دوچار نہیں دیکھنا چاہتی۔"
"اعجاز کا ایکسیڈنٹ محض ایک اتفاقی حادثہ تھا، اُس کے بارے میں اس قدر جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں، خصوصاً اعجاز کے سامنے، ورنہ اُس کا اعتماد جو بمشکل بحال ہوا ہے، دوبارہ متزلزل ہو سکتا ہے۔"
"میں جانتی ہوں..... جانتی ہوں کہ حادثہ اتفاق ہی ہوا کرتا ہے۔ مگر میں کیا کروں، اپنے احساسات کے آگے بے بس ہوں۔ وہم میں پڑ گئی ہوں۔"
"اس پر قابو پانے کی کوشش کرو۔"
"آئی کانٹ۔" وہ روہانسی آواز میں بولیں۔
"دیکھو، کہنے کو تو میں بچوں کو ڈرائیور کے ساتھ بھی بھیج سکتا ہوں مگر اس صورت میں انھیں حسبِ عادت آٹھ بجے تک گھر واپس آنا ہوگا کیونکہ ڈرائیور کو گھر جانا ہوتا ہے، اُس کا گھر کافی دور ہے۔"
"آٹھ بجے تک! مگر میں چاہتی ہوں آج رات بچے کھانا بھی میرے ساتھ کھائیں۔"
"دیکھ لو۔"
"آپ..... کیوں نہیں لے آتے انھیں اپنے ساتھ؟"
"میری مشکل تم نہیں سمجھ سکتیں شاید۔"
"سمجھتی ہوں۔"
"پھر بھی؟"
"ہاں پھر بھی۔" انھوں نے کہا۔ "کچھ تعلق میرا بھی ہے آپ سے۔"
"کیسا تعلق!" وہ چونک کر بولے۔
"آپ میرے بچوں کے باپ ہیں۔" عاصمہ بیگم نے بڑے زعم سے کہا۔
"مجھے اس تعلق سے انکار نہیں۔"
"پھر ہچکچاہٹ کیوں؟"
انھوں نے ایک ٹھنڈی سی آہ بھرنے کے بعد کہا۔ "کاش! تم نے سوچا ہوتا کہ تمہاری ایک غلطی کتنے مسائل پیدا کر سکتی ہے۔"
چند لمحوں کو خاموشی سی چھا گئی پھر عاصمہ بیگم کھیانی سی عبارت لہجے میں بولیں۔ "میں بہت شرمندہ ہوں آپ سے بھی اور بچوں سے بھی۔"
"کوئی فرق نہیں پڑتا تمہارے شرمندہ ہونے یا نہ ہونے سے۔"
"پلیز!" وہ گڑگڑائیں۔
"ٹھیک ہے..... بچے چار پانچ بجے تک پہنچ جائیں گے تمہارے پاس۔"
"آپ کے ساتھ؟"
"نہیں ڈرائیور کے ساتھ۔"

"آ کٹھ بجے تک تو وہ واپس نہ ہو پائیں گے۔"
"تو پھر ایسا کرنا ڈرائیور کو فارغ کر دینا' واپسی پر اعجاز خود ڈرائیو کر لے گا۔"
"اوہ! بات تو وہیں کی وہیں رہی۔"
"اچھا تو پھر میں انھیں تمہارے پاس پہنچا آؤں گا اور رات کو پک کر لوں گا۔"
"تھینک یو..... تھینک یو ویری مچ۔"
"ویسے تمہارے وہم کی یہ قسم میری سمجھ میں آئی نہیں کہ اعجاز آخر ویسے کبھی تو خود بھی آ تا جاتا ہے۔"
"شاید میں پاگل ہو گئی ہوں۔"
"شاید نہیں یقیناً۔"
"اچھا تو پھر بالل پاگل ہوتی ہوں گی۔"
"اس میں کیا شک ہے۔"
وہ دھیرے سے ہنس دیں۔
وہی جلترنگ سی ہنسی۔
"تو پھر شام کو آپ بچوں کو لا رہے ہیں؟"
"ہاں مجبوراً۔"
"میں منتظر رہوں گی۔"

اُس روز جب جلیس الحسن دوپہر کے کھانے پر آئے تو انھوں نے کھانے کی میز پر بچوں سے کہا: "آپ لوگ چار بجے تک تیار ہو جائیے گا۔"
الفت کے کان کھڑے ہو گئے۔
خدایا!
یہ کیا ہو رہا تھا اُس کے گھر میں!
کہاں لے جا رہے تھے جلیس الحسن بچوں کو جو انھیں چار بجے تک تیار ہو جانے کی ہدایت کی جا رہی تھی؟
وہ تو ہر معاملے میں پہلے اس سے مشورہ لینے کے عادی ہو چکے تھے۔
یک بیک یہ تغیر کیسا!
کیا اسے قصداً نظر انداز کیا جا رہا تھا؟
وہ جاننا چاہتی تھی کہ وہ بچوں کو چار بجے تک تیار ہو جانے کی ہدایت کیوں کر رہے تھے مگر پھر یہ خیال مانع رہا جب وہ ہی نہیں بتانا چاہتے تو پھر وہ کیوں پوچھے؟
کھانے کے بعد جلیس الحسن حسب معمول دفتر نہیں گئے بلکہ قیلولے کے لیے اپنے کمرے میں آ لیٹے۔
الفت اپنی نگرانی میں کھانے کی میز صاف کروانے کے بعد کمرے میں آئی تو انھوں نے از خود کہا۔
"آج عاصمہ نے بچوں کو بلایا ہے اپنے پاس۔ انھیں چھوڑنے بھی جانا ہے اور رات کو واپس لینے بھی۔"
"میں نے آپ سے کوئی وضاحت تو نہیں چاہی۔" وہ تلخی سے بولی۔
"مگر میں ضروری سمجھتا ہوں۔"
"کیوں؟"
"کیونکہ تم میری بیوی ہو۔"
"اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"
"بہت فرق پڑتا ہے..... کم از کم میرے نزدیک۔"
وہ چپ چاپ اُن سے دُور مسہری کے دوسرے کنارے پر کروٹ لے کر لیٹ گئی۔
"بچوں کو وہاں چھوڑ کر میرے واپس آنے تک تم تیار رہنا' باہر چلیں گے اور واپسی پر بچوں کو عاصمہ کے پاس

سے لیتے ہوئے آ جائیں گے۔"
وہ کچھ نہیں بولی۔
جلیس الحسن سرک کر خود اُس کے نزدیک ہو گئے۔
"الفت!" انھوں نے دھیرے سے اُسے پکارا۔
وہ بدستور کروٹ لیے پڑی رہی۔
جلیس الحسن چونکہ اس کی خفگی کے سبب سے آشنا تھے اس لیے ان کے نزدیک اس سے یہ پوچھنا کہ وہ خفا کیوں تھی' سراسر حماقت تھی۔
بچوں کو عاصمہ کے پاس وہ ہی کیوں چھوڑنے جا رہے تھے اُن کی دانست میں یہ توضیح بھی بے سود تھی کیونکہ عاصمہ کی جذباتی کیفیت کو وہ اہمیت دینے پر آمادہ نہ ہوتی۔
"تیار رہو گی نا؟"
وہ بدستور خاموش پڑی رہی۔
"بہت کچھ کیا ہے تم نے بچوں کے لیے..... یہ ایک مرحلہ اور سہی۔" وہ اُس کے وجود پر اپنا بازو دراز کرتے ہوئے بولے۔
الفت کی نگاہوں میں عاصمہ کی صورت پھرنے لگی اور اُس نے پوری شدت سے اپنے جبڑے بھینچ لیے۔
"کتنے دنوں سے تم امی اور بابا سے بھی تو ملنے نہیں گئیں۔"
"احمق ہوں نا اس لیے۔" اُس نے آنسو پیتے ہوئے سوچا: "میں اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئی تھی کہ شاید یہ گھر یہ بچے میرے ہیں..... مگر..... نہیں..... یہاں تو میرا کچھ بھی نہیں۔"
"ہاں بھئی وہ...... ہمدانی نے آج پھر فون کیا تھا۔ نگین کے لیے اپنے بیٹے کا باقاعدہ رشتہ لے کر آنے پر مُصر ہے۔ اُس سے برسوں کا یارانہ ہے میں انکار بھی نہیں کر سکتا ویسے لڑکا بھی اچھا ہے۔ مگر میں یہ چاہ رہا تھا کہ پہلے نگین اپنی تعلیم سے فارغ ہو لے پھر منگنی اور شادی کے چکر میں اُلجھا جائے۔ تم بتاؤ' کیا ان لوگوں کو اس سلسلے میں آنے کی منظوری دے دی جائے؟"
وہ کچھ نہیں بولی۔
"بھئی کچھ تو بولو۔"
"میں کیا بولوں' اب تو نگین کی ماں سے پوچھیے۔"
انھیں جھٹکا سا لگا۔
"تم نگین کی ماں نہیں ہو کیا؟"
"دعویٰ تو نہیں کر سکتی۔" اُس نے دھیمی آواز میں کہا۔
"دیکھو۔" انھوں نے سمجھانے کی کوشش کی۔ "تمہاری حیثیت میں ان بچوں سے تمہارا تعلق عاصمہ سے زیادہ قوی اور مضبوط ہے۔ عاصمہ کا کیا ہے فقط نام کی ماں! آج یہاں ہے کل نہیں ہو گی۔ بچوں کے مستقبل کے بارے میں تو ہم تم ہی کو کرنا ہے۔"
"ہاں۔" الفت نے چپ چاپ ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے سوچا: "خدا کو اتنا نامہربان تو نہیں ہونا چاہیے کہ دکھ سہیں بی فاختہ اور کوے انڈے کھائیں..... یعنی اس گھر کی خاطر اپنا تن من میں نے تجا اور آ کر قابض ہو جائے وہ بدبخت۔"
"اور ادھر میری طرف تو دیکھو ذرا۔" انھوں نے بڑی لجاجت سے کہا۔
وہ بدستور کروٹ لیے پڑی رہی۔
"پلیز!" انھوں نے اتنی سماجت سے کہا کہ وہ پلٹ کر اُن کی طرف دیکھنے پر مجبور ہو گئی۔
وہ کچھ دیر ٹکٹکی باندھے اُسے دیکھتے رہے۔ پھر بولے: "میں خود کو تمہارا احسان مند سمجھتا ہوں۔ تم نے میرے اس گھر کے اور بچوں کے لیے جو کچھ کیا ہے اس کی بہت قدر ہے میرے دل میں۔"
اُس کی آنکھوں کے کناروں میں سیلن سی اُتر آئی۔

سہ پہر کو جب جلیس الحسن ان چاروں کے ہمراہ عاصمہ بیگم کے ہوٹل پہنچے تو وہ بقول شخصے کیل کانٹے سے آراستہ ان کی منتظر تھیں۔

"تم آج بھی ویسی ہی دلکش اور دلربا ہو عاصمہ!" جلیس الحسن نے دزدیدہ نظروں سے عاصمہ بیگم کے سراپا کا جائزہ لیتے ہوئے جی ہی جی میں کہا۔ پھر وہ اپنے خیال پر آپ ہی آپ شرمندہ سے ہو گئے۔

کیا حق تھا اب انھیں عاصمہ بیگم کو سراہنے کا، وہ تو ان کے لیے غیر قرار پا چکی تھیں۔

عاصمہ بیگم نے بچوں کو اپنی باہوں میں سمیٹ کر یوں پیار کیا اور انھیں ایسی ممتا بھری نظروں سے دیکھا کہ اعجاز جیسا ہٹیلا اور خود سر لڑکا بھی پسیج گیا۔

عاصمہ بیگم جیسی دلکش اور سراپا محبت نظر آنے والی ماں تو کٹر سے کٹر اولاد کے دل کو بہا سکتی تھی۔

جلیس الحسن فوراً ہی واپس ہو جانا چاہتے تھے مگر عاصمہ بیگم نے انھیں اتنے اصرار سے چائے کے لیے روکا کہ وہ انکار نہ کر سکے۔

چائے کے بعد جب انھوں نے جانے کا قصد کیا تو عاصمہ بیگم نے بچوں کی جانب دیکھتے ہوئے کہا: "بیٹا! ہم لوگ بھی نکل لیتے ہیں کچھ وقت تو ٹیکسی کے انتظار کو بھی دینا ہوگا۔"

"اسی لیے تو اگر اعجاز گاڑی لے آتے تو آسانی رہتی۔" جلیس الحسن بولے۔

"پاپا! میں تو سمجھ رہا تھا کہ آپ ہمارے ساتھ رہیں گے یا یہاں کوئی اورا رینجمنٹ ہو گا ورنہ میں ہرگز نہ آتا یا آتا تو اپنی گاڑی میں..... ٹیکسی میں ہم پانچ افراد بیٹھیں گے کیسے؟" اعجاز نے کہا۔

"جیسے اپنی گاڑی میں بیٹھتے ہیں۔" زرین نے لقمہ دیا۔

"ڈونٹ بی سلی۔" اعجاز نے اسے گھرکا۔ "اپنی گاڑی کی بات دوسری ہوتی ہے ٹیکسی ڈرائیور کے ساتھ تو دو افراد آگے نہیں بیٹھ سکتے۔"

"کچھ نہ کچھ کر لیں گے بھائی۔" زرین اس کی گھرکی سے ذرا متاثر نظر آئی۔

"بات یہ ہے چھوٹی کہ تمہارا دماغ بھی چھوٹا ہے۔"

"میری بیٹی اکساینٹڈ ہے۔" عاصمہ بیگم نے زرین کو پریم سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اب جلدی سوچیں کہ کیا کرنا ہے۔" فراز نے کہا۔ "بائی دی وے ہم جا کہاں رہے ہیں؟"

"سی سائیڈ پر۔" عاصمہ بیگم نے بتایا۔

"پاپا! آپ ہمیں ڈراپ کیوں نہیں کر دیتے؟" فراز نے باپ کی جانب دیکھا۔

جلیس الحسن اپنی ٹھوڑی کھجانے لگے۔

"ہاں پاپا! آپ ڈراپ کر دیں ہمیں۔" زرین نے فراز کی تائید کی۔

"زری بیٹا!" عاصمہ بیگم نے کن انکھیوں سے جلیس الحسن کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ کے پاپا کی کوئی اور مصروفیت بھی تو ہو سکتی ہے۔ ہم لوگ ٹیکسی میں چلتے ہیں۔"

"اچھا تو پھر میں تو پاپا کے ساتھ واپس جا رہا ہوں۔" اعجاز نے ناگواری سے کہا۔

"اوہ نو۔" عاصمہ بیگم نے بے ساختہ کہا۔

"گھر میں ایک نہیں تین تین گاڑیوں کے ہوتے ہوئے بھی ہم ٹیکسی میں خوار ہوتے پھریں تو ہم سے بڑا احمق اور کون ہو گا۔" اعجاز نے کہا۔

"ٹھیک ہے..... میں ڈراپ کیے دیتا ہوں تم لوگوں کو۔" جلیس الحسن بولے۔

"تھینک یو پاپا!" نگین نے کہا۔

اعجاز کے تمرد کے پیش نظر عاصمہ بیگم نے تکلفاً بھی ہچکچاہٹ کا اظہار نہیں کیا۔

کچھ ہی دیر بعد جلیس الحسن کی گاڑی ساحل سمندر کی جانب رواں دواں تھی۔

اور "حسن لاج" میں الفت غیر معمولی اہتمام سے تیار ہو چکنے کے بعد جلیس الحسن کی منتظر تھی۔ وہ حد سے حد گھنٹا بھر میں واپس لوٹ آنے کو کہہ گئے تھے۔

ایک گھنٹا کیا اب تو دو گھنٹے ہونے کو آئے تھے۔ ساڑھے چار بجے وہ گھر سے نکلے تھے اور گھڑی کی سوئیاں اس وقت سوا چھ سے آگے نکل چکی تھیں مگر جلیس الحسن کا دور دور تک پتا نہ تھا۔

وہ ان کہے اضطراب سے دوچار ہوتے جا رہی تھی!

جلیس الحسن کی گاڑی شہر کے پُر رونق راستوں سے گزرتی ساحل سمندر کی جانب رواں دواں تھی۔ زرین گاڑی کی اگلی نشست پر باپ اور ماں کے درمیان بیٹھی تھی۔ عقبی نشست پر دائیں بائیں اعجاز اور فراز تھے۔ نگین اُن کے درمیان بیٹھی ہوئی تھی۔

اعجاز کی فرمائش پر زرین نے کیسٹ پلیئر پر طربیہ دھنوں والی ایک کیسٹ آن کر دی تھی۔

اپنی اپنی جگہ وہ سب کے سب اپنی قلبی کیفیات میں ڈوبے بیٹھے تھے۔

اعجاز طربیہ دھنوں پر دھیرے دھیرے اپنے پاؤں تھرکاتے اور آہستہ آہستہ چٹکیاں بجاتے ہوئے سوچ رہا تھا: "مم کے آجانے سے زندگی یک بیک کتنی خوبصورت ہو گئی ہے!"

فراز گاڑی کی کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے شہر کی پُر رونق سڑکوں پر رواں دواں ٹریفک کو ایک نئی سوچ کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔

"تصویروں میں ہلکے رنگوں کا استعمال اچھا لگتا ہے مگر گہرے رنگوں کا بھی اپنا مخصوص حسن ہے!" اس نے اپنی گاڑی کے قریب سے گزر جانے والی اشکارے مارتی سُرخ رنگ کی گاڑی میں بیٹھی ہنستی جوڑے والی اس حسینہ کو دیکھتے ہوئے سوچا جو بند کورولا کار کی اگلی نشست پر بیٹھی نہ جانے کس بات پر مسکرا رہی تھی۔

نگین کی نگاہیں بار بار ماں کے آدھے چہرے کا طواف کرنے کو اگلی نشست کی جانب اٹھے جا رہی تھیں۔

"کاش! ہم ساری زندگی اسی طرح اکٹھے رہیں۔" وہ سوچ رہی تھی۔

زرین ماں کی خوشبو کو اپنے نفس میں اتارنے کی کوشش کرتے ہوئے چپ چاپ سوچ رہی تھی: "اگر مم ہمیشہ اسی طرح میرے ساتھ بیٹھی رہیں تو کتنا اچھا ہو!"

جلیس الحسن کی نظریں بار بار اپنے سامنے آویزاں آئینے میں عاصمہ بیگم کی نگاہوں سے ٹکرائے جا رہی تھیں۔

"کاش! تم نے ایک دفعہ سوچا ہوتا عاصمہ کہ تمہاری ایک بھول ہم سب کو کیسی صلیب پر لٹکا سکتی ہے۔" وہ سوچ رہے تھے۔ عاصمہ بیگم کے باطن میں ایک بھونچال آیا ہوا تھا۔

امریکا سے پاکستان روانہ ہوتے ہوئے وہ تو اپنے ذہن میں چاروں بچوں کے وہی سراپا لے کر چلی تھیں جو وہ امریکا جاتے ہوئے اپنے پیچھے چھوڑ گئی تھیں۔

وہ گزشتہ کتنی برسوں سے ان کی پرانی تصویریں اپنے ذہن میں بسائے بیٹھی تھیں۔

اُن کے گمان میں بھی نہ تھا کہ دونوں بیٹے ماشاءاللہ بھری بہار کی مکمل تفسیر بنے ملیں گے اور بیٹیاں اُن کے اپنے قد کو پہنچی ہوں گی بلکہ زرین تو اُن سے کچھ نکلتی ہوئی بھی نکل گئی تھی۔

کیسا چمن کھلا پڑا تھا۔

وہ آئیں تو چند دن کو تھیں مگر ایسی بھری بہار چھوڑ کر جانے کی ہمت نہ کر پا رہی تھیں!

انھوں نے گردن موڑ کر عقبی نشست پر بیٹھے اپنے دونوں شاہزادوں اور حسن و جمال کی منہ بولتی تصویر بیٹی کو دیکھا پھر بڑے پریم سے اپنا بازو زرین کے شانوں پر پھیلاتے ہوئے ایک دزدیدہ نظر جلیس الحسن پر ڈالتے ہوئے جی ہی جی میں کہا: "کتنے خوش قسمت ہو تم جلیس الحسن!"

"اچھا جناب! میں تو اب چلتا ہوں۔ چونکہ بچے آج کی شام آپ کے ہمراہ ہیں اس لیے بتا دیں مجھے کہ انھیں میں کہاں اور کس وقت لینے پہنچوں؟" جلیس الحسن نے انھیں ساحل سمندر کے ایک نسبتاً خاموش قطعے پر پہنچانے کے بعد اپنی گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے عاصمہ بیگم سے پوچھا۔

اس سے پہلے کہ عاصمہ بیگم کوئی جواب دے پاتیں، زرین نے پوچھا: "پاپا! آپ جا رہے ہیں کیا؟"

"ہاں بیٹی۔"

"دیکھیے اندھیرا پھیلنے تک تو ہم لوگ یہیں ٹھہریں گے پھر ہوٹل پہنچیں گے ڈنر لیں گے۔ میرے خیال میں کم از کم دس تو بج ہی جائیں گے۔" عاصمہ بیگم بولیں۔

"ہم لوگوں کی واپسی کا کیا ہو گا؟" اعجاز نے تشویش سے پوچھا۔

"شاہزادے! میں آپ لوگوں کو لینے آؤں گا اسی لیے تو آپ کی ممی سے اُن کے آج کے پروگرام کی تفصیل پوچھی ہے۔"
"میرا مطلب ہے یہاں سے ہوٹل تک واپسی کیسے ہوگی؟" اعجاز نے اپنے سوال کی توضیح کی۔
"بیٹے ٹیکسی لے لیں گے۔" عاصمہ بیگم نے جلیس الحسن کو کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔
"مسئلہ تو یہی ہے گا جو ہوٹل سے چلتے وقت درپیش تھا۔" اعجاز نے مُنہ بنایا۔
"پاپا! آپ رک جائیں۔" زرّین نے منت آمیز لہجے میں کہا۔
"پاپا! آپ نے ہمیں گھر سے چلتے وقت بتا دیا ہوتا کہ آپ ہمارے ساتھ نہ رکیں گے تو میں اپنی گاڑی لے آتا۔" اعجاز نے ہلکی سی جھلاہٹ کا اظہار کیا۔
جلیس الحسن نے آنکھوں ہی آنکھوں میں عاصمہ بیگم سے کہا۔ "دیکھا تم نے۔ اسی لیے کہہ رہا تھا کہ اعجاز اپنی گاڑی لے آئے تو بہتر رہے گا مگر تم مانیں ہی نہیں۔"
وہ خفیف سی نظر آنے لگیں۔
"پاپا! آپ نہیں ہوں گے ہمارے ساتھ تو کیا مزہ آئے گا۔" زرّین بولی۔
"مجھے کچھ کام ہے بیٹے۔"
زرّین آزردہ خاطر نظر آنے لگی۔
"اگر کوئی بہت ضروری کام نہ ہو تو بیٹی کی خوشی کی خاطر رک جائیے۔" عاصمہ بیگم نے کہا۔
جلیس الحسن سوچ میں پڑ گئے۔
الفت کو وہ تیار رہنے کی ہدایت کر کے گھر سے نکلے تھے اور زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے میں واپس آنے کو کہہ آئے تھے۔ وہ یقیناً منتظر ہوگی۔ یہاں پانچ نفوس اُن پر اُمید بھری نگاہیں مرتکز کیے کھڑے تھے۔
الفت کو تو وہ سمجھا بجھا کر یا اپنے لہجے کی نرمی اور کچھ اپنی محبت کی گرمی سے منا سکتے تھے۔
مگر ان پانچ نفوس کو جن میں سے چار اُن کے اٹوٹ انگ تھے اور پانچویں ایک ایسی عورت جس کو کبھی وہ اپنی روح کی گہرائیوں سے چاہا کرتے تھے جس کی بات کو ماننا اُن کے اختیار میں نہ تھا۔ بھلا کیونکر مایوس کر سکتے تھے۔
خدا جانے یہ سمندر کی جانب سے آنے والی ٹھنڈی اور مست خرام ہواؤں کا اثر تھا یا زرّین کی خواہش کا احترام یا ان پانچ نفوس کی خوشی کا خیال یا پھر اپنی ماضی کی دلکش ساعتوں کی کشش کہ وہ اُن سب کے ساتھ ٹھہر گئے۔
جلیس الحسن نے اعجاز کے شانوں پر اپنا دایاں اور فراز کے شانوں پر بایاں بازو دراز کر دیا اور عاصمہ بیگم دونوں بیٹیوں کے ہاتھ تھامے ساحل پر چہل قدمی کو چل دیں۔
قصۂ ماضی کے اوراق اُلٹتے وہ تا دُور نکل گئے۔
اوراقِ ماضی کا اعادہ جلیس الحسن پر یہ حیرت انگیز راز آشکار کرتا چلا جا رہا تھا کہ عاصمہ کی محبت تو ابھی تک اُن کے دل کے نہاں خانوں میں براجمان تھی!
تو کیا اب تک وہ خود کو اس گمان سے دھوکا دیتے رہے تھے کہ اُن کے دل سے عاصمہ کی محبت ختم ہو چکی تھی۔
کیا انھوں نے الفت کو بھی دھوکے میں رکھا تھا!
انھیں عاصمہ بیگم کے جانے کے بعد کی وہ اُداس اور بے رونق شامیں یاد آ رہی تھیں جو انھوں نے اسی سمندر کنارے گزاری تھیں۔ اس ساحل کی ریت میں اُن کے آنسوؤں کی نمی اور تنہائی دفن تھی۔
عاصمہ بیگم کا دلکش چہرہ اور اُن کا دلربا سراپا جو آج بھی بہت سوں کے ایمان کو ڈانواں ڈول کر سکتا تھا، اُن کی آنکھوں کی رسائی میں تھا۔
قانوناً اور شرعاً وہ ایک بار پھر انھیں اپنا سکتے تھے۔
وہ اس حیثیت میں تھے کہ انھیں ایک نہیں چار عورتوں کو اپنے نکاح میں لا کر اُن کے حقوق بخوبی ادا کر سکتے تھے۔ مگر الفت!
الفت کا خیال سراپا شکوہ، سراپا سوال بنا اُن کے تصور میں ہچکولے لینے لگا۔
وہ اپنے ذہن کو ایک کشمکش سے دوچار پانے لگے۔
پھر اُن کا ذہن چکر پھیریاں سی کھانے لگا۔ اور اُن کے ماضی اور حال سے تعلق رکھنے والی دونوں

عورتیں باہمی تقابل کے لیے ایک دوسرے کے روبرو آ کھڑی ہوئیں۔
عاصمہ بیگم زرّین کو اس کے بچپن کا کوئی دلچسپ قصّہ سنا رہی تھیں اور محض زرّین ہی نہیں باقی تینوں بہن بھائی بھی دلچسپی اور انہماک سے سُن رہے تھے۔
اور جلیس الحسن کا ذہن بصد عجلت عاصمہ اور الفت کے تقابل میں مصروف تھا!
عاصمہ بیگم میں دلکشی اور دلربائی تھی۔
اُلفت میں سادگی اور پُرکاری!
عاصمہ بیگم اُن کی من چاہی عورت بن کر اُن کے گھر آئی تھیں۔
الفت اُن کی ضرورت اور مجبوری بن کر!
عاصمہ بیگم اُن کے چار بچوں کی ماں تھیں۔
الفت انھیں ایسی کسی زنجیر میں نہ جکڑ سکی تھی!
عاصمہ شعلۂ جوالہ تھیں۔
الفت سُلگتی ہوئی چنگاری!
عاصمہ برق تھیں۔
الفت موم شمع کی ٹمٹماتی ہوئی لَو!
عاصمہ بیگم سب کچھ تھیں۔
الفت اُن کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں!
عاصمہ بیگم، عاصمہ تھیں۔
الفت، الفت!
عاصمہ اُن کا ماضی تھیں
اُلفت حال!
عاصمہ نے اپنی تکمیلِ تمنا کی خاطر اُن کے گھر کا شیرازہ بکھیر دینے میں کوئی رُو رعایت نہیں دکھائی تھی۔ کسی تعلق کا خیال نہیں رکھا تھا..... بنے بنائے گھروندے کے نیچے سے اپنا پاؤں نکال کر اُسے بے ستون کر دیا تھا۔ جبکہ اُلفت نے اس مسمار گھروندے کو ریزہ ریزہ اپنی پلکوں سے سمیٹا تھا..... اپنی ذات پر جبر سہہ کر اُن کے بکھرے ہوئے گھر کی شیرازہ بندی کی تھی!
دفعتاً نگین نے اُن کی گہری سوچ میں مخل ہوتے ہوئے کہا۔ "آپ کہاں کھوئے ہوئے ہیں پاپا؟"
"آں..... ہاں..... کہیں نہیں۔" وہ ہڑبڑا سے گئے۔
"بیٹا! تمہارے پاپا اپنی بیگم کی ناراضگی کی فکر میں ڈوبے ہوئے ہوں گے۔" عاصمہ بیگم نے کن انکھیوں سے انھیں دیکھتے ہوئے نگین سے کہا۔
"نہیں! ایسی تو کوئی بات نہیں۔"
"آپ مائنڈ نہ کریں تو ایک بات پوچھوں آپ سے؟"
"ضرور پوچھو۔"
"آپ کی نئی بیگم ماں کیسی ثابت ہوئیں؟ میرا مطلب ہے میرے بچوں کی سوتیلی ماں؟"
جلیس الحسن دھیرے سے مسکرا دیے اور بولے۔ "یہ تو اپنے بچوں ہی سے پوچھو۔"
"ان بے چاروں سے کیا پوچھوں۔ میری غلطی کی سزا انھوں نے ہی بھگتنی ہوگی..... دکھ جھیلے ہوں گے۔ سوتیلی ماں کی نفرت بھری نگاہوں اور زہر آمیز صداؤں کی زد میں رہے ہوں گے یہ تو!" اُن کی آواز لحظہ بہ لحظہ رندھتی چلی گئی۔
"اوہ نو ممی!" نگین نے بے ساختہ۔ "وہ تو بہت اچھی ہیں۔"
عاصمہ بیگم نے چونک کر پہلے بیٹی کی طرف دیکھا پھر مشکوک نگاہوں سے جلیس الحسن کو دیکھنے لگیں کہ کہیں انھوں نے تو نگین کو کوئی اشارہ نہیں کیا تھا۔
ابھی اُن کی نگاہیں جلیس الحسن کے چہرے پر ہی مرکوز تھیں کہ فراز کی آواز اُن کی سماعت سے ٹکرائی۔ غش

ہوئی" واقعی وہ بہت اچھی ہیں!"

"میرے ایکسیڈنٹ کے بعد انھوں نے میرے لیے جو کچھ کیا اُسے تو میں ساری زندگی نہیں بھلا سکتا۔" یہ اعجاز تھا۔

"ہم! بھائی کو بیڈ پین تک دیا کرتی تھیں مما۔" زرین بولی۔

زرین کی اس بات پہ اعجاز قدرے محجوب سا نظر آنے لگا۔

"رئیلی!" عاصمہ بیگم نے تعجب کا اظہار کیا۔

"بھائی کا منہ دھلواتی تھیں۔ انھیں اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلاتی تھیں۔" زرین نے مزید بتایا۔

"خیر یہ تو جو کچھ کیا سو کیا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ انھوں نے مجھے اس وقت ذہنی سہارا دیا جب میں مایوس ہو چکا تھا۔ جب مجھے ہر سو اندھیرا ہی اندھیرا دکھائی دیتا تھا تب انھوں نے میرے دل میں امید کی شمع روشن کی..... انھوں نے میرے لیے بہت کچھ کیا۔" اعجاز بولا۔

"اور آپ کو ایک بات اور بتاؤں مما کہ جس دن ان حضرت پر کچھ زیادہ ہی جھلاہٹ اور غصہ سوار ہو رہا ہوتا تھا تو بے چاری مما اُن کے دوستوں کو اُن سے چوری چھپے فون کر کر کے انھیں گھر بلاتی تھیں اور انھیں ہدایت کر دیتی تھیں کہ جب گھر آئیں تو یہ نہ کہیں ان سے کہ انھیں ان حضرت کی مما نے فون کر کے بلایا ہے بلکہ یہ ظاہر کریں کہ بس خود ہی ملنے چلے آئے ہیں۔" تمکین نے بتایا۔

اعجاز جو انہماک اور قدرے استعجاب سے تمکین کی بات سُن رہا تھا' احساسِ تشکر سے معمور لہجے میں بولا۔

"شی از گریٹ!"

"سچ بتاؤں آپ کو مما کہ بہت دنوں تک ہم نے انھیں اپنی حرکتوں سے عاجز رکھنے کی بہت کوشش کی۔" تمکین نے کہا۔ "خاص طور پر اس وقت جب وہ ایک مرتبہ ناراض ہو کر اپنے گھر چلے جانے کے بعد دوبارہ گھر آئیں اور پاپا نے ہم سے وعدہ کیا کہ اب اگر اُن کی طرف سے کوئی گڑبڑ ہوئی تو وہ ہمیشہ کے لیے اُن کی چھٹی کر دیں گے۔" تمکین نے لحظہ بھر کو توقف کیا پھر ندامت سے بولی۔ "اوہ! میں آپ کو بتا نہیں سکتی کہ تب کیا کچھ نہ کیا ہم نے انھیں ستانے کے لیے! فراز صاحب نے اُن کے ایسے ایسے کارٹون بنائے تھے کہ مما کی جگہ کوئی اور عورت ہوتی تو ہم سب کا اور فراز کا سر تو توڑ ہی دیتی مگر اُف! کیا قوتِ برداشت ہے مما کی کہ خود اپنے ہی کارٹونز پر شکریہ لکھ دیا فراز کے نام! اور حاجی کی تو انھوں نے اتنی بدتمیزیاں برداشت کی ہیں کہ لکھنے بیٹھیں تو رجسٹر کے رجسٹر بھر جائیں..... اوہ میرے خدا! کتنا ستایا ہے ہم نے انھیں..... مجھے تو شبہ ہے کہ اُن کے اعصاب فولاد کے بنے ہوئے ہیں..... وہ جو کہتے ہیں نا اسٹیل نروز کا مالک ہونا تو کبھی وہ والی بات لگتی ہے..... اور اب جب ہم اپنی ان حرکتوں کو یاد کرتے ہیں جو ہم مما کو ستانے کے لیے کیا کرتے تھے تو کم از کم مجھے تو بہت شرمندگی ہوتی ہے۔"

عاصمہ بیگم جو تصویرِ حیرت بنی قدرے بے یقینی سے یہ سب کچھ سُن رہی تھیں' تمکین کے چُپ ہو جانے پر بولیں۔

"میں حیران ہوں یہ سوچ کر کہ کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے!"

"ہو سکتا نہیں بلکہ ہوا ہے۔" اعجاز بولا۔

جلیس الحسن جانتے تھے کہ اپنی خطا کا اعتراف آدمی کسی انتہائی صورت میں ہی کیا کرتا ہے۔

اُلفت کے ساتھ اپنی اور دیگر بہن بھائیوں کی زیادتیوں کے سلسلے میں انتہائی وسیع القلبی سے تمکین کا یہ اعتراف غالباً بلکہ یقیناً اس غیر معمولی مسرت کا خوشگوار ردِ عمل تھا جو اُسے باپ سے برسوں جدائی کے بعد اس کی آمد کی صورت مل گئی تھی۔ زندگی کے ہر معاملے میں ساتھی ہونے کے ناتے اُلفت کی فتح جلیس الحسن کی اپنی فتح تھی۔

اپنی اس فتح پر وہ کھِلے پڑتے تھے۔

اب اس سے بڑھ کر خراجِ تحسین کیا پیش کیا جا سکتا تھا اُلفت کو کہ اُس کی عدم موجودگی میں اُس کے سوتیلے بچے اپنی سگی ماں کے سامنے اُس کی تعریف میں رطب اللسان تھے!

عاصمہ بیگم ہنوز تصویرِ استعجاب بنی ہوئی تھیں!

کاش! اُلفت اپنی آنکھوں سے دیکھتی اور کانوں سے سنتی کہ اس کی ریاضت کیسی بار آور ثابت ہوئی تھی۔

وہ تو اس خراجِ تحسین سے بہت دُور "حسن لاج" کی زیریں منزل پر واقع اپنی اور جلیس الحسن کی مشترکہ خوابگاہ کا دروازہ بند کیے' تکیے میں منہ دبائے' بستر پر دل گرفتہ پڑی تھی۔

دیر ہوئی کہ قدرتی روشنی کی جگہ مصنوعی روشنیاں لے چکی تھیں۔

اندھیرا کب کا آسمان سے اُتر چکا تھا۔

مگر اس کے من میں اس اندھیرے سے زیادہ مہیب تاریکی چھائی ہوئی تھی!

جس خوف کو اُس نے برسوں دبائے رکھنے کی کوشش کی تھی' وہ آج ہیجان کی صورت ضبط و برداشت کی ساری حدیں توڑ کر باہر نکلنے کو تھا۔

جلیس الحسن زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے میں واپسی کا کہہ کر ساڑھے چار بجے گھر سے نکلے تھے اور اسے تیار رہنے کی ہدایت کر گئے تھے۔

وہ پانچ بجے سے تیار اُن کی منتظر تھی۔

اب نو بجنے والے تھے مگر اُن کا دور دور تک پتا نہ تھا!

احساسِ توہین سے اس کا رُواں رُواں تپ رہا تھا۔

تصور کی کارگزاریاں عجیب عجیب تصویریں اُس کی چشمِ تصور کے سامنے لا رہی تھیں۔

بیوی تو وہ تھی اُن کی۔

اور وہ گلچھرّے اپنی سابقہ بیوی کے ساتھ اُڑاتے پھر رہے تھے۔

عاصمہ بیگم کا تصور اُسے رقیبِ روسیاہ اور دشمنِ جاں کا تصور لگ رہا تھا۔

کتنی عرق ریزی سے اُس نے اس خزاں رسیدہ گلشن کی آبیاری کی تھی!

کس قدر چاہت سے اس اُجڑے چمن کو سنوارا تھا۔

کتنی جاں سوزی سے اس بکھرے ہوئے گھر کی شیرازہ بندی کی تھی۔

کس دلسوزی سے بچوں کو اپنا بنایا تھا۔

ایثار و وفا کی پتلی بن کر جلیس الحسن کا دل جیتا تھا۔ عاصمہ کی آمد نے اُس کی ساری ریاضت اکارت کر دی تھی۔

اُس کی مطمئن اور مسرور دنیا میں ہلچل سی مچا دی تھی۔ چند دن میں اس گھر کی دنیا ہی بدل گئی تھی۔

جلیس الحسن جو اُس کی رائے اور مشورے کے بغیر قدم نہ اُٹھانے اور اُس کی مرضی کا احترام کرنے کے عادی ہو چکے تھے' عاصمہ کے آنے کے بعد سے اُڑے اُڑے پھر رہے تھے اس کی رضا کا احترام تو کجا اُس سے رضا لینا بھی ضروری نہ سمجھ رہے تھے۔

بچے جو اُس سے محبت جتاتے تھے' اُس کا دم بھرتے تھے' پروانہ وار اس پر نثار ہوتے تھے، ہر قدم اٹھانے سے قبل اُس کی آشیرباد لینا ضروری سمجھتے تھے گزشتہ چند روز سے اُسے کسی اور ہی ہوا میں محسوس ہوتے تھے۔ انھوں نے اس سے بیٹھ کر حسبِ معمول ادھر اُدھر کے قصے بھی نہ کیے تھے اور اس درجہ خوش اس نے انھیں اس سے پہلے بڑی سے بڑی خوشی کے موقع پر بھی نہیں دیکھا تھا۔

عاصمہ نے نہ جانے کیا جادو پڑھ کر پھونکا تھا کہ بچے تو بچے خود جلیس الحسن کا رویہ بھی اُس کے ساتھ بدل گیا تھا۔ اُن کی تازہ ترین واردات یہ تھی کہ وہ ساڑھے چار بجے کے گئے نو بجے تک بھی نہ پلٹے تھے۔

وہ ان کے انتظار میں سوکھ کر رہ گئی تھی۔

اس پر مستزاد یہ کہ اُس نے پونے پانچ بجے کے لگ بھگ بابا اعراقی کو بھی فون کر دیا تھا کہ وہ اُن سے ملنے کے لیے آ رہی ہے۔

سات بجے بابا نے یہ جاننے کے لیے کہ وہ اب تک پہنچی کیوں نہ تھی' پہلا فون کیا تھا۔ پونے آٹھ بجے دوسرا اور ساڑھے آٹھ بجے تیسرا۔ پہلی دو کالز پر تو اُس نے اُن سے یہ کہہ دیا تھا کہ بس تھوڑی دیر میں پہنچ جائے گی لیکن بابا کی تیسری کال پر اُسے کہنا پڑا تھا کہ جلیس الحسن کسی اچانک اور غیر معمولی مصروفیت کے باعث وہ اُن سے ملنے نہ آ سکے گی تاہم جلیس الحسن کی اس اچانک اور غیر معمولی مصروفیت کے بارے میں بابا کے استفسار پر اُس نے انھیں عاصمہ کی آمد کے بارے میں بتانے سے گریز کرتے ہوئے اس مصلحت آمیز دروغ گوئی سے کام لیا تھا کہ وہ جلیس الحسن کی کوئی کاروباری مصروفیت تھی۔

بابا سے بات کرتے ہوئے اُس کی آواز میں آنسوؤں کی نمی حلول کر آئی تھی اور جب بابا نے تشویش کے ساتھ پوچھا "کیا بات ہے بیٹی! کچھ پریشان لگ رہی ہو تم آواز سے؟" تو اُس نے ہنسنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا تھا۔

"نہیں بابا! ایسی تو کوئی بات نہیں..... اب تو ساری پریشانیاں ختم ہو گئی ہیں۔"

وہ بابا کو اپنی پریشان سے آگاہ کر کے انھیں فکرمند و ملول نہیں کرنا چاہتی تھی۔

جلیس الحسن بچوں کے ساتھ ایسے رُکے کہ پھر تو انھیں عاصمہ کی جانب سے بچوں کو دیے جانے والے پُرتکلف ڈنر میں بھی شریک ہونا پڑا۔

رُکنے کو تو وہاں سب کے ساتھ رک گئے تھے مگر اُن کا دھیان بار بار الفت کی طرف جا رہا تھا۔

شادی کے کچھ عرصے بعد ایک طویل اور باقاعدہ ناراضگی سے قطع نظر اُس نے گزشتہ پانچ برس سے زائد عرصے کے دوران خود کو ایک صابر و شاکر عورت ثابت کر دکھایا تھا۔

اس تمام عرصے کے دوران وہ شاذ ہی اُن سے کسی بات پر خفا ہوئی تھی۔

مگر عاصمہ کی آمد کے بعد سے اس کے چہرے کے خطوط خاصے بگڑے ہوئے تھے۔

انھیں یقین تھا کہ آج وہ تا دیر اُن کی منتظر رہنے کے بعد ان سے باقاعدہ خفا ہو چکی ہو گی اور اس کا خفا ہونا بجا بھی ہو گا۔ لیکن انھیں یقین تھا کہ وہ اپنی محبت کے منتوں سے اُسے رام کر لیں گے۔

ہوٹل میں پُرتکلف کھانے کے دوران عاصمہ بیگم نے جلیس الحسن سے کہا: "دو دن اور رہوں میں یہاں، کیا یہ ممکن ہے کہ یہ دو دن بھی میں بچوں کے ساتھ گزار سکوں؟"

"صرف دو دن اور!" جلیس الحسن تعجب سے بولے: "اتنا مختصر قیام!"

"اوہ مم صرف دو دن!" ثمین نے یک بیک کھانے سے ہاتھ روک لیا تھا اور وہ انتہائی آزردہ خاطر نظر آنے لگی تھی۔ اُس کی آزردگی کا عکس اعجاز، فراز اور زرین کے چہروں پر بھی بکو سے لیتا دیکھا جا سکتا تھا۔

"مم!" زرین نے دھیمی آواز میں کہا: "کیا آپ دو دن بعد واپس چلی جائیں گی؟"

"ہاں بیٹا!"

"مم! کیا..... کیا..... آپ.......؟" وہ دُزدیدہ نظروں سے باپ کی جانب دیکھنے لگی۔

"چپ کیوں ہو گئیں سوئیٹ ہارٹ..... بولو!" عاصمہ بیگم نے پوچھا۔

زرین دُزدیدہ نظروں سے باپ کی طرف دیکھنے لگی۔

"ڈارلنگ! میں تمہاری بات سننے کے لیے بے چین ہوں!" عاصمہ بیگم نے بیتابانہ کہا۔

ثمین کو شاید کچھ کچھ اندازہ تھا کہ زرین کیا کہنے جا رہی تھی۔ شاید اعجاز اور فراز کو بھی ہو۔

"مم!" زرین کے لب کپکپائے۔

"بولو بیٹا!" عاصمہ بیگم نے بڑے دُلار سے کہا۔

"مم!" زرین نے ہچکچاتے ہوئے زبان کھولی: "کیا آپ ہمارے ساتھ نہیں رہ سکتیں ہمیشہ کے لیے مم!"

جلیس الحسن بُری طرح چونکے۔ زرین کی ہچکچاہٹ سے انھیں یہ تو اندازہ تھا کہ وہ کوئی غیر معمولی بات کہنے جا رہی تھی مگر زرین کا یہ سوال اُن کے گمان میں نہ تھا۔

عاصمہ بیگم نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا اور دل شکستہ لہجے میں بولیں: "آئی ایم سوری سوئیٹ ہارٹ!" پھر انھوں نے توقف کرنے کے بعد کہا: "مجھے افسوس ہے کہ میں اگر چاہوں بھی تو نہیں رک سکتی!"

"کیوں؟" فراز نے پوچھا۔

"کیونکہ" عاصمہ بیگم سر جھکا کر بولیں: "میں اس غلطی کو دوبارہ نہیں دُہرانا چاہتی جو مجھ سے آپ چاروں کے سلسلے میں سرزد ہوئی تھی!"

ان چاروں نے ایک دوسرے کو دیکھا پھر ثمین نے سب کی نمائندگی کرتے ہوئے کہا: "کیا مطلب مم؟"

عاصمہ بیگم نے ایک لمبی سانس لی پھر اُن سے نظریں چُراتے ہوئے بولیں: "ماشاءاللہ آپ چاروں تو اب بڑے ہو چکے ہیں۔ آپ سب کو شاید میری اتنی ضرورت نہیں جتنی اشعر کو ہے!"

"اشعر!" ثمین نے تعجب سے کہا۔

اور جلیس الحسن سمیت وہ سب وضاحت طلب نظروں سے عاصمہ بیگم کی جانب دیکھنے لگے۔

"اشعر تم چاروں کا چھوٹا بھائی ہے!" انھوں نے سر جھکا کر کچھ اس طرح کہا جیسے کوئی اعتراف جرم کر رہا ہو۔

جلیس الحسن سمیت وہ سب اُن کے اس انکشاف سے دم بخود رہ گئے تھے۔

"اشعر ابھی چھوٹا ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ اُسے ابھی کئی برس تک میری ضرورت ہے!" وہ دھیمے سُروں میں بولیں۔

اُن کے چاروں بچے خود کو ایک عجیب سے اضطراب سے دوچار پا رہے تھے۔

اَن دیکھے سوتیلے بھائی سے انھیں انجانا سا حسد محسوس ہو رہا تھا۔

یہ خیال کہ ان کی ماں نقط انھی کی ماں نہیں تھی بلکہ کوئی اور بھی تھا جسے اُن کی ماں اُن سے زیادہ اپنی محبت اور توجہ کا حق دار سمجھتی تھی، اُن کے دل کو مٹھی میں جکڑے لے رہا تھا۔

گویا ماں اب بھی اُن کی کم اور کسی اور کی زیادہ تھی!

خوشگوار مسکراہٹوں اور ہنسی کی جگہ یک بیک ایک گہری سنجیدگی نے لے لی تھی۔

اور ان چاروں نے کھانے سے ہاتھ روک لیے تھے۔

جلیس الحسن کی جہاں دیدہ نظروں کے لیے اپنے نوجوان بچوں کی قلبی کیفیت سے آگاہی چنداں دشوار نہ تھی اور وہ انھیں زیادہ دیر اس ہیجان اور اضطراب سے دوچار نہ ہونے دینا چاہتے تھے۔ چنانچہ کھانے کے ذرا دیر بعد ہی انھوں نے عاصمہ بیگم سے اجازت چاہی۔

"میری درخواست پر غور کیا آپ نے؟" عاصمہ بیگم نے جلیس الحسن سے کہا۔

"کون سی درخواست؟"

"یہی کہ میں دو روز اور رہوں یہاں۔ اگر آپ بچوں کو یہ دو دن میرے ساتھ گزارنے کی اجازت دیں تو میں آپ کی شکر گزار رہوں گی!"

"مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ اگر یہ چاہیں تو بخوشی تمہارے ساتھ رہیں۔ غریب خانے کے دروازے کھلے ہیں تم اُن کی ماں کی حیثیت سے وہاں قیام کر سکتی ہو اور اگر اس میں کچھ قباحت ہو تو میں دو روز کے لیے تمہارے ساتھ ہی ان کے بھی ہوٹل میں قیام کا بندوبست کر سکتا ہوں!"

"اوہ! آپ کتنے نفیس ہیں..... دوسروں کے جذبات کا لوگ اس طرح کہاں خیال رکھا کرتے ہیں..... رہا ان کے میرے ساتھ ہوٹل میں قیام کے بندوبست کا سوال تو وہ میں بآسانی کر سکتی ہوں بس آپ کی اجازت درکار ہے!"

"میں نے کہا نا مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ ان چاروں سے پوچھ لو اگر یہ یہاں رُکنے پر راضی ہیں تو میں انھیں ابھی سے یہاں چھوڑ کر جانے کو تیار ہوں!"

"کیوں بیٹے ٹھہرو گے نا میرے ساتھ؟" عاصمہ بیگم نے اپنی نگاہ چاروں کے چہروں پر دوڑاتے ہوئے کہا۔

"فائدہ؟" اعجاز گمبھیر لہجے میں بولا۔

"میں سمجھی نہیں بیٹا!" عاصمہ بیگم متذبذب نظر آ رہی تھیں۔

"دو روز بعد تو آپ واپس چلی جائیں گی ہم اپنی عادت کیوں بگاڑیں، ہمیں تو کل بھی آپ کے بغیر رہنا پڑا تھا آئندہ بھی رہنا ہو گا!" اعجاز کے الفاظ خنجر کی صورت عاصمہ بیگم کے دل میں اُترتے چلے گئے۔

پھر اعجاز نے باپ کی جانب رُخ کرتے ہوئے کہا: "ہمیں چلنا چاہیے بابا! ماما ہماری منتظر ہوں گی!"

"اچھا کل تھوڑی دیر کو تو آؤ گے نا میرے پاس؟" عاصمہ بیگم کی آنکھوں میں اُمڈ آنے والے آنسوؤں کی لہر نے اُن کی آواز کو اور بھی بھگو دیا تھا۔

اُن کی آنکھوں میں آنسوؤں کی لہر نے ان چاروں کو بھی مضطرب کر دیا۔ انھوں نے ایک دوسرے کو دیکھا پھر اعجاز نے عاصمہ بیگم کی جانب توجہ کرتے ہوئے اثبات میں گردن ہلا کر کہا: "ٹھیک ہے!"

اس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں۔ "ہم چاہیں بھی تو آپ سے محبت کرنا ترک نہیں کر سکتے۔"

رات گیارہ کا عمل تھا اور الفت کا دل ایک ناقابلِ بیان وحشت میں ڈوبا جا رہا تھا۔

نہ صرف بچے بلکہ جلیس الحسن بھی ابھی تک نہ لوٹے تھے۔

وہ انتظار کرتے کرتے تھک گئی تھی۔

عاصمہ کے خلاف اُس کے دل میں شدید نفرت کا لاوا پک رہا تھا۔ اُسے یوں لگ رہا تھا جیسے عاصمہ نے چند دن میں اُس سے سب کچھ چھین کر اُسے تہی دامن کر دیا ہو۔

گھر کی زمین اُسے اپنے قدموں تلے سے سرکتی اور دیواریں معلق لگ رہی تھیں۔

اُس کا دم گھٹا جا رہا تھا۔

اعصابی تناؤ کے سبب اُس کی گردن کے جوڑ بُری طرح دُکھنے لگے تھے۔

خاموشی کسی کھوئے کی طرح اُسے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں رینگتی محسوس ہو رہی تھی۔

اُس کی نگاہیں بار بار دیوار کی گھڑی کی طرف اُٹھ رہی تھیں۔

وہ خود کو بہت تنہا، دل شکستہ اور بے دست و پا محسوس کر رہی تھی۔ تہی دامنی کا گہرا احساس اس کے دل کو مٹھی میں جکڑے لے رہا تھا۔

مسلسل کئی گھنٹے کے اعصابی تناؤ کے نتیجے میں شانوں کے اکڑاؤ اور گردن کی دُکھن کو افاقہ دینے کی خاطر اُس نے اپنے دونوں بازو پیچھے کی آڑ میں لے کر ہتھیلیاں ہوئے دباؤ کے ساتھ بستر پر ٹیکتے ہوئے سر پیچھے کی طرح جھکا کر چہرہ اوپر اُٹھاتے ہوئے کمرے کی چھت کے طول و عرض میں اپنی نظریں دوڑاتے ہوئے سوچا۔

"کیا نہیں کیا میں نے اس گھر کی خاطر اور اس گھر کے مکینوں کی خاطر! ساری کشتیاں جلا کر آزمائشوں کے بحرِ ذخار میں کود پڑی اور پھر پیچھے پلٹ کر نہیں دیکھا..... خود غرضی کو پس پشت ڈال کر اپنے آپ سے لڑتی رہی..... صبر و استقامت کو اپنا شعار بنایا۔ بچوں کے دل جیتنے اور انہیں اپنا بنانے کے لیے اپنی انا کو روند ڈالا..... کیا نہیں کیا میں نے اس گھر کی خاطر..... مگر مجھے کیا ملا؟ دکھ اور تنہائی۔"

دفعتاً اُس کی نظر جلیس الحسن کی تصویر پر جا رکی۔

"آہ! کیا بدلہ دیا تم نے مجھے میرے ایثار و وفا کا؟"

اُس کی آنکھیں بھر آئیں اور جلیس الحسن کی تصویر دھندلاتی چلی گئی۔

لیکن چشمِ تصور کی کارگزاریوں نے جلیس الحسن، عاصمہ بیگم اور بچوں کو یکجا کر کے نوع بنوع مناظر دکھانا شروع کر دیے۔ کس قدر خوش تھے وہ سب کے سب! بچے کھلے پڑتے تھے۔

عاصمہ بیگم جلیس الحسن کو اپنی اداؤں سے لبھا رہی تھیں۔

اور جلیس الحسن کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا!

"اوہ! خدایا!" الفت نے پوری شدت سے اپنے جبڑوں کو باہم بھینچتے ہوئے سوچا۔ "کیا کروں؟ آخر کہاں جاؤں میں؟"

پلٹ کر دیکھنا تو فضول تھا کہ واپسی کا اب کوئی سوال ہی نہ تھا۔

کشتیاں تو وہ کب کی جلا چکی تھی۔

وہ تو بابا کے اس فرمان کو سینے سے لگا کر نکلی تھی کہ "ڈو اور ڈائی"۔

یعنی کر گزرو یا پھر جان ہی سے گزر جاؤ۔

لیکن کر گزرنے کے باوجود اُسے ہر قدم، ہر آزمائش سے نجات کی فقط ایک ہی راہ نظر آ رہی تھی۔

بعض لوگوں کا مقدر "ڈو اینڈ ڈائی" بھی تو ہوا کرتا ہے!

ساڑھے گیارہ بجے کے لگ بھگ جب کمرے کے بند دروازے پر دستک سُن کر اُس نے بستر سے بمشکل اُٹھ کر دروازہ کھولا تو اُس کا سر بھاری ہو چلا تھا اور آنکھوں میں غنودگی سی اُتر رہی تھی۔

"سوری جان! دیر ہو گئی۔" جلیس الحسن نے اُس کے کسی استفسار کا انتظار کیے بغیر خفیف سے لہجے میں کہا۔

"صرف دیر!" اُس نے مخمور نگاہوں سے اُن کی طرف دیکھا۔

"نہیں، بہت دیر۔" انھوں نے اپنے پیچھے دروازہ بند کرتے ہوئے اُسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔

الفت کو اپنا سر بُری طرح چکراتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

"دراصل میں تو فوراً ہی واپس لوٹ آنا چاہتا تھا مگر زرین کے اصرار نے مجھے وہاں ٹھہرنے پر مجبور کر دیا۔"

"زرین کے اصرار نے یا کسی اور نے؟"

"کیا تمہیں مجھ پر بھروسا نہیں؟"

"ہاں..... تھا.....!" وہ دھیرے سے بولی۔

"تھا..... یعنی اب نہیں ہے؟"

"اب..... اب تو سب..... ختم.....!" وہ خمار آلود آواز میں بولی۔

"کیا مطلب؟"

"مجھے نیند آ رہی ہے..... میں..... سونا..... چاہتی..... ہوں.....!"

"آل رائٹ..... آل رائٹ ڈارلنگ.....!" وہ اُسے بانہوں میں لیے مسہری تک پہنچے اور انھوں نے اُسے بستر پر لِٹا دیا۔

"عورت کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کب کس انداز سے خفا ہوتی ہے۔" جلیس الحسن نے آپ ہی آپ سوچا۔

اور الفت کو بستر پر لِٹا دینے کے بعد وہ اپنا لباسِ شب خوابی لے کر باتھ رُوم کی جانب بڑھ گئے۔

دن بھر کی تکان اور ساحلِ سمندر کی سیر غسل لینے کی متقاضی تھی۔

غسل کے بعد جب وہ باتھ روم سے نکلے تو الفت بستر پر مدہوش پڑی تھی۔

"آج بہت گہری نیند آ رہی ہے! شاید یہی خفگی کا کوئی انداز ہو۔" جلیس الحسن یہ سوچتے ہوئے مسہری کے دوسرے کنارے پر جا بیٹھے۔

حسبِ معمول نیند کی ایک گولی لینے کے لیے انھوں نے سائیڈ بورڈ کی دراز کھولی تو خواب آور گولیوں کی وہ شیشی جو انھوں نے تین چار روز قبل ہی کھولی تھی، خالی پڑی اُن کا مُنہ چڑا رہی تھی۔ شیشے کے نیچے ایک رقعہ کھلا پڑا تھا۔

انھوں نے رقعہ اُٹھا کر ٹیوب لائٹ جلائی اور رقعہ کے اندراجات پر نظریں دوڑانا شروع کیں۔

تحریر الفت کی تھی۔

اُس نے لکھا تھا:

"جلیس صاحب!

آپ کو یہ رقعہ ملنے تک میں آپ کی دنیا سے بہت دُور جا چکی ہوں گی۔ آج پہلی بار آپ کو یہ بتا رہی ہوں کہ ایجاب و قبول کی منزل سے گزرنے سے پہلے ہی مجھے اس عورت کے تصور نے ڈرانا شروع کر دیا تھا جس کے پیچھے آپ گزشتہ کئی روز سے پاگلے پھر رہے ہیں..... نہ جانے کیوں اس عورت کے لیے میرے دل کی گواہی اول دن سے یہی تھی کہ وہ ایک نہ ایک دن واپس لوٹ آئے گی..... اور بالآخر میرے دل کی یہ گواہی سچ ثابت ہو ہی گئی..... دوسری بار جب میں اپنے میکے سے آپ کے گھر آئی تو بابا نے مجھ سے کہا تھا "ڈو اور ڈائی"..... میں نے بابا کی اس نصیحت کو پلو میں باندھا اور کر گزرنے کی جن جن منزلوں سے گزر سکتی تھی گزرتی چلی گئی۔ مجھے اعتراف ہے کہ دوسری بار آپ کے گھر آنے کے بعد ایک طویل عرصے تک میں نے آپ کے بچوں سے مصلحت آمیز رویہ رکھا۔ مجھے وہ بُرے لگتے تھے مگر میں منافق بن کر اُن سے محبت جتانے کی کوشش کیا کرتی تھی مگر مصلحت اور منافقت کے اس راستے پر چلتے چلتے بالآخر میں آپ کے بچوں سے حقیقی محبت کی منزل تک آ پہنچی تھی..... شاید اتنی سب کی محبت تھی جس نے دنیا کے ایک معروف گائناکولوجسٹ کی زبانی یہ سننے کے بعد کہ میں کبھی ماں نہ بن سکوں گی، مجھے نفسیاتی طور پر بکھر جانے سے بچائے رکھا..... لیکن..... آہ..... بالآخر یہ عقدہ کھل گیا کہ آپ کے بچے اسی عورت کے ہیں جس نے انہیں جنم دیا ہے۔ میں تو اُن کی کتابِ زندگی کا ایک حرفِ غلط تھی اور بس..... سو جس گلشن کی میں نے خونِ دل سے آبیاری کی تھی اس پہ آج آتے دیکھنے سے پہلے ہی خود کو مٹاتے رہی ہوں..... میرے لیے یہ تصور ہی محال ہے کہ جن بچوں کو اپنا بنانے کی خاطر میں نے اپنی انا کو روند ڈالا وہ مجھے نظر انداز کر کے اس

عورت سے التفات ظاہر کریں جو بے شک ان کی سگی ماں سہی مگر میرے لیے سوہانِ روح بنی رہی ہے۔ مجھے بزدل مت سمجھیے گا کہ اپنی موت کو خود گلے سے لگا لینے والے بزدل نہیں ہوا کرتے۔ میں آپ کے اور بچوں کے لیے راستہ صاف کیے جا رہی ہوں اور اپنی موت کی ذمے دار میں خود ہوں۔

امی اور بابا سے کہہ دیجیے گا کہ مجھے معاف کر دیں۔

میرے تمام زیورات نگین وزرین اور اعجاز و فراز کی دلہنوں میں یکساں طور پر تقسیم کر دیے جائیں کہ ان کو دینے کے لیے میرے پاس اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے

الفت

جلیس الحسن خواب آور گولیوں کی خالی شیشی کا بھید پا چکے تھے۔

آخری سطر تک پہنچتے پہنچتے اُن کی نگاہوں کے آگے ستارے سے ناچنے لگے تھے۔ انھوں نے متوحش نظروں سے الفت کی جانب دیکھا وہ گرد و پیش سے بے نیاز پڑی تھی۔

گھبرا کر وہ باہر لپکے اور نیچے ہی سے بہ آوازِ بلند بچوں کو پکارنا شروع کر دیا۔

کسی کو فون کرنے یا ایمبولینس منگوانے کا موقع نہ تھا۔ الفت کو جلد از جلد اسپتال لے جایا جانا ضروری تھا۔

اعجاز اور فراز کی مدد سے انھوں نے جوں توں الفت کو گاڑی کی عقبی نشست پر ڈالا اور ایک معروف اسپتال کی طرف روانہ ہو گئے۔

نگین عقبی نشست پر الفت کا سر اپنے زانو پر دھرے سہمی سہمی سی بیٹھی تھی۔

فراز اور زرین اگلی نشست پر بیٹھ گئے تھے۔

اعجاز کو جلیس الحسن نے اس ہدایت کے ساتھ گھر پر ہی چھوڑ دیا تھا کہ وہ اُن کی عدم موجودگی میں گھر کی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے تیار رہے۔

کیا خبر آئندہ کس قسم کی صورتِ حال سامنے آتی اور اسپتال میں کتنی دیر لگ جاتی۔ صبح اسپتال میں بھی ہو سکتی تھی۔ اُن کی عدم موجودگی میں کسی کا فون بھی آ سکتا تھا۔ گھر کے نوکر چاکروں میں سے اس وقت تو فقط چوکیدار جاگ رہا تھا، جسے یہ بتایا گیا تھا کہ بیگم صاحبہ کی اچانک ناسازیٔ طبع کے باعث انھیں اسپتال لے جایا جا رہا تھا۔ اسپتال ہی میں صبح ہو جانے کی صورت میں بقیہ ملازمین کی تشفی بھی ضروری تھی ورنہ اہلِ خانہ کو غائب اور گھر کو خالی پا کر وہ خود ساختہ فسانوں اور قیاس آرائیوں کا جال بن سکتے تھے۔

بچوں کے استفسار پر جلیس الحسن کو انھیں یہ تو بتانا ہی پڑا تھا کہ الفت نے بڑی مقدار میں خواب آور گولیاں کھا لی تھیں۔ مگر کیوں؟

اس سلسلے میں انھوں نے کچھ عجلت میں ہونے کے سبب اور کچھ مصلحتاً انھیں کچھ نہ بتایا تھا۔ الفت کا خط انھوں نے اپنی تحویل میں محفوظ کر لیا تھا۔

"تم نے یہ کیا حماقت کی الفت؟" وہ اپنی گاڑی کو تیزی سے دوڑاتے ہوئے انتہائی دل گرفتگی سے سوچ رہے تھے۔ انھیں الفت کی نہ جانے کون کون سی اور کب کب کی باتیں یاد آ رہی تھیں۔

رات قیامت بن کر گزری۔

الفت کو ایک معروف نجی اسپتال لے جانے کا ایک فائدہ اگر یہ ہوا کہ فوری طور پر بہترین معالجین کی خدمات اور انتہائی نگہداشت میسر ہو گئی تو دوسرا فائدہ یہ بھی ہوا کہ پولیس کیس بننے کی نوبت نہ آئی۔

معالجین کا کہنا تھا کہ الفت کو بہت ہی بروقت اسپتال پہنچا دیا گیا تھا ورنہ اس کی جان بچانا مشکل ہو جاتا۔

جلیس الحسن نے رات کے پچھلے پہر الفت کے میکے میں فون کھڑکانا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ جانتے تھے کہ سارا خاندان دوڑا چلا آئے گا خواہ مخواہ جگ ہنسائی ہو گی لہٰذا بہتر یہی ہے کہ بلا ضرورت الفت کے اقدامِ خودکشی کی خبر مشتہر نہ کی جائے۔

ویسے یہ خدشہ تو اُن کے دل میں تمام وقت موجود رہا تھا کہ اُس کے میکے میں اطلاع نہ دینے اور خدانخواستہ

کوئی اونچ نیچ ہو جانے کی صورت میں الفت کے اس اقدام کا الزام اُن کے سر لگائے جانے کا احتمال ہو سکتا تھا۔

لیکن پھر بھی انھوں نے مصلحتاً الفت کے میکے اطلاع نہ دینے کا خطرہ مول لے لیا تھا۔

تاہم اعجاز کے اطمینان کی خاطر انھوں نے اسے اسپتال سے کئی بار فون کیا۔

اگلے روز انھوں نے معالجین کی اس یقین دہانی کے بعد کہ الفت کی حالت خطرے سے باہر اور اطمینان بخش ہے گھر کا چکر لگایا اور وہیں سے الفت کے میکے فون کرنے کا ارادہ کیا۔ پہلے تو انھوں نے سوچا کہ الفت کی ناسازیٔ طبع کے باعث اُس کے اسپتال میں زیرِ علاج ہونے کی اطلاع کر دیں اور بس۔ لیکن اس صورت میں الفت کے جملہ اہلِ میکہ کے اسپتال دوڑے چلے آنے کا احتمال تھا۔ اصل بات کھلتی اور پھر کھلتی۔ چنانچہ پھر انھوں نے فقط بابا کو اعتماد میں لے کر انھیں الفت کے اقدامِ خودکشی کی اطلاع دینے کا ارادہ کیا۔

بابا کو انھوں نے کچھ اس تدبیر سے الفت کے اس اقدام کی اطلاع دی کہ وہ زیادہ پریشان نہ ہوں اور گھر کے دیگر افراد اُن کی پریشانی دیکھ کر چونک نہ جائیں۔

انھوں نے بابا سے کہا "اب الفت کی حالت اطمینان بخش ہے۔ آپ زیادہ پریشان نہ ہوں اور اس خبر کو فقط اپنی ذات تک محدود رکھتے ہوئے اپنی تحمل سے کچھ دیر میرا انتظار کیجیے۔ میں آپ کو لینے کے لیے پہنچتا ہوں۔"

اگرچہ جلیس الحسن نے بابا کو الفت کی حالت کے اطمینان بخش ہونے کا پورا اطمینان دلانے کی کوشش کی تھی مگر پدرانہ محبت کے ہاتھوں مجبور بابا جلیس الحسن کی زبانی کلامی اطمینان دلانے سے پورے طور مطمئن نہ ہو پائے پھر بھی انھوں نے گھر والوں سے اپنی پریشانی اور تفکر چھپانے کی حتی الامکان کوشش کی۔

امی کو یہ خبر تو تھی کہ جلیس الحسن نے فون کیا تھا اور یہ کوئی بات نہ تھی جلیس الحسن اکثر خیر و عافیت معلوم کرنے کے لیے فون کرتے ہی رہتے تھے۔ مگر پھر بھی انھوں نے بابا سے پوچھنا ضروری سمجھا "الفت کے ہاں سب خیریت تو ہے؟"

"ہاں سب خیریت ہے۔ جلیس الحسن میاں کل شام نہ آ سکنے کی معذرت کر رہے تھے۔" بابا نے مصلحت آمیز دروغ گوئی سے کام لیا۔

کچھ دیر بعد بابا نے شیروانی اور ٹوپی لے کر باہر جانے کا قصد کیا تو امی بولیں "خیریت کہاں چل دیے؟"

"تمہاری مجھ پر شک کرنے کی عادت اس عمر میں بھی نہیں گئی۔" بابا نے اپنی فطری خوش مزاجی سے کام لینے کی کوشش کی۔

جلیس الحسن ایسی تیز رفتاری سے بابا کو لینے پہنچے کہ بابا ششدر رہ گئے۔

بابا کے بارے میں جلیس الحسن کی رائے اتنی مستحکم تھی کہ انھوں نے بابا سے کچھ نہیں چھپایا۔ انھیں راستے میں سب کچھ بتا دیا۔ عاصمہ بھی اس قصے کا ایک کردار تھیں اور بابا حیران تھے کہ الفت نے عاصمہ کی آمد کی خبر کیوں چھپائی تھی۔

بابا کے ہمراہ جلیس الحسن دوبارہ اسپتال پہنچے تو تینوں بچے الفت کے کمرے میں سر جھکائے بیٹھے تھے اور ایک نرس اس کی تیمارداری کو سرہانے موجود تھی۔

گو الفت پر غنودگی طاری تھی تاہم اس کی حالت بقول اس کے معالجین کے اب مکمل طور پر خطرے سے باہر تھی۔ بابا کافی دیر اس کے پاس رہے پھر جلیس الحسن گھر چھوڑ آئے مگر فقط گلی کے نکڑ تک!

بابا کے خیال میں جلیس الحسن نے الفت کے اقدامِ خودکشی کی خبر کی تشہیر نہ کر کے بڑی دور اندیشی اور دانشمندی کا ثبوت دیا تھا۔

سہ پہر کو اعجاز بھی اسپتال آ پہنچا۔ ملازموں کو ہدایت کر آیا تھا کہ اگر کسی کا فون آئے تو یہی کہا جائے کہ سب گھر والے کہیں باہر گئے ہوئے ہیں۔

چونکہ چوکیدار گھر کے تمام ملازمین کو یہ بتا چکا تھا کہ رات بیگم صاحبہ کی اچانک طبیعت خراب ہو جانے کی وجہ سے انھیں اسپتال لے جایا گیا تھا اس لیے وہ اعجاز کی اس ہدایت پر کہ کسی کا فون آئے تو یہی کہا جائے کہ سب گھر والے کہیں باہر گئے ہوئے ہیں، خاصے متعجب ہوئے۔

الفت کی پُراسرار بیماری اور اس کی علالت کو دوسروں سے چھپانے کا بھید اُن کی سمجھ میں کچھ آ رہا تھا کچھ نہیں!

شام تک اُلفت کی حالت کافی سنبھل چکی تھی۔

چونکہ عاصمہ بیگم نے گزشتہ شب بچوں سے وعدہ لیا تھا کہ وہ اگلی شام بھی اُن کے ساتھ گزاریں گے چنانچہ جلیس الحسن نے چاہا کہ وہ حسبِ وعدہ ماں کے ساتھ شام گزار آئیں تاکہ اُن سے کیا ہوا وعدہ بھی وفا ہو جائے اور جو بات وہ مشتہر نہیں کرنا چاہتے تھے، وہ بھی راز رہے۔

مگر ان چاروں میں سے ایک بھی جانے پر آمادہ نہ ہوا۔

نگین، فرازنا ور زرّین تو گزشتہ رات سے اب تک بنا کچھ کھائے پیے بیٹھے تھے۔ اعجاز کی حالت بھی اُن سے کچھ مختلف نہ تھی۔ صبح دس گیارہ بجے کافی کا ایک مگ اور دو بسکٹ زبردستی حلق سے اُتارے تھے اور بس!

نہ چاہتے ہوئے بھی جلیس الحسن کو عاصمہ بیگم سے از خود رابطہ قائم کر کے انھیں اس شام بچوں کے نہ آسکنے کے اصل سبب سے آگاہ کرنا پڑا کہ اُن سے غلط بیانی یا مصلحت آمیز دروغ گوئی انھیں کسی غلط فہمی یا شکوہ و شکایت کا شکار بھی کر سکتی تھی۔ وہ اسپتال دوڑی چلی آئیں۔ خجل اور شرمندہ سی۔

جیسے اس سانحے کی اصل ذمّے دار وہی تو تھیں!

اپنے بچوں کو انھوں نے سوتیلی ماں کے لیے متفکر، ملول اور مضطرب دیکھا تو انھیں اُلفت پر رشک آنے لگا۔

جلیس الحسن کے بیہ بتانے پر کہ وہ گزشتہ شب سے یونہی پریشان ہیں اور صبح سے اب تک انھوں نے کچھ نہ کھایا پیا ہے، عاصمہ بیگم انھیں لاڈ پیار سے سمجھا بجھا کر اسپتال کے کیفے ٹیریا میں لے گئیں اور وہاں زبردستی انھیں کچھ کھلایا پلایا۔

شام ڈھلے بابا پھر اسپتال آئے۔ عاصمہ بیگم سے بھی ملے اور اپنی باتوں سے انھیں وہ خاصی معقول دکھائی دیں۔

اُلفت اگرچہ اب پورے طور پر ہوش میں تھی مگر اُس نے آنکھیں مُوند رکھی تھیں۔

ہوش میں آنے کے بعد اُلفت کو پہلا خیال تو یہ آیا تھا کہ وہ ہے کہاں؟

جلیس الحسن کے چہرے پر نظر پڑتے ہی خیال آیا کہ کیا وہ عاصمہ کے پاس سے واپس آچکے ہیں؟

اور پھر اُس نے آنکھیں مُوندتے ہوئے سوچا کہ شرمندہ ہونے اور مزید دُکھ جھیلنے کو پھر بچ گئی۔

بابا آئے تو وہ پوری طرح ہوش میں تھی۔ مگر اپنے کمرے میں عاصمہ بیگم کی موجودگی کی تاب نہ لاتے ہوئے اُس نے آنکھیں مُوند رکھی تھیں۔

"کیسی ہے اب؟" اُس نے بابا کی آواز سُنی تھی۔

"بہت بہتر ہیں اب تو۔ ہوش آچکا ہے۔" جلیس الحسن انھیں بتا رہے تھے۔

بابا اُس کے پلنگ کے قریب آئے تو اپنے سر پر اُن کے مشفق ہاتھ کا لمس محسوس کر کے اُس کی آنکھیں بھر آئیں۔ خفت کے مارے آنکھیں کھولنے کی ہمت نہ کر پا رہی تھی وہ۔

مرنے کی کوشش کے باوجود بچ جانا اُسے ایک شرمناک تجربہ لگ رہا تھا۔

"کاش! میں مرگئی ہوتی۔" اُس نے سوچا اور انتہائی کوشش کے باوجود وہ اپنی آنکھوں سے آنسوؤں کو ڈھلک جانے سے نہ روک سکی۔ بابا سمجھ گئے کہ وہ جاگ رہی تھی۔ مگر وہ کچھ بولے نہیں۔

پیچھے ہٹے اور عاصمہ بیگم کے ساتھ جا بیٹھے اور دھیرے دھیرے ان سے باتیں کرنے لگے۔

اُلفت پر ایسا احساسِ ندامت طاری تھا کہ وہ آنکھیں نہ کھول پا رہی تھی۔

ویسے آنکھیں نہ کھولنے کا سبب یہ بھی تھا کہ وہ اپنے کمرۂ علالت میں دشمنِ جاں اور رقیبِ روسیاہ عاصمہ بیگم کی موجودگی کو برداشت نہ کر پا رہی تھی۔

رات پڑنے پر جلیس الحسن پہلے بابا کو گھر چھوڑ کر آئے مگر مصلحتاً پھر گلی کے نکڑ تک ہی!

پھر وہ فرازنا اور زرّین کو سمجھا بجھا کر گھر لے گئے۔

نگین نے کہہ دیا تھا کہ وہ رات مما کے پاس ہی گزارے گی۔

جب جلیس الحسن فرازنا اور زرّین کو گھر چھوڑ کر واپس آچکے تو اعجاز ماں کو اُن کے ہوٹل تک پہنچانے کو اُٹھ کھڑا ہوا اور اُس کے آگے عاصمہ بیگم بے بس ہو گئیں۔

رات کو جلیس الحسن بھی نگین کے ساتھ اسپتال ہی میں رہے۔

اگلی صبح جب اسپتال کی دو نرسیں اُلفت کے بستر کی چادریں تبدیل کر رہی تھیں اور جلیس الحسن نگین کے ہمراہ کمرے سے باہر نکلے راہداری میں کھڑے تھے کہ اعجاز اور زرّین ناشتا لیے آپہنچے۔

"اب کیسی ہیں مما؟" اعجاز نے آتے ہی پوچھا۔

"اب بہت بہتر ہیں۔" نگین نے بتایا۔

"بیٹا! کل تمہاری مم واپس جا رہی ہیں۔" جلیس الحسن نے ان تینوں میں سے کسی کو بطورِ خاص مخاطب کیے بنا کہا۔

انھوں نے ایک دوسرے کو دیکھا پھر نگین نے بوجھل آواز میں کہا "جی پاپا!"

"میں سمجھتا ہوں آج کا دن تم لوگوں کو انھی کے ساتھ گزارنا چاہیے۔"

"یہ کیسے ممکن ہے پاپا؟" نگین بولی۔

"کیوں، ممکن نہ ہو سکنے کی کیا بات ہے؟"

"مما اسپتال میں پڑی ہیں۔"

"وہ اب بہت بہتر ہیں، تم اُن کی فکر نہ کرو۔"

"اُن کی فکر کیسے نہ کریں پاپا؟" نگین بولی "آپ تو اچھی طرح جانتے ہیں کہ مما نے ہمارے لیے کیا نہیں کیا؟"

"بہرحال بیٹا! آج کا دن تو تمہیں اپنی ماں کو دینا چاہیے کیونکہ کل تو وہ چلی جائیں گی۔"

"جانے والوں کی کیا پروا کرنا پاپا!" اعجاز نے کہا۔

جلیس الحسن نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا پھر نگین اور زرّین کو دیکھا۔ ان تینوں کے چہروں پر دُکھ کے سائے لرزاں تھے۔

جلیس الحسن آگے بڑھے اور انھوں نے اعجاز کے شانے پر ہاتھ دھرتے ہوئے سر جھکا کر ایک سرد آہ کھینچی اور بولے "میں تمہارے دُکھ سے آشنا ہوں بیٹے....!" انھوں نے توقف کیا اور بولے۔ "زندگی اسی دھوپ چھاؤں کا نام ہے!"

نگین کا جی بھر آیا اور اُس نے اپنی آنکھوں کے کناروں پر آتر آنے والی سیلن کو پنہاں رکھنے کے لیے نگاہیں جھکا لیں۔

"اعجاز بیٹے! گھر واپس جاؤ گے تو دونوں بہنوں کو بھی لے جانا۔" جلیس الحسن نے کہا۔ "تم لوگ اگر چاہو تو خود ماں کے پاس چلے جانا یا چاہو تو انھیں گھر بلا لینا۔"

"نہیں پاپا! اُن کا گھر آنا تو کسی طرح مناسب نہیں ہوگا۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ......" وہ رُک گئی پھر بولی "کیا آپ کے خیال میں ہم مما کے سلیپنگ پلز لینے کا سبب نہیں سمجھ سکتے؟"

جلیس الحسن اُس کا مُنہ دیکھتے رہ گئے۔

"پاپا! ہم تو جانے کے لیے آئے ہیں۔ جبیت تو مما ہی کو ہمارے ساتھ رہنا ہے۔" نگین نے مزید کہا "تو پھر ہم ایسا کوئی کام کیوں کریں جس سے مما کی دل آزاری ہو؟"

"آل رائٹ...... آل رائٹ بیٹا...... ایز یو وش...... مگر اپنی مم کے پاس چلے ضرور جانا تم لوگ۔"

اُلفت کے کمرے کی صفائی کی جا چکی تھی۔ چنانچہ ان سب نے کمرے کا رُخ کیا۔

اُلفت کی مزاج پرسی کے بعد اعجاز دونوں بہنوں کے ہمراہ واپس گیا ہی تھا کہ اُلفت کے معالج اُس کے معائنے کے لیے آپہنچے۔

ابھی جلیس الحسن اُلفت کے سرہانے موجود نرس سے کچھ دیر کو نجات حاصل کرنے کی تدبیر سوچ رہے تھے کہ عاصمہ بیگم اُلفت کی عیادت کو آپہنچیں اور اُلفت نے انھیں دیکھتے ہی مُنہ موڑ کر آنکھیں مُوند لیں۔

"کیسی ہیں اب اُلفت؟" انھوں نے عاصمہ کو جلیس الحسن سے پوچھتے سُنا۔

"اب ٹھیک ہیں۔"

گو عاصمہ بیگم کمرے میں داخل ہوتے ہی اُلفت کو جاگتے اور اُن پر اُس کی نظر پڑتے ہی اُسے رُخ پھیر کر آنکھیں مُوندتے دیکھ چکی تھیں اور انھیں رنج بھی ہوا تھا مگر پھر بھی وہ ہمت کر کے اُس کے پلنگ کی طرف بڑھیں

اور اُس کے نزدیک پہنچنے کے بعد انھوں نے جلیس الحسن اور الفت کی تیمارداری پر مامور نرس سے اشاروں ہی اشاروں میں تخلیہ چاہنے کی درخواست کی۔

فرش پر قدموں کی آہٹ، دروازہ کھلنے اور پھر بند ہونے کی آوازیں سُن کر الفت نے غالباً یہ سمجھتے ہوئے کہ عاصمہ چلی گئی ہیں، آنکھیں وا کردیں لیکن انھیں اپنے نزدیک کھڑے دیکھ کر اور جلیس الحسن اور نرس کو کمرے سے غائب دیکھ کر وہ چونک سی گئی۔ اور ایک بار پھر آنکھیں موند لیں۔

عاصمہ بیگم نے دھیمے سُروں میں کہا: "میں مانتی ہوں کہ میں بہت بُری ہوں مگر اتنی بھی نہیں کہ تم میری طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کرو۔ ... جلیس صاحب نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے ... تمھیں غلط فہمی میں میری وجہ سے جو تکلیف اٹھانا پڑی، اس کی معافی چاہتی ہوں۔ میں تو صرف اپنے بچّوں سے ملنے کے لیے آئی تھی اور بس ... تمہارے شوہر سے ماضی میں میری وابستگی رہی تھی مگر اب سوائے اس کے میرا اُن سے کوئی تعلق نہیں کہ وہ میرے بچّوں کے باپ ہیں ..." انھوں نے توقف کیا پھر بولیں: "جہاں تک بچّوں کا تعلق ہے، وہ کل میرے تھے، آج ہم دونوں کے ہیں اور کل بھی ہمارے رہیں گے۔ یہ بچے میرے اور تمہارے درمیان رابطے کی ایک کڑی بنے رہیں گے۔ انھی کی محبت مجھے یہاں کھینچ لائی تھی ورنہ میرا اب یہاں کیا رکھا ہے ... میں ان کی محبت کی ڈور میں بندھی پھر کھنچی چلی آؤں گی۔ میری جڑیں دو مختلف سرزمینوں میں اتر گئی ہیں۔ نہ میں ان کو بھلا سکوں گی، نہ اُس بچے کو چھوڑ سکتی ہوں جو ہزاروں میل دُور میری واپسی کا منتظر بیٹھا ہے ..."

الفت نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔

"ہاں ...!" عاصمہ بیگم اس کا استعجاب تاڑتے ہوئے بولیں۔ "ایک بیٹا اور بھی ہے میرا جسے امریکا میں اُس کے باپ کے پاس چھوڑ کر آئی ہوں کیونکہ عدالتی پابندی کے مطابق میں اُسے اُس کے باپ کی اجازت کے بغیر امریکا سے باہر نہیں لے جاسکتی ... تم بہت خوش قسمت ہو الفت کہ تمھیں ایک اچھا شوہر اور محبت کرنے والے بچے ملے ہیں ... کل ان کی زبانی تمہاری انتہائی تعریف سُن کر مجھے بہت حسد محسوس ہوا تم سے لیکن پھر میں نے دیانت داری سے سوچا کہ تم اس تعریف اور اس محبت کی اہل ہو کیونکہ تم نے اُن کے لیے بہت کچھ کیا ہے اور مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا کہ میں انھیں تم سے محبت کرتے دیکھ کر تم سے حسد محسوس کروں کیونکہ میں نے انھیں دیا ہی کیا ہے سوائے دکھ کے!" عاصمہ بیگم نے چند ثانیے خاموشی اختیار کرنے کے بعد ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ "تم نے میرے بچّوں کے لیے جو کچھ کیا ہے، اُس کا احسان میں تمام عمر ادا نہ کر پاؤں گی ... انھیں اسی طرح عزیز رکھنا الفت اور کل صبح میرے واپس جانے کے بعد اگر یہ دل گرفتہ دکھائی دیں تو اُن کے زخموں پر پھاہے رکھتے ہوئے انھیں اپنی محبت کی آغوش میں سمیٹ لینا ... میں تمہاری ممنونِ احسان رہوں گی۔"

پھر عاصمہ بیگم نے جھک کر مغربی آداب کے بموجب الفت کے رخسار کو دھیرے سے چوما اور پھر اُس کے کمرے سے باہر نکل گئیں۔ الفت دم بخود پڑی تھی۔

عاصمہ بیگم الفت کے کمرے سے نکلیں تو جلیس الحسن راہداری میں کھڑے سگریٹ کے کش لے رہے تھے۔ عاصمہ کو دیکھتے ہی وہ اُن کی جانب بڑھ آئے۔

"کیا ہوا؟" انھوں نے بیتابانہ پوچھا۔

"کچھ نہیں آپ کی بیگم سے کچھ بات کرنی تھی سو کرلی۔" عاصمہ بیگم نے مسکرانے کی ناکام کوشش کی۔

جلیس الحسن کو عاصمہ بیگم کا چہرہ ایک ملول، دل گرفتہ اور شکست خوردہ عورت کا چہرہ لگا۔

کیسی عجیب بات تھی کہ ماضی میں اس عورت کو عزیز از جان رکھنے کے باوجود وہ اُسے تسلی کے دو بول دینے سے قاصر تھے۔ زندگی کبھی کبھی بڑے عجیب راستوں پر لا کھڑا کرتی ہے!

"میں نے بچّوں سے کہہ دیا ہے، وہ آج کا دن تمہارے ساتھ گزارنے آ رہے ہیں۔"

"سو نائس آف یو!" وہ دُکھ سے مسکرا دیں۔

عاصمہ بیگم کے جانے کے بعد جلیس الحسن الفت کے کمرے میں گئے تو وہ دروازے کے رُخ نگاہیں لگائے لیٹی تھی۔

وہ تخلیے کا فائدہ اٹھاتے والہانہ انداز میں اُس کی طرف بڑھے۔

"یہ کیا حماقت کی تھی تم نے؟" وہ شاکی لہجے میں بولے۔

الفت کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔

"کیسا پریشان کر ڈالا تم نے ہم سب کو۔" وہ اُس کی ناک کی پھننگ چھوتے ہوئے بولے۔ "جانان! یہ سوچ کر ہی رعایت دے دی ہوتی مجھے کہ اس کے چار بچّوں کا باپ ہوں میں اور ..... ماضی میں اُس سے ایک مخصوص قسم کی جذباتی وابستگی رہی ہے میری۔" الفت نے آنکھیں موند لیں۔ اور اس کے چہرے سے کرب ٹپکنے لگا۔

پھر اُس کے لب کپکپائے: "اب ..... اب ..... کبھی ..... اس ..... وابستگی ..... کا ..... ذکر ..... نہ کیجیے ..... گا ..... میرے ..... سامنے۔"

"ایسی بہادر ہوکر اتنی کمزور اور بزدل؟" اُن کے لہجے سے استعجاب ٹپک رہا تھا۔

الفت نے آنکھیں کھول لیں۔ ڈبڈبائی نگاہوں سے انھیں دیکھا پھر بولی: "دنیا کی کوئی عورت اپنے مرد اور دوسری عورت کے معاملے میں بہادری کا مظاہرہ نہیں کرسکتی!"

تب ہی دروازے پر دستک سنائی دی۔

"کم اِن۔" جلیس الحسن نے کہا اور بابا کمرے میں در آئے۔

بابا خاصی دیر اُس کے پاس رہے۔

"الفت بیٹے!" بابا نے رسانیت سے کہا۔ "منزل سے دو گام پرے ہمت ہار بیٹھیں ..... ارے بیٹا ابھی تو اصل امتحان تھا تمہاری آزمائش کا ..... پھر تو ہر منزل تمہاری تھی!"

اُس نے شرمندہ ہوکر بابا سے نظریں چرا لیں۔ وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہے تھے۔

وہ چاروں عاصمہ بیگم کے پاس آئے ضرور اور شام تک اُن کے پاس بھی رہے مگر اُن کی نگاہوں میں دبی دبی سی شکایتیں اور حکایتیں تھیں۔

شاید وہ اپنے ساتھ اُن کی جانب سے ہونے والی زیادتی کا شکوہ کرنا چاہتے تھے۔

شاید وہ ان زیادتیوں کا قصاص چاہتے تھے۔ یا شاید وہ کچھ کہنا چاہتے تھے۔

عاصمہ بیگم کو یوں لگ رہا تھا جیسے وقت کے سرد اور بے رحم ہاتھوں نے اُن کے اور اُن کے جگر گوشوں کے مابین ایک دیوار حائل کردی ہو۔

اس دیوار سے اپنا کان لگا کر وہ دیوار کے دوسری طرف سے اُن کی گھٹی گھٹی سسکیاں، اُن کے دلوں کی بیتاب سرسراہٹیں تو سُن سکتی تھیں مگر اُسے گرانے سے قاصر تھیں۔

اعجاز گاڑی ڈرائیو کرکے لایا تھا اور جب سرِ شام ان چاروں نے الفت کو دیکھنے کے لیے اسپتال جانے کی خاطر واپسی کا قصد کیا تو انھوں نے اعجاز کو ہدایت کی۔ "بیٹا! گاڑی احتیاط سے چلانا۔"

"آپ اطمینان رکھیں۔" اعجاز نے کہا۔ "اور یہ بتائیں کہ کل یہاں سے آپ کے ایئرپورٹ جانے کا کیا انتظام ہے؟"

"ہوٹل کی گاڑی مجھے ایئرپورٹ پہنچائے گی۔"

"میں آجاؤں گا آپ کو ایئرپورٹ لے جانے کے لیے۔"

"اوہ! نو! بیٹا!"

"کیوں؟"

"کیونکہ تم تو مجھے ایئرپورٹ پہنچا دو گے لیکن جہاز میں بیٹھنے کے بعد میرا دھیان تمہاری طرف لگا رہے گا۔"

"کوئی بات نہیں اپنی منزل پر پہنچنے اور اپنے لوگوں سے ملنے کے بعد آپ یہاں والوں کو بھول جائیں گی۔"

"تم سے زیادہ میرا اپنا اور کون ہوگا!" وہ بھیگی ہوئی آواز میں بولیں۔

اعجاز ماں سے کچھ نہیں بولا۔ مگر اُس کی نگاہوں نے کہا۔ "کیا اپنوں کے ساتھ یہی کیا جاتا ہے؟"

عاصمہ بیگم انھیں کار پارکنگ تک رخصت کرنے آئیں اور انھوں نے ایک ایک کو بار بار پیار کرتے ہوئے اپنی تشنہ کامی کو سیرابی میں بدلنے کی کوشش کی۔

مگر جب وہ گاڑی میں سوار ہوکر چلے گئے تو انھیں یوں لگا جیسے وہ اور زیادہ پیاسی ہوگئی ہوں!

اپنے ہاتھوں میں پھول لیے
وہ چاروں اسپتال پہنچے تو کمرہ خالی پڑا تھا۔
متوحش ہو کر وہ سب اسپتال کے شعبۂ استفسارات تک پہنچے۔
کمرہ نمبر ۱۲ کی مریضہ کی بابت استفسار کرنے پر پتا چلا کہ اُن کی اسپتال سے چھٹی ہو گئی ہے۔
وہ گھر پہنچے تو الفت اپنے کمرے میں بستر پر نیم دراز پڑی تھی۔
اُن میں سے ایک نے پوچھا "کیسی ہیں ماما؟" اور پھول اُس کے قدموں میں ڈھیر کر دیے۔
"ٹھیک ہوں بیٹا!"
"ہم سب تو ہاسپٹل میں آپ کا کمرہ خالی دیکھ کر گھبرا گئے تھے۔" زرّین نے بتایا۔
"مجھے بھی خدشہ تھا۔" جلیس الحسن بولے۔
"مگر پاپا! یہ اچانک ہی ماما کو کیوں ڈسچارج کر دیا گیا ہاسپٹل سے؟"
"یہ خود ہی رخصت لینے پر مُصر ہو گئی تھیں۔"
"کیوں ماما؟"
"کیونکہ میں بالکل ٹھیک ہوں۔" الفت اُن سے نظریں ملانے کی ہمت نہ پا رہی تھی۔
"وہ تو آپ ہیں مگر آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔" تمکین نے کہا۔
"تم میری فکر نہ کرو..... میں بالکل ٹھیک ہوں۔" اُس نے تمکین کا گال تھپتھپایا پھر دھیمے سُروں میں بولی۔
"صبح جاؤ گی نا؟"
"کہاں؟ یونیورسٹی؟"
"یونیورسٹی نہیں، ایئرپورٹ..... اپنی مم کو سی آف کرنے۔"
تمکین نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔
"صبح ہم سب انھیں سی آف کرنے چل رہے ہیں۔"
"رئیلی!" فراز کے مُنہ سے بے ساختہ نکلا۔
"ہاں بیٹے..... اسی لیے تو میں ہاسپٹل سے گھر آئی ہوں۔"
اور یہ سچ بھی تھا۔
بابا کے دو جملوں نے پھر اس کی کایا پلٹ دی تھی۔
اپنی ایک ذرا سی جذباتی بھول سے اُس نے کئی برس کی ریاضت کو داؤ پر لگا دینے کی جو حماقت کی تھی، اُس کے ازالے کی کوئی صورت نکالنی ہی تھی۔
گو یہ منزل اُسے پچھلی ہر منزل سے زیادہ کڑی لگ رہی تھی۔
مگر
پچھلی منزلوں پر اپنا پرچم بدستور سربلند رکھنے کے لیے اس منزل سے بھی سرخرو گزرنا ضروری قرار پا گیا تھا۔
تمکین، اعجاز، فراز اور زرّین چاروں اُسے بے یقینی سے دیکھ رہے تھے۔
جلیس الحسن کی نگاہوں میں استعجاب ڈول رہا تھا۔
عجیب تھی یہ عورت بھی جس کا نام الفت تھا!
ہر بار ایک نئے روپ میں سامنے آ کر انھیں ششدر کر دیا کرتی تھی۔
اپنے جذباتی سہو کا ازالہ کی جو صورت اُس نے اختیار کرنے کی کوشش کی غالباً یہ اسی کا ردِ عمل تھا کہ اعجاز اپنی جگہ سے اٹھ کر اُن کے نزدیک آ بیٹھا اور اُن کے شانوں پر اپنا بازو بصد محبت دراز کرتے ہوئے بولا "کیا آپ جانتی ہیں کہ یہ گھر آپ کے بغیر کتنا اُداس تھا؟"
"اور ہم سب بھی۔" تمکین نے کہا۔
"گھر کا تصور آپ کے بغیر مکمل ہی نہیں ہوتا ماما۔" فراز بولا۔
"ہم سب کو آپ کی ضرورت ہے۔" اعجاز نے کہا۔
"پاپا کو بھی؟" زرّین نے مسکراتے ہوئے باپ کو دیکھا۔

"اور مجھے تم سب کی۔" الفت نے شدتِ جذبات سے بوجھل آواز میں کہا۔

اگلی صبح جب عاصمہ بیگم ایئرپورٹ پر روشن مصنوعی بتیوں کے اجیارے میں ہوٹل کی گاڑی سے اترنے کے بعد اپنا مختصر سا اسباب ٹرالی پر دھرے بین الاقوامی روانگی والے حصے کی جانب پیش قدمی کر رہی تھیں تو زرّین کی آواز نے اُن کے قدم روک لیے۔
"مم!" اُس نے بلند آواز میں پکارا تھا۔
انھوں نے پلٹ کر دیکھا اور اُن کی نگاہوں میں اداسی کی جگہ حیرانی اور مسرت کی ملی جلی کیفیت ہلکورے لینے لگی۔ غیر متوقع طور پر وہ سب انھیں الوداع کہنے کے لیے موجود تھے۔
جلیس الحسن بھی!
انھوں نے دونوں بیٹوں کے ماتھے چومے۔ بیٹیوں کو پیار کیا پھر انھیں ایسی محبت بھری نگاہوں سے دیکھنے لگیں جیسے انھیں اپنی آنکھوں میں بسا لینا چاہتی ہوں!
"تھینک یو..... تھینک یو ویری مچ۔" انھوں نے تشکر آمیز لہجے میں جلیس الحسن سے کہا "کہ آپ نے یہ خوشگوار ساعتیں بھی میرے ہمراہ کر دینے کی زحمت کی۔"
"میرا نہیں۔" جلیس الحسن انگلی سے ایک مخصوص سمت اشارہ کرتے ہوئے بولے "شکریہ ادا کرنا ہی ہے تو الفت کا کرو۔"
عاصمہ بیگم نے چونک کر انگلی کی سمت دیکھا۔
الفت مخصوص وضع کی ایک کرسی پر بیٹھی انتہائی انہماک سے دوسری سمت ایک نوجوان ماں کو بے تحاشا روتے ایک ننھے بچے کو سنبھالنے کی کوشش میں ہراساں ہوتے دیکھ کر سوچ رہی تھی۔
"بچے پالنا واقعی ایک کارِ گراں ہے!"
عاصمہ بیگم اپنا سامان وہیں چھوڑ کر الفت کی سمت بڑھ گئیں۔
جونہی الفت کی نظر اُن پر پڑی، وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔
دو عورتیں جو ایک ہی مرد کا ماضی اور حال تھیں ایک دوسرے کے روبرو کھڑی تھیں!
الفت نے جس کے لیے عاصمہ بیگم کا تصور سوہانِ روح بنا رہا تھا اپنے من میں چھپے خوف کا سر قلم کر کے اُس کے لاشے پر کھڑے ہو کر عاصمہ بیگم کا سامنا کرنے کی کوشش کی۔
عاصمہ بیگم نے اپنا ہاتھ بڑھا کر اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے جذبات سے رُندھی آواز میں کہا۔
"تھینک یو۔" پھر اُن کی آنکھیں بھر آئیں اور وہ الفت کا ہاتھ چھوڑ کر سر جھکائے واپس پلٹ گئیں۔
جاتے جاتے عاصمہ بیگم نے پھر بچوں کو پیار کیا۔
پھر انھیں نظروں میں بسانے کی کوشش کی۔
اور روانگی ہال کی طرف چل دیں۔
داخلی دروازے سے ہال میں داخل ہونے سے قبل انھوں نے آخری بار پلٹ کر دیکھا اور اپنا ہاتھ لہرایا۔
اُن کے چاروں بچے اور جلیس الحسن بھی الوداعی انداز میں ہاتھ ہلا رہے تھے۔
الفت پہلے تو ہچکچائی لیکن پھر اُس نے بھی اپنا ہاتھ اوپر اٹھا کر لہرانا شروع کر دیا۔
ادھر عاصمہ بیگم کی آنکھیں بھیگ چکی تھیں۔
اور ادھر اُن کے بچوں کی!
عاصمہ بیگم کے روانگی ہال میں داخل ہونے کے بعد جب تمکین اور زرّین اپنے آنسوؤں کو چھپانے کی کوشش کرنے لگیں تو الفت نے اُن سے کہا "جان! وہ پھر آئیں گی..... تمہاری محبت انھیں پھر کھینچ لائے گی۔"
تمکین کے لبوں کے گوشے پھڑکنے لگے۔
زرّین بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔
جلیس الحسن نے اپنا بایاں بازو زرّین کے شانوں پر دراز کرتے ہوئے بڑی محبت سے کہا "بیٹا! ہم سب تو ہیں آپ کے ساتھ۔"

اعجاز الفت کی جانب بڑھا اور اُس نے اپنا توانا بازو ان کے شانوں پر پھیلاتے ہوئے کہا۔ "آیئے ممّا گھر چلیں۔"

جب اعجاز اور فرزانہ اُسے اپنے جلو میں لے کر کار پارکنگ کی طرف چلے تو صبح کا اُجیارا آسمان سے زمین پر اُتر رہا تھا۔

عاصمہ بیگم کے جگر گوشوں کے دل کی چبھن وہ اپنے دل میں محسوس کر رہی تھی۔

ان چاروں سے اُسے آج ایک عجیب سا رشتہ استوار ہوتا لگ رہا تھا۔

مَنوں کا رشتہ!

جو اجنبی کو آشنا اور غیر کو اپنا بنا دیتا ہے۔

وہ چاروں اُسے اپنے ہی وجود کا حصّہ لگ رہے تھے۔

اس کے تصور میں رعنا جمیل در آئیں۔

وہ اس وقت ہوتیں تو دیکھتیں کہ دوسری عورت کے بچے کس طرح اس کے بن گئے تھے۔

ضروری نہیں کہ ہر شخص کی ہر بات درست یا ہر بات غلط ہو۔

رعنا جمیل نے اس کی ہمدردی اور بہی خواہی میں جو بہت سی باتیں کہی تھیں اُن میں سے یہ بات بہر حال غلط ثابت ہوئی تھی کہ دوسرے کے بچے اپنے نہیں بن سکتے۔

عظیم الشان سلطنت روما کے عظیم حکمران مارکس آریلیئس کے حوالے سے بابا نے سچ ہی کہا تھا کہ سچی خوشی انھیں ملتی ہے جو خود پر حکومت کرنا جانتے ہیں۔

اس رات جب وہ چاروں اُسے اپنے جلو میں ڈائننگ لاؤنج میں لائے تو اُس نے دیکھا کھانے کی میز موم شمعوں سے جگمگا رہی تھی۔

میز پر وسط میں ایک بڑا سا کیک تھا جس پر لکھا تھا۔

"ویلکم ہوم ممّا!"

اُس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو اُمڈ آئے۔

یہی میز ہوا کرتی تھی جس کے گرد اُسے موجود پا کر وہ چاروں واک آؤٹ کر جایا کرتے تھے۔

اور آج!

اسی میز پر وہ اُسے خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ اپنی اس فتح کے لیے وہ بابا کی ممنونِ احسان تھی۔

اس رات جب جلیس الحسن اُس کی سُرخروئی پر اُسے مبارکباد دینے کو جھکے تو اُس نے دیکھا ایک عرصے بعد وہی لاکٹ اُن کے گلے میں جھول رہا تھا۔

پہلی بار وہ اُس عورت کے تصور سے سہمی نہیں جس کے اس لاکٹ کی زینت بنے ہونے کا اب بھی احتمال ہو سکتا تھا۔

اُس نے بلا جھجکے لاکٹ کا کھٹکا دبا دیا۔

اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ لاکٹ میں تو اُس کی اپنی تصویر آراستہ تھی!

یک بیک اُسے یوں لگا جیسے اُس کے اردگرد سیکڑوں ہزاروں چراغ جل اٹھے ہوں۔

وہ روشنیوں میں نہا گئی۔

اور جیت کا نشہ اُسے مغرور کرنے لگا۔

تھی ناجیرت کی بات

کہ

اُس نے بہتے پانی پہ مکان بنایا تھا!

اور مقدر کی بات۔

کہ وہ

وہ ہارتے ہارتے جیت گئی تھی!!

(ختم شد)